

# بیاض القرۃ

ڈاکٹر اسرار احمد



هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١﴾ (آل عمران)

# بیان القرآن

حصہ ہفتم

ترجمہ ومختصر تفسیر

سُورَةُ ق تَا سُورَةُ النَّاسِ

ڈاکٹر اسرار احمد

مُرتبہ

حافظ خالد محمود خضر

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین



سابع کردہ

انجمن خدام القرآن  
خیبر پختونخوا، پشاور

مرحوم و مغفور مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی تاحیات خواہش اور عمل کے عین مطابق، مرحوم کے قانونی جائشیں تمام حضرات کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طبع شدہ تصنیفات / تالیفات 'آڈیو' ویڈیوز کو طبع / تیار کر کے چاہے قیمتاً ہو یا مفت، تقسیم کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائٹلی یا "محفوظ حقوق" کا تقاضا بھی نہیں ہے البتہ تیار کردہ مواد (آڈیو یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی مذموم کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ، غلط اقتباس، سیاق و سباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت و شہرت پر حرف آئے، تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق رکھتے ہیں۔

نام کتاب : بیان القرآن (حصہ ہفتم)

اشاعت اول : جون 2015ء

قیمت : 650 روپے

ISBN: 978-969-606-038-3

مآخذ کتب :

انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا

18-A ناصرمیشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار، پشاور

فون: 2584824 - 2214495 (091)

ای میل: peshawar@tanzeem.org

زیر اہتمام :

شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 35869501-3

ای میل: publications@tanzeem.org

ملنے کا پتا: مکتبہ خدام القرآن، 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس لاہور



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

حافظ عاکف سعید

”بیان القرآن“ کی ساتویں جلد ترتیب و تسوید کے تمام مراحل سے گزر کر اب بحمد اللہ تعالیٰ طباعت کے آخری و حتمی مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں کراچی میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نماز تراویح کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے ترجمہ و مختصر تشریح کا جو مبارک فریضہ ادا کیا تھا، جسے عرف عام میں ”دورہ ترجمہ قرآن“ کہا جاتا ہے، وہ ایک سو آٹھ گھنٹوں پر محیط تھا۔ ”بیان القرآن“ دراصل اسی کی تحریری صورت ہے۔ تصنیف و تالیف کی دنیا سے وابستہ حضرات خوب جانتے ہیں کہ محض ایک ڈیڑھ گھنٹے پر محیط کسی بلند پایہ تقریر یا خطاب کو اعلیٰ معیاری سطح پر تحریری صورت میں مرتب کرنا بھی کس قدر مشقت طلب اور کٹھن کام شمار ہوتا ہے اور اس کے لیے کس اعلیٰ درجے کی علمی و ادبی صلاحیت درکار ہوتی ہے، جبکہ ”بیان القرآن“ کی ریکارڈنگ ایک ڈیڑھ گھنٹے پر نہیں، ایک سو آٹھ گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و توفیق کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایں سعادت بزدور باز و نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس کارِ خیر کی تکمیل میں جن ساتھیوں نے بھی عملی حصہ ڈالا ہے وہ تمام لوگ ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ میں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کروں گا اپنے دیرینہ تنظیمی و تحریری ساتھی اور قرآن اکیڈمی میں میرے خصوصی معاون کار حافظ خالد محمود خضر صاحب کا، جن کی سال ہا سال کی پیہم جدوجہد اور قابل رشک خلوص و لگن کا نتیجہ ”بیان القرآن“ کی تکمیل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ محترم حافظ صاحب نے ”مکرمہ تشکر“ کے حوالے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ ”بیان القرآن“ کی ترتیب و تسوید اور طباعت و اشاعت کے ضمن میں جن ساتھیوں کا خصوصیت کے ساتھ انہوں نے ذکر کیا اور شکریہ ادا کیا ہے ان میں ہمارے ایک تنظیمی ساتھی جن کی قافلۂ تنظیم میں شمولیت تو زیادہ پرانی نہیں ہے، لیکن بعض اعتبارات سے وہ ان قابل رشک افراد میں شامل ہیں جو دیر سے آتے ہیں لیکن آگے نکل جاتے ہیں — کرنل (ر) عاشق حسین صاحب ہیں جو ”بیان القرآن“ کے حصہ اول کی اشاعت کے بعد ہمارے رابطے میں آئے، لیکن پھر انہوں نے خود کو ہمہ تن اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ زبان و ادب کے حوالے سے اللہ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ ”بیان القرآن“ کی ترتیب و تسوید (editing) کے کام میں ان کا غیر معمولی تعاون ہمارے لیے تائید غیبی سے کم نہ تھا۔ اسی طرح طباعت کے حوالے سے ہمارے ایک دیرینہ ساتھی شیخ رحیم الدین صاحب کی غیر معمولی مساعی ان تھک محنت اور بے پناہ جذبہ و لگن مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ ساتھ عملے کے تمام دیگر ارکان جن کا

خصوصی تعاون اس کام میں ہمیں حاصل رہا، بالخصوص حافظ محبوب احمد صاحب، حافظ محمد زاہد صاحب اور مرتضیٰ احمد اعوان سب ہمارے شکرے اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء!

”بیان القرآن“ عام معنوں میں تفسیر قرآن نہیں ہے۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو زمانہ طالب علمی کے آخری سالوں میں ہی قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی و قلبی والہانہ تعلق قائم ہو چکا تھا، چنانچہ میڈیکل کی تعلیم کے آخری سالوں میں ہی ان کے دروس قرآن کو قبولیت عام کا مقام حاصل ہو گیا تھا، لیکن جیسا کہ انہوں نے ”بیان القرآن“ حصہ اول کے مقدمہ میں خود اس حقیقت کا وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ انہیں ہرگز ”مفسر“ ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ان کے دروس قرآن سے متاثر ہو کر جب بھی احباب فرمائش کرتے تھے کہ آپ قرآن حکیم کی تفسیر بھی ضرور لکھیں تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں خود کو اس مقام کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہر کیف، قرآن کی عظمت کا نقش ان کے دل پر کچھ اس انداز سے ثبت ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا، قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی انہیں ترغیب دینا اور قرآن کے منتخب مقامات کے دروس کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرنا ان کی زندگی کا مشن تھا۔ ان کی ان تمام تردعویٰ تبلیغی مساعی کے مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم ہی کو حاصل تھی۔ قرآن مجید کی عظمت اور امت کے عروج و زوال کے ضمن میں قرآن کی اہمیت کے حوالے سے علامہ اقبال کے یہ اشعار گویا ان کے تحت الشعور کا حصہ بن چکے تھے کہ۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن  
نیت ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر  
اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

حکیم الامت علامہ اقبال، امت کے زوال و انحطاط کی تشخیص کرتے ہوئے ہمیں مسلسل یہ پیغام دیتے رہے کہ اس کا اصل سبب ترک قرآن ہے، یعنی قرآن سے اپنے مطلوب تعلق کو توڑ کر اسے محض ایک ایسی کتاب مقدس یا بقول اقبال نسخہ موت بنا دینا ہے جس کا زندگی کے پیچیدہ معاملات و مسائل کے حل اور علم و فکر کے میدان میں رشد و ہدایت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اقبال ہی کے دور کی ایک اور عظیم شخصیت جن کا تعلق طبقہ علماء سے تھا، یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دہلویؒ، وہ بھی یہی سوچ رکھتے تھے کہ زوال امت کا اصل سبب قرآن کو ترک کر دینا ہے۔ انگریز کے خلاف جہاد حریت کے اس عظیم مجاہد نے مالٹا کی اسیری سے رہائی پانے کے بعد اپنی پیرائہ سالی میں طبقہ علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس

کام میں صرف کروں گا کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔“ (بحوالہ: ”وحدت امت“ از مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ)

والد محترمؒ کی تمام مساعی پر اگر نگاہ ڈالیں تو یہ ”میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!“ کے مصداق امت کو دوبارہ قرآن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش ہی کا مظہر ہیں اور اس ضمن میں شیخ الہندؒ نے جو راستہ تجویز کیا، یعنی قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کرنا، لوگوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں قرآن کے معانی سے روشناس کرانا اور انہیں قرآن کی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کرنا، اسی کی عملی تعبیر ہیں۔ قرآن کا پیغام آج ان کے دروس قرآن اور خطابات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اردو بولنے سمجھنے والے دنیا بھر میں کروڑوں افراد تک پہنچ رہا ہے۔ اسی خدمت قرآنی کا ایک بہت بڑا مظہر اور ایک اعتبار سے نقطہ عروج نزول قرآن کے مہینے رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں نماز تراویح کے ساتھ پورے قرآن کا ترجمہ نہایت مختصر اور ضروری تفسیر کے ساتھ، یعنی دورہ ترجمہ قرآن ہے، جو بحمد اللہ اب ”بیان القرآن“ کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی پورے کا پورا دستیاب ہے۔ فالحمد لله على ذلك!

یہ امر واقعہ ہے کہ ”بیان القرآن“ کا کتابی صورت میں مرتب ہو جانا، والد محترمؒ اور ہم سب کا ایک خواب تو ضرور تھا، لیکن اس کی عملی تعبیر بظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔ تاہم اس کی پہلی جلد کی اشاعت سے ہمیں یہ حوصلہ ملا کہ یہ کام ناممکن نہیں ہے، جیسا کہ خود والد محترمؒ نے بھی پہلی جلد کی بار دیگر اشاعت کے موقع پر ”تقدیم“ میں اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا:

”اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے، گویا کہ ابھی پہلا ایسا کام باقی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ جیسے اس نے میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرادی ویسے ہی باقی بھی شائع کرادے گا۔“ خواہ میری اس دنیا سے دیر آخرت کی جانب رواں دواگی کے بعد ہی سہی!

والد محترمؒ کی حیات میں صرف پہلی جلد ہی شائع ہو سکی تھی، بعد کی تمام جلدیں ان کی وفات کے بعد وقفے وقفے سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ اور اب ان کی وفات کے پانچ سال دو ماہ بعد آخری جلد کے آجانے پر یہ کام بحمد اللہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ السّعی مینا والا تمام من اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خدمت قرآنی کے اس کام کو والد محترمؒ کے لیے توشہ آخرت اور عوام الناس کو قرآن سے جوڑنے، اس کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا موجب بنادے۔ آمین یا رب العالمین!

احقر عالم محمد سعید  
امیر تنظیم اسلامی

۲۴ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ / ۱۲ جون ۲۰۱۵ء

بروز جمعہ المبارک



## ترتيب

284	سورة التَّحْرِيمِ	9	سورة قَآ
297	سورة الْمُلْكِ	27	سورة الذَّرِيَّةِ
308	سورة الْقَلَمِ	39	سورة الطُّورِ
321	سورة الْحَاقَّةِ	51	سورة النَّجْمِ
328	سورة الْمَعَارِجِ	67	سورة الْقَمَرِ
339	سورة نُوحٍ	80	سورة الرَّحْمَنِ
347	سورة الْجِنِّ	98	سورة الْوَاقِعَةِ
357	سورة الْمَرْقَلِ	118	سورة الْحَدِيدِ
365	سورة الْمُدَّثِّرِ	163	سورة الْمُجَادَلَةِ
378	سورة الْقِيَمَةِ	180	سورة الْحَشْرِ
387	سورة الدَّهْرِ	201	سورة الْمُمتَحِنَةِ
395	سورة الْمُرْسَلَتِ	215	سورة الصَّفِّ
402	سورة النَّبَاِ	231	سورة الْجُمُعَةِ
407	سورة النَّازِعَاتِ	244	سورة الْمُنفِقُونَ
415	سورة عَبَسَ	256	سورة التَّغَابُنِ
422	سورة التَّكْوِيْنِ	272	سورة الطَّلَاقِ

517	سورة الرِّزَال	428	سورة الْإِنْفِطَار
520	سورة الْعَدِيت	432	سورة الْمُطَفِّفِينَ
522	سورة الْقَارِعَة	438	سورة الْإِنْشِقَاق
524	سورة التَّكَاثُر	447	سورة الْبُرُوج
526	سورة الْعَصْر	451	سورة الطَّارِق
528	سورة الْهَمَزَة	453	سورة الْأَعْلَى
531	سورة الْفِيل	460	سورة الْغَاشِيَة
533	سورة قُرَيْش	465	سورة الْفَجْرِ
535	سورة الْمَاعُون	473	سورة الْبَلَد
537	سورة الْكُوْثَر	479	سورة الشَّمْس
539	سورة الْكُفْرُون	484	سورة اللَّيْل
541	سورة النَّصْر	491	سورة الضُّحَى
543	سورة اللَّهَب	496	سورة أَلَمْ نَشْرَح
546	سورة الْإِخْلَاص	500	سورة التِّيْن
548	سورة الْفَلَق	504	سورة الْعَلَق
552	سورة النَّاس	509	سورة الْقُدْر
555	دعائے ختم قرآن	512	سورة الْبَيِّنَة



# سُورَةُ ق

## تمہیدی کلمات

سورہ ق سے مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں (آخری) منزل کا آغاز ایک ساتھ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقام بھی گویا قرآن الشّٰعِدین ہے۔ قبل ازیں سورہ یونس کے آغاز کو بھی میں نے اس لحاظ سے قرآن الشّٰعِدین قرار دیا تھا کہ وہاں پر بھی مکی مدنی سورتوں کے نئے گروپ اور نئی منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں تو سورتوں کے گروپ اور منزل کے اعداد بھی برابر ہیں۔ یعنی سورہ یونس کے آغاز کے ساتھ مکی مدنی سورتوں کا تیسرا گروپ اور تیسری منزل ایک ساتھ شروع ہوتے ہیں جبکہ یہاں پر مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ اور ساتویں منزل کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر منازل (احزاب) کی تقسیم کے بارے میں بھی چند اہم نکات نوٹ کر لیجئے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ تقسیم ہفتے کے سات دنوں کے حساب سے کی گئی ہے تاکہ اگر کوئی شخص ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرنا چاہے تو وہ ہر روز ایک منزل (حزب) تلاوت کر لے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر حضرات نے رات کے نوافل میں تلاوت کا یہی معمول اپنا رکھا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام منازل میں قرآن کی مقدار بالکل برابر نہیں بلکہ تقریباً برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منازل خالصتاً سورتوں کے حساب سے بنائی گئی ہیں اور مقدار برابر کرنے کے لیے پاروں کی تقسیم کی طرح سورتوں کو تقسیم نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے تیسری اہم بات یہ ہے کہ منازل کی تقسیم میں سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک خاص ”حسن ترتیب“ پایا جاتا ہے۔ یعنی پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں (اس گنتی میں سورۃ الفاتحہ شامل نہیں کہ وہ قرآن حکیم کے لیے بمنزلہ مقدمہ کے ہے اور سورۃ الحجۃ کی آیت ۸۹ کی رو سے خود ایک قرآن ہے) دوسری منزل میں پانچ سورتیں تیسری منزل میں سات چوتھی میں نو پانچویں میں گیارہ چھٹی میں تیرہ جب کہ ساتویں منزل میں پینسٹھ سورتیں شامل ہیں (۶۵ کا عدد ۱۳ کا حاصل ضرب ہے)۔ گویا منزل بہ منزل سورتوں کی تعداد میں ایک خاص ”عددی نسبت“ کارفرما ہے جس کی وجہ سے اعداد کی ایک خوبصورت میزھی بنتی نظر آتی ہے۔ اور چوتھا اہم نکتہ یہ کہ ساتویں یا آخری منزل میں چونکہ سورتوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس منزل کو ”حزب مفصل“ بھی کہا جاتا ہے۔

مکی مدنی سورتوں کا چھٹا گروپ جس کا آغاز سورہ ق سے ہو رہا ہے سات مکی (سورہ ق تا سورۃ الواقعة) اور دس مدنی (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکی اور مدنی قرآن کا حجم تقریباً برابر ہے۔ یعنی سورہ ق سے لے کر سورۃ الواقعة تک مکی قرآن کا حجم تقریباً ایک پارے کے برابر ہے جبکہ سورۃ الحدید سے لے کر سورۃ التحریم تک مدنی قرآن تقریباً سوا پارے کے برابر ہے اس کے بعد مکی مدنی سورتوں کا

ساتواں اور آخری گروپ زیادہ تر مکی قرآن پر مشتمل ہے۔ مکی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے سورتوں کے پہلے دو گروپس اور آخری دو گروپس میں باہم ایک بہت خوبصورت ”مناسبت“ پائی جاتی ہے۔ اس مناسبت کو یوں سمجھیں کہ جس طرح پہلا گروپ تقریباً تمام مدنی قرآن پر مشتمل ہے (اس میں صرف سورۃ الفاتحہ کی ہے) باقی سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائدۃ تقریباً سوا چھ پارے مدنی قرآن ہے (اسی طرح آخری گروپ اکثر و بیشتر مکی قرآن پر مشتمل ہے) (اس گروپ میں بالاتفاق تو صرف آخری دو سورتوں یعنی ”معدّٰتین“ کو ہی مدنی مانا گیا ہے)۔ پھر جس طرح دوسرا گروپ مکی اور مدنی قرآن کے حجم کے اعتبار سے متوازن ہے (اس گروپ میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دو مکی سورتیں ہیں جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو ہی مدنی سورتیں ہیں) اسی طرح آخری سے پہلا یعنی چھٹا گروپ بھی اس لحاظ سے متوازن ہے کہ اس میں تقریباً ایک پارہ مکی قرآن (سورۃ ق تا سورۃ الواقعة) اور تقریباً سوا پارہ مدنی قرآن (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) ہے۔

چھٹے گروپ کی مکی سورتوں کا ایک امتیازیہ بھی ہے کہ لسانی اور ادبی محاسن کے اعتبار سے قرآن کا خوبصورت ترین حصہ ان سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کا مخصوص صوتی آہنگ جسے میں Divine Music سے تعبیر کرتا ہوں ان سورتوں میں تیز رجھ کے ساتھ اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ چھوٹی چھوٹی آیات میں خوبصورت الفاظ گنیموں کی طرح چمکتے دیکتے نظر آتے ہیں۔ ان ہی سورتوں میں سورۃ الرحمن بھی شامل ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ”عروس القرآن“ (قرآن کی دلہن) قرار دیا ہے۔ بہر حال فصاحت، بلاغت اور ادبی خوبیوں کے اعتبار سے ان سورتوں کو قرآن کے ذرۂ سنام (climax) کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں سورۃ ق بہت جامع اور اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد سورت ہے۔ باقی چھ سورتیں باہم جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ یعنی سورۃ الذاریات اور سورۃ الطور کا جوڑا، سورۃ الانجم اور سورۃ القمر (ان میں چاند اور ستارے کی نسبت بھی ہے) کا جوڑا، اور سورۃ الرحمن اور سورۃ الواقعة کا جوڑا۔

زیر مطالعہ (آخری) منزل کی مکی سورتوں (سورۃ ق سے آخر تک) سے متعلق دو باتیں جو قبل ازیں بھی کئی مرتبہ دہرائی جا چکی ہیں یہاں موقع کی مناسبت سے ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ پہلی بات یہ کہ یہ تمام سورتیں حضور ﷺ کی مکی دور کے ابتدائی چار برسوں میں نازل ہوئی ہیں اور دوسری یہ کہ ان سورتوں کا مرکزی مضمون ”انذار آخرت“ ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جو پہلا حکم ملا تھا وہ انذار کا تھا۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا۔ ان آیات میں کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کو پہلا حکم سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَأَنذِرْ ۝٢﴾ ”اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو“۔ یعنی لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ان کی دنیوی زندگی ہی بس اصل زندگی نہیں ہے کہ وہ کھائیں پیئیں عیش کریں اور اس دنیا سے چلے جائیں بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اسی نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ نہ تو یہ کائنات ہمیشہ رہنے والی ہے اور نہ ہی کسی انسان کی زندگی دائمی ہے۔ انسانی زندگی کی مہلت محدود مدت کے لیے ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا ختم



ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہونا ہے اور نئی زندگی کے حوالے سے ایک بے لاگ محاسبے کا سامنا کرنا ہے۔ اسی محاسبے کے بعد مزایا جزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت سے غافل ہیں ان پر اس ”انذار“ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ غالب کا یہ شعر گویا انہی لوگوں کی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد      یہ طبیعتِ ادھر نہیں آتی!

اسی وجہ سے قرآن میں ”انذارِ آخرت“ پر خصوصی زور دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے ”عقیدہ آخرت“ کے لیے صرف ”ایمان“ کے لفظ کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ یعنی جہاں دوسرے عقائد کے لیے ”ایمان“ کا مطالبہ ہے وہاں ”آخرت“ کے لیے عام طور پر یقین (حقیقی ایمان) کا مطالبہ کیا گیا ہے: ﴿وَبَلَاءُ حَوْرَةٍ هُمْ يُوَفُّونَهَا﴾ (البقرة)۔ عقیدہ آخرت کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے اندر عملی اعتبار سے حقیقی مثبت تبدیلی اسی عقیدے کی بنا پر آتی ہے۔ بہر حال چھٹے اور ساتویں گروپ یعنی آخری منزل کی کئی سورتوں کا مرکزی مضمون ”انذارِ آخرت“ ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں بہت مختصر انداز میں ”انباء الرسل“ کا تذکرہ بھی ہے اور کئی سورتوں کے عمومی مضامین کی جھلکیں بھی۔

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱۵ تا ۱۵

قَالَ وَالْقُرْآنَ الْحَكِيمَ ۚ بَلْ عَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكُفْرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ۚ ءَاذَا مِنَّا وَلَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ۚ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ۖ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيفٌ ۚ بَلْ كَذَّبُوا بِآلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ ۖ أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۖ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَكْنُتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ بَهِيجٍ ۖ تَبَصَّرَةٌ وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۖ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبْرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَبْتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۚ وَالنَّخْلَ بَسَقَتْ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۖ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۚ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيِّتًا ۖ كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۖ كَذَبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَكُودٌ ۚ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۚ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ ثَمُودَ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدُ ۚ أَفَعَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ

**آیت ۱ ﴿قَسَّ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ۝۱﴾** ”ق“ قسم ہے عظیم الشان قرآن کی۔“

قرآن کی تین سورتیں ایسی ہیں جن کے آغاز میں صرف ایک ایک حرف مقطعہ ہے۔ ان میں سورہ ق کے علاوہ تیسویں پارے کی سورہ ص اور انیسویں پارے کی سورہ القلم (یا سورہ ن) شامل ہیں۔ بہت سی دوسری سورتوں کے آغاز کی طرح اس سورت کے آغاز میں بھی قرآن مجید کی قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے۔ بہر حال چونکہ سورہ یس کے آغاز میں قرآن حکیم کی قسم کا مقسم علیہ موجود ہے اس لیے اس قسم کا مقسم علیہ بھی وہی ہوگا، یعنی ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝۱﴾ (یس)۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ (اے محمد ﷺ) قسم ہے اس عظیم الشان قرآن کی بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں۔ اس قسم کے فوراً بعد دوسری آیت میں حضور ﷺ کا تعارف انداز آخرت کے حوالے سے کرایا گیا ہے جو اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔

**آیت ۲ ﴿بَلْ عَجِبُوا اَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ﴾** ”بلکہ انہیں بہت عجیب محسوس ہوا ہے کہ ان کے پاس آیا ہے ایک خبردار کرنے والا ان ہی میں سے“

”منذر“ کے معنی ہیں انداز کرنے والا، خبردار (warn) کرنے والا۔

**﴿فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ۝۲﴾** ”تو کافروں نے کہا یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔“

**آیت ۳ ﴿اِذَا مَثْنَا وَاَنْتُمْ تَرَابًا﴾** ”کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو ہم پھر سے زندہ کیے جائیں گے؟)“

**﴿ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ۝۳﴾** ”یہ لوٹنا یا جانا تو بہت دور کی بات ہے۔“

مر کر مٹی ہو جانے کے بعد ہمارا دوبارہ زندہ ہونا بالکل انہونی سی بات ہے یہ بعید از قیاس دعویٰ کر کے یہ صاحب بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔

**آیت ۴ ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ﴾** ”ہم خوب جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کیا چیز کم کرتی ہے۔“

”ہم“ کے صیغے کے ساتھ یہ شاہانہ انداز بیان ہے۔ انسانوں کے دفن ہونے کے بعد زمین ان کے جسموں کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے ہر انسان کا کون سا عضو کیسے ضائع ہوتا ہے اور پھر ان کے اجزاء کس کس صورت میں کہاں کہاں جاتے ہیں، ہمیں ایک ایک چیز کا علم ہے۔

**﴿وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيْظٌ ۝۴﴾** ”اور ہمارے پاس تو ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی موجود ہے۔“  
ہمارے پاس ایک ایک چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ ان کے جسموں کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا تھا اور ان کی موت کے بعد ان کے تمام اجزاء کو ہم مٹی میں ہی محفوظ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن اسی مٹی سے ہم انہیں نکال لیں گے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نَعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰی ۝۵﴾ (طہ)۔ اس کے علاوہ ان کے ایک ایک عمل کی پوری تفصیل بھی ہم نے لکھ رکھی ہے اور ان کی ارواح بھی ہمارے پاس عَلٰیٰیْنِ یا سَجِیْنِ میں موجود ہیں۔ غرض ان کی کوئی چیز بھی ہمارے علم یا قبضے سے باہر نہیں ہے۔

**آیت ۵** ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ﴾ ”بلکہ انہوں نے جھٹلادیا حق کو جب کہ وہ ان کے پاس آیا“  
 ﴿فَهُمْ فِي أَمْرٍ مُّرِيحٍ﴾ ”سو اب وہ ایک بڑی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔“

ایک طرف تو جواب دہی اور احتساب کی باتیں ماننے کے لیے ان کی طبیعتیں آماوہ نہیں اور دوسری طرف اس بارے میں قرآن کی زبان میں حضور ﷺ کے دلائل ایسے قوی ہیں کہ انہیں جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں۔ بس یہی الجھن ہے جس میں یہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ اس کائنات کی ایک چیز اس حقیقت پر گواہ ہے اور اس کا مربوط و مستحکم نظام بھی زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا خالق ایک عظیم و حکیم ہستی ہے۔ پھر انسان کے اندر پائی جانے والی ”اخلاقی حس“ بھی اس کے اچھے برے اعمال کے ثبوت اور حتمی نتائج کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے ایک دوسری زندگی کی ضرورت ہے۔ ان تمام حقائق و شواہد کی موجودگی میں ایک صاحب عقل اور ذی شعور انسان کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بس ”رام کی لیلیا“ ہے اور انسان کی اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ چنانچہ منکرین آخرت کے لیے ان حقائق کو تسلیم کیے بغیر چارہ بھی نہیں، لیکن ان کی طبیعتیں ہیں کہ احتساب کے لیے تیار بھی نہیں۔ یہ انسان کی وہی نفسیاتی الجھن ہے جس کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے جو میں نے ابھی آپ کو سنایا ہے:

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

ان لوگوں کے قلوب و اذہان میں منفی خیالات و نظریات اس قدر رائج ہو چکے ہیں کہ اب ان سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ دراصل انسان اپنے لڑکپن کی عمر میں جن عقائد و نظریات کا اثر قبول کرتا ہے وہ ساری عمر کے لیے اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انسان کی اس کمزوری کا نقشہ ایک انگریزی نظم The Cage میں بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم میں نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں پڑھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ان عادات کے ”بنجرے“ کا قیدی ہے جنہیں وہ لڑکپن کی عمر میں ایک ایک کر کے اپناتا ہے۔ گویا اس بنجرے کی سلاخیں اپنے لیے وہ خود تیار کرتا ہے۔ بقول شاعر:

"I built these bars when I was young"

”اس بنجرے کی سلاخیں میں نے اس وقت تیار کی تھیں جب میں جوان تھا“۔ جوانی میں انسان کے قوی مضبوط ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن پر نقش کا لجر بن جاتا ہے اور پھر اپنی باقی عمر وہ ان عادات و نظریات کا قیدی بن کر بنجرے میں قید پرندے کی مانند گزار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ منکرین آخرت بھی اپنے غلط عقائد و نظریات کے خود ساختہ بنجروں کے قیدی ہیں۔ ان بنجروں کی سلاخیں وہ اس قدر مضبوط کر چکے ہیں کہ اب انہیں توڑ کر باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

**آیت ۶** ﴿أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ﴾ ”تو کیا انہوں نے دیکھا نہیں آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور کیسے اسے مزین کیا ہے اور اس میں کہیں کوئی رخ نہ نہیں ہے۔“

اس آیت کی مکافقہ تشریح تو کوئی ماہر فلکیات ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال آج کا انسان خوب جانتا ہے کہ

ستاروں، سیاروں اور کھشائوں کا نظام بہت محکم و مربوط ہے اور یہ کہ اس نظام میں کسی رخنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔  
**آیت ۷** ﴿وَالْأَرْضُ مَدَدُهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ﴾ ”اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور ہم نے اس میں لنگر ڈال دیے ہیں“

ماہرین طبقات الارض (Geologists) بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کی گردش کے دوران اس کا توازن (isostasy) برقرار رکھنے میں پہاڑوں کا انتہائی اہم کردار ہے۔

﴿وَأَنْثَقْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ ”اور ہم نے اس میں ہر طرح کی بڑی ہی رونق والی چیزیں (جوڑوں کی شکل میں) پیدا کر دیں۔“

**آیت ۸** ﴿تَبْصِرَةٌ وَدُكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنبِئٍ﴾ ”(یہ اللہ کی نشانیاں ہیں) بھانے اور یاد دہانی کرانے کو ہر اس بندے کے لیے جو رجوع رکھے ہوئے ہو۔“

عَبْدٌ مُّنبِئٌ سے ایسا بندہ مراد ہے جس کی روح اور فطرت کا رخ اللہ کی طرف ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی انسان کی فطرت سلیم اور روح زندہ ہو تب ہی یہ ”بصائر“ اس کے لیے مفید ہوں گے۔ ایسی صورت میں اسے کائنات میں بکھری اللہ کی نشانیاں نظر بھی آئیں گی اور ان نشانوں سے اس کے دل میں خالق حقیقی کی ”یاد“ بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر کسی انسان کی فطرت مسخ اور روح مردہ ہو چکی ہو تو اس کا ”دیکھنا“ اور ”سننا“ اس کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

سورۃ الغاشیہ کی ان آیات کا انداز بھی اس حوالے سے بہت بصیرت افروز ہے:

﴿أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۖ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۖ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۖ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۖ﴾

”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟ اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو کہ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں؟ اور زمین کو کہ کیسے بچھا دی گئی ہے؟“

یعنی پوری کائنات میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں جو انسان کو قدم قدم پر یاد دلاتی ہیں کہ ہر چیز کا خالق اور صورت گروہی ہے: ﴿هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾ (الحشر: ۲) ”وہی ہے اللہ پیدا کرنے والا وجود بخشنے والا صورتیں بنانے والا تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔“

اقبال نے ”آیات خداوندی“ کے مشاہدے کی دعوت ان الفاظ میں دی ہے:

کھول آکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ، مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

**آیت ۹** ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا﴾ ”اور ہم نے آسمان سے اُتار ابرکت والا پانی“

لفظ ”برکت“ میں کسی چیز کی خفہ صلاحیت کو ترقی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی متعدد بار وضاحت ہو چکی ہے کہ بارش کا پانی زمین کی قوتِ نمو کو جلا بخشتا ہے اور اس کی روئیدگی کو اجاگر کرنے کا باعث بنتا ہے اور اسی پہلو سے یہ مبارک ہے۔

﴿فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝۹﴾ ”تو ہم نے اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو اور ان فصلوں کو جو کٹ جاتی ہیں۔“

الفاظ کی یہ ترتیب منطقی اور بہت خوبصورت ہے۔ جنت سے درختوں کے باغات مراد ہیں اور درختوں کو کاٹنا نہیں جاتا، صرف ان کے پھل اُتارے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اناج کی فصل (جیسے گندم کی فصل) پودوں سمیت کاٹ لی جاتی ہے اس لیے اس کے لیے حَبَّ الْحَصِيد کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لِّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ ۝۱۰﴾ ”اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت جن کے خوشے ہیں تہہ بہ تہہ۔“

آیت ۱۱ ﴿رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۚ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مَّيِّتًا ۝۱۱﴾ ”یہ سب رزق ہے بندوں کے لیے اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مُردہ زمین کو۔“

﴿كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۝۱۲﴾ ”اسی طریقے سے نکلنا ہوگا (تمہارا بھی)۔“  
جس طرح بارش کے پانی کے باعث خشک اور بنجر زمین سے طرح طرح کی نباتات اُگ آتی ہیں اسی طرح تم بھی ہمارے حکم سے زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔

آیت ۱۲ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝۱۲﴾ ”جھٹلایا تھا ان سے پہلے بھی نوح کی قوم نے، کنوئیں والوں نے اور قوم ثمود نے۔“  
یہ انباء الرسل کا تذکرہ ہے لیکن انتہائی مختصر انداز میں۔

آیت ۱۳ ﴿وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطَ ۝۱۳﴾ ”اور قوم عاد، فرعون اور لوط کے بھائیوں نے۔“

آیت ۱۴ ﴿وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمِ تُبَّعٍ ۝۱۴﴾ ”اور بن والوں اور قوم تُبَّع نے۔“  
بن والوں سے یہاں اہل مدین مراد ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ”تُبَّع“ شاہانِ یمن کا لقب تھا۔ قبل ازیں سورۃ الدخان کی آیت ۳۷ میں بھی ہم قوم تُبَّع کا ذکر پڑھا آئے ہیں۔  
﴿كُلُّ كَذَّابٍ الْمُسْلَفِ فَحَقَّ وَعِيدِ ۝۱۵﴾ ”ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو وہ مستحق ہو گئے میری وعید کے۔“

پیغمبروں کو جھٹلا کر وہ لوگ عذاب کی وعیدوں کے مصداق بن گئے۔

آیت ۱۵ ﴿أَفَعَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۝۱۵﴾ ”تو کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے عاجز آ گئے ہیں!“  
کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں (creative potential) اب ختم ہو کر رہ گئی ہیں اور اب ہم انہیں دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ الاحقاف میں اس طرح آیا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْزُبْ عَنْهُمُ خَلْقُهُمْ بَلَدٍ ۙ بَلَدٍ ۙ عَلَىٰ اَنْ يُخْرِجَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ بَلَدًا ۙ اِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۶﴾

”کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور ان کی تخلیق سے تھکا نہیں وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے! کیوں نہیں یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

﴿بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝﴾ ”بلکہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں نئی تخلیق سے متعلق۔“

ہماری خلاقیت کی قدرت میں تو کوئی کمی نہیں آئی البتہ یہ لوگ اپنے ذہنوں کی تنگی کی وجہ سے پریشان ہیں اور مبتلائے شک ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر لیا جائے گا!

## آیات ۱۶ تا ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسُّوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۚ إِذْ يَتَلَفَّى الْمُتَكَلِّفِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۚ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۚ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۚ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۚ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ۚ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۚ وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَىٰ عَتِيدٍ ۚ أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ غَلَّارٍ عَنِيدٍ ۚ مَّتَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۚ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَأَلْقِيهِ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ۚ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۚ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ ۚ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۚ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأَتْ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ۚ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ۚ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيفٍ ۚ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ۚ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۚ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ۚ

**آیت ۱۶** ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسُّوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ﴾ ”اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔“

یہ اس توت شرکہ ذکر ہے جو انسان کے اندر ہے۔ نفس انسانی کے شرکاء ذکر سورہ یوسف میں یوں آیا ہے:

﴿وَمَا أَرْبَىٰ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ ۖ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

”اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے

جس پر میرا رب رحم فرمائے۔ یقیناً میرا رب بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

فطری طور پر انسان کے اندر داعیہ خیر بھی ہے اور داعیہ شر بھی۔ انسان کی اندرونی توت شرک سورہ یوسف کی اس

آیت میں ”نفس اتارہ“ کا نام دیا گیا ہے۔ فرائیڈ اسے id یا libido کہتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر خیر کی قوت اس کی روح ہے جس کا مسکن قلب انسانی ہے۔ انسان کی روح اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس داعیہ یا قوت کو فرائیڈ super ego کا نام دیتا ہے، یعنی ego (انسانی انا) کا اعلیٰ درجہ۔ فرائیڈ کے دیے ہوئے یہ عنوانات تو کسی حد تک ہمارے لیے قابل قبول ہیں، لیکن ان عنوانات کی تشریح جو اُس نے کی ہے اسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اس حوالے سے کئی مرتبہ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ مغربی سائنسدان اور فلاسفرز سب کے سب ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف ”عالم خلق“، یعنی اسباب و علل کی دنیا سے واقف ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مادی دنیا کے اُسرار و رموز کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کے ایسے معیار قائم کیے ہیں کہ انسانی عقل واقعی دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ”عالم امر“ کے بارے میں وہ بالکل اندھے اور کورے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں روح وحی اور فرشتے وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”انسان“ کے بارے میں ان کے فلسفیانہ تجزیے اکثر درست نہیں ہوتے۔ بہر حال آیت زیر مطالعہ میں انسان کے اندر موجود قوت شر (نفس اتارہ) کا ذکر ہے کہ انسان کا نفس اسے جو پٹیاں پڑھاتا ہے اس کی تفصیلات اس کے خالق سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝۶﴾ ”اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قرب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے، بقول شاعر یہ قرب ”بے تکلیف و بے قیاس“ ہے:-

اتصالے بے تکلیف بے قیاس ہست رب الناس را با جانِ ناس  
سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قرب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس ”معیت“ کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر بھی ہے، اس کا چہرہ کیسا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں آسمان و نیار پر نزول فرماتا ہے۔ وہ کیسے نزول فرماتا ہے؟ ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے معاملات میں خواہ مخواہ کا تجسس ہمیں فتوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں آخری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ”عالم امر“ اور اس کی کیفیات ہماری سمجھ سے وراۓ اور اہم ہیں۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ اور عقل و شعور کے ذریعے جو علم حاصل کر سکتے ہیں اس کا تعلق ”عالم خلق“ سے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی ”دائرے“ میں رہتے ہوئے سوچیں سمجھیں، تحقیق کریں نتائج اخذ کریں اور ان نتائج کو بروئے کار لائیں۔ دوسری طرف ”عالم امر“ سے متعلق جو معلومات وحی کے ذریعے ہم تک پہنچیں انہیں سن و عن تسلیم کر لیں۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے الفاظ ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ میں اسی طرزِ عمل کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس قرب

کی منطق اور کیفیت کے بارے میں ہمیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

**آیت ۱۷** ﴿إِذْ يَتَلَفَّى الْمُتَلَقُّونَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝﴾ ”جبکہ لیتے جاتے ہیں دو لینے والے جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوتے ہیں۔“

یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کے ہر فعل اور عمل کو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ سورۃ الانفطار آیت ۱۱ میں ان فرشتوں کو ”کُتُبًا مَّا كَاتِبِينَ“ کا نام دیا گیا ہے۔

**آیت ۱۸** ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝﴾ ”وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اُس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔“

یعنی کوئی انسان جو لفظ بھی اپنی زبان سے بولتا ہے متعلقہ فرشتہ اس کو فوراً ریکارڈ کر لیتا ہے اور ظاہر ہے فرشتوں کی یہ ریکارڈنگ بھی عالم امر کی چیز ہے اُس لیے اس کی کیفیت بھی ہمارے تصور میں نہیں آ سکتی۔ ریکارڈنگ کے شعبے میں گزشتہ چند دہائیوں میں انسانی سطح پر جو ترقی دیکھنے میں آئی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب انسان کی ”ریکارڈنگ“ کا معیار یہ ہے اور اس معیار میں مزید ترقی بھی رکھنے کا نام نہیں لے رہی تو اللہ کی قدرت سے جو ریکارڈنگ ہو رہی ہے اُس کا معیار کیا ہوگا!

**آیت ۱۹** ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۝﴾ ”اور بالآخر موت کی بے ہوشی کا وقت آن پہنچا ہے حق کے ساتھ۔“

موت کا آنا تو قطعی اور برحق ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں۔ اللہ کے منکر تو بہت ہیں لیکن موت کا منکر کوئی نہیں۔ ﴿ذَلِكَ مَا كُنْتُمْ مِنْهُ تَحِيدُونَ﴾ ”یہی ہے نا وہ چیز جس سے تو بھاگا کرتا تھا!“

اس بات کا انسان کی نفسیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ ہر انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ موت کو برحق جاننے ہوئے بھی وہ اس کے تصور کو حتی الوسع اپنے ذہن سے دور رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وقتی طور پر اگر کسی عزیز کی موت اور تجسیم و تکفین کے موقع پر اپنی موت اور قبر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے تو انسان فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر روزمرہ کے معمولات میں خود کو مصروف کر لیتا ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۝ ذَلِكَ يَوْمَ الْوَعْدِ ۝﴾ ”اور صور میں پھونکا جائے گا یہ ہے وعدے کا دن!“

پہلے انفرادی موت کی بات کی گئی تھی۔ اب اس آیت میں پوری دنیا کی اجتماعی موت کا ذکر ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کے لیے تو گویا وہی قیامت ہے۔ اس لیے انسان کی انفرادی موت کو قیامت صغریٰ اور تمام انسانوں کی اجتماعی موت کو قیامت کبریٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیت میں قیامت صغریٰ کا بیان تھا اب یہاں قیامت کبریٰ کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

**آیت ۲۱** ﴿وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَنَهْيٌ ۝﴾ ”اور ہر جان آئے گی (اس حالت میں کہ) اس کے ساتھ ہوگا ایک دھکیلنے والا اور ایک گواہ۔“



دنیا میں ہر انسان کے ساتھ جو دو فرشتے (کَرَامًا کَاتِبَیْنِ) مامور ہیں وہی قیامت کے دن اسے لا کر اللہ کی عدالت میں پیش کریں گے۔ ان میں سے ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ اٹھائے ہوئے ہوگا جب کہ دوسرا اسے عدالت کی طرف دھکیل رہا ہوگا۔

**آیت ۲۲** ﴿لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا﴾ ”(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا نا!“

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ ”تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے“ تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔“

دنیا میں رہتے ہوئے بہت سے حقائق تمہارے لیے پردہ غیب میں تھے۔ وہاں تجھ سے مطالبہ تھا کہ ان حقائق پر بغیر دیکھے ایمان لاؤ۔ آج غیب کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور اب تمہاری نظر ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے حتیٰ کہ آج تم اپنے ساتھ آنے والے فرشتوں کو بھی دیکھ رہے ہو۔

**آیت ۲۳** ﴿وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَيْنِي﴾ ”اور اُس کا ساتھی کہے گا: (پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے!“

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں ”ساتھی“ سے فرشتہ مراد ہے، لیکن میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو اس سے شیطان مراد لیتے ہیں۔ دراصل خیر اور شر کی قوتیں انسان کے اندر بھی موجود ہیں اور خارج میں بھی۔ اندر سے انسان کا نفس اسے برائی پر ابھارتا ہے جبکہ خارج میں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی مامور ہے جو اس کے نفس میں ہر وقت دوسرا انداز کی تکرار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر اس کی روح ”داعی خیر“ کے طور پر موجود ہے جبکہ خارج میں اس حوالے سے فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں۔ سورہ حتم السجدۃ کی آیات ۳۰ اور ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں جو نیکی کے کاموں میں انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں: ﴿نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾۔ فرشتوں کی معیت کے باعث ہی کوئی نیک کام کر کے ہمیں خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر فرشتے دراصل ہمیں بشارت اور شاباش دے رہے ہوتے ہیں جس کے اثرات ہماری روح پر طمانیت کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں۔

**آیت ۲۴** ﴿اٰلَيْهَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلٌّ كَفٰرٍ غٰثٍ﴾ ”(اللہ تعالیٰ فرمائے گا) جھوٹک دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش کو۔“

یہ حکم گویا اس انسان اور اس کے ساتھی شیطان دونوں کے لیے ہوگا۔

**آیت ۲۵** ﴿مَتٰعٍ لِّلْخٰیْرِ مُّتَعِدٍ مَّرْبُوبٍ﴾ ”جو خیر سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا اور شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والا ہے۔“

**آیت ۲۶** ﴿اِنَّ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ الْاٰخَرَ﴾ ”جس نے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الہ بھی بنا لیا تھا۔“  
﴿فَاٰلَقٰیہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ﴾ ”تو جھوٹک دو اس کو بڑے سخت عذاب میں۔“

اس انسان کا شیطان یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی اپنی حیثیت ”سرکاری کارندے“ کی ہے جو مجرم کو سزا کے لیے لے کر آیا ہے، لیکن دونوں کو جہنم رسید کرنے کا حکم سن کر وہ فوراً اپنی صفائی میں چلانا شروع کر دے گا۔

**آیت ۲۷** ﴿قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ﴾ ﴿۲۷﴾ ”اُس کا ساتھی (شیطان) کہے گا: پروردگار! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔“

گویا وہ چاہے گا کہ جو انسان اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اُسے سزا کے لیے وصول کر لیا جائے اور خود اس کی جان بخشی کر دی جائے۔

**آیت ۲۸** ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ﴾ ﴿۲۸﴾ ”(اللہ فرمائے گا:) اب میرے سامنے جھگڑا مت کرو جبکہ میں پہلے ہی تمہاری طرف وعید بھیج چکا ہوں۔“

کہ میں نے تو جن وانس پر ”انذار“ کے حوالے سے اتمام حجت کر دیا تھا۔ سورۃ الاحقاف میں ان جنات کے بارے میں ہم پڑھا آئے ہیں جو حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر داعیانِ حق بن کر اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گویا قرآن کا پیغام اور انذار جنات تک بھی پہنچا دیا گیا ہے۔

**آیت ۲۹** ﴿مَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ﴾ ﴿۲۹﴾ ”میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جاسکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔“

چنانچہ اب میرے قانون کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

**آیت ۳۰** ﴿يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ﴾ ”جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تو بھر گئی؟“

﴿وَنَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ﴾ ﴿۳۰﴾ ”اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟“

یعنی وہ کہے گی کہ ابھی تو میرے اندر بہت گنجائش ہے۔ ابھی مزید جنوں اور انسانوں کو میرے اندر ڈالا جائے تاکہ میں بھر جاؤں۔

**آیت ۳۱** ﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ﴾ ﴿۳۱﴾ ”اور جنت قریب لائی جائے گی اہل تقویٰ کے لیے کچھ بھی دور نہیں ہوگی۔“

**آیت ۳۲** ﴿هَٰذَا مَا تُوْعَدُونَ﴾ ”(ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جس کا وعدہ تم لوگوں سے کیا جاتا تھا“

﴿لِكُلِّ آوَابٍ حَفِظٍ﴾ ﴿۳۲﴾ ”ہر اُس شخص کے لیے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا اور حفاظت کرنے والا ہو۔“

یعنی اس امانت کی حفاظت کرنے والا جو ہم نے اس کے سپرد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو روح پھونکی ہے وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾ (آیت ۷۲) ”ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔“ چنانچہ ”حَفِظٌ“ سے ایسا شخص مراد ہے

جس نے اس امانت کا حق ادا کیا اور اپنی روح کو گناہ کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔ سورۃ اشعراء میں ایسی محفوظ اور پاکیزہ روح کو ”قلب سلیم“ کا نام دیا گیا ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۳۸﴾ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۳۹﴾﴾ ”جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اُس کے جو آئے اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر۔“ اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ کی تشریح۔

**آیت ۳۳ ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ﴾** ”جو ڈرتا رہا رحمن سے غیب میں ہونے کے باوجود۔“

**﴿وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُبِيبٍ ﴿۳۴﴾﴾** ”اور لے کر آیا رجوع کرنے والا دل۔“

قلب مبیب سے بھی یہاں قلب سلیم ہی مراد ہے۔ یہ ایسے شخص کا ذکر ہے جو دنیا میں اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کر رہا۔ اللہ کی امانت کو اُس نے پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ رکھا اور صحیح و سلامت حالت میں لوٹا یا۔

**آیت ۳۴ ﴿إِذْ خُلُوْهَُا بِسَلَمٍ ۚ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۵﴾﴾** ”(ان سے کہا جائے گا:) داخل ہو جاؤ اس

(جنت) میں سلامتی کے ساتھ اب یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔“

اب ایسا کوئی مرحلہ نہیں آئے گا کہ تمہیں جنت سے نکلنا پڑے۔

**آیت ۳۵ ﴿لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۶﴾﴾** ”ان کے لیے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ

چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے۔“

قرآن کے مختلف مقامات پر جنت کی نعمتوں کا جو تعارف ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتوں

کے تین درجے ہیں۔ نفس انسانی کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کا بھرپور سامان تو جنت میں پہلے سے موجود ہوگا۔

اس کے علاوہ ہر شخص اپنی پسند و ذوق اور خواہش کے مطابق جو کچھ طلب کرے گا وہ بھی اسے فراہم کیا جائے گا۔

ظاہر ہے ہر شخص کی طلب اپنے ذوق اور معیار کے مطابق ہوگی۔ ایک سادہ لوح و دیہاتی اپنی پسند کے مطابق کوئی

چیز مانگے گا اور ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کی تسکین چاہے گا۔ البتہ اس حوالے سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو

کچھ بھی طلب نہیں کریں گے وہ لوگ یُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ (الکہف: ۲۸) کے مصداق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور

اس کی رضا کے طالب ہوں گے۔ جیسے رابعہ بصریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ جذب کے عالم میں

ایک مشعل اور پانی کا لوٹا لیے گھر سے نکلیں۔ لوگوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں اس آگ سے جنت کو

جلانے نکلی ہوں اور اس پانی سے میں جہنم کی آگ کو بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ سے خالص اُس کی ذات

کے لیے محبت کریں نہ کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف کی وجہ سے اسے چاہیں۔ بہر حال جنت میں وہ لوگ بھی

ہوں گے جنہیں اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے ہوگا۔ جبکہ ان دو اقسام کے علاوہ تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہوں

گی جو انسانی تصور سے بالاتر ہیں اور آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ”وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ“ میں انہی نعمتوں کی طرف اشارہ

ہے۔ سورۃ السجدۃ میں جنت کی ان نعمتوں کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةٍ

أَعْيُنٌ﴾ (آیت ۱۷) ”پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا

کر رکھا گیا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((قَالَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ: اَعَدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ، فَافْقَرُوا وَإِنْ شِئْتُمْ: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُوَّةٍ أَعْيُنٌ))<sup>(۱)</sup>  
 ”اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرے۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ”پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔“

### آیات ۳۶ تا ۴۵

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ ۝ إِنْ فِي ذَلِكَ لَذِكْرٌ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۚ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۚ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ النُّجُودِ ۝ وَاسْتَغْمِمْ يَوْمَ يَنَادُ الْبُنَادُ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۚ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَلِكَ يَوْمُ الْغُرُوبِ ۝ إِنْ تَأَخَّرْنَا لَأَكْثُنَّ نَعْيٍ وَنُبَيِّتُ وَالْإِنَّا لَبَصِيرَةٌ ۚ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْكُمْ يُبَيِّرُ ۚ كُنْ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۚ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِبِيدُ ۝

**آیت ۳۶** ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ﴾<sup>(۲)</sup> ”اور کتنی ہی قوموں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے جو قوت میں ان سے بڑھ کر تھیں سوانہوں نے ملکوں کے ملک فتح کیے! پھر کیا وہ کوئی جائے فرار پاسکے؟“  
 نَقَبَ کا معنی ہے نقب لگانا، یعنی دیوار میں سوراخ کرنا جبکہ نَقَبَ فِي الْأَرْضِ (باب تفصیل) کا مفہوم ہے: بھاگ دوڑ کرتے ہوئے کسی ملک میں جا گھسنا، یعنی کسی علاقے کو فتح کر لینا۔ وہ لوگ اتنے زور آور تھے کہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں گھستے چلے گئے اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے، لیکن جب اللہ کی پکڑ آئی تو انہیں بھاگنے کو جگہ نہ ملی۔

**آیت ۳۷** ﴿إِنْ فِي ذَلِكَ لَذِكْرٌ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝﴾ ”یقیناً اس میں یاد دہانی ہے اُس کے لیے جس کا دل ہو یا جو توجہ سے سنے حاضر ہو کر۔“

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وانها مخلوقة - وصحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کا بہت اہم مقام ہے۔ یاد دہانی کے حوالے سے اس آیت میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہ یاد دہانی یا تو ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو ”دل“ رکھتے ہیں یا پھر وہ جو پوری توجہ سے اس کو سنیں۔ گویا یہاں قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے دو الگ الگ طریقوں اور راستوں (approaches) کا ذکر ہے۔ ایک ان لوگوں کا راستہ ہے جو دل رکھتے ہیں۔ یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کی روح زندہ ہے۔ روح کا ممکن چونکہ قلب انسانی ہے اس لیے جس انسان کی روح زندہ ہوگی اس کا دل بھی زندہ ہوگا۔ ایسے دل کو دل بیدار دل زندہ یا قلب سلیم کہا جاتا ہے۔ میر درد نے اپنے اس شعر میں دل کی اسی ”زندگی“ کا ذکر کیا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے      کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے! <sup>(۱)</sup>

چنانچہ ایک زندہ دل شخص جب قرآن سنے گا تو اس شخص کی روح یوں لپک کر قرآنی پیغام تک پہنچ جائے گی جیسے پٹرول دور سے آگ پکڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت کو سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا بُقِيعٌ وَلَوْ كَمْ تَمْسَسُهُ نَارٌ﴾ (النور: ۳۵) ”قریب ہے کہ اس کا روغن خود بخود روشن ہو جائے“ چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو“۔ گویا ایک پاکیزہ روح نور و وحی تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز      تو ذرا چھیڑ تو دے تشنہ مضرب ہے ساز  
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے      طور مضطرب ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

حافظ ابن قیمؒ نے اس بارے میں بڑی خوبصورت بات لکھی کہ بہت سے لوگ قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے قرآن ان کے دل پر نقش ہے اور وہ اس کی عبارت کو مصحف سے نہیں بلکہ اپنی لوح قلب سے پڑھ رہے ہیں۔ یعنی سلیم الفطرت لوگوں کی ارواح کو قرآن حکیم کے ساتھ خصوصی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی روحوں میں ایک مانوس قسم کا ارتعاش (sympathetic vibration) پیدا ہوتا ہے۔ گویا ان کی ارواح قرآنی الفاظ و آیات کے ساتھ پہلے سے ہی مانوس ہیں۔ بقول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا      میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

ایسے لوگوں کو قرآن کی ہدایت تک پہنچنے کے لیے کسی مہلت یا تنگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے قبول حق میں ایک لمحے کا توقف بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ارواح پر غفلت اور مادیات کے پردے پڑ چکے ہوں ان کے لیے اس آیت میں دوسرا طریقہ بتایا گیا ہے: ﴿أَوِ الْكُفَى السَّمْعِ﴾

(۱) علامہ اقبال کے کلام میں بھی جا بجا دل بیدار دل زندہ دل مردہ دل مینا اور قلب سلیم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ”بال جبریل“ میں انہوں نے ”دل بیدار“ کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری      مس آدم کے حق میں کیا ہے دل کی بیداری  
دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک      نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری!  
(حاشیہ از مرتب)

وَهُوَ شَهِيدٌ﴾۔ یعنی ان لوگوں کو خصوصی توجہ کے ساتھ محنت کرنا ہوگی تب کہیں جا کر ”گوہر مقصود“ تک ان کی رسائی ہوگی۔ مطالعہ قرآن کے ہمارے منتخب نصاب میں ایمان کی بحث کے تحت دو دروس (درس ۱۶ اور ۱۷) ایسے ہیں جو انہی دو طریقوں کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں پہلا درس سورہ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں آیات آفاقی کے مشابہے کی بنیاد پر تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰخِلَافِ الْاٰلِیِّ وَالْاٰوٰلٰی الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ فِیْمَا وُقُوعُوْا وَعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾

”یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور مزید غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔ تو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے) پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!“

لیکن یہ تفکر و تدبر تب نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے ساتھ اللہ کے ذکر کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی منزلی مقصود تک پہنچنے کے لیے ذکر اور فکر دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر  
فقر قرآن ضغنی روباہی است

یعنی فقر قرآن تو ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے جبکہ میں ذکر کے بغیر فکر کو ناقص اور نامکمل دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی شیر بھی ہو تو قرآن کے بغیر وہ لومڑی کی طرح ہوگا، اصل شہنشاہ تو وہ ہے جسے فقر قرآن ملی گیا۔

اس ضمن میں ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذکر اور فکر کے الگ الگ حلقے بن چکے ہیں۔ ان میں سے ہر حلقے کے لوگ اپنے طور طریقوں میں اس قدر رگن ہیں کہ انہیں دوسروں سے کچھ سروکار نہیں۔ ایک طرف مفکرین ہیں جو فلسفہ و فکر پر بڑی بڑی کتابیں رقم کر رہے ہیں، کیسی کیسی تفسیریں لکھتے جاتے ہیں، مگر وہ ذکر کی لذت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ دوسری طرف ذاکرین ہیں جو ذکر کی روح پرور محفلیں سجاتے ہیں لیکن انہیں فکر و تدبر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ظاہر ہے گاڑی کے ان دونوں پہیوں میں ہم آہنگی ہوگی تو امت کا قافلہ منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ بہر حال سورہ آل عمران کی مذکورہ آیات میں ذکر و فکر کے ذریعے ہدایت کی ”منزل مقصود“ تک پہنچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے جبکہ دوسرے طریقے کی نشاندہی سورہ النور کے پانچویں رکوع (منتخب نصاب کے درس ۷) میں کی گئی ہے کہ اپنے قلب کو صاف کر لیجیے اس کی تمام کدورتیں دور کر دیجیے تو اس کے آئینے میں قرآن خود بخود منعکس ہو کر اسے منور (نُورٌ عَلٰی نُور) کر دے گا اور یوں نور فطرت اور نور وحی کے امتزاج سے نور ایمان کی تکمیل ہو جائے گی۔

**آیت ۳۸** ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ ”اور ہم نے آسمانوں اور

زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے پیدا کیا چھ دنوں میں۔“

﴿وَمَا مَسْنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی۔“

یہ مضمون موجودہ تورات میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تھکن دور کی۔ اسی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ”ویک اینڈ“ کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کیا تھا، لہذا ہم لوگ بھی چھ دن کام کر کے ساتویں دن آرام کرو۔ اس آیت میں دراصل تورات کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ اسلام میں ”ویک اینڈ“ کا کوئی تصور نہیں۔ اس حوالے سے یہ تاریخی حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ اصل تورات بخت نصر کے حملے میں گم ہو گئی تھی اور دوبارہ اس کو یادداشت کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا۔ مرتبین چونکہ عام انسان تھے نبی نہیں تھے اس لیے ان کی یادداشتوں نے ٹھوکریں کھائیں اور بہت سی غلط باتیں بھی اس میں شامل کر دی گئیں۔

آیت ۳۹ ﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ﴾ ”تو اے نبی ﷺ! آپ صبر کیجیے اس پر جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں“  
﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل۔“

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے، زیر مطالعہ سورتیں مکی دور کے ابتدائی چار سال کے دوران نازل ہوئی تھیں۔ اُس وقت تک بیچ گانہ نماز کا باقاعدہ نظام وضع نہیں ہوا تھا۔ بیچ گانہ نماز تو معراج کے موقع پر (۱۰ نبویؐ میں) فرض ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو بس صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے کی بار بار تلقین و تاکید کی جاتی تھی، جیسا کہ سورہہ کی آیت ۱۳۰ میں بھی بالکل یہی الفاظ آئے ہیں یا اس سے بھی پہلے سورۃ المزمل میں رات کی نماز اور اس میں تلاوت قرآن کا حکم آچکا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ اوقات کے ساتھ پانچ نمازوں کا نظام وضع ہوا تو ان دو اوقات میں دو نمازیں فرض ہو گئیں، یعنی قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ کے اوقات میں فجر کی نماز اور قَبْلَ الْغُرُوبِ کے وقت میں نماز عصر۔

آیت ۲۰ ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح بیان کرو۔“

﴿وَأَذِّنَا الشُّجُودَ﴾ اور سجدوں (نمازوں) کے بعد بھی۔“

یہ گویا نماز سے فارغ ہونے کے بعد کی تسبیح و تحمید کا حکم ہے۔ نمازوں کے بعد کے اذکار کی تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں، جیسے تسبیح فاطمہؑ (۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ یا ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھنا) کی مداومت سے متعلق احادیث میں ترغیب آئی ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَأَسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادُ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ﴾ اور کان لگائے رکھو جس دن پکارنے

والا پکارے گا بہت قریب کی جگہ سے۔“

یعنی اس دن کے منتظر ہو جب صور میں پھونکا جائے گا اور ہر شخص کو اس کی آواز بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوگی۔ صور کی آواز ایسی زوردار اور خوفناک ہوگی کہ اس سے ہر جان دار کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد سب انسانوں کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرنے کے لیے پھر صور پھونکا جائے گا۔ یہاں اسی دوسرے صور کا ذکر ہے۔

آیت ۲۲ ﴿يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ﴾ ”جس دن کہ وہ سنیں گے ایک چنگھاڑ حق کے ساتھ۔“

﴿ذَلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ﴾ ”وہ ہوگا نکلنے کا دن۔“

یعنی وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔

آیت ۲۳ ﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ﴾ ”یقیناً ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت وارد کرتے ہیں۔“

﴿وَالْآيَاتُ الْمُبِينَاتُ﴾ ”اور ہماری ہی طرف (سب کو) پلٹ کر آنا ہے۔“

واضح رہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ جلالت کا زیادہ اظہار کرنا چاہتا ہے وہاں اپنے لیے جمع کا صیغہ پسند فرماتا ہے۔

آیت ۲۴ ﴿يَوْمَ تَشَقُّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا﴾ ”جس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور وہ

تیزی سے نکل پڑیں گے۔“

﴿ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ﴾ ”یہ (سب کا) جمع کر دینا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔“

آیت ۲۵ ﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔“

﴿وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ ”اور آپ ان پر کوئی زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔“

آپ کا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ ہم نے آپ کو اس اختیار کے ساتھ نہیں بھیجا کہ آپ انہیں زبردستی حق کی طرف لے آئیں۔

﴿فَلَذِكْرُ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدُ﴾ ”پس آپ تذکیر کرتے رہیے اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔“

جس شخص کی روح مردہ نہ ہو چکی ہوگی اور اس میں تھوڑی سی بھی جان ہوگی اور جس کے اندر اخلاقی حس دم نہ توڑ چکی ہوگی اور بھلائی کی معمولی سی رمت بھی باقی ہوگی وہ آپ ﷺ کی باتیں سن کر قرآن کی تذکیر اور یاد دہانی سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ یہاں پر ﴿فَلَذِكْرُ بِالْقُرْآنِ﴾ کے الفاظ میں حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ہدایت دی جا رہی ہے کہ آپ تبلیغ و تذکیر انذار و تبشیر اور لوگوں کے تزکیہ نفس کا ذریعہ قرآن ہی کو بنائیں۔ اس حکم کے مقابلے میں آج امت مسلمہ کی مجموعی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود کو قرآن سے بالکل ہی بے نیاز کر لیا ہے اور دعوت و تبلیغ و عطا و نصیحت اور تربیت و تزکیہ کے دیگر ذرائع اختیار کر لیے ہیں۔





# سُورَةُ الذَّرِيَّتِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الذاریات کا آغاز چار قسموں سے ہو رہا ہے۔ اس انداز سے شروع ہونے والی یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ۲۳ ویں پارے میں سورۃ الصّٰفّٰتِ ہے جس کے آغاز میں بالکل اسی انداز میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں:

﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳ اِنَّ الْهٰكُمَ لَوٰ اٰحَدٌ ۝۴﴾

”قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی۔ یقیناً تمہارا الہ ایک ہی ہے۔“

سورۃ الصّٰفّٰتِ کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے آغاز کی تین قسموں کے مقسم علیہ کا تعلق بھی توحید سے ہے: ﴿اِنَّ الْهٰكُمَ لَوٰ اٰحَدٌ ۝۴﴾ کہ یقیناً تمہارا الہ ایک ہی ہے۔ زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ اندازِ آخرت ہے اس لیے سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی تصدیق کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا تُوعَدُوْنَ لَصٰدِقٌ ۝۵ وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾

جس طرح سورۃ الصّٰفّٰتِ کی قسموں کے بارے میں تقریباً سب علمائے تفسیر کا اتفاق ہے کہ وہ قسمیں فرشتوں کے بارے میں ہیں اسی طرح سورۃ الذّریت کی قسموں کے بارے میں بھی تقریباً سب مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ تا ۲۳

وَالذّرٰیّتِ ذَرَوًا ۝۱ فَالْحَمَلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجَارِیَّتِ یُسْرًا ۝۳ فَالْمَقْسِمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوعَدُوْنَ لَصٰدِقٌ ۝۵ وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الْحُبْكِ ۝۷ اِنّكُمۡ لَفِیۡ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸ یُؤَفِّكُ عَنْهُ مَنۡ اُولٰٓئِكَ ۝۹ فَبَلِّغِ الصّٰرِصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ هُمْ فِیۡ غَمَرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱ یَسْأَلُوْنَ اَیَّٰنَ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۱۲ یَوْمَ هُمْ عَلٰی النَّارِ یُقْتَلُوْنَ ۝۱۳ دُوقُوا وَنُنْتَكَمُ ۝۱۴ هٰذَا الَّذِیۡ كُنْتُمْ بِہِ سَتَعْمَلُوْنَ ۝۱۵ اِنَّ الْمُبْتَغِیْنَ فِیۡ جَنَّتٍ وَعِیُّوْنَ ۝۱۶ اِخِذِیۡنَ مَا اَلٰهُمۡ رَبُّہُمْ ۝۱۷ اِنَّہُمْ كَانُوْا

قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ ۝ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝ وَبِالْأَسْكَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝  
وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنْفُسِكُمْ  
أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ  
بِشَيْءٍ مِّثْلَ مَا أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝

**آیت ۱** ﴿وَالَّذِينَ ذُرُّوا ۝۱﴾ ”قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرنے والی ہیں جیسے کہ بکھیرا جاتا ہے۔“  
ہوائیں بہت سی چیزوں کو بکھیرتی ہیں۔ مثلاً پودوں کے پھولوں کے زردانے (pollens) ہواؤں کی مدد  
سے ایک پودے سے دوسرے تک پہنچ کر اسے بارور کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے درختوں کے بیج ہواؤں  
کے دوش پر سفر کرتے ہوئے دور دراز علاقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یوں ہوائیں پودوں کے پھلنے پھولنے اور  
جنگلات کے بڑھانے میں بھی مدد دیتی ہیں۔

**آیت ۲** ﴿فَالْحُمِلَتْ وَفُورًا ۝۲﴾ ”پھر بوجھ اٹھا کر لانے والی ہیں۔“  
ہوائیں اربوں کھربوں ٹن پانی سمندر سے اٹھا کر بادلوں کی شکل میں ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں اور  
پھر مختلف علاقوں میں بارش برساتی ہیں۔

**آیت ۳** ﴿فَالْجُرَيْتِ يُسْرًا ۝۳﴾ ”پھر نرمی سے چلنے والی ہیں۔“  
کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس طرح چلتی ہے کہ اس کے ہلکے ہلکے حصوں کے نباتات و حیوانات سب کے لیے  
بہت فرحت بخش ہوتے ہیں۔

**آیت ۴** ﴿فَالْمَقْسَمَاتِ أَمْرًا ۝۴﴾ ”پھر اللہ کے امر کو تقسیم کرنے والی ہیں۔“  
اس سے مراد بارش کے پانی کی تقسیم ہے۔ بادل کی شکل میں سمندر کے پانی کو ہوائیں مختلف علاقوں میں  
اڑائے پھرتی ہیں، مگر کس جگہ بارش ہوگی اور کس جگہ نہیں ہوگی وہاں کس قدر ہوگی، یہ سب کچھ تو  
اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ کے اس امر (حکم) کی تقسیم ہواؤں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا  
مشاہدہ ہم آئے دن کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں میں بارش سے جل تھل ہو جاتا ہے اور کچھ علاقے پانی کی  
ایک ایک بوند کو ترستے رہ جاتے ہیں اور کالی گھٹائیں ان کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

ان آیات میں ہواؤں کی قسمیں کھا کر اور پھر ان کے ذریعے طے پانے والے بعض امور کا ذکر کر کے  
در اصل کائنات کے محکم نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انسان اس بارے میں غور کرے گا تو وہ ضرور  
اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائی ہے: ﴿إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ  
خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ﴾ (۱) ”یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔“

**آیت ۲۵** ﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝۲۵﴾ ﴿وَأَنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝۲۶﴾ ”جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً

سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔“

یہ کائنات اور اس کا نظام گواہ ہے کہ بعث بعد الموت، نفعہ اولیٰ، نفعہ ثانیہ وغیرہ سے متعلق جو خبریں تمہیں دی جا رہی ہیں وہ یقیناً سچی ہیں اور جس عذاب کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ قیامت ضرور قائم ہوگی اور اس دن تمام انسانوں کو پھر سے ضرور زندہ کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔

**آیت ۷** ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْجُبُلِ ۝۷﴾ ”اور قسم ہے جالی دار آسمان کی۔“

یہ اس منظر کی طرف اشارہ ہے جو رات کے وقت تاروں بھرا آسمان پیش کرتا ہے۔

**آیت ۸** ﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸﴾ ”یقیناً تم لوگ ایک جھگڑے کی بات میں پڑ گئے ہو۔“

یعنی آخرت کے بارے میں تم ایک اختلاف میں پڑ گئے ہو اور تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

**آیت ۹** ﴿يُؤْفِكُ عَنْهُ مِنَ الْفِكِّ ۝۹﴾ ”اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہے۔“

تم میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو وحی کے اس پیغام کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور جزا و سزا کے متعلق مختلف باتیں بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس کو تسلیم کرنے سے وہی شخص باز رہے گا جو راندہ درگاہ ہے اور خیر و سعادت کے راستوں سے پھیر دیا گیا ہے۔

**آیت ۱۰** ﴿قُتِلَ الْخَرِصُونَ ۝۱۰﴾ ”ہلاک ہو جائیں یہ انکلیں دوڑانے والے۔“

**آیت ۱۱** ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ ۝۱۱﴾ ”جو اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔“

انہیں نہ تو اپنے مقصد تخلیق کی خبر ہے اور نہ اپنے انجام کی فکر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس عہد کو بھی بھولے ہوئے ہیں جو عالم ارواح میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۷۲ میں اس عہد کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۖ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوا بَلَىٰ ۖ سُبْحَانَكَ ۚ﴾

”اور یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے تمام بنی آدم کی بیٹیوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان

کے اوپر (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔“

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس عہد کا ”عرفان“ اس کی روح کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن دنیوی زندگی کے دوران بعض لوگوں کی ارواح غفلت میں اس قدر ڈوب جاتی ہیں کہ انہیں اپنے رب سے کیا ہوا یہ عہد یاد ہی نہیں رہتا۔ زیر مطالعہ آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

**آیت ۱۲** ﴿يَسْتَلُونَ أَيَّانَ يَوْمَ الدِّينِ ۝۱۲﴾ ”وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن!“

مشرکین یہ سوال طنزیہ انداز میں کرتے تھے کہ آپ کہتے رہتے ہیں کہ جزائے اعمال کا دن آکر رہے گا تو

آخر کب تک آئے گا وہ روز جزا؟ چنانچہ ان کے اس سوال کا جواب بھی انہیں اسی انداز میں دیا جا رہا ہے:

**آیت ۱۳** ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ۝﴾ ”جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے۔“

چونکہ مشرکین یہ سوال غیر سنجیدہ انداز میں کرتے تھے اس لیے جواب میں ان کے لیے ڈانٹ کا انداز پایا جاتا ہے۔

**آیت ۱۴** ﴿ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ ۚ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ۝﴾ ”(اُس دن ان سے کہا جائے

گا) اب چکھو مزہ اپنی شرارت کا۔ یہ ہے وہ (عذاب) جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔“

تم لوگ ہمارے رسول کو چیلنج کیا کرتے تھے ناکہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لاسکتے ہو۔ چنانچہ یہ ہے آج تمہارے اس مطالبے کا جواب۔ اب چکھو اس عذاب کا مزہ!

**آیت ۱۵** ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝﴾ ”یقیناً اہل تقویٰ باغات اور چشموں کے اندر ہوں گے۔“

**آیت ۱۶** ﴿الْخٰزِنِينَ مَا لَهُمْ مِنْهُمْ رَهْبٌ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُجْسِنِينَ ۝﴾ ”وہ (شکرے کے ساتھ)

لے رہے ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس سے پہلے نیکو کار تھے۔“

یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے نیک اعمال کی وجہ سے درجہ احسان تک پہنچے ہوئے تھے۔

**آیت ۱۷** ﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝﴾ ”رات کا تھوڑا ہی حصہ ہوتا تھا جس میں وہ سوتے تھے۔“

ان لوگوں کی راتوں کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور حاضری میں گزرتا تھا۔ سورۃ الفرقان میں ”عباد

الرحمن“ کے اس معمول کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَبْتُغُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ۝﴾ ”اور وہ لوگ

راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کرتے ہوئے۔“

**آیت ۱۸** ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝﴾ ”اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔“

**آیت ۱۹** ﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝﴾ ”اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا

حق ہوا کرتا تھا۔“

انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر رکھا تھا کہ ان کے پاس اللہ کا دیا جو کچھ بھی ہے اس میں فقراء و مساکین کا

بھی حصہ ہے اور وہ متعلقہ لوگوں کا حق ان تک پہنچایا بھی کرتے تھے۔

**آیت ۲۰** ﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝﴾ ”اور زمین میں (ہر چہا طرف) نشانیاں ہیں یقین

کرنے والوں کے لیے۔“

سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۳ (آیت الایات) میں اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

**آیت ۲۱** ﴿وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝﴾ ”اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی (نشانیاں ہیں)۔ تو

کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟“

یعنی انسان کے جسم اور جسم کے ایک ایک نظام کے اندر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ انسان کو

چاہیے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے۔ مرزا ابیدل نے اس خوبصورت شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرود و من درآ  
 تو زغنجہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ!  
 اے انسان! بڑے ستم کی بات ہے اگر تجھے تیری خواہش نفس کسی باغ کی سیر کے لیے کھینچ کر لے جاتی  
 ہے جبکہ خود تیری اپنی چمک دک کی پھول سے کم نہیں ہے۔ کبھی اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس چمن کی  
 سیر کے لیے بھی آؤ جو تمہاری روح کے اندر اللہ تعالیٰ نے مہکار رکھا ہے۔  
 اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی تخلیق اور اپنے وجود پر غور کرے  
 اور اس اعتبار سے اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے۔ بقول مرزا بیدل :-  
 ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی  
 اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!  
 (اس شعر کی تفسیر سورۃ النحل کی آیت ۴۰ کے تحت بیان ہوئی ہے۔)

**آیت ۱۲** ﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝﴾ ”اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس  
 کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا رزق بھی طے شدہ ہے اور تمہارے جنت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ بھی اسی  
 کی مشیت سے ہوتا ہے۔

**آیت ۲۳** ﴿فَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ ۝﴾ ”تو آسمانوں اور زمین  
 کے رب کی قسم یقیناً یہ حق ہے بالکل ایسے جیسے (اس وقت) تم بات چیت کر رہے ہو۔“  
 یعنی بڑے بعد الموت شدنی ہے برحق ہے قیامت آکر رہے گی۔

### آیات ۲۳ تا ۴۶

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۖ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ  
 سَلَامٌ قَوْمٌ مُّنتَكِرُونَ ۖ فَرَأَاهُمْ إِلَىٰ أَهْلِهِ ۖ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَبِينٍ ۖ فَفَرَّقَهُ إِلَيْهِمْ ۖ قَالَ أَلَا  
 تَأْكُلُونَ ۖ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۖ فَأَقْبَلَتْ  
 امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۖ قَالُوا كَذْلِكِ ۖ قَالَ رَبُّكِ إِنَّهُ  
 هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۖ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۖ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ  
 مُّجْرِمِينَ ۖ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ ۖ مَّسْومَةٌ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُؤْسِفِينَ ۖ  
 فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۖ  
 وَكَرَّمْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَمْنَعُونَ الْعَذَابَ ۖ الْآيَةُ ۖ وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَوَلَّىٰ يَرْكٰٓئِهٖ وَقَالَ سَحَرًا اَوْ جُنُوْنًا ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدًا فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝ وَفِي عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذٰرُ مِنْ شَيْءٍ اَنْتَ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلْتَهُ كَالْزَمْيْمِ ۝ وَفِي ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى جِيْنَ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذْنٰهُمْ الصَّعِقَةَ ۝ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوْا مُتَعَصِّرِيْنَ ۝ وَتَوْمَرُنُوْرٍ مِّنْ قَبْلُ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

**آیت ۲۳** ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ صٰٓئِفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝﴾ ”کیا آپ کے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے!“

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب فرشتے انسانی شکلوں میں مہمان بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے تھے۔

**آیت ۲۵** ﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾ ”جب وہ اس کے ہاں داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کہا۔“  
**﴿قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝﴾** ”اس نے بھی (جواب میں) سلام کہا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو کوئی اجنبی لوگ ہیں۔“

**آیت ۲۶** ﴿فَرَاغَ اِلٰى اٰهْلِهٖ فَبَجَّآءَ يَعْجَلُ سَمِيْنٌ ۝﴾ ”پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آیا۔“

سورہ ہود (آیت ۶۹) میں ”عٰجِلٌ حٰنِيْنٌ“ (بھنا ہوا بچھڑا) کے الفاظ آئے ہیں۔ پرانے زمانے کی دعوتیں اسی انداز سے ہوا کرتی تھیں کہ جانور ذبح کیا اور کھچی میں تل کر یا بھون کر پورے کا پورا مہمانوں کے سامنے حاضر کر دیا۔

**آیت ۲۷** ﴿فَقَرَّبَتْ اِلَيْهِمْ قَالِ اِلَّا تَاْكُلُوْنَ ۝﴾ ”پھر اسے ان کی طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں؟“

**آیت ۲۸** ﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۝﴾ ”تو اُس نے ان کی طرف سے دل میں اندیشہ محسوس کیا۔“  
 مہمانوں کے کھانا تناول نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید یہ لوگ میرے دشمن ہیں مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور اسی لیے میرا نمک کھانے سے احتراز کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ دشمنی میں بھی شرافت دکھاتے تھے۔ اگر کسی کا نمک کھالیا جاتا تو اس کے بعد اسے نقصان پہنچانے کا نہیں سوچا جاتا تھا۔

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ ۝﴾ ”انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں۔“

﴿وَبَشِّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾ ”اور انہوں نے اسے بشارت دی ایک صاحب علم بیٹے کی۔“  
 صاحب علم بیٹے سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جن کی پیدائش کی بشارت فرشتوں نے دی۔

آیت ۲۹ ﴿فَاقْبَلَتْ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۝﴾ ”اس پر اُس کی بیوی سامنے آئی بڑبڑاتی ہوئی اور اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگی: بڑھیا بانجھ (بچہ جنے گی کیا)؟“  
 کہ میں تو ساری عمر بانجھ رہی ہوں اور اب تو میری عمر بھی ماں بننے کی نہیں رہی تو کیا اب میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؟

آیت ۳۰ ﴿قَالُوا كَذَلِكَ ۖ قَالَ رَبُّنَا ۙ﴾ ”انہوں نے کہا: ایسا ہی فرمایا ہے آپ کے رب نے۔“  
 فرشتے جو انسانی شکل میں تھے انہوں نے جواب دیا: یقیناً ایسے ہی ہوگا۔ ہم اپنی طرف سے یہ خبر نہیں دے رہے بلکہ یہ آپ کے رب کا فیصلہ ہے۔

﴿إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝﴾ ”یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا بھی ہے اور بہت حکمت والا بھی۔“  
 آیت ۳۱ ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝﴾ ”ابراہیم نے پوچھا کہ اے ایلیچو! پھر آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے؟“

آپ کا قصد اور ارادہ کیا ہے؟ کیا خصوصی مہم آپ کو درپیش ہے؟  
 آیت ۳۲ ﴿قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ۝﴾ ”انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف۔“

آیت ۳۳ ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ ۝﴾ ”تاکہ ہم ان پر بارش برسا سکیں کنکریوں کی۔“  
 آیت ۳۴ ﴿مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ۝﴾ ”جو نشان زدہ ہیں آپ کے رب کے پاس حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے۔“

اللہ تعالیٰ نے ہر کنکری کو ان کے ایک خاص فرد کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے لیے گولی (bullet) کا کام کرے گی۔

آیت ۳۵ ﴿فَآخِزْنَاهَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ ”پھر ہم نے نکال لیا جو بھی اس بستی میں تھے اہل ایمان۔“

آیت ۳۶ ﴿فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾ ”تو ہم نے اس میں سوائے ایک گھر کے کسی کو مسلمانوں میں سے۔“

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے ایک گھر کے سوا اس پوری قوم میں اور کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔

آیت ۳۷ ﴿وَوَرَّكُنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝﴾ ”اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہوں دردناک عذاب سے۔“

قوم لوط کی بستیاں (سدوم اور عامورہ) سمندر کے کنارے پر آباد تھیں، جو اب بحیرہ مردار (Dead Sea) کہلاتا ہے۔ ان بستیوں کے بارے میں یہی اندازہ تھا کہ جب زلزلے سے یہ علاقہ تلپٹ ہوا ہوگا تو یہ بستیاں

سمندر میں غرق ہو گئی ہوں گی۔ اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے اور بحیرہ مردار کی تہ میں ان شہروں کے کھنڈرات کو دریافت بھی کر لیا گیا ہے۔ یہاں نشانی سے مراد یہی کھنڈرات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک لوگوں کی عبرت کے لیے ظاہر فرما دیا ہے۔

**آیت ۳۸** ﴿وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ﴾ ”اور موسیٰ کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اسے بھیجا فرعون کی طرف کھلی سند دے کر۔“

**آیت ۳۹** ﴿تَتَوَلَّىٰ بُرْجُكِهِ﴾ ”تو اُس نے منہ موڑ لیا اپنی شان و شوکت کے گھمنڈ میں“

﴿وَقَالَ سِحْرٌ أَوْ مَجْنُونٌ﴾ ”اور کہا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔“

یعنی فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی القابات دیے تھے جو اہل مکہ حضور ﷺ کو دے رہے تھے۔

**آیت ۴۰** ﴿فَاَخَذْنَاهُ وَجُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ﴾ ”سو ہم نے پکڑا اُس کو اور اُس کے لشکروں کو اور انہیں پھینک دیا سمندر میں اور وہ ملامت زدہ تھا۔“

**آیت ۴۱** ﴿وَفِي عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ ”اور قوم عاد میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اُن پر ایک ایسی ہوا چھوڑ دی تھی جو ہر خیر سے خالی تھی۔“

عَقِيم کے معنی بانجھ کے ہیں، یعنی ایسا مرد یا ایسی عورت جس کے اولاد پیدا نہ ہوتی ہو۔ قبل ازیں آیت ۲۹ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ اس مفہوم میں الرِّيحُ الْعَقِيمُ سے مراد ایسی ہوا ہے جو ہر قسم کی خیر سے خالی تھی۔

**آیت ۴۲** ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلْنَاهُ كَالرَّمِيمِ﴾ ”وہ نہیں چھوڑتی تھی کسی شے کو جس پر وہ آ جاتی تھی مگر اُس کو چورا چورا کر کے رکھ دیتی تھی۔“

**آیت ۴۳** ﴿وَفِي ثَمُودَ اِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ﴾ ”اور اسی طرح ثمود کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ان سے کہا گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے تم فائدہ اٹھا لو (دنیا کی نعمتوں سے)۔“

**آیت ۴۴** ﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ ”تو انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے“

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾ ”تو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چنگھاڑ نے انہیں آپکڑا۔“

**آیت ۴۵** ﴿فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُتَّصِرِينَ﴾ ”تو نہ ان میں کھڑے ہونے کی سکت رہی اور نہ ہی اس قابل رہے کہ بدلہ لیتے۔“

یعنی نہ تو وہ اٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔

**آیت ۴۶** ﴿وَقَوْمِ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ﴾ ”اور قوم نوح کو بھی اس سے پہلے (ہم نے پکڑا)۔“

﴿اِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ﴾ ”یقیناً وہ بھی بڑے ہی نافرمان لوگ تھے۔“

نوٹ کیجیے یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا ان سب پیغمبروں کا ذکر آ گیا ہے جن کے حالات طویل کی



سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یعنی سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود میں ایک ایک پیغمبر کا واقعہ عموماً ایک ایک رکوع میں بیان ہوا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر ایک ایک دودو آیات میں آیا ہے۔ گویا بعد میں نازل ہونے والی طویل کی سورتوں میں انباء الرسل کی تفصیل بیان ہوئی ہے جبکہ زیر مطالعہ کی سورتوں میں ان پیغمبروں کا ذکر انتہائی مختصر انداز میں آیا ہے۔

## آیات ۴۷ تا ۶۰

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا يَاقُوتَ ۖ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ۝ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمُهْدُونَ ۝ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَفَرَّقُوا إِلَى اللَّهِ ۖ إِنَّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۖ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ ۝ أَتَوَا صَوَابَهُ ۖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۝ فَكَتَلْنَا عَنْهُمْ فَمَا أَنتَ بِمَلُومٌ ۝ وَذَكَرْنَاكَ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ ذَنْبٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِّثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝ قَوْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۖ وَمِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝

آیت ۴۷ ﴿وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا يَاقُوتَ ۖ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ﴾ اور آسمان کو ہم نے بنایا اپنے ہاتھوں سے اور ہم (اس کو) توسیع دینے والے ہیں۔“

إِنَّا لَمُوسِعُونَ کا ترجمہ عام طور پر ”ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں“ یا ”ہم بڑی قدرت والے ہیں“ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن لغوی اعتبار سے اس کا یہ ترجمہ زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ہے جو اد پر متبن میں اختیار کیا گیا ہے۔ اَوَسَّعَ يَوْسَعُ باب افعال ہے جس کا مطلب ہے کشادہ کرنا وسعت دینا۔ وَسَّعَ ثَلَاثِي مجرد ہے جس سے اسم الفاعل وَاسِعٌ آتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ کا مطلب ہے: اللہ بڑی وسعت سمانی والا ہے اس کے خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ مَوْسِعُ باب افعال سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معنی ہوں گے: وسعت دینے والا۔ اس لحاظ سے یہاں ﴿إِنَّا لَمُوسِعُونَ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کائنات کو مسلسل وسعت بخش رہے ہیں اسے وسیع سے وسیع تر کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہی بات ہے جو آج ہمیں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تک انسان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر گھڑی نئے نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں ہر آن نئی نئی کہکشاؤں وجود میں آرہی ہیں اور یہ کائنات مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ”Expanding Universe“ کے اس تصور کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔  
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُنْ فَيَكُونُ

تو اللہ تعالیٰ کی شان کُنْ فَيَكُونُ کا ظہور مسلسل جاری ہے۔ اسی مفہوم کو سورہ فاطر کی پہلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ﴾ ”وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے“۔ چنانچہ وہ آسمانوں کو یعنی کائنات کو مسلسل وسعت دے جا رہا ہے۔

**آیت ۴۸** ﴿وَالْأَرْضُ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمُهْدُونَ﴾ ”اور زمین کو ہم نے (فرش کی مانند) بچھا دیا، پس ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!“

**آیت ۴۹** ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلْقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ”اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت اخذ کرو۔“

”جوڑوں“ کی تخلیق میں ہمارے لیے کس کس پہلو سے نصیحت کا سامان ہے؟ یہ جاننے کے لیے تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہاں پر اس حوالے سے صرف یہ نکتہ سمجھ لیجیے کہ اس مفہوم کی آیات آخرت سے متعلق عقلی دلیل فراہم کرتی ہیں۔ یعنی جب ہر شے کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی جوڑا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔

**آیت ۵۰** ﴿فَقَرِّعُوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ ”تو دوڑو اللہ کی طرف‘ یقیناً میں تم لوگوں کے لیے اُس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔“

اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچ گیا ہے اور میری باتیں تمہاری سمجھ میں آگئی ہیں تو پھر اللہ کی طرف رجوع کرنے میں دیر نہ کرو۔ ممکن ہے فرشتے کو تمہاری جان قبض کرنے کا حکم بھی مل چکا ہو اور تمہاری مہلت عمل ختم ہونے کا وقت بالکل قریب آگیا ہو۔

**آیت ۵۱** ﴿وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ ”اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ۔“

﴿إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ ”یقیناً میں اُس کی جانب سے تمہارے لیے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔“

**آیت ۵۲** ﴿كَذَلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ﴾ ”اسی طرح (ہوتا آیا ہے کہ) نہیں آیا تھا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔“

**آیت ۵۳** ﴿اتَّوَصَّوْا بِهِ﴾ ”کیا وہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے اس کی؟“

یعنی جو باتیں آج سے صدیوں پہلے کے لوگ اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے وہی باتیں قریش مکہ آج ہمارے آخری رسول ﷺ سے کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کی ہر نسل دوسری نسل کو یہ باتیں وصیت میں بتا کر جاتی رہی ہے؟

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾ ”بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ!“

ان کے رویے کی یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی مسلسل تکرار کی وجہ یہ ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف ان کے اعتراضات بھی ایک جیسے ہیں۔

**آیت ۵۴** ﴿تَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ ۝۵۴﴾ ”پس (اے نبی ﷺ) آپ ان سے رخ پھیر لیں‘ آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔“

یعنی اگر وہ آپ کی مخالفت میں یہاں تک آ گئے ہیں کہ آپ کو شاعر‘ ساحر‘ مجنون اور معلم (سکھایا ہوا) تک کہہ رہے ہیں اور آپ کی دعوت سے مسلسل اعراض کر رہے ہیں تو اب آپ بھی اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹا لیجیے۔ آپ محکم دلائل کے ساتھ ان پر اتمام حجت کر چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئے تو اس کی جواب دہی آپ سے نہیں ہوگی۔ لہذا آپ انہیں چھوڑ کر ان لوگوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں جو آپ کی بات کو سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

**آیت ۵۵** ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝۵۵﴾ ”اور آپ تذکیر کرتے رہیے‘ کیونکہ یہ تذکیر اہل ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔“

آپ تعلیم و تبلیغ کی صورت میں تذکیر و یاد دہانی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ سرکش لوگ اگر اس تذکیر کو نظر انداز کر رہے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں‘ اہل ایمان کے لیے تو یہ بہت مفید ہے۔ آپ سے قرآن سن کر اہل ایمان کے ایمان میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

**آیت ۵۶** ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝۵۶﴾ ”اور میں نے جنہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔“

شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے:-

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تخلیقِ انسانی کی غایت بیان کی گئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس تخلیق کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر زمانے کے فلاسفہ اور حکماء نے اپنی اپنی آراء دی ہیں۔ یہ ان تفاسیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ایک عام غرض کے لیے تخلیق کائنات کے سبب کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں۔ البتہ اپنی تخلیق کی غرض و غایت کے بارے میں جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان کو اپنی غایت تخلیق ہی کا علم نہیں ہوگا تو گویا اس کی ساری زندگی رابیکاں جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں بنی نوع انسان کو ان کی غایت تخلیق واضح طور پر بتادی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ”بندگی“ کے لیے پیدا کیا ہے۔

بندگی یا عبادت کے بارے میں قبل ازیں بھی میں نے کئی مرتبہ وضاحت کی ہے کہ اس کے تین حصے ہیں: اولاً ہم تنہا اطاعت‘ ثانیاً اطاعت کی روح یعنی اللہ تعالیٰ کی غایت درجے کی محبت۔ عبادت اصلاً ان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے (الْعِبَادَةُ تَجْمَعُ أَصْلَيْنِ: غَايَةُ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذِّلِّ وَالْخُضُوعِ)۔ جبکہ تیسری چیز مراسمِ عبودیت ہے‘ جس کی حیثیت عبادت کے ظاہر یا جسم کی ہے۔ مثلاً اللہ کے سامنے عاجزی کی حالت

(قوت) میں کھڑے ہونا (قیام) رکوع، سجدہ، کلمات ادا کرنا، نماز وغیرہ مراسم عبادت ہیں اور ان کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر ہم عبادت کی اس تعریف (اللہ تعالیٰ کی ہمتن اطاعت) کی روشنی میں آج اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت واضح ہوگی کہ ہم میں سے جو لوگ اپنے زعم میں شب و روز پابندی کے ساتھ اللہ کی عبادت پر کمر بستہ ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دن یا پندرہ فیصد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اس کا واضح تر مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کا غالب حصہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت سے نکلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس پر کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اس نظام کے تحت رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ہمتن اطاعت ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا عبادت کے تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے خواہش مند حضرات اس موضوع پر میری کتب اور تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں پر مختصر آئیہ سمجھ لیں کہ مادی و علمی لحاظ سے انسان جس قدر چاہے ترقی کر لے اگر وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا بندگی کے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہا تو انسانی سطح پر اس کی ساری زندگی بیکار اور رازیاں ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں انسان کی اسی ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا      اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا  
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا      زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

**آیت ۵۷** ﴿مَا أَرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ﴾ ”میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا“

﴿وَمَا أَرِيدُ أَنْ يُطِيعُونِ﴾ ”اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھلائیں، پلائیں۔“

**آیت ۵۸** ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ ”یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا، قوت

والا، زبردست ہے۔“

**آیت ۵۹** ﴿فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ﴾ ”پس

ان ظالموں کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کا پیمانہ لبریز ہوا تھا“ سو یہ مجھ سے جلدی نہ بچائیں۔“

”ذُنُوب“ ایسے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ مراد یہ کہ زمانہ ماضی میں عذاب کا شکار ہونے والی اقوام کی طرح ان کفار و مشرکین کی بد اعمالیوں کا ڈول بھی لبریز ہو چکا ہے اور یہ ڈول اب کسی دقت بھی کھینچا جاسکتا ہے۔ لہذا اگر فوری طور پر ان کی پکڑ نہیں بھی ہو رہی تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

**آیت ۶۰** ﴿قَوْلِیْ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا مِنْ یَوْمِهِمْ الَّذِیْ یُوعَدُونَ﴾ ”تو ہلاکت اور بربادی ہے ان

کافروں کے لیے اُس دن سے جس کا اُن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔“



# سُورَةُ الطُّور

## تمہیدی کلمات

سورۃ الطور کے آغاز میں پانچ قسموں کا ذکر ہے۔ ان قسموں کے مفہوم کا تعین کرنا مشکلات القرآن میں سے ہے۔ سورۃ الطور اور سورۃ الذاریات کے درمیان نسبت زوجیت اور گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں سورتوں کے آغاز کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں کے آغاز میں پے درپے قسمیں کھائی گئی ہیں اور دونوں کی قسموں کا مقسم علیہ بھی ایک ہے۔ سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد فرمایا گیا: ﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٍ﴾ ⑤ ﴿وَأَنَّ الَّذِينَ لَوْ افْعَ ⑥﴾ جبکہ سورۃ الطور کی قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر یوں ہوا: ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَالِغٌ ⑦ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ⑧﴾۔ اس کے بعد سورۃ الذاریات میں جنت اور دوزخ کی کیفیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بالکل اسی انداز سے یہ مضمون سورۃ الطور میں بھی آیا ہے۔ پھر سورۃ الذاریات کے دوسرے رکوع میں نہایت اختصار کے ساتھ انباء الرسل کا تذکرہ ہے جبکہ سورۃ الطور میں اس کے مقابل تذکیر بالآء اللہ یعنی اللہ کی قدرتوں اور اس کی صفات کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۲۸

وَالطُّورُ ۝ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ ۝ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۝ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۝ وَالسَّافِرِ الْكَرْفُورِ ۝  
وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ۝ يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۝  
وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سِيرًا ۝ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا يَوْمَ يَكُونُ لِمَن كَانَ يُنْفِقُ فِي حَيَاتِهِ خِزْفًا يَلْعَبُونَ ۝  
يَوْمَ يَدْعُؤْنَ إِلَى نَارِ جَهَنَّمَ دَعَا هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝ أَفَحَسْرَتُ هَذَا  
أَمْرًا تَنْتَمِرُونَ ۝ إصْلَوْهَا فَاصْصِرُوا أَوْ لَا تَصِرُوا ۝ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَمْ أَنْتُمْ حُجْرُونَ ۝ مَّا  
كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ فَلَهِمْ فِيهَا أَنْهَامٌ رَّهِيمٌ ۝ وَوَقَّهْمُ  
رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ مُتَّكِئِينَ عَلَى سُرُرٍ  
مَّصْفُوفَةٍ ۝ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا  
بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ۝ وَمَا أَلْتَنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۝ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ۝

وَأَمْدَدْنَهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۖ يَتَنَزَّاعُونَ فِيهَا كَأَسَا لَا لَعُوفٍ فِيهَا وَلَا تَائِبَةٌ ۖ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ۖ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۖ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۖ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَذَابَ السُّمُورِ ۖ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ۝

**آیت ۱ ﴿وَالطُّورِ﴾** ”قسم ہے طور کی۔“

طور عام پہاڑ کو بھی کہا جاتا ہے، لیکن ”الطُّور“ سے مراد وہ خاص پہاڑ (طورِ سینین) ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

**آیت ۲ ﴿وَكُتِبَ مُنْطُورٌ﴾** ”اور اس کتاب کی قسم جو لکھی ہوئی ہے۔“

اس بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے مراد تورات ہے، کیونکہ تورات پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی، جبکہ قرآن قلب محمد ﷺ پر براہ راست نازل ہوا تھا۔

**آیت ۳ ﴿فِي رَقٍ مُنْشُورٍ﴾** ”کشادہ ورق میں۔“

یعنی وہ تختیاں خوب کشادہ تھیں جن پر تورات کی عبارت تحریر تھی۔ گویا یہ تین قسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے متعلق ہیں۔ کوہ طور پر آپ کو مکالمہ الہی سے سرفراز فرمایا گیا اور آپ کو ایک ایسی کتاب عطا کی گئی جو کشادہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔

**آیت ۴ ﴿وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ﴾** ”اور قسم ہے آباد گھر کی۔“

”الْبَيْتِ الْمَعْمُور“ سے بعض مفسرین بیت اللہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں طواف اور عبادت کے لیے ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں اس سے مراد خانہ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے جو ہر وقت ”معمور“ رہتا ہے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین کی رائے میں اس سے دنیا مراد ہے جو طرح طرح کی مخلوق سے معمور ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ بعد والی قسم اسی مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے۔

**آیت ۵ ﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ﴾** ”اور قسم ہے اونچی چھت کی۔“

اس سے آسمان مراد ہے۔ پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ دنیا ایک گھر کی مانند ہے جس میں انسان آباد ہیں اور آسمان اس گھر کی چھت ہے۔

**آیت ۶ ﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ﴾** ”اور قسم ہے اُلتے ہوئے سمندر کی۔“

اس سے سمندر کی وہ کیفیت مراد ہے جسے ہم اپنی زبان میں ”موج زن سمندر“ یا ”ٹھانھیں مارتا ہوا سمندر“

☆ اس کا تذکرہ سورۃ التین میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿وَالطُّورِ سِينِينَ﴾ ”اور قسم ہے طورِ سینین کی!“

کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ سمندر کو دیکھنے سے واقفنا ایسے محسوس بھی ہوتا ہے جیسے یہ جوش سے اُبل رہا ہے۔ بہر حال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے ان قسموں کے معانی و مفاہیم کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ ان قسموں کا مقسم علیہ وہی ہے جو کہ سورۃ الذاریات کی قسموں کا مقسم علیہ ہے۔

**آیت ۷** ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ ﴿۷﴾ ”تیرے رب کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا۔“  
اس سے قیامت کا سخت دن مراد ہے جس کے اُٹل ہونے کی حقیقت کو سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۷ میں ﴿يَوْمَ لَا مَرَدَ لَهُ﴾ ”وہ دن جسے لوٹنا یا نہ جاسکے گا“ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

**آیت ۸** ﴿مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ﴾ ﴿۸﴾ ”اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔“

**آیت ۹** ﴿يَوْمَ تَعْمُرُ السَّمَاءُ مَوْزًا﴾ ﴿۹﴾ ”جس روز کہ آسمان بری طرح لرزے گا۔“

**آیت ۱۰** ﴿وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سِيرًا﴾ ﴿۱۰﴾ ”اور پہاڑ چل رہے ہوں گے جیسے چلا جاتا ہے۔“

پہاڑوں پر زمین کی گرفت برقرار نہیں رہے گی اور وہ ٹوٹ کر فضا میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔

**آیت ۱۱** ﴿فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ ﴿۱۱﴾ ”پس ہلاکت و بربادی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

**آیت ۱۲** ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ﴾ ﴿۱۲﴾ ”وہ لوگ جو خوش گینوں میں مصروف کھیل رہے ہیں۔“

**آیت ۱۳** ﴿يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ نَارٍ جَهَنَّمَ دَعَا﴾ ﴿۱۳﴾ ”جس دن ان کو دھکے دے دے کر جہنم کی طرف

دھکیلا جائے گا۔“

**آیت ۱۴** ﴿هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ﴾ ﴿۱۴﴾ ”(اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ آگ جس کو تم

جھٹلایا کرتے تھے۔“

**آیت ۱۵** ﴿أَفَسِحْرُ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ﴾ ﴿۱۵﴾ ”کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟“

اب بتاؤ! کیا تم اپنے سامنے واقعی جہنم کو دیکھ رہے ہو یا اس کو بھی تم جادو کا کھیل ہی سمجھتے ہو؟

**آیت ۱۶** ﴿إِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا﴾ ﴿۱۶﴾ ”اب داخل ہو جاؤ اس میں تم خواہ

صبر کرو یا نہ کرو اب تمہارے حق میں برابر ہے۔“

اب تمہارے جزع نزع کرنے اور چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں

آئے گا۔ تمہارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس میں خاموشی سے داخل ہو جاؤ اور اس کی سختیوں کو

صبر سے برداشت کرو۔

﴿إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ﴿۱۷﴾ ”تمہیں بدلے میں وہی کچھ تو مل رہا ہے جو کچھ تم عمل کیا

کرتے تھے۔“

**آیت ۱۷** ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُنٍ﴾ ﴿۱۷﴾ ”یقیناً متقی لوگ باغات میں اور نعمتوں میں ہوں گے۔“

**آیت ۱۸** ﴿فَلِكِهِنَّ بِمَا أَتَيْنَهُمْ رَبُّهُنَّ﴾ ﴿۱۸﴾ ”وہ مزے کر رہے ہوں گے ان نعمتوں کے ساتھ جو ان کے

رب نے انہیں عطا کی ہوں گی۔“

﴿وَوَفَّيْنَاهُمْ رِزْقَهُمْ رِزْقَهُمُ الْعَذَابِ الْجَحِيمِ﴾ اور بچائے گا انہیں ان کا رب جہنم کے عذاب سے۔“  
**آیت ۱۹** ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ اور کھاؤ پوچھا پچھا اُن اعمال کا صلہ جو تم کرتے رہے ہو۔“

قبل ازیں بھی متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کی قدر افزائی کے لیے جنت اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیا جائے گا جبکہ اہل جنت بار بار یہ اقرار کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ تیرا فضل ہے جو تو نے ہمیں بخش دیا اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، ورنہ ہم اس قابل ہرگز نہ تھے۔  
**آیت ۲۰** ﴿مُتَكِبِّينَ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ﴾ وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ان تختوں پر جو برابر بچھے ہوں گے صف در صف۔“

﴿وَزَوْجَهُمْ بِحُورٍ عِينٍ﴾ اور انہیں ہم بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔“  
**آیت ۲۱** ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اس اولاد کو۔“

قبل ازیں اس مضمون کا ذکر سورۃ المؤمن میں حاملین عرش اور ان کے ساتھی فرشتوں کی دعا کے ضمن میں بھی آچکا ہے۔ وہ اللہ کے حضور مؤمنین کے لیے یوں دعا کر رہے ہوں گے: ﴿رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ فِي الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ اے ہمارے پروردگار! انہیں داخل فرما تا اُن رہنے والے باغات میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (ان کو بھی) جو نیک ہوں ان کے آباء و اجداد ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ تو یقیناً زبردست ہے کمال حکمت والا ہے۔ اب زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے اس کریمانہ فیصلے کا خود اعلان فرما رہے ہیں کہ ہم اہل جنت کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔ یعنی نچلے درجے کی جنت کے مستحق افراد کو بھی ان کے والدین کے برابر لے آئیں گے جو اعلیٰ درجات کی جنتوں میں متمکن ہوں گے۔

﴿وَمَا أَلْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور ہم اُن کے عمل میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔“  
 یعنی اگر کوئی شخص اعلیٰ درجے کی جنت میں ہے اور اس کے اہل و عیال نسبتاً نچلے درجے میں ہیں تو یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کو اس کے اہل و عیال کے پاس نچلے درجے میں بھیج دیا جائے بلکہ اس کے اہل و عیال کے درجات بلند کر کے اس کے برابر کر دیا جائے گا۔ گویا اہل جنت کے اکرام کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوگا کہ ان کے رشتے داروں میں سے جو کوئی کم سے کم درجے کی جنت کا بھی مستحق ہو جائے گا اسے ترقی دے کر ان کے اعلیٰ جنتوں والے رشتے داروں سے ملا دیا جائے گا تاکہ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو۔



﴿كُلُّ أَمْرٍ يُبَيِّنُ لِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱﴾ ”ہر انسان اپنی کمائی کے عوض رہن ہوگا۔“

**آیت ۲۲** ﴿وَأَمَّا دُلَّهُمْ فَبِأَكْثَرِهِمْ وَلَحْمٌ مِّمَّا يَسْتَهْوُونَ ۝۲۲﴾ ”اور ہم انہیں دیے چلے جائیں گے پھل اور گوشت جس سے وہ چاہیں گے۔“

**آیت ۲۳** ﴿يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْتِيهِمْ ۝۲۳﴾ ”اس میں وہ ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے وہ جام جن (کے مشروب) میں نہ تو کوئی بے ہودگی ہوگی اور نہ ہی گناہ میں ڈالنے والی کوئی بات۔“

یہ اہل جنت کی دوستانہ محفلوں کی رونق اور چہل پہل کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ وہ خوش طبعی کے انداز میں ایک دوسرے سے جام چھین رہے ہوں گے۔ اہل جنت کو جو مشروب ملے گا اس میں کیف و سرور تو ہوگا لیکن دنیا کی شراب کی طرح بے ہودگی کی کوئی کیفیت نہیں ہوگی۔

**آیت ۲۴** ﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ۝۲۴﴾ ”اور ان پر گردش میں رہیں گے نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے وہ ایسے ہوں گے جیسے موتی ہوں غلافوں میں رکھے ہوئے۔“

**آیت ۲۵** ﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝۲۵﴾ ”اور وہ (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم سوال کریں گے۔“

**آیت ۲۶** ﴿قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝۲۶﴾ ”وہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے اہل و عیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے۔“

دنیا میں اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے درمیان معمول کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں۔ نہ معلوم نیک اعمال کی قبولیت کے لیے مطلوبہ معیار کا اخلاص ہمارے دلوں میں ہے بھی یا نہیں۔ کہیں ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو ہماری ساری محنت کو بھی اکارت کر دے۔ ایسے اندیشے اور خدشے ہر لمحہ ہمیں دامن گیر رہتے تھے۔

**آیت ۲۷** ﴿فَمَنْ لِّلَّهِ عَلَيْنَا وَوَقَفْنَا عَذَابَ السَّمُومِ ۝۲۷﴾ ”تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہم پر اور ہمیں بچا لیا لو کہ عذاب سے۔“

**آیت ۲۸** ﴿إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۝۲۸﴾ ”یقیناً ہم پہلے سے اس کو پکارا کرتے تھے۔“  
البتہ یہ ضرور تھا کہ اپنی دنیوی زندگی میں ہم اپنی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں کرتے رہتے تھے۔

﴿إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ۝۲۹﴾ ”یقیناً وہ بہت ہی اچھا سلوک کرنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔“

## آیات ۲۹ تا ۴۹

فَذَكِّرْ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۖ أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ لَتَتَّبِعَنَّهُ رِبِّي  
 السُّنُونَ ۖ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظَرِينَ ۖ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَخْلَاهُمُ بِهِدَا أَمْ  
 هُمْ قَوْمٌ طَاغُوتٌ ۖ أَمْ يَقُولُونَ نَقُولُهُ ۖ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ۖ فَلْيَاثُوا بِحَدِيثِ قَبِيلِهِ ۖ إِن كَانُوا  
 صَادِقِينَ ۖ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۖ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ  
 بَلْ لَا يُؤْقِنُونَ ۖ أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُضِيِّطُونَ ۖ أَمْ لَهُمْ سَلْمٌ  
 يَسْتَمْعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعَهُمْ بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۖ أَمْ لَهُ الْهِنْتُ وَلَكُمُ الْهِنْتُ ۖ أَمْ  
 سَأَلَهُمْ أَجْرًا فَهَمْ مِنْ مُتَعَمِّرٍ مُنْقَلُونَ ۖ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ ۖ أَمْ يُرِيدُونَ  
 كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ۖ أَمْ لَهُمْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۖ سُبْحَنَ اللَّهُ عَمَّا  
 يُشْرِكُونَ ۖ وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَرْكُومٌ ۖ فَذَرُهُمْ حَتَّى  
 يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۖ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۖ  
 وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۖ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ  
 ۖ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۖ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَادْبَارَ النُّجُومِ ۖ

آیت ۲۹ ﴿فَذَكِّرْ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۖ﴾ (تو اے نبی ﷺ!)

تذکیر کرتے رہیے پس آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔  
 یہ خطاب اگرچہ حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں سنانا ان لوگوں کو مقصود ہے جو آپ کے ایسے نام رکھتے  
 تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان کی فضول باتوں پر بالکل  
 توجہ نہ دیں اور لوگوں کو مسلسل تذکیر اور یاد دہانی کرتے رہیں۔ اس سے ملتا جلتا مضمون قبل ازیں گزشتہ سورت  
 (الذاریات) میں بھی آچکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا:

﴿قَتُلْ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ ۖ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ﴾

”پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رخ پھیر لیں آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور آپ تذکیر کرتے

رہیے کیونکہ یہ تذکیر اہل ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔“

آپ تذکیر و تبلیغ کا عمل مسلسل جاری رکھیے۔ کیا خبر کسی دل میں ایمان کی کوئی کلی کھلنے والی ہو کیا خبر آپ  
 کے کسی دشمن کا دل بھی موم ہونے والا ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ اس حقیقت کا گواہ ہے  
 کہ تذکیر آہستہ آہستہ دلوں کو متاثر کرتی رہتی ہے اور پھر کسی وقت اچانک وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جب دل میں

ایمان کی کلی کھل اُٹھتی ہے۔ حضرت عمرؓ اگرچہ حضور ﷺ کی مخالفت میں ہر وقت پیش پیش رہتے تھے لیکن چونکہ سخن شناس تھے اس لیے کلام الہی سننے کے لیے متحسّس بھی رہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ امرات کو صحن کعبہ میں قیام اللیل کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تو کبھی کبھی حضرت عمرؓ چھپ کر حضور ﷺ کی زبان مبارک سے تلاوت سنتے اور کلام الہی کی تاثیر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے تھے۔ گویا حضور ﷺ کی تذکیر اور قرآن کی تاثیر تدربحان کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اسی تدربحی عمل کے باعث آپؐ کے خیالات و جذبات میں اندر ہی اندر ایک مثبت تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اُس کے بعد مشیت الہی سے وہ واقعہ رونما ہوا جس کے باعث اس خاموش تبدیلی کو اظہار کا موقع ملا اور آپؐ کو ایمان کی دولت نصیب ہو گئی۔ اس دن تو آپؐ گھر سے حضور ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔ راستے میں اپنی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زید سے الجھ پڑے۔ آپؐ کے تشدد کا سامنا کرتے ہوئے بہن نے جب ڈٹ کر کہا کہ عمر تم جو چاہے کر لو اب ہم اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں! تو آپؐ اپنی بہن کے اس غیر معمولی عزم اور حوصلے کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ پھر کیا تھا! آپؐ کے دل کا ”بند“ یکدم کھل گیا اور آپؐ نے حق کو اعلانیہ قبول کر لیا۔

**آیت ۳۰** ﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ مَّتَرَبِّصٌ بِهِ رَبِّبُ الْمُتَوَنُّونَ ۚ﴾ ”کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم منتظر ہیں گردش زمانہ کے؟“

مشرکین مکہ آپس میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) محض ایک شاعر ہیں۔ ان کے شاعرانہ کلام سے متاثر ہونے میں جلدی مت کرو کچھ دیر انتظار کرو گے (wait and see!) تو ان کے دعووں کی اصل حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آ جائے گی۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت جلد یہ خود ہی گردش زمانہ کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔

**آیت ۳۱** ﴿قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ۝﴾ ”آپؐ کہیے کہ اچھا تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔“

**آیت ۳۲** ﴿أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاعُونَ ۝﴾ ”کیا ان کی عقلیں انہیں یہی کچھ سکھا رہی ہیں یا یہ ہی سرکش لوگ؟“

مشرکین کے ایمان نہ لانے کی یہ دو ہی ممکنہ وجوہات تھیں۔ یا تو واقعتاً انہیں بات سمجھ نہیں آرہی تھی اور ان کی عقلیں انہیں یہی سکھاتی تھیں کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ محض شاعری اور ان کا من گھڑت کلام ہے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ بات ان کی سمجھ میں بھی آتی تھی اور ان کے دل گواہی بھی دیتے تھے کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر وہ اپنی سرکشی، ضد اور عناد کی وجہ سے انکار پر جبرے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں یہ ساری باتیں وہ عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کر رہے تھے۔ دراصل نفس انسانی کی سرکشی بھی دریا کی طغیانی کی طرح ہے جس کے سامنے منطق، تدبیر، کوشش وغیرہ کسی کی نہیں چلتی۔ بقول الطاف حسین حالی:۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

**آیت ۳۳ ﴿اَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ﴾** ”کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (محمد ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟“

تَقَوَّلَ باب تفعّل سے ہے اور اس کے معنی تکلف کر کے کچھ کہنے کے ہیں، یعنی قرآن کے بارے میں مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) محنت و ریاضت کے ذریعے یہ کلام خود ”موزوں“ کرتے ہیں۔

﴿بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (بلکہ) اصل بات یہ ہے کہ (یہ ماننے والے نہیں ہیں۔“

**آیت ۳۴ ﴿فَلْيَكُونُوا بِحَدِيثِ مَثَلَةٍ اِنْ كَانُوا صٰدِقِيْنَ﴾** ”تو وہ لے آئیں اس جیسی کوئی ایک بات

اگر وہ سچے ہیں۔“

یہ وہ چیلنج ہے جو قرآن نے بار بار انہیں دیا کہ اگر تم واقعی بتا رہے ہو کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کا اپنا بنایا ہوا ہے تو ایسا ہی کلام تم بھی اس کے مقابلے میں بنا کر لے آؤ۔ آخر تمہارے درمیان بڑے بڑے خطباء، ادباء اور شعراء موجود ہیں، ان سب کو اکٹھا کر دو اور کوشش کر کے دیکھ لو۔

**آیت ۳۵ ﴿اَمْ خَلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُونَ﴾** ”کیا یہ بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بن

گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں؟“

یہ فلسفے کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کوئی شے بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بخود تو بنتی نہیں ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز کی تخلیق کے حوالے سے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یعنی یا تو اس چیز کو کسی نے تخلیق کیا ہے یا اس چیز نے اپنے آپ کو خود تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ یہ منطقی سوال ان کے سامنے رکھا گیا کہ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ تم نے خود اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا تو پھر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی دوسری ہستی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

**آیت ۳۶ ﴿اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾** ”کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں

نے بنایا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں رکھتے۔“

چلو اپنی تخلیق کی بحث کو چھوڑ دو، تم ذرا یہ بتاؤ کہ زمین و آسمان تم نے بنائے ہیں؟ اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نہیں بنائے تو پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ خود تمہارا خالق اور تمام مخلوق سمیت پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو دو اور دو چار کی طرح مسلم ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یقین سے محروم ہیں۔

**آیت ۳۷ ﴿اَمْ عَنْدهُمْ خَزٰٓئِرُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُضْطَرُوْنَ﴾** ”کیا ان کے قبضہ قدرت میں

آپ کے رب کے خزانے ہیں یا یہ دار و غدہ ہیں؟“

اس آیت کو پڑھتے ہوئے مشرکین مکہ کا وہ اعتراض بھی ذہن میں تازہ کر لیں جس کا ذکر سورۃ الزخرف کی آیت ۳۱ میں ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر وہی بھیجتا تھی اور اپنا کلام دنیا میں نازل کرنا ہی تھا تو اس کے لیے اس کی نظر بنو ہاشم کے ایک یتیم شخص ہی پر کیوں پڑی، جو نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی مکہ کے قبائلی نظام کے اعلیٰ عہدوں (hierarchy) میں سے کوئی عہدہ اس کے پاس ہے! عرب کے قبائلی معاشرے میں کسی شخصیت کے ”بڑے“

ہونے کا ایک معیار یہ بھی تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس زمانے میں مقدماتِ قتل کے فیصلے کرنے پر مامور تھے۔ یہ قبائلی نظام کا بہت بڑا اور انتہائی حساس نوعیت کا عہدہ تھا جس پر حضرت ابوبکرؓ اس زمانے میں فائز تھے۔ اس کے علاوہ آپؓ بہت بڑے تاجراور سرمایہ دار بھی تھے۔ اس زمانے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرمائے کی مالیت چالیس ہزار درہم کے لگ بھگ تھی۔ اس حوالے سے یہ حقیقت بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آپؓ نے یہ سارا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دیا اور جب آپؓ ہجرت کے لیے مدینہ روانہ ہوئے تو پیچھے گھر والوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

بہر حال مشرکین مکہ بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس منصب کے لیے ان دو بڑے شہروں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑی شخصیت کو کیوں منتخب نہیں کیا: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِينَ عَظِيمٍ﴾ (الزخرف: ۳۱) اور کہنے لگے کہ کیوں نہیں اتارا گیا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم شخص پر؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ (الزخرف: ۳۲) ”کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کریں گے؟“ آیت زیر مطالعہ میں بھی حضور ﷺ کے خلاف اسی نوعیت کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے خزانے کیا ان لوگوں کے بقدر قدرت میں ہیں؟ اور کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے فیصلے کرنے میں ان لوگوں کی مرضی و منشا کا پابند ہے؟

**آیت ۳۸** ﴿أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ﴾ ”کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعے سے یہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟“

﴿فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ﴾ ”(اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لائے۔“

**آیت ۳۹** ﴿أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبُنُونَ﴾ ”کیا اُس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟“

**آیت ۴۰** ﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّن مَّعْرَمٍ مَّثْقُلُونَ﴾ ”کیا آپ ان لوگوں سے کوئی اجرت طلب کر رہے ہیں کہ یہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟“

یہاں پر پے در پے سوالات کا انداز خصوصی تاثر کا حامل ہے۔ یہ مقام زور و خطابت، فصاحت، بلاغت، ادبیت اور عذوبت کے حوالے سے گویا قرآن کی معراج ہے۔ ظاہر بات ہے ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

**آیت ۴۱** ﴿أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ﴾ ”کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟“

**آیت ۴۲** ﴿أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ﴾ ”کیا یہ لوگ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اصل میں تو یہ کافر خود ہی چال کا شکار ہو گئے ہیں۔“

یہ لوگ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہمارے رسول ﷺ اور قرآن کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں تاکہ عوام ان سے متاثر نہ ہوں۔ لیکن ان کی یہ باتیں اس قدر بودی ہیں کہ خود ان کے اپنے دل بھی ان کو نہیں مانتے۔ ان کی سازشوں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح ناکام کرتا رہتا ہے جیسا کہ سورۃ الطارق میں فرمایا گیا: ﴿أَنَّهُمْ يَكِيدُونَ

کَيْدًا ۱۵) وَآيَكُنْ كَيْدًا ۱۶) ”یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنی تدبیر کر رہا ہوں۔“  
**آیت ۲۳** ﴿أَمْ لَهُمْ آلِهٌ غَيْرُ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۲۳﴾ ”کیا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور الہ بھی ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو شرک یہ کر رہے ہیں۔“

**آیت ۲۴** ﴿وَأَن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ۲۴﴾ ”اور اگر کبھی یہ دیکھیں آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا تو کہیں گے کہ یہ تو بادل ہیں تہہ برتہ۔“

ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی عذاب الہی بن کر ان پر گر رہا ہو تو اسے بھی یہ لوگ بارش برسانے والا بادل ہی سمجھیں گے۔ جیسا کہ قوم عاد کے لوگوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے عذاب کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿هَذَا غَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (الاحقاف: ۲۴) ”یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے۔“ یہ بادل برسیں گے تو ہمارے علاقے میں جل تھل کر دیں گے۔

**آیت ۲۵** ﴿فَذَرُهُمْ حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۲۵﴾ ”تو (اے نبی ﷺ!) چھوڑے رکھیے ان کو یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس میں ان پر بجلی کی کڑک گرے گی۔“

”چھوڑ دینے“ کے مفہوم میں یہ حکم ابتدائی زمانے کی سورتوں میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرُهُمْ يَخْوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوْمَعُدُونَ ۳۱﴾ ”تو (اے پیغمبر ﷺ!) ان کو باطل میں پڑے رہنے اور کھیل لینے دو یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ان کے سامنے آ موجود ہو۔“ سورۃ القلم میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ ۚ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۳۳﴾ ”تو آپ مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔“ اس حکم کے تکرار کا مطلب یہی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کے تمسخر، استہزاء اور دیگر مخالفانہ ہتھکنڈوں کو بالکل خاطر میں نہ لائیں اور تبلیغ و تذکیر کے حوالے سے اپنا مشن جاری رکھیں۔ ان لوگوں کے معاملے کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں ان سے میں خود منٹ لوں گا۔

**آیت ۲۶** ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۲۶﴾ ”جس دن ان کی چالیں ان کے کسی کام نہ آسکیں گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ملی ہوگی۔“

ان کی ساری چالیں ناکام ہو جائیں گی اور کوئی مددگار ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔

**آیت ۲۷** ﴿وَأَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَٰكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۲۷﴾ ”اور ان ظالموں کے لیے اُس (آخرت کے عذاب) کے علاوہ بھی ایک عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔“

اس عذاب سے یا تو قحط مکہ کا عذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۃ الدخان میں ہے اور یا پھر غزوہ بدر کے دن کا عذاب جس دن مکہ کے سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

**آیت ۲۸** ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ”(اور اے نبی ﷺ!) آپ اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔“

ابتدائی کمی دور کی سورتوں میں یہ حکم بار بار آیا ہے۔ خصوصاً زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں اور ۲۹ ویں پارے کی سورتوں میں تو قَاضِیُہ یا وَاضِیُہ کے صغے کی بہت تکرار ملتی ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا: ﴿وَاضِیُّہٖ وَمَا صَبَّرُکَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (آیت ۱۲۷) ”آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے۔“ سورۃ الاحقاف میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿قَاضِیُّہٖ کَمَا صَبَّرَ اُولُو الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۳۵) ”پس آپ بھی صبر کیجیے جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تھا۔“ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کی زیادتیاں برداشت کیں۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاضِیُّہٗ عَلٰی مَا یَقُولُوْنَ﴾ (آیت ۱۰) ”اور اس پر صبر کیجیے جو یہ لوگ آپ کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں۔“ سورۃ المدثر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْلَیْکَ قَاضِیُّہٗ﴾ (آیت ۵) ”اور آپ اپنے رب کے لیے صبر کریں۔“ غرض ابتدائی کمی دور کی سورتوں میں رسول اللہ ﷺ کو براہ راست مخاطب کر کے بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ آپ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامیں رہیں۔ عربی میں ”صبر“ کے بعد اگر ”ن“ آ جائے جیسے کہ آیت زیر مطالعہ میں ہے تو اس کے معنی انتظار کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ اسی مفہوم کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

﴿فَإِنَّکَ بِأَعْيُنِنَا﴾ ”بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں۔“

آپ مسلسل ہماری نظروں کے سامنے ہیں، ہم آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ہم آپ کی نگہبانی کر رہے ہیں آپ کو آپ کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ بالکل یہی مضمون سورۃ یونس کی آیت ۶۱ میں بھی آیا ہے: ﴿وَمَا تَكُونُ فِیْ شَأْنٍ وَمَا تَتَلَوْنَ مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شَہُودًا ۚ اِذْ تُفِضُونَ فِیْہٖ﴾

”اور (اے نبی ﷺ) نہیں ہوتے آپ کسی بھی کیفیت میں اور نہیں پڑھ رہے ہوتے آپ قرآن میں سے کچھ اور (اے مسلمانو!) تم نہیں کر رہے ہوتے کوئی بھی (اچھا) عمل مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔“

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُومُ﴾ (۳۸) ”اور آپ تسبیح کرتے رہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ جب آپ کھڑے ہوں۔“

اس بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی تہجد کی نماز کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ آغاز میں تو وہی ایک نماز تھی۔ جیسا کہ سورۃ المزمل کی ان آیات میں قیام اللیل کا ذکر ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ الَّذِیْ ۝۱ قُمِ اللَّیْلَ إِلَّا قَلِیْلًا ۝۲ نِصْفَہٗٓ أَوْ اَنْقُصْ مِنْہٗ قَلِیْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَیْہٖ وَزَلَیْلُ الْقُرْآنِ تَرٰیۤہٗ ۝۴﴾

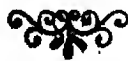
”اے کپڑا اوڑھنے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر (ساری رات نہیں بلکہ) کم۔ (یعنی) نصف رات یا اس سے کچھ کم کرلو۔ یا اس پر کچھ زیادہ کرلو اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔“

آیت ۳۹ ﴿وَمِنَ اللَّیْلِ فَسَبِّحْہٗ﴾ ”اور رات کے ایک حصے میں بھی آپ اُس کی تسبیح کریں“

گویا تہجد کے علاوہ بھی رات کے مختلف حصوں میں حضور ﷺ کو تسبیح و تحمید کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ ابتدائی دور کی ان سورتوں میں جن اوقات کو اللہ کے ذکر کے لیے مخصوص کرنے کے احکام دیے گئے ہیں، بعد میں جب پانچ اوقات کی نماز فرض ہوئی تو وہی اوقات مختلف نمازوں کے اوقات قرار پائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مغرب اور عشاء کی نمازیں فرض ہوئیں، کیونکہ غروب آفتاب سے رات شروع ہو جاتی ہے اور عشاء کی نماز بھی رات کے ایک حصے میں ہی ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَإِذَا بَرَءُ الشُّجُومِ ۝﴾ ”اور ستاروں کے پیٹھ موڑتے وقت بھی (آپ تسبیح کیجیے)۔“

جب ستاروں کا قافلہ کوچ کرتا ہے تو صبح کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس سے صبح صادق کا وقت مراد ہے اور بعد میں اس وقت پر نماز فجر فرض ہوئی۔





# سُورَةُ النَّجْمِ

## تمہیدی کلمات

کئی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی تین سورتوں کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان میں سورۃ قٰ منفر د ہے جبکہ سورۃ الذاریات اور سورۃ الطور جوڑے کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے سورۃ الذاریات میں انباء الرسل کے انداز میں مختلف پیغمبروں کا ذکر ہے جبکہ سورۃ الطور میں قیامت کے احوال، جنت، دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سورۃ النجم اور سورۃ القمر بھی جوڑے کی صورت میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں بعض مضامین بہت مشکل ہیں۔ ان دونوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت ان کی آغاز کی آیات سے ظاہر ہوتی ہے۔ سورۃ النجم کی پہلی آیت میں ستارے کے گرنے کا ذکر ہے جبکہ سورۃ القمر کی پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کا حوالہ آیا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۱۸

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۖ مَا صَلَٰ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۚ عَلَيْهِ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۖ ذُو مِرَّةٍ ۖ فَاسْتَوَىٰ ۖ وَهُوَ بِالْأَفْقِ الْأَعْلَىٰ ۚ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۖ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۚ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۚ أَفَتَمْرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۚ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۖ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۖ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۖ إِذْ يَخْشَى السِّدْرَةَ مَا يَخْشَىٰ ۚ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۚ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۖ

﴿آیت ۱﴾ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ﴿۱﴾ ”قسم ہے ستارے کی جبکہ وہ گرتا ہے۔“

ہوئی یٰہویٰ ہوئیٰ کا اصل معنی ہے اوپر سے نیچے گرنا۔ یہاں اس سے ستاروں کا افق سے غائب ہونا، ڈوب جانا یا فنا ہو جانا مراد ہو سکتا ہے۔ (اس پر قدرے تفصیلی بحث سورۃ الواقعة میں ”مَوَاقِعِ التُّجُومِ“ کے ضمن میں آئے گی۔) الٰہویۃ گہرے کنویں کو اور ہادیۃ دوزخ کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ اسی مادہ سے ہویٰ یٰہویٰ ہوئیٰ کا معنی ہے خواہش کرنا۔ یہ لفظ (الٰہویٰ) آگے آیت ۳ میں آرہا ہے۔

**آیت ۲** ﴿مَا صَلَّٰ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ۝۲﴾ ”(اے لوگو! تمہارے یہ ساتھی نہ تو بھٹکے ہیں اور نہ ہی بھٹکے ہیں۔“

قرآن حکیم میں قسم بالعموم شہادت کے لیے آتی ہے۔ یہاں ستاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے یہ ساتھی (محمد رسول اللہ ﷺ) نہ تو غلط فہمی کی بنا پر راستہ سے بھٹکے ہیں اور نہ اپنے قصد و اختیار سے جان بوجھ کر غلط راستے پر چلے ہیں۔

**آیت ۳** ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝۳﴾ ”اور یہ (جو کچھ کہہ رہے ہیں) اپنی خواہش نفس سے نہیں کہہ رہے ہیں۔“

**آیت ۴** ﴿اِنَّ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی ۝۴﴾ ”یہ تو صرف وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔“

اگلی آیات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر ہے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کو اس کلام کی تعلیم دی۔ یہ مضمون دوسری مرتبہ ۳ ویں پارے کی سورۃ التکوین میں آیا ہے۔ دونوں عبارتوں میں ایک خوبصورت مماثلت یہ ہے کہ وہاں بھی حضور ﷺ کا ذکر صَاحِبُكُمْ کے لفظ سے کیا گیا ہے:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَغْنُونٍ ۝۵﴾ وَلَقَدْ رَاَهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِیْنِ ۝۶ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضُنِیْنٍ ۝۷﴾  
هُوَ یَقُولُ شَیْطٰنٌ رَّجِیْمٌ ۝۸﴾ (التکوین)

”اور (کے والو) تمہارے یہ رفیق دیوانے نہیں ہیں۔ بے شک انہوں نے اس (جبرائیل) کو کھلے آفاق پر دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہیں۔ اور یہ ہرگز کسی شیطان رجم کا قول نہیں ہے۔“

حضرت جبرائیل علیہ السلام جب وحی لے کر آتے تو وہ حضور ﷺ کو نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہی وحی کو آپ اپنے کانوں سے سن سکتے تھے۔ فرشتے اور وحی دونوں کا تعلق چونکہ عالم امر سے ہے اس لیے ان کا نزول بھی آپ کی شخصیت کے اس حصے پر ہوتا تھا جو عالم امر سے متعلق تھا، یعنی آپ کی روح مبارک۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ انسانی روح کا مسکن چونکہ قلب انسانی ہے اس لیے وحی کا نزول براہ راست حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ہوتا تھا۔

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو رُوح سنے اور روح سنائے!

تاہم حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضور ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آنا بھی ثابت ہے۔ روایات میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ حضرت جبرائیل جب انسانی شکل میں آپ کے پاس آتے تو عموماً خوبصورت نوجوان صحابی حضرت وحید کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے جو بہت عظیم انسان تھے۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ انسانی شکل میں حضرت جبرائیل کی حضور ﷺ سے جو گفتگو ہوتی وہ ”وحی تلو“ یعنی قرآن میں شامل نہیں ہے۔ مثلاً ”حدیث جبریل“ میں حضرت جبرائیل کے ساتھ حضور ﷺ کے مکالمے کی تفصیل درج ہے۔ اس موقع پر حضرت جبرائیل انسانی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے دین کے بارے میں چند بنیادی سوالات پوچھے۔ آپ نے ان سوالات کے جوابات دیے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ یہ جبرائیل تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس حدیث کا مضمون اس قدر اہم ہے کہ

محدثین نے اسے ”اُمُّ السُّنَّة“ قرار دیا ہے، لیکن اس حدیث کے مندرجات قرآن میں شامل نہیں۔  
 البتہ حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں بھی دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ تو آپ ﷺ نے انہیں آغا نبوت کے زمانے میں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ ”فترت وحی“ کے دنوں میں پیش آیا۔ (پہلی وحی کے بعد وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع رہا، اس وقفے کو ”فترت وحی“ کہا جاتا ہے۔) ایک دن آپ ﷺ نماز حرا سے اُتر رہے تھے تو آپ نے ایک آواز سنی ”یا محمد!“ آپ نے ادھر ادھر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ آپ نے سمجھا کہ شاید مجھے دھوکہ ہوا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے وہی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بھی آپ کو جب کوئی انسان دکھائی نہ دیا تو آپ کو کچھ خوف محسوس ہوا۔ تیسری مرتبہ جب آپ نے پھر وہی آواز سنی تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر دیکھنے سے آپ کو حضرت جبرائیل اپنی اصلی ملکوتی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا افق بھرا ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل کو معراج کے موقع پر سدرة المنتہی کے قریب دیکھا۔ آئندہ آیات میں اسی مشاہدے کا ذکر ہے۔ حضرت جبرائیل جب حضور ﷺ کو سفر معراج پر لے جانے کے لیے آئے تو وہ انسانی شکل میں تھے اور آپ کے لیے جو سواری (براق) وہ لے کر آئے تھے وہ بھی کوئی محسوس و مرقی قسم کی مخلوق تھی۔ لیکن جب آپ ساتویں آسمان پر سدرة المنتہی کے پاس پہنچے تو وہاں حضرت جبرائیل اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس مقام پر انہوں نے آگے جانے سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہاں سے آگے بڑھوں گا تو میرے پر جل جائیں گے۔

اگر یک سرِ نموئے برتر قدم فروغ تجلی بسوزد پر

اس مضمون کے حوالے سے یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اصل ملکوتی شکل میں حضور ﷺ سے ملاقات کرانے اور پھر اس ملاقات کا قرآن مجید میں ذکر کرنے کا مقصد نزول وحی کے سلسلے کے درمیان رابطے (link) کی سند فراہم کرنا ہے۔ اس نکتہ لطیف کو ”اصول حدیث“ کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ محدثین نے احادیث کی صحت (authenticity) کی تحقیق کے لیے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جس شخص کی کسی دوسری شخصیت سے روایت منقول ہے اس کی اس شخصیت سے شعور کی عمراور شعور کی کیفیت میں ملاقات بھی ثابت ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسی ملاقات ثابت نہ ہو سکے تو متعلقہ راوی کی روایت قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً اگر ایک تابعی کسی صحابی سے کوئی روایت منقول ہے مگر حقائق ثابت کرتے ہیں کہ جب وہ صحابی فوت ہوئے تو متعلقہ تابعی کی عمر صرف چھ سال تھی، یعنی اس وقت ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ بات کو سمجھ کر کسی دوسرے کو بتا سکتے، تو ایسی صورت میں متعلقہ تابعی کی وہ روایت محدثین کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی۔ چنانچہ حدیث رسول کی صحت (authenticity) کے لیے اگر متعلقہ راویوں کی ملاقات کا ثابت ہونا ضروری ہے تو ایسا ہی ثبوت اللہ تعالیٰ کی حدیث (اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سورۃ الزمر کی آیت ۲۳ میں اَحْسَنُ الْحَدِيثِ قرار دیا ہے) کی روایت کے حوالے سے بھی دستیاب ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید کی روایت کی تصدیق و توثیق یوں ہوگی: قرآن کیا ہے؟ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ سے اس کا کلام کس نے سنا؟ جبرائیل نے سنا۔ جبرائیل سے کس نے سنا؟ جبرائیل سے محمد (ﷺ) نے سنا۔ تو کیا جبرائیل اور محمد (ﷺ) کی ملاقات ثابت ہے؟

جی ہاں! ان کے درمیان دو مرتبہ کی ملاقات قرآن سے ثابت ہے۔ چنانچہ وحی کی ”روایت“ کا درمیانی رابطہ (link) ثابت کرنے کے لیے حضور ﷺ کی حضرت جبرائیل سے اصل ملکوتی شکل میں ملاقات کی ”سند“ انتہائی اہم ہے جو یہ آیات فراہم کر رہی ہیں۔

**آیت ۵ ﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ﴾** ”انہیں سکھایا ہے اُس نے جو زبردست قوت والا ہے۔“  
 ”شَدِيدُ الْقُوَىٰ“ سے یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ قرآن جبرائیل نے سکھایا ہے جو زبردست قوت والا ہے۔

**آیت ۶ ﴿ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ﴾** ”جو بڑا زور آور ہے۔ وہ سیدھا ہوا۔“

**آیت ۷ ﴿وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ﴾** ”اور وہ اُفقِ اعلیٰ پر تھا۔“  
 یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل کو اُفقِ اعلیٰ پر اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔

**آیت ۸ ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ﴾** ”پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا۔“

**آیت ۹ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾** ”بس دو کمانوں کے برابر (فاصلہ رہ گیا) یا اس سے بھی قریب۔“

**آیت ۱۰ ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾** ”پھر اُس نے وحی کی اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کی۔“  
 ”اَوْحَىٰ“ کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: ”پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔“

جس وحی کا یہ ذکر ہے وہ ”وحی رسالت“ تھی، جبکہ پہلی وحی جو سورۃ العلق کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی ”وحی نبوت“ تھی۔ اس وحی سے حضور ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵﴾ ان پانچ آیات میں نہ تو آپ کو کوئی حکم دیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد کئی ماہ تک کوئی وحی نہیں آئی۔ اس عارضی وقفے کو ”فترتِ وحی“ کا دور کہا جاتا ہے۔ پھر ایک دن جب آپ ﷺ غارِ حرا سے واپس آرہے تھے تو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر آیات زیر مطالعہ میں ہو رہا ہے۔ یعنی آپ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصل ملکی شکل میں اُفق پر دیکھا۔ اس منظر سے آپ خوفزدہ ہو گئے اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں آپ گھر پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کھلے اور ہانے کا فرمایا۔ اس کیفیت میں جب آپ کھلے اور اُڑھے لیٹے تھے تو یہ وحی نازل ہوئی، جس میں آپ کو رسالت کی ذمہ داری سونپ دی گئی: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَأَنذِرْ ۝۲ وَرَبُّكَ فَكَبِيرٌ ۝۳﴾ (المدثر) ”اے کھلے میں لپٹ کر لیٹنے والے! اب کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی (کا اعلان) کرو!“ یعنی آپ ﷺ کی اس دعوت کا نقطہ آغاز تو ”انذار“ ہے مگر دنیا میں اس کا ہدف ”تکبیرِ رب“ ہے۔ پس آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں اس کی بڑائی منوائیں اور اس کی بڑائی کو نافذ کریں۔

**آیت ۱۱ ﴿مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ﴾** ”جو کچھ انہوں نے دیکھا، ان کے دل و دماغ نے اسے جھٹلایا نہیں۔“

یعنی دل میں کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ یہ وہم ہو سکتا ہے یا خواب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، انسان جب کوئی غیر معمولی واقعہ یا انوکھا منظر دیکھتا ہے تو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ”آنجہی پنم بیداریست یا رب یا خواب!“ (اے اللہ! یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ بیداری میں دیکھ رہا ہوں یا خواب میں!) لیکن اس واقعہ کے بارے میں حضور ﷺ کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ آپ کی آنکھوں نے جو دیکھا آپ کے دل نے اسے تسلیم کیا اور اس کی تصدیق کی۔ گویا اس انتہائی غیر معمولی واقعہ کے بارے میں آپ ﷺ کے دل اور آپ کے نگاہوں کے درمیان کوئی تضاد و اختلاف نہیں تھا۔

**آیت ۱۲ ﴿اَفْتَمَرُوْنَهٗ عَلٰی مَا يَوْمٰی﴾** ”تو کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس چیز پر جسے وہ دیکھتا ہے!“ اس بارے میں جو تفصیل محمد ﷺ بیان کر رہے ہیں تم لوگ اس میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن وہ تو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اور وہ تم سے آنکھوں دیکھا واقعہ ہی بیان کر رہے ہیں۔ بقول اقبال : ع ”قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید“ کہ قلندر جو بھی بیان کرتا ہے اپنا مشاہدہ ہی بیان کرتا ہے۔

**آیت ۱۳ ﴿وَلَقَدْ رَاَهُ نَزْلَةً اٰخِرٰی﴾** ”اور انہوں نے تو اس کو ایک مرتبہ اور بھی اترتے دیکھا ہے۔“ یعنی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کو دو مرتبہ اصلی شکل و صورت میں دیکھا ہے۔ دوسری مرتبہ کہاں دیکھا؟

**آیت ۱۴ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی﴾** ”سدرۃ المنتہی کے پاس۔“

یہ ساتویں آسمان پر وہ مقام ہے جس سے آگے کسی مخلوق کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس انتہائی حد کی علامت بیری کا وہ درخت ہے جسے آیت میں ”سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی“ کا نام دیا گیا ہے۔ اس مقام کی کیفیت اور نوعیت ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ معراج کے موقع پر ”سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی“ پر حضرت جبرائیلؑ اپنی اصل ملکوتی شکل میں ظاہر ہوئے اور آگے جانے سے معذرت کر لی۔

**آیت ۱۵ ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاوٰی﴾** ”جنت الماویٰ بھی اس کے پاس ہی ہے۔“ ”جنت الماویٰ“ سب سے اونچے درجے کی جنت ہے جو ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہی کے قریب ہے۔ قیامت کے دن اہل جنت کو جہاں ”نزل“ پیش کیا جائے گا وہ جنت توزمین پر واقع ہوگی۔ اس کے بعد ان میں سے ہر شخص کے اپنے اپنے ایمان و خلوص کی گہرائی اور انفاق جان و مال کے تناسب کے حساب سے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی جائے گی۔ حتیٰ کہ کچھ خوش قسمت لوگ جنت الماویٰ میں پہنچ جائیں گے۔

**آیت ۱۶ ﴿اِذْ يَمْشٰی السِّدْرَةُ مَا يَغْشٰی﴾** ”جبکہ چھائے ہوئے تھا سدرہ پر جو چھائے ہوئے تھا۔“ یعنی تم انسانوں کو کیا بتایا جائے کہ اس بیری کے درخت کی اس وقت کیا کیفیت تھی۔ تم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے ہو۔ وہ انوار و تجلیات الہیہ کے نزول کی ایسی کیفیت تھی جو نہ تو کسی زبان سے ادا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے الفاظ اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔

**آیت ۱۷ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی﴾** ”(اُس وقت محمد ﷺ کی) آنکھ نہ تو کج ہوئی اور نہ ہی حد سے بڑھی۔“

یہاں پر دونوں انتہائی کیفیات کی نفی کر دی گئی۔ انسان کی فطری اور طبعی کمزوری ہے کہ اگر اسے اچانک بہت تیز روشنی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ نظروں کو اس سے پھیرنے اور ہٹانے کی کوشش کرتا ہے یا پلک جھپک لیتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں بتایا گیا کہ حضور ﷺ نے انوار و تجلیاتِ الہیہ کا کھلی آنکھوں سے براہِ راست مشاہدہ کیا اور نگاہ جما کر دیکھا۔ لیکن اس مشاہدے میں حد ادب سے تجاوز بھی نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو اکثر و بیشتر لوگ سمجھ نہیں سکے۔ جبکہ میں نے اس کے مفہوم کو علامہ اقبال کے اس شعر کی مدد سے سمجھا ہے:-

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا گر چہ بہانہ مجور ہی میری نگاہ بے ادب!  
یہ بال جبریل کی نظم ”ذوق و شوق“ کا شعر ہے۔ یہ نظم بلاشبہ علامہ اقبال کی شاعرانہ استعداد کی معراج ہے، اگرچہ امت مسلمہ کے لیے پیغام کے اعتبار سے ان کی آخری عمر (۱۹۳۶ء) کی نظم ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ نقطہٴ عروج کا درجہ رکھتی ہے۔ اس شعر میں علامہ کہتے ہیں کہ میں وصال کے دوران ادب کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محبوب کے حسن کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا مگر نظریں جما کر براہِ راست دیکھنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ یہاں اقبال اپنی نظری ”بے ادبی“ کو خود تسلیم کر رہے ہیں اور حد ادب سے تجاوز کرنے کی شدید خواہش کا بھی اعتراف کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ اپنی معذوری کا بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ ایسا کرنے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ گویا صرف وہ حوصلے کے فقدان کی وجہ سے ”بے ادبی“ کے ارتکاب سے بچے رہے۔ اب اس شعر میں پیش کیے گئے تصور کی روشنی میں غور کریں تو آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے عمل اور حوصلے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ان انوار و تجلیات کو براہِ راست دیکھا اور جم کر مشاہدہ کیا۔ لیکن دوسری طرف آپ کے ضبط اور ”ادب“ کا کمال یہ تھا کہ ”حوصلہ“ ہوتے ہوئے بھی آپ کی طرف سے ایک خاص حد سے سرمو تجاوز نہ ہوا۔

**آیت ۱۸ ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾** ”انہوں نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات کو دیکھا۔“  
معراج کے موقع پر حضور ﷺ کے مشاہدے سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی دو آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ صحابہ کا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا، جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ آپ نے اللہ کو نہیں دیکھا بلکہ انوارِ الہیہ کا مشاہدہ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اس بات کے قائل تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو یہاں تک فرمایا کرتی تھیں کہ ”جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افترا کرتا ہے“۔ صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن شقیق کی دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ”ہَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ؟“ ”کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟“ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”(نُورٌ أَنَّىٰ أَرَاهُ؟)“ ”ایک نور تھا“ میں اسے کیسے دیکھتا؟“ دوسری روایت میں حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب آپ ﷺ نے یہ دیا کہ ”(رَأَيْتُ نُورًا)“ ”میں نے ایک نور دیکھا تھا“۔ علامہ ابن قیمؒ نے ”زاد المعاد“ میں رسول اللہ ﷺ کے پہلے ارشاد کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”میرے اور رویت باری تعالیٰ کے درمیان نور حائل تھا“۔ جبکہ دوسرے ارشاد کا مطلب وہ یہ بیان کرتے

ہیں کہ ”میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نور دیکھا“۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب روایات میں روایت باری تعالیٰ کا اثبات ملتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ اس حوالے سے یہ واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کی عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ یہ آیت اول الذکر کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کیا نہ کہ خود اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں سفر معراج کے پہلے حصے (مسجد حرام تا مسجد اقصیٰ) کا ذکر ہوا، وہاں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے بندے کو اس لیے لے گئے تھے ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ أَيْنَأَ﴾ ”تاکہ اُس کو اپنی نشانیاں دکھائیں“۔ لیکن وہاں ”زمینی آیات“ کے مشاہدے کی بات ہوئی ہے جبکہ ان آیات میں سفر معراج کے دوسرے مرحلے کے دوران سدرۃ المنتہی کے مقام کی آیات و تجلیات کے مشاہدے کا ذکر ہے۔ یہ مقام کسی مخلوق کی رسائی کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے ”حریم ذات“ ہے جہاں کسی غیر کا کوئی دخل ممکن نہیں۔ اس مقام خاص اور اس آخری حد پر لے جا کر حضور ﷺ کو خاص الخاص آیات الہیہ کا مشاہدہ کرایا گیا جنہیں آیت زیر مطالعہ میں ”آیات الکبریٰ“ کہا گیا ہے۔

### آیات ۱۹ تا ۳۲

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّتَّ وَالْعُزَّىٰ ۖ وَمَنْوَةَ الثَّالِثَةِ الْآخِرَىٰ ۖ أَلَمْ يَذْكُرُوا لَهُ الْأُنثَىٰ ۖ تِلْكَ إِذًا قِسْبَةٌ ضِيزَىٰ ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمْ الْهُدَىٰ ۖ أَمَرَ لِلنَّاسِ مَا تَنَبَّىٰ ۖ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ۖ وَكَمْ مِنْ مَلَكَ فِي السَّمَوَاتِ لَا يُغْنِي شِفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ۖ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْتَوُونَ عِنْدَ الْمَلِكَةِ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ۖ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۖ فَأَعْرِضْ عَنْ تَوَلَّيَ ۖ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۖ ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۖ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ اهْتَدَىٰ ۖ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَىٰ ۖ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۖ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ ۖ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ۖ

آیت ۱۹ ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّتَّ وَالْعُزَّىٰ﴾ ”تو کیا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کے بارے میں غور کیا ہے؟“

اب یہاں سے مکی سورتوں کے عمومی مضامین کا آغاز ہو رہا ہے۔

**آیت ۲۰ ﴿وَمَنْعَةُ النَّالَةِ الْاُخْرٰی﴾** ﴿۲۰﴾ ”اور جو تیسری ایک اور (دیوی) منات ہے؟“

یعنی کبھی تم لوگوں نے اپنی ان تین دیویوں کی حقیقت کے بارے میں بھی سوچا ہے؟

**آیت ۲۱ ﴿اَلَكُمُ الدَّكْرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی﴾** ﴿۲۱﴾ ”کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اُس کے لیے بیٹیاں؟“

تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو تم نے الاٹ بھی کی ہیں تو بیٹیاں!

**آیت ۲۲ ﴿تَلْكَ اِذَا قِسْمَةٌ ضِیْرٰی﴾** ﴿۲۲﴾ ”یہ تو بہت بھونڈی تقسیم ہے!“

**آیت ۲۳ ﴿اِنْ هٰی اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ﴾** ”یہ کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کچھ

نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے“

﴿مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ ”اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔“

﴿اِنْ یَّبْعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوٰی الْاَنْفُسُ﴾ ”یہ لوگ نہیں پیروی کر رہے مگر ظن و تخمین کی اور

اپنی خواہشاتِ نفس کی۔“

یعنی ان لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور wishful thinkings کو عقائد کی شکل دے دی ہے

اور کچھ فرضی نام رکھ کر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدٰی﴾ ﴿۲۴﴾ ”جب کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے

الہدیٰ آچکا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب بھی نازل کی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی بھیجا ہے۔

**آیت ۲۴ ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمْتَنٰی﴾** ﴿۲۴﴾ ”کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ آرزو کرتا ہے؟“

**آیت ۲۵ ﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰی﴾** ﴿۲۵﴾ ”پس آخرت اور دنیا سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

یعنی دنیا اور آخرت سے متعلق اختیار مطلق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

**آیت ۲۶ ﴿وَاَنْتُمْ مِنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا﴾** ”اور کتنے ہی فرشتے ہیں

آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آئے گی“

﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرِضٰی﴾ ﴿۲۷﴾ ”مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کے لیے

چاہے اجازت بخشے اور (سفارش) پسند کرے۔“

آسمانوں کے فرشتے اہل ایمان کے لیے تو دعا کرتے ہیں: ﴿یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (المومن: ۷)

کہ پروردگار! تو اہل ایمان کی مغفرت فرما دے۔ لیکن ان مشرکین کے لیے نہ کوئی دعا کرے گا اور نہ ہی شفاعت۔

**آیت ۲۷ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیَسْمُوْنَ الْمَلِٰکَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی﴾** ﴿۲۸﴾ ”یہ لوگ جو

آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہوں نے فرشتوں کے مؤنث نام رکھ دیے ہیں۔“



اور پھر اپنے خیال کے مطابق ان ہی ناموں پر انہوں نے اپنے لیے دیویاں گھڑ لی ہیں۔  
**آیت ۲۸** ﴿وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾ ”اور ان کے پاس اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ نہیں پیروی کر رہے مگر صرف گمان کی۔“

یعنی فرشتوں کے مؤنث نام رکھنے اور پھر ان ناموں کے مطابق دیویاں بنا کر ان کی پوجا کرنے کے بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی اللہ کی اتاری ہوئی کسی کتاب سے کوئی سند۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ لوگ محض اپنے ظن و تخمین اور وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔  
**﴿وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾** ”اور ظن تو حق سے کچھ بھی مستغنی نہیں کر سکتا۔“

یعنی گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں ہو سکتا اور وہ حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا — حق یا تو وہ الہامی علم (revealed knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا ہے یا پھر انسان کا وہ اکتسابی علم (acquired knowledge) جو وہ اپنے حواس سے حاصل ہونے والی ٹھوس معلومات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر حاصل کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: **أَلْعِلْمُ عِلْمَانِ، عِلْمُ الْأَذْيَانِ وَعِلْمُ الْأَبْدَانِ**۔ (اس موضوع پر مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کی تشریح)۔ اس کے علاوہ جن علوم کی بنیاد ظن و تخمین پر ہے، حق کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

**آیت ۲۹** ﴿فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ ”(تو اے نبی ﷺ) آپ اعراض کر لیجیے ہر اُس شخص سے جس نے روگردانی کی ہے ہمارے ذکر سے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے۔“

آپ ﷺ ہر ایسے شخص کو نظر انداز کر دیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں جو صرف اور صرف دنیا کا طالب ہے اور اپنے اُس مطلوب کی دھن میں اس نے ہماری یاد سے پیٹھ موڑ لی ہے۔ ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے جس کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل کی ان آیات میں کر دی گئی ہے:

**﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنْ أَتَىٰ نَفْسًا لِّمَنِ تُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَنُوعًا مَّدْحُورًا﴾** (۱۸)  
**﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيًا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يُلَاقِهَا سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾** (۱۹)

”جو کوئی عاجلہ (دنیا) کا طلب گار بنتا ہے، ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں سے جو کچھ ہم چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں، پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم۔ وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ دھتکارا ہوا۔ اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو، اور اس کے لیے اس کے شایان شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔“

**آیت ۳۰** ﴿ذَٰلِكَ مِمَّا لَبِثُهُمْ مِنْ الْعِلْمِ﴾ ”یہ ہے ان کے علم کی رسائی کی حد۔“

ان کے علم کی رسائی بس دنیا تک ہی ہے اور وہ اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ علم آخرت ان کے چھوٹے اور

محدود ذہنوں کی پہنچ میں ہے ہی نہیں۔ حالانکہ انسان کا ذہنی ظرف ذرا بھی وسیع ہو تو وہ اپنے غور و فکر سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اس کی زندگی اتنی بے وقعت نہیں ہو سکتی کہ اسے ”چار دن“ کی زندگی کا عنوان دے کر فضول خواہشات کی نذر کر دیا جائے۔ بقول بہادر شاہ ظفر:-

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!  
بہر حال یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف ہے کہ انسان جیسی اشرف المخلوقات اور موجود ملائکہ ہستی کی زندگی محض تیس چالیس یا پچاس برس کے دور ایسے تک ہی محدود ہو۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کا فلسفہ بہت بصیرت افروز اور ذہنی برحقیت ہے۔ علامہ کے نزدیک انسانی زندگی وقت کے ایسے جادو دانی تسلسل کا نام ہے جسے پیمانہ امروز و فردا سے ناپنا ممکن ہی نہیں:-

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ جاو داں، پیہم دواں ہر دم جو اں ہے زندگی!  
﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ﴾ ”یقیناً آپ (ﷺ) کا رب خوب جانتا ہے ان کو بھی جو اُس کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو ہدایت پر ہیں۔“

**آیت ۳۱** ﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ”اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے“

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔  
﴿وَيَجْزِي الَّذِينَ اَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا﴾ ”تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جنہوں نے برائیاں کرائی ہیں ان کے اعمال کا“

﴿وَيَجْزِي الَّذِينَ اَحْسَنُوا بِالْحُسْنٰی﴾ ”اور بدلہ دے ان کو جنہوں نے نیک کام کیے ہیں اچھا۔“  
**آیت ۳۲** ﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَثِيرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّعْمَ﴾ ”وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں سوائے کچھ آلودگی کے۔“

یہاں پر لَعْم سے مراد صغائر ہیں<sup>(۱)</sup>۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النساء آیت ۳۱ اور سورۃ الشوریٰ آیت ۳۷ میں بھی آچکا ہے اور اب یہاں تیسری مرتبہ آیا ہے۔ مذکورہ آیات کے ضمن میں اس مضمون کے مختلف عربی میں ”لَعْم“ کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار یا اس کے خفیف سے اثر یا اُس کے محض قرب یا اُس کے ذرا سی دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے ”لَعْم“ کی تفسیر میں کئی قول نقل کیے ہیں۔ بعض کے نزدیک گناہ کے جو خیالات دل میں آئیں مگر ان پر عمل نہ کیا جائے وہ ”لَعْم“ ہیں۔ بعض نے صغیرہ گناہ مراد لیے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آدمی جس گناہ پر اصرار نہ کرے یا اسے اپنی عادت نہ بنالے یا جس گناہ سے توبہ کر لے وہ مراد ہیں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے۔ (حاشیہ از مرتب)

پہلوؤں کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہوا جائے اور دوسروں سے درگزر سے بھی کام لیا جائے۔

یہاں اس حوالے سے میں آپ کی توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی دلیل کے ساتھ ایک دو کبار کو اپنے لیے ”جائز“ قرار دے لیتا ہے (إلا ما شاء اللہ)۔ فیکٹری کا مالک کہتا ہے کہ کیا کریں جی! سود کے بغیر تو ہمارے ملک میں کاروبار کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اب مجبوری ہے کیا کریں! فیکٹری بند کر کے تو نہیں بیٹھ سکتے نا۔ سرکاری ملازم کہتا ہے کہ سکولوں کی فیسیں گھر کا کرایہ، یوٹیلٹی بلز کہاں سے ادا کروں؟ تنخواہ میں تو کسی طرح بھی گزارا ممکن نہیں۔ اب اگر رشوت نہیں لیں گے تو ظاہر ہے بھوکوں مریں گے! غرض ہر شخص نے اپنے ضمیر کے سامنے اپنی مجبوری کا رونا رو کر کبار میں سے کم از کم ایک گناہ کو اپنا لیا ہے اور ضمیر کی تسلی کے لیے اپنی تمام تر ترجیحات صفائے ”پرہیز“ کی طرف منتقل کر دی ہیں۔ اس حوالے سے یہ لوگ صفائے متعلق مسائل بھی دریافت کرتے ہیں، پھر ان مسائل پر بحثیں بھی ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں دوسروں پر اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑوں کی وجہ سے ”من دیکرم تو دیکری“ (میں اور ہوں تم اور ہو) کے فتوے بھی صادر کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی بھی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا (إلا ما شاء اللہ!) کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ میں اس چند روزہ زندگی کی آسانوں اور عیاشیوں کے بدلے اصل زندگی کو تو قربان نہ کروں۔ اگر ایک کام سے جائز طور پر گزارا نہیں ہوتا تو کوئی دوسرا کام کر لوں یا اپنی ضروریات کو سکینڈ کر کم وسائل کے ساتھ زندگی بسر کر لوں، مگر حرام تو نہ کھاؤں!

﴿إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ﴾ ”یقیناً آپ کا رب بہت ہی وسیع مغفرت والا ہے۔“

اُس کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔ اہل ایمان بندے اگر کبار و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں تو وہ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر گرفت نہیں کرے گا اور اپنی رحمت بے پایاں کی وجہ سے ان کو معاف فرما دے گا۔ ﴿هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَتُمْ لِي بِطُؤِنِ أُمَمَلِكُمْ﴾ ”وہ تمہیں خوب جانتا ہے جبکہ اُس نے تمہیں زمین سے اٹھایا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔“

﴿فَلَا تَرْكُؤْا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى﴾ ”تو تم خود کو بہت پاکباز نہ ٹھہراؤ۔ وہ اسے

خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔“

یعنی اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کر دو وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعتاً متقی کون ہے۔ دراصل اپنی پرہیزگاری کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت اس شخص کو ہی محسوس ہوتی ہے جس کا دل ”تھوٹھا چنبا بے گھنا“ کے مصداق تقویٰ سے خالی ہو۔ جہاں تقویٰ کی روح کو نظر انداز کیا جا رہا ہوگا وہاں سارا زور تقویٰ کے مظاہر پر ہوگا۔ اندر سے حرام خوری جاری ہوگی اور اس کو چھپانے کے لیے اوپر سے چھوٹی چھوٹی دینی علامات کو اپنا کر تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہوگا۔

## آیات ۳۳ تا ۶۲

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۖ وَاعْطَى قَلِيلًا وَكَذَّبَى ۚ أَعِنْدَهُ عَلَمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَى ۚ أَمْ لَمْ يَنْتَبِهْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَى ۚ وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى ۚ أَلَا تَذَرُوهُ وَارْتَدَّ وَزُرَّ ۚ أُخْرَى ۚ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ۚ وَأَنْ سَعِيَهُ سَوْفَ يَرَى ۚ ثُمَّ يُخْرَجُهُ الْخَزَاءُ الْأَوَّلَى ۚ وَأَنْ إِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهَى ۚ وَأَنْهُ هُوَ أَضْحَكَكَ وَأَبْكَى ۚ وَأَنْهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ۚ وَأَنْهُ خَلَقَ الذُّرُوجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى ۚ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَى ۚ وَأَنْ عَلَيْهِ الشَّكَاةُ الْأُخْرَى ۚ وَأَنْهُ هُوَ أَغْنَى وَأَقْنَى ۚ وَأَنْهُ هَوَّ رَبُّ الشَّعْرَى ۚ وَأَنْهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَى ۚ وَكُودًا فَمَا أَبْقَى ۚ وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطَى ۚ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى ۚ فَغَشَّيَهَا مَا غَشَّى ۚ فِئَايَ الْأَعْرَابِ تَتَّبَعِيَ ۚ هَذَا نَذِيرٌ مِنَ النَّذِيرِ الْأُولَى ۚ أَرَفَتِ الْأَرْفَةَ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ۚ أَفَيْنَ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ۚ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَتَّبَعُونَ ۚ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ۚ

آیت ۳۳ ﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى﴾ ”پھر (اے نبی ﷺ) کیا آپ نے اُس شخص کو بھی دیکھا جس نے پیٹھ موڑ لی؟“

آیت ۳۴ ﴿وَاعْطَى قَلِيلًا وَكَذَّبَى﴾ ”تھوڑا سا دیا اور پھر سخت ہو گیا۔“  
عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں ولید بن مغیرہ کا تذکرہ ہے۔ مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ تاریخ میں اس شخص کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا مگر پھر اچانک اسے اپنی چودھراہٹ یاد آگئی۔ حق جوئی کی خواہش پر عصبیت کا جذبہ غالب آ گیا اور یوں اس نے اپنی سوچ دوبارہ بدل لی۔ یہاں اس کے اسی رویے کا ذکر ہے۔ سورۃ المدثر میں اس شخص کا تذکرہ قدرے تفصیل سے آیا ہے۔

آیت ۳۵ ﴿أَعِنْدَهُ عَلَمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَى﴾ ”کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے!“  
آیت ۳۶ ﴿أَمْ لَمْ يَنْتَبِهْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَى﴾ ”کیا اسے خبر نہیں پہنچی اس بارے میں جو کچھ موسیٰ کے صحیفوں میں تھا؟“

آیت ۳۷ ﴿وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ ”اور ابراہیم (کے صحیفوں میں تھا) جس نے وفا کی انتہا کر دی!“  
صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ کا ذکر سورۃ الاعلیٰ میں بھی آیا ہے: ﴿إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى﴾

صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ۝۱۹﴾ ”یہی بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے“ (یعنی) ابراہیمؑ اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ ”صحف موسیٰ تو عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں، البتہ صحف ابراہیمؑ کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں۔ اس حوالے سے میرا گمان ہے (واللہ اعلم) کہ ہندوؤں کے اُنشد صحف ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیل سورہ طہ کی آیت ۹۸ کے تحت ملاحظہ ہو۔) حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں سے جس بات کا یہاں حوالہ دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے:

**آیت ۳۸ ﴿لَا تَوَدُّ وَاِزْرَةً وِزْرًا خُورٰی ۝۳۸﴾** ”کہ نہیں اٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے بوجھ کو۔“

قیامت کے دن ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کے لیے خود جواب دہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کی مدد کو نہیں آئے گا جیسا کہ سورہ مریم کی اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے: ﴿وَكَلَّمَهُمۡ اٰتِيهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَرْدًا ۝۵۱﴾ کہ اُس دن ہر شخص اکیلا حاضر ہوگا۔ ماں باپ، اولاد، عزیز و اقارب میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔

**آیت ۳۹ ﴿وَاَنْ لِّئِْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝۳۹﴾** ”اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کی اُس نے سعی کی ہوگی۔“

انسان کو جو کچھ کرنا ہوگا اپنی محنت اور کوشش کے بل پر کرنا ہوگا، خواہ مشوں اور تنہاؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ قبل ازیں آیت ۲۴ میں سوال کیا گیا تھا کہ ”کیا انسان کو وہی کچھ مل جائے گا جس کی وہ تنہا کرے گا؟“ یہ آیت گویا مذکورہ سوال کا جواب ہے۔

**آیت ۴۰ ﴿وَاَنْ سَعِيْءٌ سَوَفۡ يُّرٰی ۝۴۰﴾** ”اور یہ کہ اُس کی سعی عنقریب اسے دکھا دی جائے گی۔“

سورۃ الزلزال میں اس مضمون کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ﴿اَقَمَنۡ يَّعْمَلۡ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّوۡمَ ۝۶ وَمَنۡ يَّعْمَلۡ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرۡۤا ۝۷﴾ ”تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔“

**آیت ۴۱ ﴿ثُمَّ يُعْزِلُہُ الْجَزَآءُ الْاَوَّلٰی ۝۴۱﴾** ”پھر اُس کو بدلہ دیا جائے گا پورا پورا بدلہ۔“

**آیت ۴۲ ﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی ۝۴۲﴾** ”اور یہ کہ بالآخر پہنچنا تمہارے رب ہی کی طرف ہے۔“

**آیت ۴۳ ﴿وَاِنَّہٗ هُوَ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی ۝۴۳﴾** ”اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔“

یعنی اچھے برے حالات، خوشی، غم، تکلیف، بیماری سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

**آیت ۴۴ ﴿وَاِنَّہٗ هُوَ اَمَاتٌ وَّاَحْیَا ۝۴۴﴾** ”اور یہ کہ وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی رکھتا ہے۔“

**آیت ۴۵ ﴿وَاِنَّہٗ خَلَقَ الرُّوْحَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنثٰی ۝۴۵﴾** ”اور یہ کہ وہی ہے جس نے پیدا کی ہیں جوڑے نر اور مادہ کے، ایک ہی بوند سے جبکہ وہ ٹپکائی جاتی ہے۔“

**آیت ۴۷ ﴿وَاَنَّ عَلَیْہِ النَّشَاۃُ الْاٰخِرٰی ۝۴۷﴾** ”اور یہ کہ اُسی کے ذمے ہے دوبارہ اٹھانا۔“

یہاں یہ نکتہ بہت اہم اور لائق توجہ ہے کہ انسانوں کو دوبارہ اٹھانا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ گویا انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کا احتساب کرنا اللہ کے انصاف کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ انسانوں کو دوبارہ نہیں اٹھاتا اور ان کو ان کے اچھے برے اعمال کا بدلہ نہیں دیتا تو نیکو کار لوگوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی بھی آزمائشوں اور مصیبتوں میں گزاری۔ ساری زندگی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے، حرام خوریوں سے بچنے کے لیے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ اگر انہیں ان کی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟

**آیت ۲۸ ﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ﴾** ”اور یہ کہ اُسی نے دولت دی اور اسی نے خزانہ دیا۔“  
 اَقْنَىٰ چونکہ باب افعال سے ہے، جس کی خصوصیات میں ”سلب ماخذ“ بھی ہے، چنانچہ اس کا ترجمہ اَقْفَر بھی کیا گیا ہے۔ یعنی اُس نے کسی کو غنی اور کسی کو فقیر بنا دیا۔

**آیت ۲۹ ﴿وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشَّعْرَىٰ﴾** ”اور یہ کہ وہی شَعْرَىٰ کا بھی رب ہے۔“  
 الشَّعْرَىٰ وہ ستارہ تھا جس کی مختلف اقوام میں پوجا کی جاتی تھی۔ یہ ستارہ اس حیثیت سے اہل عرب کے ہاں بھی معروف تھا۔ اس لیے انہیں بتایا گیا کہ جسے تم لوگ الہ مانتے ہو اس کا رب بھی اللہ ہی ہے۔ تمہاری قسمت کے فیصلے یہ ستارہ نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

**آیت ۵۰ ﴿وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ﴾** ”اور یہ کہ اُسی نے ہلاک کیا تھا عَادِیۃِ اولیٰ کو۔“  
 ”عَادِیۃِ اولیٰ“ سے مراد قدیم قوم عَاد ہے، جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ یہ قوم آخاف کے علاقے میں آباد ہوئی۔ اس قوم پر جب عذاب بھیجے کا فیصلہ ہوا تو حضرت ہود اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے ہمراہ اس علاقے سے ہجرت کر گئے۔ ان لوگوں کی نسل سے جو قوم وجود میں آئی وہ ”ثمود“ کہلائی۔ لیکن وہ لوگ چونکہ قوم عَاد ہی کی نسل سے تھے اس لیے انہیں ”عَادِیۃِ ثانیہ“ بھی کہا جاتا ہے۔

**آیت ۵۱ ﴿وَتَمُودًا فَمَا أَبْقَىٰ﴾** ”اور ثمود کو بھی پس کسی کو باقی نہ چھوڑا۔“

**آیت ۵۲ ﴿وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ﴾** ”اور قوم نُوح کو بھی (ہلاک کیا) ان سے پہلے۔“  
 ﴿إِنَّهُمْ كَانُوا أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ﴾ ”یقیناً وہ تو ان سے بڑھ کر ظالم اور ان سے بڑھ کر سرکش تھے۔“

**آیت ۵۳ ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ﴾** ”اور (اُسی نے) اُلٹی ہوئی بستیوں کو شخ دیا۔“

اس سے سدوم اور عامورہ یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں مراد ہیں۔

**آیت ۵۴ ﴿فَغَشَّيْهَا مَا غَشَّىٰ﴾** ”اور پھر اس کو ڈھانپ لیا جس چیز نے ڈھانپ لیا۔“

پہلے شدید زلزلے نے ان آبادیوں کو تپکٹ کیا اور اس کے بعد ان پر کنکروں کی بارش ہوئی۔ یہاں اس آیت میں اس بارش کی طرف اشارہ ہے یعنی کنکروں کی بارش نے اس علاقے کو ڈھانپ لیا۔

**آیت ۵۵ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ﴾** ”تو تم اپنے رب کی کون کون سی قدرتوں کے بارے میں

شک کرو گے؟“

آیت ۵۶ ﴿هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذْرِ الْأُولَىٰ﴾ ”یہ (محمد ﷺ) ایک خبردار کرنے والے ہیں پہلے خبردار کرنے والوں (کے زمرے) میں سے۔“

نذیر کے معنی ہیں: ڈرانے والا آگاہ کرنے والا خبردار (warn) کرنے والا اور النذرا سی کی جمع ہے۔

آیت ۵۷ ﴿إِزِفَتْ الْأَرْفَةُ﴾ ”قریب آچکی ہے وہ آنے والی۔“

آیت ۵۸ ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ﴾ ”نہیں ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا۔“

قیامت برپا کرنے کا اختیار صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ گویا اس وقت قیامت کسی کشتی کی طرح ”لنگر انداز“ ہے اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کا لنگر اٹھا کر اسے برپا کر دے گا۔ پھر یہ کہ اس کے وقوع کا علم بھی اللہ ہی کے پاس ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کھول کر نہیں بتا سکتا کہ قیامت کب آئے گی۔ اور جب وہ وقت معین آ جائے گا تو اللہ کے سوا کوئی اس کو ٹالنے اور دور کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

آیت ۵۹ ﴿أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ﴾ ”تو کیا تم لوگوں کو اس کلام کے بارے میں تعجب ہو رہا ہے؟“

هَذَا الْحَدِيثِ سے مراد یہاں قرآن مجید ہے، یعنی کیا تم لوگ قرآن کے بارے میں تعجب کر رہے ہو؟

آیت ۶۰ ﴿وَتَضَحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ﴾ ”اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو!“

آیت ۶۱ ﴿وَأَنْتُمْ سَمِدُونَ﴾ ”اور تم خوش فعلیاں کر رہے ہو!“

آیت ۶۲ ﴿فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا﴾ ”پس سجدہ کرو اللہ کے لیے اور اسی کی بندگی کرو!“

روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے پہلی مرتبہ یہ سورت حرم کعبہ میں قریش کے ایک بڑے مجمع کے سامنے تلاوت فرمائی تھی۔ اس مجمع میں اہل ایمان بھی تھے اور مشرکین کے خواص و عوام بھی۔ اس کلام کی شدت تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ﷺ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کی ہمت نہ ہوئی اور حضور ﷺ نے جب یہ آخری آیت تلاوت فرمانے کے بعد سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلم و کافر سبھی سجدہ میں گر گئے۔ بعد میں مشرکین کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ آخر کار انہوں نے اپنے سجدے کے جواز میں یہ بات بتائی کہ ہم نے تو لات عزریٰ اور منات کے ذکر (آیت ۱۱۹ اور ۲۰) کے بعد محمد ﷺ کی زبان سے یہ کلمات بھی سنے تھے: تِلْكَ الْغُرَانِقَةُ الْعُلَىٰ، وَانْشَفَاعَتْهُمْ لُشْرَجَىٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے)۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کلمات سننے کے بعد ہم نے سمجھا کہ محمد ﷺ نے ہماری دیویوں کو بھی تسلیم کر لیا ہے، لہذا اب ان کے ساتھ ہمارا جھگڑا ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس پوری سورت کے سیاق و سباق میں ان فقرہ کی کوئی جگہ ممکن ہی نہیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے کانوں نے سنے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرکین کے سجدہ میں گر جانے کا واقعہ کلام الہی کی غیر معمولی تاثیر اور خصوصی طور پر اس سورت کے پر جلال اندازِ خطابت کے باعث پیش آیا تھا۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم کلام اللہ کے ادبی جمال اس کی

نصاحت و بلاغت کی لطافتوں اور خطابت کی چاشنی کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے اولین مخاطبین تو اہل زبان تھے۔ پھر نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب معاشرے میں سخن گوئی اور سخن فہمی کا مجموعی ذوق بھی عروج پر تھا۔ وہ لوگ قرآن مجید کے ادبی و لسانی محاسن کو خوب سمجھتے تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء ادباء اور خطباء قرآن مجید کے اعجازِ بیان کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے اچھے کلام کی تاثیر سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ خود حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةً))<sup>(۱)</sup> ”یقیناً بہت سے اشعار حکمت پر مبنی ہوتے ہیں“۔ نیز فرمایا: ((إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لِسِحْرًا))<sup>(۲)</sup> ”یقیناً بہت سے خطبات جادو کی سی تاثیر رکھتے ہیں“۔ زورِ خطابت اور تاثیر کے اعتبار سے اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت ہی لا جواب ہے مگر سورۃ النجم اس حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے تناظر میں مذکورہ واقعہ کی توجیہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے اس سورت کی تلاوت شروع کی تو تمام حاضرینِ مجمع دم بخود ہو کر سننے میں محو ہو گئے۔ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ ان کی رگوں کی گہرائیوں تک اترتا گیا۔ خصوصاً مشرکین کی کیفیت تو ایسی تھی کہ تلاوت کے اختتام تک وہ گویا مبہوت ہو چکے تھے۔ چنانچہ اختتامِ تلاوت پر جب حضور ﷺ اور مجمع میں موجود اہل ایمان سجدہ میں گئے تو ﴿فَاسْجُدُوا لِلَّهِ﴾ کے حکم کی تاثیر، ہیبت اور جلالت کی تاب نہ لاتے ہوئے سب کے سب مشرکین بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ گویا وہ اسی طرح سجدے میں گرا دیے گئے (واللہ اعلم!) جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے ہوئے جادوگر سجدوں میں گرا دیے گئے تھے: ﴿وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَلْجِدِينَ﴾ (الاعراف)۔ واضح رہے کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں فعل مجہول (أُلْقِيَ) استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسے لگا جیسے انہیں کسی نے پکڑ کر سجدے میں گرا دیا ہو۔



(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ما يحوز من الشعر والرجز والحداء ..... و سنن الترمذی، ابواب

الادب، باب ما جاء ان من الشعر حكمة۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب ان من البيان سحراً۔ و صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف

الصلاة والحدیث۔



# سُورَةُ الْقَمَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۸ تا

اِقْرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۚ وَانْ يَرَوْا آيَةً يُعَرِّضُوا وَيَقُولُوا سَحَابٌ مُسْتَهْمَرٌ ۚ وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۚ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ التَّذَرُّۥ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نَّكَرٍ ۚ خُشَعَا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ ۚ مَهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۚ

**آیت ۱** ﴿اِقْرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ ① ”قیامت کی گھڑی قریب آچکی اور چاند شک ہو گیا۔“ جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سب سے قطعی اور یقینی نشانی حضور ﷺ کی بعثت ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) ② ”مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح (جڑا ہوا) بھیجا گیا ہے۔“ اس لحاظ سے اِقْرَبَتِ السَّاعَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ اب جبکہ آخری رسول بھی دنیا میں آچکے ہیں تو سمجھ لو کہ قیامت کا وقت بہت قریب آگیا ہے۔ سورۃ السجدہ کی آیت ۵ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے وصال کو ابھی صرف ڈیڑھ دن ہی ہوا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب قیامت بالکل سامنے ہے۔ حضرت اسرافیلؑ اپنے منہ کے ساتھ صور لگائے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارے کی دیر ہے۔ جو نبی اشارہ ہو گا وہ صور میں پھونک مار دیں گے۔ قرب قیامت کے اس مفہوم کو سورۃ المعارج میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۖ وَنَرَاهُ قَرِيبًا﴾ ③ ”یہ لوگ تو قیامت کو بہت دُور سمجھ رہے ہیں جبکہ ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔“

آیت میں چاند کے پھٹنے کا ذکر ایک خرقِ عادت واقعہ کے طور پر ہوا ہے۔ روایات کے مطابق اس وقت حضور ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی۔ آپ کے ارد گرد ہر طرح کے لوگ تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ کی طرف سے کوئی نشانی ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چاند کی طرف دیکھو۔ لوگوں کو متوجہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ بعثت أنا و الساعۃ کہاتین۔ ح: ۶۵۰۴ و ۶۵۰۵۔

و صحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، باب قرب الساعۃ، ح: ۸۶۷ و ۲۹۵۱۔

کر کے آپ ﷺ نے انگلی کا اشارہ کیا اور چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں ٹکڑے قریب آ کر دوبارہ جڑ گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو! کفار نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہم پر جادو کر دیا تھا، اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکہ کھایا۔ بعد میں باہر سے آنے والے لوگوں نے بھی اس کی شہادت دی۔ میرے نزدیک یہ معجزہ نہیں تھا بلکہ ایک ”خرق عادت“ واقعہ تھا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کی جا چکی ہے کہ ہر رسول کو ایک معجزہ دیا گیا جو باقاعدہ دعوے کے ساتھ دکھایا گیا۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ البتہ خرق عادت واقعات حضور ﷺ سے بے شمار نقل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے تو حضور ﷺ کی کرامات تو ہزار گنا بڑی ہوں گی۔

اس واقعہ پر بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر بھی کہ اس سے متعلق دنیا میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ اسی لیے سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے مکتبہ فکر کے لوگوں نے آیت کے متعلقہ الفاظ کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ بہر حال جہاں تک تاریخی ثبوت نہ ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں یہ حقیقت بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ یہ واقعہ رونما ہونے کے وقت آدمی دنیا میں تو دن کی روشنی ہوگی۔ لیکن جن علاقوں میں چاند دیکھا جاسکتا تھا ان علاقوں کے لوگ بھی تو ظاہر ہے اس وقت تکملگی باندھے چاند کو نہیں دیکھ رہے تھے کہ ان میں سے اکثر اس واقعے کے عینی شاہد بن جاتے۔ پھر یہ منظر بھی صرف لمحے بھر کا تھا اور اس دوران چاند کی روشنی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ لوگ چونک کر دیکھتے۔ البتہ ایک تاریخی روایت کے مطابق برصغیر میں مالا بار کے ساحلی علاقے کے ایک ہندو راجہ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بعد میں جب عرب تاجروں کے ذریعے اس تک اسلام کی دعوت اور قرآنی تعلیمات پہنچیں تو اس نے نہ صرف ایک چشم دید گواہ کے طور پر اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ وہ ایمان بھی لے آیا۔ واللہ اعلم!

**آیت ۲** ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝﴾ ”اور اگر وہ دیکھیں گے کوئی نشانی

تب بھی وہ اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔“

**آیت ۳** ﴿وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۝﴾ ”اور انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی“

﴿وَكُلٌّ أُمَمٌ مُّسْتَقِرَّةٌ ۝﴾ ”اور (اللہ کا) ہر امرا یک وقت معین کے لیے قرار پا چکا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اللہ کے طے شدہ وقت سے نہ تو پہلے انجام پاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے مؤخر ہو سکتا ہے۔ انسان کا کام ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے اور نتائج اللہ پر چھوڑ دے۔ جیسے یہ طے شدہ امر ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ دنیا میں ہو کر رہے گا، مگر اللہ کی مشیت میں اس کے لیے کون سا وقت مقرر ہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم اقامت دین کی جدوجہد کو فرض عین اور اپنی اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس میں اپنا تن من وھن لگانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہیں۔ سیرت نبوی سے اس جدوجہد کے منہج کو سمجھیں، اس کے آداب سیکھیں، اس کی شرائط معلوم کریں

اور پورے خلوص نیت کے ساتھ اس کے لیے محنت کریں۔ اس محنت اور جدوجہد کے دوران ہمیں نتائج کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں تو یہ محنت اللہ کی رضا کے لیے کرنی ہے۔ اگر ہماری اس محنت کے نتائج ہماری زندگیوں میں ظاہر نہیں ہوتے تو کوئی پروا نہیں، ہم دین کو غالب کرنے کے مکلف نہیں، ہم تو صرف اس کے لیے جدوجہد کرنے کے مکلف ہیں۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ذمے ہے۔ اگر ہم نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خلوص نیت سے اس راستے میں محنت کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔

اس فلسفہ کو اچھی طرح سے نہ سمجھنے کی وجہ سے اقامت دین کی جدوجہد میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ جب ان کی جدوجہد کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آتے تو وہ عجلت اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے الٹے سیدھے طریقے اپناتے ہیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے تحریکیں غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں اور اس وجہ سے دین الٹا بدنام ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائق توجہ ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے دوران غور و فکر کا روزہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کے بعد اب نہ تو کوئی شخصیت معصوم عن الخطا ہے اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست راہنمائی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اب یہ کام اجتہاد اور غور و فکر سے ہی چلنا ہے اور اجتہاد میں غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ چنانچہ انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانوں سے غلطیاں سرزد ہونے کے امکان کے پیش نظر فیصلوں پر نظر ثانی کی گنجائش بھی رکھنی چاہیے اور اس کے لیے ذہنی طور پر ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔

**آیت ۴** ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۝﴾ ”اور ان کے پاس وہ خبریں آچکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔“

گزشتہ اقوام کے اپنے پیغمبروں کو جھٹلانے اور پھر اس کے نتیجے میں عذاب الہی کے ذریعے تباہ ہو جانے کی خبریں (انباء الرسل) ان لوگوں کو تفصیل سے بتائی جا چکی ہیں۔ ان خبروں میں مشرکین مکہ کے لیے یقیناً کافی تنبیہ و تہدید اور سامان عبرت موجود ہے۔

**آیت ۵** ﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النَّذْرُ ۝﴾ ”کامل و انائی (کی باتیں) لیکن ان خبردار کرنے والوں سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا۔“

**آیت ۶** ﴿فَقَتُلَ عَنْهُمْ ۝﴾ ”(تو) اے نبی ﷺ! آپ ان سے صرف نظر کر لیجیے۔“

﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ تُكْمِرُ ۝﴾ ”جس دن ایک پکارنے والا پکارے گا ایک بہت ناگوار چیز کی طرف۔“

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے، ابتدائی کمی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں حضور ﷺ کو ملتے جلتے الفاظ میں یہ ہدایت بار بار دی گئی ہے کہ آپ صبر کریں، آپ درگزر سے کام لیں، انہیں نظر انداز کر دیں، وغیرہ وغیرہ۔

**آیت ۷** ﴿خُشِعُوا أَبْصَارُهُمْ﴾ ”(اس وقت) ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔“

﴿يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَانَهُمْ جُرَادٌ مُنْتَشِرُونَ﴾ ”یہ اپنی قبروں سے ایسے نکل کر آئیں گے جیسے ٹڈی ذل پھیلا ہوا ہو۔“

ظاہر ہے ہزاروں سال سے انسان اس زمین میں دفن ہو رہے ہیں اور قیامت تک ان کی تعداد کتنی ہو جائے گی، ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری فوت ہونے والے انسان تک سب کے سب زمین سے نکل کر ایک ہی سمت دوڑے چلے جا رہے ہوں گے تو وہ ٹڈی دل کی طرح نظر آئیں گے۔

**آیت ۸** ﴿ثُمَّ طَعْنِ إِلَى الدَّاعِ﴾ ”دوڑتے ہوئے آئیں گے پکارنے والے کی طرف۔“

﴿يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾ ”کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا سخت دن ہے۔“

ہر شخص کو اپنی قبر سے اٹھتے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ کیسا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ﴾ کہ ہر انسان اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ”من آثم کم من دائم!“ چنانچہ کفار و مشرکین اپنی قبروں سے نکلتے ہی روزِ حشر کی سختیوں کے بارے میں چیخ و پکار شروع کر دیں گے۔

## آیات ۹ تا ۱۷

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۖ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ  
فَانْتَصِرْ ۖ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَرٍ ۖ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَاتَّسَعَ الْمَاءُ عَلَى  
أَمْوَاقٍ يُدِيرُ ۖ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ الْأَوَاجِرِ وُدُسٍ ۖ فَتَجَرَّي بِأَعْيُنِنَا ۖ جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرَ ۖ  
وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُّذَكِّرٍ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي ۖ وَلَقَدْ يَسْرُنَا الْقُرْآنُ  
لِلذِّكْرِ ۖ فَهَلْ مِنْ مُّذَكِّرٍ ۖ

**آیت ۹** ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ﴾ ”بھٹلایا تھا ان سے پہلے نوح کی قوم نے“

اب یہاں سے اس سورت میں انباء الرسل کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سورۃ النجم میں ”تذکیر بآلاء اللہ“ (اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کے ذریعے تذکیر) کا انداز تھا، جبکہ اس سورت میں ”تذکیر بایام اللہ“ اور انباء الرسل کا تذکرہ ہے۔ بالکل یہی تقسیم اور یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے مطالعے کے دوران بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الانعام میں آلاء اللہ کے ذریعے تذکیر کی گئی ہے، جبکہ سورۃ الاعراف میں انباء الرسل کا انداز ہے۔ اسی طرح یہ دونوں سورتیں بھی مل کر تذکیر و انداز کے دونوں پہلوؤں

کی تکمیل کرتی ہیں۔

﴿فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝۹﴾ ”تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ تو مجنون ہے اور اسے جھڑک دیا گیا۔“

اس بد بخت قوم نے ہمارے طویل القدر رسول کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک روا رکھا۔  
**آیت ۱۰** ﴿فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ ۝۱۰﴾ ”تو اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں، اب تو اُن سے انتقام لے۔“

رسولوں کی مدد کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے قانون کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝۱۴﴾ ”اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں، کہ ان کی لازماً مدد کی جائے گی۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔“

**آیت ۱۱** ﴿فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱﴾ ”تو ہم نے کھول دیے آسمان کے دروازے اس پانی کے ساتھ جو مسلسل چھا جوں برستار ہا۔“

**آیت ۱۲** ﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا﴾ ”اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشمے ہی چشمے کر دیا۔“  
 اس وقت اس علاقے کی صورت حال یوں تھی کہ آسمان سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین سے جا بجا چشمے اس طرح پھوٹ رہے تھے کہ زمین گویا چشموں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

﴿فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲﴾ ”تو وہ سارا پانی مل گیا ایک ایسے کام کے لیے جس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نافرمان قوم کو غرق کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق آسمان سے برسنے والے اور زمین سے پھوٹنے والے پانی نے مل کر ایک خوفناک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔  
**آیت ۱۳** ﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ الْأَوَّاحِ وَدُسِّرَ ۝۱۳﴾ ”اور ہم نے اُسے سوار کر دیا اس (کشتی) پر جو تختوں اور کیلوں سے بنی تھی۔“

**آیت ۱۴** ﴿تَجَرَّيْ بِأَعْيُنِنَا﴾ ”جو چل رہی تھی ہماری نگاہوں کے سامنے۔“  
 وہ کشتی ہماری نگرانی اور حفاظت میں چل رہی تھی۔

﴿جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرًا ۝۱۴﴾ ”یہ بدلہ تھا اُس شخص کے لیے جس کی نافرمانی کی گئی تھی۔“  
 یوں ہم نے اپنے بندے نوح کی قدر افزائی فرمائی جس کی قوم نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کشتی کے ذریعے ہم نے اسے اور اس کے اہل ایمان ساتھیوں کو سیلاب سے محفوظ رکھا۔

**آیت ۱۵** ﴿وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدْكِرٍ ۝۱۵﴾ ”اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی کے طور پر

تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!“

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مشیت الہی سے محفوظ کر لی گئی اور کسی وقت ایک بہت بڑی نشانی کے طور پر دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح زیر زمین دفن شدہ شہزاد کی جنت ارضی کے بارے میں اب دنیا جان چکی ہے یا بحیرہ مردار کی تہہ میں قوم لوط کے شہروں کے کھنڈرات دریافت کر لیے گئے ہیں۔

**آیت ۱۶ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي﴾** ”تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا!“

**آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾** ”اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے

نصیحت اخذ کرنے کے لیے، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!“

یہ اس سورت کی ترجعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے اور اس میں ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیش نظر پوری سورت میں اس آیت کو چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد ایک بندے پر گویا اتمام حجت ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے استطاعت بھر کوشش شروع کر دے۔ خصوصی طور پر پڑھے لکھے خواتین و حضرات پر تو گویا فرض ہے کہ وہ عربی سیکھیں اور قرآن کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ باقی علوم حاصل کر سکتے ہیں تو قرآن کا علم باقاعدہ حاصل نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس قدر اہم اور بنیادی فرض کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے، مختلف اذکار و وظائف کے ثواب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قرآن کے مطالب و مفاد کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عربی سیکھنے کے حوالے سے ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ آج کوئی بین الاقوامی فورم ایسا نہیں جہاں پر عربی ترجمہ پیش کرنے کا انتظام نہ ہو۔ ہم مسلمانوں کو اپنی البانی کتاب کی زبان کو سیکھنے کے لیے یہودیوں اور ہندوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ قومیں اپنی مردہ زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو زندہ کر سکتی ہیں تو ہم اپنی زندہ زبان کو کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ بہر حال آج نوجوان نسل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

## آیات ۱۸ تا ۳۲

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي ۖ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمٍ  
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۖ تَنْزِعُ النَّاسَ ۖ كَانَتْهُمْ أَعْجَارٌ ۖ نَّحْلٌ مُّنْقَعِرٌ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي  
وَنُذْرِي ۖ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۖ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذْرِ ۖ

فَقَالُوا أَبَشَرًا مِثْلًا وَاحِدًا تَتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۖ ؕ أَلْتَقَى الَّذِ كُرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ ۖ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُّ ۖ إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَبِعْهُمْ وَأَصْطَبِرْ ۖ وَبَيِّنْ لَهُمْ أَنَّ الْبَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ شَرِبٍ مُتَحَضَّرٍ ۖ فَتَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنَذِيرِي ۖ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيِّحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَيْئَةِ الْحُتَّارِ ۖ وَلَقَدْ يَسْرَنَّا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۖ

آیت ۱۸ ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنَذِيرِي﴾ ”جھٹلایا تھا قوم عاد نے بھی تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟“

آیت ۱۹ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا﴾ ”ہم نے ان پر مسلط کر دی ایک توند تیز ہوا“

﴿فَلَمَّا يَوْمَ نَحْشٍ مُّتَمَرٍّ﴾ ”ایک مسلسل نحوست کے دن میں۔“

آیت ۲۰ ﴿تَنَزَّاعُ النَّاسُ ۖ كَانَتْهُمْ أَعْجَازُ نَحْلِ مُنْفَعِرٍ﴾ ”وہ لوگوں کو یوں اکھاڑ بھینکتی تھی جیسے وہ کھجور کے تنے ہوں اکھڑی ہوئی جڑوں والے۔“

طویل القامت ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو کھجور کے تنوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ہوا کے اس عذاب کی وجہ سے وہ مردہ حالت میں زمین پر ایسے پڑے تھے جیسے جڑوں سے اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے پڑے ہوں۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنَذِيرِي﴾ ”تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟“

آیت ۲۲ ﴿وَلَقَدْ يَسْرَنَّا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ﴾ ”اور ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا!“

آیت ۲۳ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ﴾ ”قوم ثمود نے بھی جھٹلایا خبردار کرنے والوں کو۔“

آیت ۲۴ ﴿فَقَالُوا أَبَشَرًا مِثْلًا وَاحِدًا تَتَّبِعُهُ﴾ ”انہوں نے کہا: کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں؟“

﴿إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ﴾ ”پھر تو یقیناً ہم پڑ جائیں گے گمراہی میں اور آگ میں۔“

اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت اور پیروی کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ہی گمراہی میں اور آگ کے تڑھے میں ڈال دیا۔ سُعُر جمع ہے سَعِير کی اور سَعِير کے معنی آگ کے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ گویا حضرت صالح علیہ السلام ہی کے الفاظ میں آپ کو جواب دے رہے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام ان سے کہتے تھے کہ تم لوگ اگر میری بات نہیں مانو گے تو آخرت میں جہنم کی آگ کا ایندھن بنو گے۔ جواب میں

وہ کہتے تھے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ اگر ہم تمہیں اپنا پیشوا مان کر تمہارے پیچھے چل پڑیں تو یہ گمراہی کا راستہ ہوگا اور ہمارے لیے اسی دنیا میں خود کو آگ میں جھونک دینے کے مترادف ہوگا۔

**آیت ۲۵** ﴿ءَالْفَىٰ الذِّكْرُ عَلَيْنَا مِنْ بَيْنِنَا﴾ ”کیا یہ ذکر ہمارے مابین اسی پر القا کیا گیا ہے؟“  
 اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی کے لیے آخر اسی شخص کا انتخاب کیوں کیا؟ اس منصب کے لیے اس کی نظر ہمارے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں پڑی؟  
 ﴿بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ﴾ ”بلکہ یہ انتہائی جھوٹا اور شخی خور ہے۔“

لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور صرف اپنی بڑائی جتانے اور شخی بگھارنے کے لیے اس نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔

**آیت ۲۶** ﴿سَيَعْلَمُونَ غَدًا مِنَ الْكَذَّابِ الْأَشِرِّ﴾ ”جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون انتہائی جھوٹا اور شخی خور ہے!“

**آیت ۲۷** ﴿إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَبِعْهُمْ وَاضْطَبِرْ﴾ ”ہم بھیج دیتے ہیں اونٹنی کو ان کی آزمائش کے لیے، تو آپ انتظار کیجیے ان کے بارے میں اور صبر کیجیے۔“

یہ خطاب حضرت صالح علیہ السلام سے ہے کہ ہم ان کے مطالبے کے مطابق اونٹنی بطور معجزہ ان کے سامنے لا رہے ہیں، جو ان کے لیے بہت بڑی آزمائش بن جائے گی۔ لیکن ابھی چونکہ ان کی مہلت باقی ہے اس لیے آپ صبر کے ساتھ ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔

**آیت ۲۸** ﴿وَيَبَيِّنُهُمُ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شَرْبٍ مُّخْتَصِرٌ﴾ ”اور انہیں بتا دیجیے کہ اب پانی ان کے مابین تقسیم ہوگا، ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر ایک چٹان سے حاملہ اونٹنی پیدا کر دی اور اس کا نام ناقۃ اللہ (اللہ کی اونٹنی) [الاعراف: ۷۳ اور ہود: ۶۴] رکھا۔ وہ اونٹنی جب چشمے پر پانی پینے کے لیے آتی تو اس کی ہیبت سے ان کے تمام مویشی بدک کر بھاگ جاتے تھے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے ہوا کہ ایک دن اونٹنی پانی پئے گی اور دوسرے دن ان کے مال مویشی پانی پینے کے لیے آئیں گے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے دن چشمے پر آتی تو چشمے کا سارا پانی پی جاتی۔

**آیت ۲۹** ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ﴾ ”تو انہوں نے پکارا اپنے ایک ساتھی کو، پس اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی گونچیں کاٹ دیں۔“

انہوں نے اس اونٹنی سے جان چھڑانے کے لیے اپنی قوم کے ایک ایسے شخص کو تیار کیا جو ان میں سب سے زیادہ سخت دل تھا۔ اس بد بخت نے ناقۃ اللہ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔

**آیت ۳۰** ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي﴾ ”پھر کیسا ہامیر اعذاب اور میرا خبردار کرنا؟“



**آیت ۳۱** ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ۝﴾ ”ہم نے ان پر بس ایک ہی چٹکھاڑ بھیجی تو وہ باڑھ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح چورا ہو کر رہ گئے۔“

اگر جانوروں کا کوئی بڑا سا گلہ کسی کھیت کی باڑھ کو روندتا ہوا گزر جائے تو وہ باڑھ چورا چورا ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح وہ نافرمان لوگ بھی چورا چورا ہو کر پڑے رہ گئے۔

**آیت ۳۲** ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ۝﴾ ”اور ہم نے تو اس قرآن کو آسان کر دیا ہے سمجھنے کے لیے تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟“

### آیات ۳۳ تا ۴۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالَّذِي ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ۝ إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ۝ نِعْمَةٌ مِّنْ عِندِنَا ۝ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝ وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَكَارَوُا بِالَّذِي ۝ وَلَقَدْ رَاودُوهُ عَنْ صَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذِرِ ۝ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمُ بَكْرَةٌ عَذَابٌ مُّسْتَقَرٌّ ۝ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذِرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۝ وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا ۝ فَأَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٌ مُّقْتَدِرٌ ۝

**آیت ۳۳** ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالَّذِي ۝﴾ ”لوٹ کی قوم نے بھی خبردار کرنے والوں کو جھٹلایا۔“

**آیت ۳۴** ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ۝ إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ۝﴾ ”ہم نے ان پر بھیج دی ایک ایسی تیز آندھی جس میں پھرتے سوائے لوٹ کے گھر والوں کے۔ ان کو ہم نے نجات دے دی صبح کے وقت۔“

**آیت ۳۵** ﴿نِعْمَةٌ مِّنْ عِندِنَا ۝ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝﴾ ”وہ نعمت تھی ہمارے پاس سے۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اُس کو جو شکر کرتا ہے۔“

**آیت ۳۶** ﴿وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَكَارَوُا بِالَّذِي ۝﴾ ”اور لوٹ نے ان کو خبردار کروایا تھا ہماری پکڑ سے، لیکن انہوں نے شک کیا ان چیزوں پر جن کے بارے میں انہیں خبردار کیا گیا تھا۔“

وہ ہماری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔

**آیت ۳۷** ﴿وَلَقَدْ رَاودُوهُ عَنْ صَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ ۝﴾ ”اور انہوں نے اس سے اس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا۔“

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بدکردار لوگ ان خوبصورت مہمان لڑکوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے جو اصل میں فرشتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اندھا کر دیا۔ بائبل میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ ان میں

سے ایک فرشتے نے ان لوگوں کی طرف اپنا ہاتھ پھیلا یا تو وہ سب کے سب اندھے ہو گئے۔

﴿فَقُورُوا عَذَابِي وَنُذِرٌ﴾ ”تو مزا چکھو اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔“

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ صَبَّحَهُمُ بُكْرَةً عَذَابٌ مُسْتَقِرٌّ﴾ ”اور ان پر صبح ہی صبح آدھم کا ایک عذاب جو کہ ٹھہر چکا تھا۔“

آیت ۳۹ ﴿فَقُورُوا عَذَابِي وَنُذِرٌ﴾ ”تو چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔“

آیت ۴۰ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾ ”اور ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن سمجھنے کو تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟“

یہ آیت یہاں چوتھی اور آخری مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ﴾ ”اسی طرح قوم فرعون کے پاس بھی آئے تھے خبردار کرنے والے۔“

آیت ۴۲ ﴿كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا﴾ ”انہوں نے ہماری تمام نشانیاں کو جھٹلا دیا“

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰ میں ان نشانوں کی تعداد نو (۹) بتائی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى نَسْعَ الْيَلَةِ بِبَيْتٍ﴾ ”اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں۔“ ان میں دو نشانیاں تو آپ کو ابتدا میں عطا ہوئی تھیں یعنی عصا کا اثر دھابن جانا اور ہاتھ کا چمکدار ہو جانا۔ جبکہ سات نشانیاں وہ تھیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں آیا ہے۔ یہ نشانیاں تو مفرعون پر وقتاً فوقتاً عذاب کی صورت میں نازل ہوتی رہیں۔

﴿فَاَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٌ مُقْتَدِرٌ﴾ ”پھر ہم نے انہیں پکڑا ایک زبردست صاحب قدرت کا پکڑنا۔“ یعنی یہ کوئی معمولی اور کمزور پکڑ نہیں تھی کہ اس سے کوئی نکل بھاگتا، بلکہ اُس اللہ کی پکڑ تھی جو زبردست طاقت کا مالک ہے اور کائنات کے ہر معاملے میں اسے پوری قدرت حاصل ہے۔

ان پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب روئے سخن حضور ﷺ اور کفار مکہ کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

### آیات ۴۳ تا ۵۵

الْفَاكِرُ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكَ اَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۚ اَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرُونَ ۚ سَيَهْزِمُ الْجَمْعُ وَيُؤْتُونَ الدُّبُرَ ۚ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَذْهٰى وَاَمَرٌ ۚ اِنَّ الْعَجْرَمِينَ فِي ضَلٰلٍ وَسُعُرٍ ۚ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوْهِهِمْ ذُقُوْا مَسَّ سَقَرٍ ۚ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۚ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ ۚ كَلِمَةً بِالْبَصَرِ ۚ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۚ

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌّ ۚ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۖ فِي مَقْعَدٍ صَدِيقٍ عِنْدَ  
مَلِكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝

آیت ۲۳ ﴿اَكْفَارُكُمْ خَيْرٌ مِنْ اُولٰٓئِكُمْ﴾ ”(تو اے قریش!) کیا تمہارے کفار اُن (کفار) سے کچھ  
بہتر ہیں؟“

زمانہ سابق میں جن قوموں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے انجام سے متعلق تمام تفصیلات تم لوگ جان  
چکے ہو۔ اب ذرا سوچو کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے رسول ﷺ کا انکار کر کے کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں کیا وہ  
کسی خاص خوبی کے حامل ہیں کہ گزشتہ کافرا تو ام کی طرح ان پر عذاب نہیں آئے گا؟  
﴿اَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِی الزُّبُرِ ۝﴾ ”یا تمہارے لیے سابقہ الہامی کتب میں کوئی فارغ خطی آچکی ہے؟“  
تم میں آخر کیا خوبی ہے کہ جس تکذیب اور ہٹ دھرمی کی روش پر پچھلی قوموں کو سزا دی گئی ہے وہی روش تم  
اختیار کرو تو تمہیں سزا نہ دی جائے؟ کیا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں کوئی براءت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم پر  
عذاب نہیں آئے گا؟

آیت ۲۴ ﴿اَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّتَمِّصُونَ﴾ ”یا یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک طاقتور جمیعت ہیں اور  
بدلہ لینے پر قادر ہیں؟“

آیت ۲۵ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝﴾ ”عنقریب ان کی جمیعت شکست کھا جائے گی اور وہ  
پٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔“

یہ پیشین گوئی جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی میدان بدر میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ روایات  
میں آتا ہے کہ غزوہ بدر سے پہلی رات میں حضور ﷺ نے سجدے کی حالت میں رو رو کر دعا کی۔ آپ کا یہ سجدہ  
بہت طویل تھا اور دعا بھی بہت طویل تھی۔ آپ کی اس دعا کا لب لباب یہ تھا کہ اے اللہ! میں نے اپنی پندرہ سال  
کی کمائی لا کر اس میدان میں ڈال دی ہے۔ میں آخری رسول ہوں میرے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔  
اے اللہ! اس معرکے میں اگر یہ لوگ ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک اس زمین پر تیری بندگی کرنے والا کوئی نہیں  
ہوگا۔ اس رات آپ ﷺ کے عریضے پر پہرے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مامور تھے وہ سجدے میں آپ کی  
کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے اور دعا کے رقت آمیز الفاظ سن رہے تھے۔ اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب  
حضرت ابوبکرؓ سے رہانہ گیا اور وہ پکارا اٹھے: حَسْبُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ..... کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اب بس  
کر دیجیے۔ پھر جب حضور ﷺ نے سجدے سے سر مبارک اٹھایا تو آپ کی زبان مبارک پر یہی الفاظ تھے:  
﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝﴾ کہ یہ لوگ اپنی طرف سے بہت بڑا لشکر لے کر آئے ہیں۔ ان کا یہ لشکر  
یہاں شکست سے دوچار ہوگا اور یہ سب پٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔<sup>(۱)</sup>

(۱) مسیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قوله ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝﴾، و متعدد مقامات

**آیت ۲۶** ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذْهَىٰ وَأَمْرٌ ۝۲۶﴾ ”بلکہ ان کے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت ہے اور بہت زیادہ کڑوی ہے۔“

عربی میں کڑوی چیز کو مَوِّعٌ کہتے ہیں اور اَمْرٌ کے معنی ہیں بہت ہی زیادہ کڑوی۔ سیاقِ مضمون میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں بے درپے شکست مشرکین عرب کا مقدر ہے۔ عنقریب (۹ ہجری میں) ان پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین ان پر جنگ ہو جائے گی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام قبول کرنے یا حدودِ عرب سے باہر چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ایک مضبوط جمعیت اور اعلیٰ پائے کی جنگی صلاحیت کے باوجود ان کی یہ ہزیمتیں نقصانِ مال و جان اور ذلت و رسوائی اللہ کے عذاب ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ تو چھوٹے چھوٹے عذاب ہیں اور دنیا کی زندگی کی حد تک عارضی نوعیت کی تکالیف ہیں۔ جبکہ انہیں بہت بڑے اور دائمی عذاب کا سامنا تو آخرت میں کرنا پڑے گا۔

**آیت ۲۷** ﴿إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝۲۷﴾ ”یقیناً یہ مجرمین گمراہی میں ہیں اور یہ آگ (کے مختلف طبقات) میں ہوں گے۔“

**آیت ۲۸** ﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِِهِمْ ۝۲۸﴾ ”جس دن یہ گھسیٹے جائیں گے آگ میں اپنے چہروں کے بل۔“

﴿ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ۝۲۹﴾ ”(ان سے کہا جائے گا: اب چکھو آگ کی لپٹ کا مزا!)“

**آیت ۲۹** ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝۲۹﴾ ”یقیناً ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔“

**آیت ۵۰** ﴿وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝۵۰﴾ ”اور ہمارا امر تو یکبارگی ہوتا ہے جیسے نگاہ کا لپک جانا۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کا امر ایک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہوتا ہے۔ اللہ کے امر کی یہ وہی شان ہے جو قرآن میں جگہ جگہ ”كُنْ فَيَكُونُ“ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی وہ جب کسی چیز کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ اس کی مشیت کے مطابق اُسی وقت ہو جاتی ہے۔

**آیت ۵۱** ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاءَ عَنكُم فَهَلْ مِنْ مُدَّةٍ ۝۵۱﴾ ”(اے قریش مکہ) ہم نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے تو کوئی ہے اس سے سبق حاصل کرنے والا؟“

تمہاری تذکیر اور یاد دہانی کے لیے قرآن حکیم میں سابقہ اقوام کے انجام کی عبرت انگیز تفصیل بار بار بیان کی گئی ہیں۔ تاریخی حوالوں سے بھی ان اقوام کے حالات سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ اب تم لوگ چاہو تو ان کے انجام سے سبق حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بے شمار آیاتِ آفاقی و انفسی بھی تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم لوگ کبھی ان آیات کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے کرو تو وہ بھی تمہاری ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

**آیت ۵۲** ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝﴾ ”اور وہ تمام اعمال جو ان لوگوں نے کیے ہیں وہ صحیفوں میں محفوظ ہیں۔“

**آیت ۵۳** ﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَقَرٌّ ۝﴾ ”اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی چیز یکسی ہوئی ہے۔“

قیامت کے دن یہ لوگ اپنے اعمال ناموں میں اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اندراج دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ سورۃ الکہف کی یہ آیت اس منظر کا نقشہ دکھاتی ہے جب سرعشران بحرین کے سامنے ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُوسِّتَا مَا لِيْذَا الْكِتَابِ لَا يَغَايِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً اِلَّا اَخْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۙ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝﴾

”اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ اسے موجود پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہوگا۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔“

**آیت ۵۴** ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِينَ فِيْ جَنَّتٍ وَنَهْرٍ ۝﴾ ”یقیناً متقین باغات اور نہروں (کے ماحول) میں ہوں گے۔“

یہ مقام ان خوش نصیب لوگوں کو عطا ہوگا جو اپنی دنیا کی زندگی میں اللہ سے ڈرنے والے آخرت کے خیال سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہنے والے اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے والے اور اس حوالے سے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے تھے۔

**آیت ۵۵** ﴿فِيْ مَقْعَدٍ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكَ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾ ”بہت اعلیٰ راسی کے مقام میں اُس بادشاہ کے پاس جو اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔“

ان خوش قسمت لوگوں کے مقام و مرتبہ کا ذکر ایسے ہی الفاظ کے ساتھ سورۃ یونس کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿اِنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۙ﴾ (آیت ۲) ”ان کے لیے ان کے رب کے پاس بہت اونچا مرتبہ ہے۔“

یعنی ان لوگوں کو آخرت میں شہنشاہِ ارض و سما کا خصوصی قرب حاصل ہوگا۔ اَللّٰهُمَّ رِنَّا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رِنَّا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رِنَّا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین یا ربّ العالمین!!



# سُورَةُ الرَّحْمَنِ

## تمہیدی کلمات

قبل ازیں سورہ ق کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ سات کی سورتوں میں سے سورہ ق منفرد ہے جبکہ باقی چھ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑ سورہ الذاریات اور سورہ الطور کا ہے دوسرا سورہ النجم اور سورہ القمر کا اور تیسرا سورہ الرحمن اور سورہ الواقعة کا۔ چنانچہ اب ہم ان میں سے تیسرے جوڑے کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں (سورہ الرحمن اور سورہ الواقعة) اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت رسالت اور وحی کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ پھر سورہ الرحمن پورے قرآن میں واحد ایسی سورت ہے جس میں جنوں اور انسانوں سے مسلسل اور متوازی خطاب ہو رہا ہے۔

اس حوالے سے ضمنی طور پر یہاں ایک یہ نکتہ بھی سمجھ لیں کہ جنوں کے ہاں نبوت اور وحی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ”عالم خلق“ (دنیا) میں وحی الہی کے نزول کی مشتمل صرف ”روح“ ہو سکتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں کو عطا کی ہے۔ جنوں میں روح نہیں ہوتی۔ اس لیے جنات ان ہی انبیاء و رسل کے پیروکار رہے ہیں جو انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں اہل ایمان اور کافر جن بھی ہیں اور نیک و بد بھی۔ سورہ الاحقاف میں ہم جنات کی ایک جماعت کا ذکر پڑھ آئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے ماننے والے تھے۔ وہ حضور ﷺ سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر انہوں نے ایمان و قرآن کی دعوت اپنی قوم تک بھی پہنچائی۔ بہر حال سورہ الرحمن اس حوالے سے پورے قرآن میں منفرد سورت ہے کہ اس میں جنوں اور انسانوں سے خطاب کے لیے بار بار تثنیہ کا صیغہ آیا ہے بلکہ خصوصی طور پر یَمْنَعُشَرُ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ کے الفاظ میں بھی خطاب ہوا ہے۔ اس طرح اس سورت میں تخصیص کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ان دونوں نسلوں کے افراد ہیں۔ لہذا قرآن مجید میں جہاں کہیں یَا أَيُّهَا النَّاسُ کے الفاظ میں خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد اگرچہ نوع انسانی ہے لیکن اس صیغہ مخاطب میں جنوں کو انسانوں کے تابع سمجھا جائے گا چنانچہ ایسے ہر خطاب میں انسانوں کے ساتھ جن بھی مخاطب ہیں۔

سورہ الرحمن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو دو جنّتوں کا دو مرتبہ تذکرہ ہے اور سورہ الواقعة میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی ترتیب میں ایک انوکھی اور عجیب مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس ترتیب کو معکوس ترتیب یا mirror image کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ایک سورہ کے مضامین جس ترتیب سے آئے ہیں دوسری سورت میں وہی مضامین اس کے برعکس ترتیب میں ہیں۔ آج کل بعض لوگ جڑواں گھر اس طرح بناتے ہیں کہ دونوں کا نقشہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن ایک گھر میں کمروں وغیرہ کی location کی ترتیب

دوسرے کی ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ اس طرح ایک گھر دوسرے گھر کا mirror image محسوس ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین اور ان مضامین کی ترتیب میں گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔

سورۃ الرحمن کی ترجیحی آیت ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ ہے جو اس سورت میں ۳۱ مرتبہ آئی ہے جبکہ اس سورت کی کل آیات ۷۸ ہیں۔ آیات کی ترجیح کا اسلوب اگرچہ قبل ازیں ہم سورۃ الشعراء اور سورۃ القمر میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں یہ دو آیات آٹھ بار دہرائی گئی ہیں: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّوَمَا تَكُنْ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿ جبکہ سورۃ القمر میں ان دو آیات کی تکرار چار مرتبہ آئی ہے: ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي﴾ وَلَقَدْ يَسْرُونَ الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ﴿۔ بہر حال یہ خاص اسلوب سورۃ الرحمن میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## آیات ۱ تا ۲۵

الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ  
حُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْهَيْزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا  
فِي الْهَيْزَانِ ۝ وَأَقْبَبُوا الْوُزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْهَيْزَانَ ۝ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا  
لِلْأَنَامِ ۝ فِيهَا فَاكِهَةٌ ۝ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ ۝ وَالزَّيْتَانُ ۝  
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَانَّ  
مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَّارٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ رَبِّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبِّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝  
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ۝ فَبِأَيِّ  
الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝  
وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

ج

آیت ۱ ﴿الرَّحْمَنُ ۝﴾ ”رحمن نے“

آیت ۲ ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝﴾ ”قرآن سکھایا۔“

رحمن اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ اس کا مادہ ”رحم“ ہے اور یہ فعلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ان کے مفہوم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ (الاعراف: ۱۵۰ اور طہ: ۸۶) غَضَبَان کا لفظ آیا ہے، یعنی غصے سے بہت زیادہ بھرا ہوا۔ اسی طرح اَنَا عَظُشَان

کا مطلب ہے کہ میں پیاس سے مر جا رہا ہوں اور اَنَا جَوْعَان: بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے رَحْمَن کے مفہوم میں ایک طوفانی شان پائی جاتی ہے (لفظ ”طوفان“ بھی اسی وزن پر ہے) اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس مفہوم کو ہم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ رَحْمَن وہ ذات ہے جس کی رحمت ٹھانٹیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ کسی مخلوق کا کوئی فرد بھی اس کی رحمت سے مستغنی نہیں۔ خاص طور پر نبی نورِ انسانی تو دنیا میں بھی اُس کی رحمت کی محتاج ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت میں نہیں جاسکے گا جب تک کہ رحمت خداوندی اس کی دیکھری نہ کرے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ((وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِمَغْفِرَةٍ وَرَحْمَةٍ))<sup>(۱)</sup> ”ہاں میں بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رَحْمَن چوٹی کا نام ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام رَحْمَن ہے اسی طرح اللہ نے انسان کو جو علم سکھایا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے۔ اکتسابی علم (acquired knowledge) میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو الہامی علم (revealed knowledge) عطا ہوا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے جو ہر قسم کے تمام علوم کا نقطہ عروج ہے۔

**آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝﴾** ”اُسی نے انسان کو بنایا۔“

اس سلسلے کا تیسرا اہم نکتہ یہ نوٹ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ النحل، آیت ۴۰ م کی تشریح) دونوں کو جمع فرمادیا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بَيْنَهُ﴾ (ص: ۷۰) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔

**آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝﴾** ”اس کو بیان سکھایا۔“

یعنی اسے بولنا سکھایا، اسے گویائی کی صلاحیت بخشی۔ آیات زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں میں سے جو چوٹی کی صلاحیت ہے وہ قوتِ بیان (گویائی) ہے۔ آج میڈیکل سائنس کی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی قوتِ گویائی کا تعلق اس کے دماغ کی خصوصی بناوٹ سے ہے۔ سائنس کی زبان میں تو انسان بھی حیوان ہی ہے، لیکن اس کے بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہا گیا ہے۔ دماغ تو ظاہر ہے انسان سمیت تمام جانوروں میں موجود ہے، لیکن ہر جانور کے دماغ کی بناوٹ اور صلاحیت مختلف ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا دماغ تمام حیوانات کے دماغوں میں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ح: ۶۶۶۷۔ وصحیح مسلم، کتاب

صفة القيامة والجنة والنار، باب لن يدخل احد الجنة بعمله بل برحمة الله تعالى، ح: ۲۸۱۶۔



سب سے اعلیٰ ہے اور اس میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں جو کسی اور جانور کے دماغ میں نہیں ہیں۔ بہر حال استعداد کے حوالے سے حیوانی دماغ کی بناوٹ غلی سطح سے ترقی کر کے گوریلوں اور چیمپنیز (champanzies) کے دماغ کی سطح تک پہنچتی ہے، اور پھر اس ترقی کی معراج انسان کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ کے مختلف حصے ہیں مثلاً سماعت سے متعلقہ حصہ، بصارت سے متعلقہ حصہ وغیرہ۔ حواس (آنکھ، کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والی معلومات پہلے دماغ کے متعلقہ حصے میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے gray matter کے پچھلے حصے میں پہنچتی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ کا سب سے اہم اور بڑا حصہ speech centre ہے، اور پھر اس میں بھی کلام کے فہم اور ابلاغ سے متعلق دو الگ الگ حصے ہیں، یعنی ایک حصے میں دوسروں کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسرا حصہ دوسروں تک بات پہنچانے سے متعلق ہے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے، لیکن قوت گویائی کے علاوہ انسان کی باقی تقریباً تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی درجے میں دوسرے حیوانات کو بھی ملی ہیں، بلکہ بعض حیوانات کی بعض صلاحیتیں تو انسان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ بعض جانوروں کی بصارت ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ تیز ہے، کئی جانور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دیکھنے کے لیے روشنی کے محتاج ہیں۔ گھوڑے کی قوت سماعت انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ذرا سی آہٹ پر گھوڑے کے کان (antenna کی طرح) کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ گھڑسوار نے ابھی کچھ دیکھا ہوتا ہے نہ سنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کتوں کے دماغ میں سوگھنے کا حصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سوگھنے کی حس انسان کے مقابلے میں سو گنا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بہر حال باقی صلاحیتیں تو دوسرے جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن بیان اور گویائی کی صلاحیت صرف اور صرف انسان کا طرہ امتیاز ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ان آیات کو دوبارہ پڑھئے۔ ان چار آیات سے تین جملے بنتے ہیں۔ پہلی آیت ﴿الْوَحْمُنُ ۝۱﴾ جملہ نہیں ہے، یہ مبتدأ ہے اور ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝۱﴾ اس کی خبر ہے۔ چنانچہ پہلی اور دوسری آیت کے ملنے سے مکمل جملہ بنتا ہے۔ یعنی ”رحمن نے قرآن سکھایا۔“ اس کے بعد آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝۳﴾ ”اُس نے انسان کو پیدا کیا“ بھی مکمل جملہ ہے اور آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴﴾ ”اُسے بیان کی صلاحیت عطا کی“ بھی مکمل جملہ ہے۔ اب ان آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے اعلیٰ نام کے حوالے سے سب سے اعلیٰ علم (قرآن) کا ذکر کیا۔ پھر اپنی چوٹی کی مخلوق اور اس مخلوق کی چوٹی کی صلاحیت (بیان) کا ذکر کیا۔ اس زادی سے غور کیا جائے تو یہ تین جملے ریاضی کے کسی سوال کی طرح ”جواب“ کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ریاضی کے ”نسبت و تناسب“ کے سوالات میں تین رقموں (values) کی مدد سے چوتھی رقم معلوم کی جاتی ہے، اسی طرح ان تین جملوں پر غور کرنے سے اس عبارت کے اصل مدعا تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ”رحمن نے قرآن سکھایا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی۔“ کس لیے؟ — جواب بالکل واضح ہے: ”قرآن کے بیان کے لیے!“ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ ترین مخلوق کو

”بیان“ کی اصول صلاحیت سے اس لیے تو نہیں نوازا کہ وہ اسے لہو و لعب میں ضائع کرتا پھرے یا دلائل کے انبار لگانے والا دیکھ یا شعلہ بیان مقرر بن کر اسے حصول دولت و شہرت کا ذریعہ بنالے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ توپ اس لیے تو نہیں بنائی جاتی کہ اس سے کھیاں ماری جائیں۔ چنانچہ انسان کی اس بہترین صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ وہ اسے بہترین علم کے سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بنائے۔ یعنی اپنی قوت بیان کو قرآن کی تعلیم اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دے۔ ان آیات کے اس مفہوم کو حضور ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))<sup>(۱)</sup> یہاں خَيْرُكُمْ کا صیغہ تفصیل کُل (superlative degree) کے مفہوم میں آیا ہے کہ تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث کے حوالے سے ضمنی طور پر یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس کے راوی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام اور حدیث کے لفظ ”قرآن“ کے قافیے بھی زیر مطالعہ آیات کے قافیوں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یعنی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس حدیث کی ان آیات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ سورۃ الرحمن کی ان ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سورۃ القمر کی ترجمی آیت ((وَلَقَدْ يَسْرُنَا الْقُرْآنَ لِلْذِّكْرِ .....)) کے مفہوم اور اس کے پر شکوہ اسلوب کو بھی مد نظر رکھا جائے اور ان آیات کی ترتیب پر بھی غور کیا جائے کہ سورۃ القمر کی مذکورہ آیت کو بار بار دہرانے کے فوراً بعد سورۃ الرحمن کی یہ آیات آئی ہیں تو ان آیات کا مذکورہ مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان آیات کے مین السطور یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

**آیت ۵ ﴿الْشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾** ”سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔“  
سورج اور چاند کی گردش ایک قطعی اور مربوط نظام کا حصہ ہے۔ ان کی گردش سے ہی دن رات بنتے ہیں اور دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب ممکن ہوتا ہے۔

**آیت ۶ ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾** ”اور ستارے اور درخت (اللہ کو) سجدہ کرتے ہیں۔“  
نجم کے معروف معنی ستارے کے ہیں، لیکن عربی میں یہ لفظ ایسے پودوں اور تیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا۔ مثلاً جھاڑیاں اور خر بوزے اور تر بوز کی بلیں وغیرہ۔ جس طرح لاتعداد ستارے آسمان پر بکھرے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح بے شمار جھاڑیاں اور تیل بوٹے زمین پر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی آیت میں سورج اور چاند کے ذکر کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہاں النجم سے ستارے مراد ہوں گے لیکن اگلے لفظ الشجر کے حوالے سے جھاڑیاں یا بلیں کا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

**آیت ۷ ﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ﴾** ”اور آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کی۔“  
یہاں میزان سے مراد کائناتی نظام کے اندر پایا جانے والا مربوط اور خوبصورت توازن (cosmic balance) ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ توازن تمام اجرام سماویہ کے اندر موجود

کشش ثقل (gravitational force) کی وجہ سے قائم ہے۔ تمام اجرام فلکی اس کشش کی وجہ سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ہر کڑے کا دوسرے کڑے سے فاصلہ اس کی کشش کی طاقت کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اگر کہیں یہ فاصلہ ایک طرف سے معمولی سا کم ہو جائے اور دوسری طرف سے معمولی سا بڑھ جائے تو یہ سارا نظام ٹپٹ ہو جائے اور تمام کڑے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تمام چیزوں میں ایک توازن قائم کر رکھا ہے۔

**آیت ۸ ﴿لَا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝۸﴾** ”تا کہ تم میزان میں زیادتی مت کرو۔“

اس کائناتی توازن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے تم بھی عدل و انصاف پر قائم رہو۔  
**آیت ۹ ﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝۹﴾** ”اور قائم رکھو وزن کو انصاف کے ساتھ اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو۔“

کسی بھی نظام میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کے اندر عدل قائم رکھنا یعنی اس کی ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ کسی بھی قسم کی کمی بیشی نظام میں خرابی اور عدم توازن کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے زیادتی سے بھی منع کر دیا گیا (لَا تَطْغَوْا) اور کمی کرنے سے بھی روک دیا گیا (لَا تُخْسِرُوا)۔ خالق کائنات نے اس کائنات کا پورا نظام توازن اور عدل و قسط پر قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرہ اختیار میں اسی طرح توازن اور عدل و قسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے ورنہ سارے نظام معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ یہاں کوئی بڑا ظلم تو درکنار ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حصے کی تھوڑی سی چیز بھی مار لیتا ہے تو میزان عالم میں خلل برپا کر دیتا ہے۔

**آیت ۱۰ ﴿وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝۱۰﴾** ”اور زمین کو اُس نے بچھا دیا مخلوق کے لیے۔“

ظاہر ہے مخلوق میں انسان بھی شامل ہیں اور جنات بھی۔ نوٹ کیجیے کہ پہلے آسمان، سورج اور چاند کا ذکر ہوا ہے اور اب زمین کا۔ گویا ترتیب تدبیراً اوپر سے نیچے کی طرف آرہی ہے۔

**آیت ۱۱ ﴿فِيهَا فَاكِهَةٌ ۖ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ۝۱۱﴾** ”اس میں میوے ہیں اور کھجوریں ہیں، جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔“

**آیت ۱۲ ﴿وَالْحَبُّ ذُرٌّ وَالْعُصْفُ وَالرَّيْحَانُ ۝۱۲﴾** ”اور ٹھس والا اناج بھی ہے اور خوشبودار پھول بھی۔“  
بعض مترجمین ”الرَّيْحَانُ“ سے مختلف النوع غذائیں بھی مراد لیتے ہیں۔

**آیت ۱۳ ﴿فَبِآيِ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَنِ ۝۱۳﴾** ”تو تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

عام طور پر الْآءِ کا ترجمہ ”نعمتیں“ کیا جاتا ہے، لیکن اس لفظ میں نعمتوں کے ساتھ ساتھ قدرتوں کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی اس لفظ سے کہیں اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور کہیں اس کی قدرتیں۔ تُكَذِّبَنِ

تشبیہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورت میں جنوں اور انسانوں سے مسلسل ایک ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ آگے چل کر آیت ۳۳ میں يَمْعُشَرُ الْعِجَى وَالْإِنْسِ کے خطاب سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔<sup>(۱)</sup>

**آیت ۱۳** ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ ”اُس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھٹکھٹاتی ہوئی مٹی سے۔“

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں تین مرتبہ ﴿صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد ایسا گارا ہے جس میں سڑاند پیدا ہو چکی ہو، یعنی سنا ہوا گارا۔ ایسا گارا خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے اور ٹھوکر لگنے سے کھٹکنے لگتا ہے۔ یہاں پر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ سے ایسا ہی سوکھا ہوا گارا مراد ہے، یعنی ٹھیکرے کی طرح کھٹکھٹاتا ہوا گارا۔

**آیت ۱۵** ﴿وَحَقَّقَ الْجَنَّانَ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ ”اور جنات کو اُس نے پیدا کیا آگ کی لپٹ سے۔“

مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ سے آگ کی لویا لپٹ مراد ہے۔ اس کا اطلاق آگ کے شعلے کے اس حصے پر ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن انتہائی گرم ہوتا ہے۔ شعلے کے اندر سب سے زیادہ درجہ حرارت اسی نظر نہ آنے والے حصے میں ہوتا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۲۷ میں آگ کی اس لپٹ کو نَارِ السَّمُومِ کا نام دیا گیا ہے۔

**آیت ۱۶** ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَنِ﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۱۷** ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ ”وہ رب ہے دونوں مشرقوں کا اور دونوں مغربوں کا۔“

یہاں پر رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ اور رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ تشبیہ کے اس صیغہ کی مناسبت سے آیا ہے جو پوری سورت میں بار بار آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (المزمل: ۹) اور ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (المعارج: ۴۰) کی تراکیب بھی آئی ہیں۔ بہر حال واحد تشبیہ اور جمع کے یہ تینوں صیغے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ واحد کے صیغے میں مشرق اور مغرب تو معروف عام ہیں۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں کے تصور کو یوں سمجھیں کہ ایک وقت میں سورج جہاں سے طلوع ہو رہا ہے گلوب کی دوسری طرف وہیں پر وہ غروب ہوتا بھی نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح جس نقطے پر سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے دوسری طرف اسی جگہ سے طلوع ہوتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ گویا سورج طلوع ہونے کا ہر نقطہ مقام غروب بھی ہے اور اسی طرح ہر مقام غروب

(۱) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو سورۃ الرحمن شروع سے آخر تک سنائی تو وہ اسے سن کر خاموش رہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے لیلیۃ الجن میں یہ سورت جنوں کو سنائی تھی تو وہ تم سے بہتر جواب دینے والے تھے۔ میں جب بھی یہ آیت شریفہ پڑھتا: ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَنِ﴾ تو وہ جواب میں کہتے: لَا بَشِيءٌ مِنْ نِعْمِكَ رَبَّنَا نَكْذِبُ، فَلَكَ الْحَمْدُ (پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے، پس شکر و تعریف تیرے ہی لیے ہے)۔“ سنن الترمذی، ابواب تفسیر

گویا مقام طلوع بھی ہے۔ اس لحاظ سے گویا مشرق بھی دو ہیں اور مغرب بھی دو۔ پھر کسی ایک مقام سے بظاہر نظر آنے والے مشرق و مغرب کے درمیان زمین پر ہر نقطہ گلوب میں کسی کے لیے مقام طلوع ہے اور کسی کے لیے مقام غروب۔ اس طرح گویا بہت سے مشرق ہیں اور بہت سے مغرب۔

**آیت ۱۸ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۱۹ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيْنَ﴾** ”اُس نے چلا دیے دو دریا جو آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔“

**آیت ۲۰ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيْنَ﴾** ”لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔“

دونوں دریا باہم مل کر چلتے ہیں لیکن ایک دوسرے میں گھٹے نہیں، اپنی اپنی حد میں رہتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈے پانی کے سمندروں میں گرم پانی کی روئیں بہتی ہیں اور کھاری سمندروں میں میٹھے پانی کی روئیں بہتی ہیں۔ اسی طرح کئی دریا باہم ملتے ہیں لیکن دور تک الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں دریائے کابل کا پانی جب دریائے سندھ میں ملتا ہے تو بہت دور تک دونوں پانی اپنے رنگ کی وجہ سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ انک کے پل پر کھڑے ہو کر دونوں پانیوں کا الگ الگ رنگ دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا ہی منظر مظفر آباد کے قریب ”دومیل“ کے مقام پر نظر آتا ہے جہاں دریائے نیلم دریائے جہلم میں ملتا ہے۔

**آیت ۲۱ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۲۲ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾** ”ان دونوں سے نکلتے ہیں موتی بھی اور مونگے بھی۔“

**آیت ۲۳ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۲۴ ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ﴾** ”اور اُسی کے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔“

یعنی اُسی کی قدرت کا نمونہ ہیں اور اُسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ پچھلے زمانے کے جہاز اگرچہ دور جدید کے جہازوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے، لیکن جب ان کے بادبان کھلتے تھے تو وہ بھی اونچائی میں پہاڑوں جیسے نظر آتے تھے۔ اور آج کل کے جہاز تو واقعتاً پہاڑوں سے مشابہ ہیں۔

**آیت ۲۵ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

یہاں ایک دفعہ پھر نوٹ کر لیں کہ سورت کے آغاز سے لے کر اب تک جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں

پہلے قرآن کی عظمت کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد اللہ کی صنای اور اس کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ابتدائی آیات میں انسان کی قوت بیان کے تذکرے کے ساتھ قرآن کی عظمت کا ذکر کر کے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اس کی اس صلاحیت کا بہترین مصرف یہی ہے کہ وہ قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس کی مزید وضاحت نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ملتی ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ بہر حال انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو بہترین طور پر مصرف کرے۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں اسی جذبے کو ترغیب و تحریک دی گئی ہے:

اگر ایک قطرہ خون داری، اگر مشیت پرے داری، بیامن با تو آ موزم طریق شاہبازی را!  
(کہ اے نغھی چڑیا! اگر تیرے پاس چند پر ہیں اور ایک قطرہ خون بھی ہے تو میرے پاس آؤ، میں تجھے شاہن کی سی اڑان کا طریقہ سکھا دوں!)

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے، یہ موضوعات (قرآن کی عظمت اور اللہ کی صنای کا بیان) ہم سورۃ الواقعة میں بھی پڑھیں گے، لیکن وہاں ان کی ترتیب سورۃ الرحمن کے مضامین کی ترتیب کے بالعکس ہے۔ یعنی قرآن کی عظمت کا بیان جو سورۃ الرحمن کے آغاز میں ہے سورۃ الواقعة میں بالکل آخر پر ہے۔ پھر سورۃ الرحمن میں اللہ کی خلاق و صنای کا ذکر عظمت قرآن کے بعد ہے جبکہ سورۃ الواقعة میں یہ موضوع عظمت قرآن کے ذکر سے پہلے بیان ہوا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں میں ایک جیسے موضوعات بیان ہوئے ہیں لیکن مککوس ترتیب سے۔ اس ترتیب کو قبل ازیں mirror image کا نام دیا گیا ہے۔

## آیات ۲۶ تا ۴۵

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۖ وَيَسْفَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلِيلِ وَالْإِكْرَامِ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ سَفَرُكُمْ لَكُمْ آيَةُ الثَّقَلَيْنِ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ يَعْشَرُ الْحَيِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَنِ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شَوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۖ وَنَحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرِينَ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ يَعْرِفُ الْجَرْمُونَ بِإِسْمِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِالْوَاوِصِ وَالْأَقْدَامِ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكْذَّبُ بِهَا الْجَرْمُونَ ۖ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ ۖ فَيَأْتِيَ الْآءَ رَبِّكُمَا تُكْذِبِينَ ۖ

**آیت ۳۱** ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ ”جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔“  
**آیت ۳۲** ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ ”اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی اور بہت عظمت والا ہے۔“

اللہ کے چہرے کا تصور ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لحاظ سے اگرچہ یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے لیکن اس کا عمومی مفہوم بالکل واضح ہے کہ باقی رہنے والی صرف ایک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہے جس کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور ان میں کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں جو اپنے بل پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہو۔ ہر چیز اور ہر مخلوق کا وجود اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کا مرہون منت ہے۔ جب تک وہ چاہتا ہے کسی چیز کا وجود برقرار رہتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے اسے فنا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القصص کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ إِنَّهُ الْحَكِيمُ ذَا الْبَیِّنَاتِ﴾ ”ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اُس کے چہرے کے۔ فرمان روائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹا دیے جاؤ گے۔“

**آیت ۳۸** ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۲۹** ﴿يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ”اُسی سے مانگتا ہے جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ ہی کے در کی سوالی ہے۔ ہر کسی کو وجود بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ہر زندہ وجود کی زندگی بھی اسی کی دین ہے کسی مخلوق میں اگر کوئی صلاحیت ہے تو وہ بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے اور تمام مخلوقات کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں کا خبر گیر و نگہبان بھی وہی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ محمد کی آیت ۳۸ کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿وَاللَّهُ الْغَنِيُّ ۖ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ﴾ کہ اللہ غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو۔ یعنی تمہارا وجود تمہاری زندگی تمہاری صلاحیتیں غرض تمہارا سب کچھ اُسی کا عطا کردہ ہے۔ تم اپنے تمام تر وسائل سے بس وہی کچھ کر سکتے ہو جس کی وہ اجازت دیتا ہے اور صرف اسی قدر جان سکتے ہو جس قدر وہ چاہتا ہے۔ اس کی مخلوق کے تمام افراد پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (البقرہ: ۲۵۵) کہ وہ سب کے سب اس کے احاطہ علم میں مقید و محصور ہیں اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے، مگر اسی قدر جس قدر وہ چاہتا ہے۔

﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ ”ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔“

ہر دن اُس کی ایک نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۃ السجدۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿يَذَّبُو الْأُمُورَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ ”وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی

طرف پھروہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہے۔ یعنی کائنات اور مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ اس کائنات کے نظام اور ارض و سماء میں پھیلی ہوئی مخلوقات سے متعلق تمام امور کو وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی تدبیر سے چلا رہا ہے۔ اس تدبیر کی منصوبہ بندی کے لیے اس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ایک دن کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، اہم فیصلے کیے جاتے ہیں، احکام جاری ہوتے ہیں، ان احکام کی تعمیل و تنفیذ عمل میں لائی جاتی ہے اور پھر جائزہ رپورٹیں اسے پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر دن کے لیے اس کی نئی شان ہے اور نئی مصروفیات!

**آیت ۳۰ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

**آیت ۳۱ ﴿سَفَرُغْ لَكُمْ آيَةُ الْفَقْلِ﴾** ”ہم جلد ہی فارغ ہو جائیں گے تمہارے لیے“ اے دو بھاری قافلو!

اس آیت میں اشارۃً اور آگے آیت ۳۳ میں باقاعدہ نام لے کر تنزیہ (تُكَذِّبِينَ) کے صیغے کی وضاحت کر دی گئی کہ اے جن و انس کے قافلوں کے افراد! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ یاد رکھو! تم دونوں گروہ اپنے اعمال کے لیے ہمارے سامنے جواب دہ ہو۔ یاد رکھو! ہم اس کائنات کو ”مہلت“ کے اصول پر چلا رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے کائنات کی ایک عمر ﴿إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ مقرر کر رکھی ہے، اسی اصول کے تحت ہر قوم کو بھی ہم ایک وقت معین تک مہلت دیتے ہیں: ﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ﴾ (الاعراف: ۳۴) اور ہر فرد کو بھی۔ چنانچہ ہماری عطا کردہ مہلت سے تم یہ مت سمجھو کہ تمہارا احتساب نہیں ہوگا، بلکہ ہم عنقریب تم سب لوگوں کو اپنے حضور حاضر کرنے والے ہیں جہاں تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔

**آیت ۳۲ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۳۳ ﴿يَمَعْشَرُ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا﴾** ”اے گروہ جن و انس! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل بھاگو تو نکل بھاگو۔“ ﴿لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ ”تم نکل نہیں سکو گے مگر (اللہ کی) سند کے ساتھ۔“

یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ جب تک کائنات (cosmos) کی وسعتوں کے بارے میں انسان کا علم مزید ترقی نہیں کر جاتا اس آیت کا مفہوم شاید ہم پوری طرح سمجھ نہ پائیں۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک انسان زمین کی ”حدود“ سے نکل کر نظام شمسی کے کسی ایک سیارے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی اس رفتار سے تو یہی لگتا ہے کہ نظام شمسی کی وسعتوں تک بھی اس کی رسائی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ جہاں تک اس معاملے میں جنوں کی ”استطاعت“ کا تعلق



ہے اس کے بارے میں قبل ازیں سورۃ الحجر کی آیت ۷۱ کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہ نظامِ شمس کی حدود کے اندر آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں، لیکن نظامِ شمس کی حدود کو پھلانگنے کی استطاعت وہ بھی نہیں رکھتے۔ دوسری طرف اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی وسعتوں کا عالم یہ ہے کہ ان وسعتوں کے اندر خود نظامِ شمس کی حیثیت ایک نقطے کی سی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں گروہ جن وانس کی اس بے بسی اور بے بضاعتی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی طرف آیت زیر مطالعہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں جب آسمانوں اور زمین کا ذکر آتا ہے تو اس سے پوری کائنات مراد ہوتی ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں پوری کائنات کے کناروں سے نکل بھاگنے کے معنی معدوم ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ قیامت کے دن عذاب کے مستحق لوگ خواہش کریں گے: ﴿يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا﴾ (النساء) ”اُس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے۔“ لیکن ہمارا یہ وجود چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر یہ معدوم بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم میرے خیال میں یہ ہے کہ تم لوگ اگر معدوم بھی ہونا چاہو تو اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر (اِلَّا بِسُلْطٰنٍ) ایسا نہیں کر سکو گے۔ واللہ اعلم!

**آیت ۳۲ ﴿فَبَآئِيَ الْاٰءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۳۵ ﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ﴾** ”تم پر پھینکے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اور دھواں، تو تم لوگ بدلہ نہیں لے سکو گے۔“

**آیت ۳۶ ﴿فَبَآئِيَ الْاٰءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۳۷ ﴿فَاِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾** ”پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی تیل کی تلچھٹ جیسا۔“

**آیت ۳۸ ﴿فَبَآئِيَ الْاٰءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۳۹ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهِٗ اِنْسٌ وَلَا جَانٌّ﴾** ”تو اُس روز پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، نہ کسی جن سے اور نہ انسان سے اُس کے گناہوں کے بارے میں۔“

اگرچہ سوال و جواب بھی ہوں گے اور ایک ایک عمل کا حساب بھی ہوگا، لیکن چونکہ ہر انسان اپنے اندرونی احوال کو خوب سمجھتا ہے: ﴿يَلِی الْاِنْسَانَ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ﴾ (القیامۃ) اس لیے میدانِ حشر میں ہر شخص کا

چہرہ ہی گویا اُس کے انجام کی خبر دے رہا ہوگا۔ اس کیفیت کا نقشہ قرآن میں جا بجا دکھایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے، جبکہ کچھ چہروں پر مردنی چھارہی ہوگی۔ اس کیفیت کی عملی مثال ہمارے ہاں اسکولوں کے سالانہ نتائج کے اعلان کے موقع پر دیکھنے میں آتی ہے۔ چونکہ ہر طالب علم کو امتحان کے دوران اپنی کارکردگی کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے نتائج کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی ہر ایک کا نتیجہ اس کے چہرے پر سے پڑھا جاسکتا ہے۔

**آیت ۴۰ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۴۱ ﴿يَعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ﴾** ”پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے“ پھر ان کو پکڑا جائے گا پیشانی (کے بالوں) سے اور پاؤں سے۔“  
اُس دن مجرمین کے اترے ہوئے چہرے ہی ان کی پہچان ہوں گے۔ چنانچہ فرشتے انہیں ٹانگوں اور پیشانی کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنم کی طرف اُچھالتے جائیں گے۔

**آیت ۴۲ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۴۳ ﴿هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ﴾** ”(اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جہنم جسے مجرمین جھٹلایا کرتے تھے۔“

**آیت ۴۴ ﴿يَطُوفُونَ فِيهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ﴾** ”اب وہ چکر لگاتے رہیں گے اس (آگ) کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔“

آگ کی تپش سے گھبرا کر پانی کی طرف لپکیں گے اور جب کھولتے ہوئے پانی کا مزہ چکھیں گے تو پھر واپس بھاگیں گے۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْ ذَلِكَ!

**آیت ۴۵ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

یہ اہل جہنم کا تذکرہ تھا، اب اس کے بعد آئندہ آیات میں اہل جنت کا بیان ہوگا۔ البتہ سورۃ الواقعہ میں پہلے اہل جنت کا ذکر ہے اور اس کے بعد اہل جہنم کا۔ یعنی جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین باہم عکس ترتیب میں ہیں۔

## آیات ۴۶ تا ۷۸

وَلَيْسَ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ ۖ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۚ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ ۖ فَبِأَيِّ

الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهَا عَيْنٌ مُجُورٌ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهَا مِنْ كُلِّ  
 فَاكِهَةٍ رُوحِينَ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ مُتَكَبِّرِينَ عَلَى قُرُوشِ بَطَائِنُهَا مِنْ  
 اسْتَبْرَقٍ ۝ وَجَنَّ الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهِنَّ قُصُورُ الظَّرْفِ لَمْ  
 يَطْمِئِنَّهُنَّ أَنْسَ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ  
 وَالْمَرْجَانُ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝ فَيَايَ الْآءِ  
 رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَيْنِ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ مُدْهَمَمَتَيْنِ ۝ فَيَايَ  
 الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهَا عَيْنٌ نَصَّخَاتٍ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهَا  
 فَاكِهَةٌ وَتَخْلُ وَرْمَانٌ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۝ فَيَايَ الْآءِ  
 رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْبُيُوتِ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ لَمْ يَطْمِئِنَّهُنَّ  
 أَنْسَ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ مُتَكَبِّرِينَ عَلَى رُفْرِفٍ خُضِرٍ وَعَبَقَرِيٍّ  
 حِسَانٍ ۝ فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝

آیت ۳۶ ﴿وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٍ ۝﴾ ”اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے  
 ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں۔“

اہل جنت کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کے حضور پیشی سے لرزاں و ترساں رہے۔  
 حقیقت یہ ہے کہ انسان کا جاوہ مستقیم پر قائم رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کا خوف ہے۔  
 دو جنتوں کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں تاہم دو جنتوں کی توجہ جو میری سمجھ میں آئی  
 ہے اور مجھے اپنی اس رائے پر اطمینان اور انشراح ہے کہ یہ انسانوں اور جنوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا بیان  
 ہے۔ چونکہ اس سورت میں خطاب بھی مسلسل ان دونوں سے ہے اور جہنم کی وعید بھی دونوں گروہوں کو دی گئی ہے  
 اس لیے جنت کی نوید بھی دونوں کے لیے ہونی چاہیے تھی۔ اب چونکہ انسانوں اور جنوں کا مادہ تخلیق اور ان کی  
 فطرتیں الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان کی ضرورتیں پسند و ناپسند رنج و غم کے معیار راحت و سکون کے پیمانے اور  
 کیف و سرور کے انداز سب کچھ ہی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں اس لیے ظاہر ہے جنت میں بھی ان کے  
 لیے الگ الگ ماحول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دونوں گروہوں کے لیے  
 الگ الگ جنتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مد نظر رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں جن دو جنتوں کا ذکر  
 ہوا ہے وہ نچلے درجے کی جنتیں ہیں جبکہ آگے چل کر آیت ۶۲ میں جن دو جنتوں کا ذکر ہوا ہے وہ اونچے درجے کی  
 جنتیں ہیں۔ گویا اس سورت میں کل چار جنتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ہر گروہ کے لیے دو جنتیں ہوں گی ان میں سے ایک  
 جنت نچلے درجے میں ہوگی اور دوسری نسبتاً برتر درجے میں۔

آیت ۳۷ ﴿فَيَايَ الْآءِ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور

قد رتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۲۸ ﴿ذَوَاتَا أَفْئَانٍ ۝۲۸﴾ ”دونوں بہت سی شاخوں والی ہوں گی۔“

آیت ۲۹ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۲۹﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور

قد رتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۵۰ ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ ۝۵۰﴾ ”ان دونوں میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے۔“

یعنی ہر جنت میں ایک چشمہ رواں ہوگا۔

آیت ۵۱ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۵۱﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قد رتوں

کا انکار کرو گے؟“

آیت ۵۲ ﴿فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ۝۵۲﴾ ”ان دونوں میں ہر قسم کے میوے ہوں گے جوڑوں کی

شکل میں۔“

یعنی ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی۔

آیت ۵۳ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۵۳﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور

قد رتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۵۴ ﴿مُتَكَيِّسِينَ عَلَىٰ عُرُشٍ بِطَائِنِهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ۝۵۴﴾ ”وہ وہاں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ایسے

بچھونوں پر جن کے آستر گاڑھے ریشم کے ہوں گے۔“

یہاں پر جنت کے بچھونوں کے اندرونی کپڑے (آستر) کا ذکر ہوا ہے کہ وہ گاڑھے یعنی موٹے ریشم کے

بنے ہوں گے لیکن ان کے بیرونی غلافوں کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بیرونی غلافوں کی کیفیت

ہمارے احاطہ خیال میں آہی نہیں سکتی۔

﴿وَجَنَّاتُ الْجَنَّةِ ذَانِ ۝۵۵﴾ ”اور دونوں جنتوں کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔“

یعنی وہ اہل جنت میں سے ہر ایک کی پہنچ میں ہوں گے۔

آیت ۵۵ ﴿فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۵۵﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور

قد رتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۵۶ ﴿فِيهِنَّ قِصِرَاتُ الطَّرَفِ ۝۵۶﴾ ”ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔“

عورت کی جھکی ہوئی نگاہیں شرم و حیا کی علامت ہیں اور شرم و حیا انسانیت کا خاص زیور بھی ہے اور اس کے

اخلاق کا سب سے بڑا مافظ بھی۔ جتنی عورتوں کی جھکی ہوئی نظروں کا ذکر گویا ان کے حسن ظاہری و باطنی کا بیان ہے۔

﴿لَمْ يَطْمِئْهُمْ نَأْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جِئَانٌ ۝۵۷﴾ ”ان کو چھوٹا نہیں ہوگا ان سے پہلے نہ کسی انسان نے

اور نہ کسی جن نے۔“

جنتی جنوں کی بیویاں ظاہر ہے انہی کی جنس سے ہوں گی جنہیں پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا جبکہ انسانوں کی بیویاں انسان ہوں گی اور انہیں بھی پہلے کسی انسان نے نہیں چھوا ہوگا۔

آیت ۵۷ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۵۸ ﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ ”وہ ایسی ہوں گی گویا لعل اور موتے ہوں۔“  
 ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۶۰ ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ ”کیا بھلائی کا بدلہ بھلائی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟“

نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے جو قربانیاں دیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے حوالے سے انہوں نے جو مشقتیں اٹھائیں ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کا بدلہ تو دینا ہے۔ لہذا جنت کی مذکورہ نعمتوں کی صورت میں انہیں بدلہ دے کر اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں اور کوششوں کی قدر افزائی فرمائے گا۔

آیت ۶۱ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۶۲ ﴿وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَيْنِ﴾ ”اور ان سے پرے دو جنتیں اور بھی ہیں۔“  
 مفسرین نے ان دو جنتوں کی مختلف توجیہات کی ہیں لیکن جیسا کہ قبل ازیں آیت ۳۶ کی تشریح میں ذکر ہو چکا ہے میرے نزدیک ان میں سے دو جنتیں جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ نچلے درجے میں ہیں اور دو جنتیں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ اونچے درجے میں ہیں۔ اہل جنت کے ان درجات کی وضاحت اگلی سورت یعنی سورۃ الواقعة میں ملے گی (یاد رہے کہ سورۃ الرحمن اور سورۃ الواقعة کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے)۔ سورۃ الواقعة میں اہل جہنم (أَصْحَابُ الشَّمَالِ) کے مقابلے میں اہل جنت کے دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو أَصْحَابُ الِیْمَنِ (دائیں جانب والوں) کا ہے۔ ان کے لیے الگ جنت کا ذکر ہے جو نسبتاً نچلے درجے کی جنت ہوگی۔ جبکہ دوسرا گروہ مقررین بارگاہ کا ہے: ﴿وَالسَّبْقُونَ السَّبْقُونَ﴾ ۱۵ اُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۱۶ ”اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہ تو بہت مقرب ہوں گے۔“ یہ وہی خوش نصیب لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ التوبہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَالسَّبْقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

”اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکو کاری کے ساتھ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اُس نے ان کے لیے وہ باغات

تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔“  
 سورۃ الواقعة میں ان مقررین بارگاہ کے لیے بہت خصوصی انداز میں جنت کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے لیے بہت اونچے درجے کی جنت ہوگی۔ چنانچہ میری رائے میں سورۃ الرحمن کی آیت ۴۶ میں جن دو جنتوں (جنتوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ) کا ذکر ہوا ہے وہ اصحاب الیمین کے لیے ہیں جبکہ زیر مطالعہ آیات میں جنتوں اور انسانوں میں سے مقررین بارگاہ کی جنتوں کا ذکر ہونے جا رہا ہے۔

**آیت ۶۳ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۶۴ ﴿مُلْهُمَا مَتْنِ﴾** ”دونوں گہرے سبز رنگ کی ہوں گی۔“  
 ان دونوں جنتوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوگا۔ یعنی بہت گھنی اور سرمبز و شاداب۔ اس رنگ کے ذکر کی توجیہ آگے آیت ۶۸ کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

**آیت ۶۵ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۶۶ ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتِنِ﴾** ”ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے۔“  
 یعنی ہر جنت میں ایک ایک ایسا چشمہ ہوگا۔

**آیت ۶۷ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۶۸ ﴿فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ﴾** ”ان دونوں میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے۔“  
 ان جنتوں کی کیفیت کے بیان میں ایک طرف گویا عجمی پسند کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف عربی ذوق کی عکاسی۔ عجمی علاقوں کے درختوں اور باغات کے جوین کا کمال یہ ہے کہ ان کے سبز پتوں کا رنگ گہرا ہوتے ہوتے سیاہی مائل ہو جائے۔ ایسے درختوں اور پودوں کا سایہ بھی مثالی ہوتا ہے اور ان کے پھلوں کی پیداوار اور کوالٹی بھی بہترین ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمین عرب خصوصاً نزولِ قرآن کے علاقے حجاز کے ذوق کے مطابق ایک مثالی باغ کا نقشہ بھی دکھایا گیا ہے۔ یعنی پہاڑی ڈھلوان سے اُبلتا ہوا چشمہ، چشمے کے نشیب میں کھجور اور انار کے درختوں کا جھنڈ اور ان درختوں کے جھرمٹ میں انگور کی لہلہاتی بیلیں!

**آیت ۶۹ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

**آیت ۷۰ ﴿فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾** ”ان میں ہوں گی نہایت نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں۔“  
**آیت ۷۱ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾** ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۷۲ ﴿حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِی الْحِیَامِ ۝﴾ ”یعنی حوریں جو قیام پذیر ہوں گی خیموں میں۔“

یہاں پر ”خیموں“ کا ذکر خصوصی طور پر عرب کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب میں شہروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور زیادہ تر لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ اس لیے یہاں پر گھریا محل کے بجائے خیمے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ﴿مَّقْصُورَاتٌ فِی الْحِیَامِ﴾ کے الفاظ میں ﴿وَقُرْنَنَ فِی بُیُوتِکُنَّ﴾ (الاحزاب: ۳۳) کے حکم کی عملی جھلک دکھائی دیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل عورت کا وہ روپ ہے جس روپ میں اسلام اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام عورت کو ”چراغ خانہ“ بن کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ”شمع محفل“ بننے سے منع کرتا ہے۔ یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائق توجہ ہے کہ ان آیات میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہو رہا ہے ان میں ”حوریں“ ہوں گی جبکہ قبل ازیں جن جنّتوں کا ذکر ہوا تھا ان میں حوروں کا نہیں بلکہ ”جنتی عورتوں“ کا تذکرہ تھا: ﴿فِیْہُنَّ فَصْرٰتٌ ظُفْرِیَّۃٌ﴾ ”ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔“ اسی طرح سورۃ الواقعہ میں اصحاب الیمین کی جنت میں خوبصورت عورتوں ﴿اِنَّا اَنْشَاْنَهُنَّ اِنْشَاۗءً ۝﴾ کا ذکر ہے جبکہ ”مقربین“ کے لیے جنت کے حوالے سے ”حُورٌ عِیْنٌ“ (آیت ۷۲) کا تذکرہ ہے۔

آیت ۷۳ ﴿فَبَآئِیَ الْاَیِّ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَنِ ۝﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۷۴ ﴿لَمْ یَطْمِئِنَّۤ اَنْسُ قَبْلَہُمْ وَلَا جَاۗءَ ۝﴾ ”نہیں چھو ہوا گا ان سے پہلے انہیں نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔“

یہاں خصوصی طور پر جن اور انسان کے ذکر سے بھی میری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ جنوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا بیان ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنوں کی جنت کی حوروں کو ان کے خاوندوں سے پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا اور انسانوں کی جنت کی حوروں کو قبل ازاں کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔

آیت ۷۵ ﴿فَبَآئِیَ الْاَیِّ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَنِ ۝﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۷۶ ﴿مَنْکِبَیْنِ عَلٰی رُفْرِیْ خُضْرٍ وَعَبْقَرِیَّ حَسٰنٍ ۝﴾ ”وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مندوں اور بہت نفیس بچھونوں پر۔“

آیت ۷۷ ﴿فَبَآئِیَ الْاَیِّ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَنِ ۝﴾ ”تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟“

آیت ۷۸ ﴿تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۝﴾ ”بہت بابرکت نام ہے تیرے رب کا جو بہت عظمت والا بہت اکرام والا ہے۔“



# سُورَةُ الْوَاقِعَةِ

## تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الرحمن کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے، سورۃ الرحمن اور سورۃ الواقعة کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ان سورتوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت بہت گہری ہے۔ دونوں سورتیں اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت، رسالت یا وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ دونوں سورتیں اللہ تعالیٰ کی صنایع و خلاقیت کے تذکرے، جنت و دوزخ کے احوال، آیاتِ انفسی و آفاقی کے بیان اور تذکیرِ بآلاء اللہ جیسے مضامین کی حامل ہیں۔ یہ مضامین ان دونوں سورتوں میں عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۴۰

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۚ لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۖ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۚ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۚ وَبَسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۚ فَكَانَتْ هَبَاءً مُثْبَتًا ۚ وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۚ فَأَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ وَالْمُشْمِئَةَ ۖ مَا أَصْحَبُ الْمُشْمِئَةَ ۖ وَالشَّقِيقُونَ ۖ أُولَئِكَ الْمَقَرُّونَ ۖ فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ ۖ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ۖ وَقَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ ۖ عَلَى سُرُرٍ مَوْضُونَةٍ ۖ مُتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ ۖ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخْتَلِفُونَ ۖ يَكُوبُ آبَارُئِيلُ ۖ وَكَأْسٌ مِنْ مَعِينٍ ۖ لَا يَصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُزْفُونَ ۖ فَبِأَكْهَةِ مِمَّا يَخْتَارُونَ ۖ وَلَحْمٌ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۖ وَحُورٌ عِينٌ ۖ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۖ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۖ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ۖ وَأَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ فِي سِدْرٍ مَقْصُودٍ ۖ وَطَلْحٍ مَبْدُودٍ ۖ وَظِلٌّ مَبْدُودٍ ۖ وَمَاءٌ مَسْكُوبٌ ۖ وَفَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ ۖ لَا تَمْقُوعَةٌ وَلَا مَمْنُوعَةٌ ۖ وَقُرُشٌ مَرْفُوعَةٌ ۖ إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنِشَاءً ۖ فَجَعَلْنَهُنَّ أَبْكَارًا ۖ عُرُبًا أَتْرَابًا ۖ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ۖ وَثَلَاثَةٌ مِنَ الْآخِرِينَ ۖ



**آیت ۱** ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱﴾ ”جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔“

اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ ”جب وہ وقوع پذیر ہونے والی وقوع پذیر ہو جائے گی۔“ یعنی جس قیامت کی خبر تم لوگوں کو دی جا رہی ہے جب وہ آجائے گی۔

**آیت ۲** ﴿لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَذِبٌ ۝۲﴾ ”(اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“ یعنی وہ ہر صورت وقوع پذیر ہو کر رہے گی۔

**آیت ۳** ﴿خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ ۝۳﴾ ”وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔“

بہت سے ایسے لوگ جو دنیا میں بہت بلند مقام و منصب کے مالک تھے قیامت انہیں ذلیل و سوا کر دے گی۔ اس کے برعکس کئی فقراء و مساکین جن کا دنیا میں کوئی پُرساں حال نہیں تھا اس دن بہت بلند مقامات پر فائز نظر آئیں گے۔ اُس دن حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابودرداءؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور دوسرے فقراء صحابہؓ کو ایسے اعلیٰ مراتب عطا ہوں گے جن کے بارے میں آج ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

**آیت ۴** ﴿إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۝۴﴾ ”جب زمین ہلا ڈالی جائے گی جیسے کہ زلزلہ آتا ہے۔“

**آیت ۵** ﴿وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًا ۝۵﴾ ”اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔“

**آیت ۶** ﴿فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًا ۝۶﴾ ”پس وہ ہو جائیں گے اُڑتا ہوا غبار۔“

**آیت ۷** ﴿وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۝۷﴾ ”اور تم تین گروہوں میں منقسم ہو جاؤ گے۔“

ان تین گروہوں کا ذکر بالواسطہ طور پر سورۃ الرحمن میں دو جنتوں کے حوالے سے ہوا ہے۔ یعنی اہل جہنم نکلے درجے کی جنت کے مستحق اور اونچے درجے کی جنت کے باسی۔

**آیت ۸** ﴿فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۚ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸﴾ ”تو جو داہنے والے ہوں گے، کیا خوب ہوں گے وہ داہنے والے!“

داہنے والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا ہوگا — یا تم لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ داہنے والے لوگ کون ہوں گے ان کی کیا شان ہوگی اور وہ کس کیفیت میں ہوں گے۔ مَيْمَنَةُ ”میں“ سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور ”یمن“ سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی برکت اور خوش نصیبی کے ہیں۔ اس اعتبار سے أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ کا ترجمہ مبارک لوگ یا خوش نصیب اور نیک بخت لوگ بھی ہو سکتا ہے۔

**آیت ۹** ﴿وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۚ مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝۹﴾ ”اور جو بائیں والے ہوں گے، تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا!“

مَشْأَمَةُ ”شام“ سے ہے، جس کے معنی بد نصیبی اور نحوست کے ہیں۔ عربوں کے ہاں جس طرح داہنی جانب خوش قسمتی اور برکت کی علامت سمجھی جاتی تھی اسی طرح بائیں جانب کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان دونوں مادوں میں مستقل طور پر برکت اور نحوست کے معنی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ

کا دوسرا ترجمہ بدقسمت، بد بخت اور برے لوگ بھی کیا گیا ہے۔ اردو لفظ ”شوم“ (شومی قسمت وغیرہ) بھی اسی سے مشتق ہے۔ بہر حال دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو دربار الہی میں بائیں جانب کھڑے کر دیے جائیں گے اور بہت برے انجام سے دوچار ہوں گے۔

**آیت ۱۰** ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ﴾ ”اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔“

**آیت ۱۱** ﴿أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ﴾ ”وہی تو بہت مقرب ہوں گے۔“

یعنی تیسرا گروہ مقربین بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے قرب سے نوازنا چاہتا ہے اور اس کے لیے قرآن میں جا بجا ترغیبیں انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں تو امر کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ﴾ (آیت ۳۵) کہ تم اس کا قرب تلاش کرو اور اس کے لیے اس کی راہ میں جہاد کرو۔ ظاہر ہے جو کوئی اللہ کی راہ میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے گا اللہ تعالیٰ اسے ضرور اپنے مقربین میں شامل فرمائیں گے۔

**آیت ۱۲** ﴿فَإِذَا جَاءَتْ النَّعِيمُ﴾ ”یہ نعمتوں والے باغات میں ہوں گے۔“

**آیت ۱۳** ﴿ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ﴾ ”یہ بڑی تعداد میں ہوں گے پہلوں میں سے۔“

**آیت ۱۴** ﴿وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾ ”اور تھوڑے ہوں گے پچھلوں میں سے۔“

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں اولین سے پہلی امتیں اور آخرین سے یہ امت مراد ہے۔ لیکن اگر اس مفہوم کو درست سمجھا جائے تو اس سے النایہ ثابت ہوگا کہ پہلی امتیں اس امت کے مقابلے میں بہتر اور افضل تھیں۔ اس لیے زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو ہر امت کے اولین اور آخرین سے متعلق سمجھا جائے۔ یعنی ہر امت کے اولین (ہر نبی کے ابتدائی پیروکاروں) میں سے مقربین کی تعداد زیادہ ہوگی جبکہ ہر امت کے آخرین میں سے بہت کم لوگ اس درجے تک پہنچ پائیں گے۔ اور یہی معاملہ اس امت کا بھی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((إِنَّ خَيْرَكُمْ قُرْبَى، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ))<sup>(۱)</sup> یعنی اس امت کا بہترین زمانہ حضور ﷺ کا زمانہ تھا۔ اس دور کے لوگ کثیر تعداد میں مقربین بارگاہ کے درجے تک پہنچے کیونکہ جس قدر قربانیاں ان لوگوں نے دیں جتنے زمانہ کے لوگوں نے نہیں دیں۔ تاہم یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یعنی ہر دور میں لوگ صدیقین کے مقام تک بھی پہنچیں گے اور شہادت عظمیٰ کا درجہ بھی حاصل کریں گے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوگی جبکہ زیادہ تر مومنین ”صالحین“ کے درجے تک پہنچ پائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ وَالْآخِرُونَ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ.....﴾ (آیت ۱۰۰) ”اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ و متعدد مقامات ح: ۶۴۲۸، ۶۶۹۵۔

و صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم، ح: ۲۵۳۵۔ واللفظ له۔

انصار میں سے، اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی احسان کے ساتھ.....“ یعنی ”سابقون الاولون“ تو آگے نکل جانے والے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ اسی راستے پر ان کے پیچھے آنے والے بھی ہوں گے۔ یہ عام مومنین صالحین ہوں گے جنہیں آیات زیر مطالعہ میں اصْحَابُ الْمُئِمَّنَةِ اور اصْحَابُ الْيَمِينِ کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ ہر امت کے پہلے دور کے اہل ایمان میں سے نسبتاً زیادہ لوگ ”مقرنین“ ہونے کی سعادت حاصل کریں گے جبکہ بعد کے ادوار میں بہت کم لوگ اس درجہ تک پہنچ پائیں گے۔ جیسے آج حضور ﷺ کی امت کی تعداد ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہے لیکن ان میں مقرنین آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوں گے۔

**آیت ۱۶۱۵** ﴿عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ۖ مَّتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَبِّلِينَ ۝۱۵﴾ ”جڑاؤ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے آمنے سامنے۔“

**آیت ۱۷** ﴿يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۝۱۷﴾ ”ان پر گردش کر رہے ہوں گے وہ لڑکے جو سدا اسی طرح رہیں گے۔“

عام طور پر گھروں میں چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ملازم رکھا جاتا ہے اور وہ آپ کے مزان اور ذوق سے واقف ہو جاتے ہیں، لیکن بڑے ہونے پر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جبکہ جنت میں چھوٹے لڑکے (غلمان) جو اہل جنت کی خدمت پر مامور ہوں گے وہ ”بڑے“ نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ لڑکپن کی عمر میں ہی رہیں گے۔

**آیت ۱۸** ﴿بِالنَّكَاحِ وَالْإِبْرَاقِ ۚ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝۱۸﴾ ”آب خورے، صراحیاں اور شراب خالص کے جام لیے ہوئے۔“

اہل جنت کی مغفلوں میں خوبصورت غلمان نہایت شفاف قسم کی شراب کے مینا و جام لیے ہر وقت محو گردش رہیں گے۔

**آیت ۱۹** ﴿لَّا يَصْطَعُونَ عَلَيْهَا وَلَا يَنْزِفُونَ ۝۱۹﴾ ”(اس سے) نہ تو ان کے سروں میں کوئی گرانی ہوگی اور نہ ہی وہ بہکیں گے۔“

دنیا کی شراب پینے سے تو سر چکرانے لگتا ہے اور آدمی مدہوش ہو جاتا ہے، بہکی، بہکی باتیں کرنے لگتا ہے، لیکن جنت کی ”شراب طہور“ کو اس شراب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ایسی کسی خرابی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

**آیت ۲۰** ﴿وَلَا كِهَافٌ مِّمَّا يَتَخِفُّونَ ۝۲۰﴾ ”اور میوے جو وہ پسند کریں گے۔“

**آیت ۲۱** ﴿وَلَنَحْمِ طَيْرٌ مِّمَّا يَشْتَبُونَ ۝۲۱﴾ ”اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں گے۔“

خوب صورت ابدی لڑکے یہ سب نعمتیں اہل جنت کی خدمت میں پیش کر رہے ہوں گے۔

**آیت ۲۲** ﴿وَحُودٌ حِينٍ ۝۲۲﴾ ”اور حوریں ہوں گی بڑی بڑی آنکھوں والی۔“

نوٹ کیجیے یہاں اس جنت کی نعمتوں میں حوروں کا ذکر بھی ہوا ہے لیکن اگلی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کے تذکرے میں ”حُود“ کا لفظ نہیں آیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمن میں نچلے درجے کی جنت کا ذکر پہلے

جبکہ حوروں والی جنت (اونچے درجے کی جنت) کا ذکر بعد میں آیا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین کی اسی ترتیب کو میں نے ابتدا میں عکسی ترتیب (mirror image) کا نام دیا ہے۔

**آیت ۲۳** ﴿كَامَنَآلِ اللَّوْثُ الْكَوْنُ الْمَكْنُونِ﴾ ”جیسے موتی ہوں چھپا کر رکھے گئے۔“

**آیت ۲۴** ﴿جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ”یہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے۔“

یہ ان قربانیوں کا صلہ ہوگا جو انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے دی ہوں گی۔

**آیت ۲۵** ﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيَمًا﴾ ”وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغوبات اور نہ ہی کوئی الزام۔“

**آیت ۲۶** ﴿إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا﴾ ”مگر (ان کے لیے) ہر طرف سے (سلام سلام ہی کی آوازیں ہوں گی۔“

یہ تو تمام ترین اور ان کی جنت کا بیان اب آگے اصحاب الیمین اور ان کی جنت کا ذکر ہے۔

**آیت ۲۷** ﴿وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ﴾ ”اور اصحاب الیمین! کیا کہنے ہیں اصحاب الیمین کے!“

**آیت ۲۸** ﴿فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ﴾ ”وہ ہوں گے بیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔“

**آیت ۲۹** ﴿وَوُطِّحَ مَصْنُودٍ﴾ ”اور تہہ برتہ کیلے۔“

**آیت ۳۰** ﴿وَوُطِّئَ مَمْدُودٍ﴾ ”اور پھیلے ہوئے سائے۔“

**آیت ۳۱** ﴿وَمَاءٌ مَّسْكُوبٍ﴾ ”اور بہتا ہوا پانی۔“

**آیت ۳۲** ﴿وَفَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ﴾ ”اور کثرت کے ساتھ میوے۔“

**آیت ۳۳** ﴿لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ﴾ ”نہ ٹوٹے ہوئے اور نہ ہی پہنچنے سے باہر۔“

جنت کے پھل درختوں سے توڑ کر انہیں پیش نہیں کیے جائیں گے بلکہ جب وہ پھل حاصل کرنا چاہیں گے

درخت خود ان کے سامنے جھک جائیں گے۔ تمام پھل بکثرت بے روک ٹوک ملیں گے۔ کوئی پھل ایسا نہیں ہوگا جو ان کی پہنچ سے باہر ہو یا اسے کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہو۔

**آیت ۳۴** ﴿وَفُورٍ شَرْفُوعَةٍ﴾ ”اور اونچے اونچے بچھونے۔“

**آیت ۳۵** ﴿إِنَّا أَنشَأْنَهُمْ إِنِشَاءً﴾ ”ان (کی بیویوں) کو اٹھایا ہے ہم نے بڑی اچھی اٹھان پر۔“

**آیت ۳۶** ﴿فَجَعَلْنَهُمْ أَبْنَاءَ﴾ ”پس ہم نے بنایا ہے انہیں کنواریاں۔“

**آیت ۳۷** ﴿عُرُبًا أَتْرَابًا﴾ ”پیارے دلائے والیاں ہم عمر۔“

**آیت ۳۸** ﴿لَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ﴾ ”(یہ سب کچھ ہوگا) اصحاب الیمین کے لیے۔“

آیت ۳۹ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ﴾ ”جو پہلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔“

آیت ۴۰ ﴿وَكُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾ ”اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔“

اب اس کے بعد اہل جہنم کا تذکرہ ہے۔

## آیات ۴۱ تا ۵۶

وَأَصْحَابُ السَّمَاءِ ۖ مَا أَصْحَابُ السَّمَاءِ ۖ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ۖ وَظِلٍّ مِّنْ يَحْمُومٍ ۖ  
لَّا بَارِدٌ وَلَا كَرِيمٌ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ ۖ وَكَانُوا يُصْرُؤْنَ عَلَى الْجَنبِ  
الْعَظِيمِ ۖ وَكَانُوا يَقُولُونَ ۖ إِذَا دُمْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَبَعُودُونَ ۖ أَوَابَاؤُنَا  
الْأَوَّلُونَ ۖ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ۖ لَجَمْعُوعُونَ ۖ إِلَىٰ مِيقَاتٍ يَوْمَ مَعْلُومٍ ۖ  
ثُمَّ نَأْتِيهِمُ الصَّاكُونَ الْمَكْذِبُونَ ۖ لَا كَلِمَٰتٍ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ رَّقُومٍ ۖ فَبَالِئُونَ مِنْهَا  
الْبُطُونَ ۖ فَشَرِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ۖ فَشَرِبُونَ شُرْبَ الْهَيْمِ ۖ هَذَا نَزَّلْنَاهُمْ يَوْمَ  
الدِّينِ ۖ

آیت ۴۱ ﴿وَأَصْحَابُ السَّمَاءِ ۖ مَا أَصْحَابُ السَّمَاءِ﴾ ”اور بائیں والے! کیا (ہی برا) حال ہوگا بائیں والوں کا!“

آیت ۴۲ ﴿فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ﴾ ”وہ ہوں گے تیز لو اور کھولتے ہوئے پانی میں۔“

آیت ۴۳ ﴿وَوَظِلٍّ مِّنْ يَحْمُومٍ﴾ ”اور کالے دھوئیں کے سائے میں۔“

آیت ۴۴ ﴿لَّا بَارِدٌ وَلَا كَرِيمٌ﴾ ”نہ وہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی سکون بخش۔“

آیت ۴۵ ﴿إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ﴾ ”یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) بڑے خوشحال تھے۔“  
دنیا میں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ وہاں انہوں نے خوب مزے کیے۔

آیت ۴۶ ﴿وَكَانُوا يُصْرُؤْنَ عَلَى الْجَنبِ الْعَظِيمِ﴾ ”اور یہ اصرار کرتے تھے بہت بڑے گناہ پر۔“  
بہت بڑے گناہ سے یہاں شرک مراد ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ النساء میں حتمی فیصلہ دیا جا چکا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (آیت ۴۸) کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ کیے گئے شرک کو کبھی نہیں بخشنے گا اس کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَكَانُوا يَقُولُونَ ۖ إِذَا دُمْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَبَعُودُونَ﴾ ”اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کیا ہم جب مرجائیں گے اور ہوجائیں مٹی اور ہڈیاں تو کیا پھر سے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟“

آیت ۴۸ ﴿أَوَابَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ﴾ ”اور کیا ہمارے آباء و اجداد بھی جو پہلے گزر چکے ہیں؟“

**آیت ۴۹** ﴿قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ﴾ (اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یقیناً پہلے بھی اور پچھلے بھی۔  
**آیت ۵۰** ﴿لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ (لا زماناً جمع کیے جائیں گے ایک مقرر دن کے طے شدہ وقت پر۔)

**آیت ۵۱** ﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيْهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ﴾ (پھر تم اے گمراہ اور جھٹلانے والو!)  
**آیت ۵۲** ﴿لَا تَكُونُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زُقُومٍ﴾ (ضرور کھاؤ گے زقوم کے درخت سے۔)  
 تم بھٹکے ہوئے تھے ہم نے تمہاری راہنمائی کے لیے اپنا رسول بھیجا کتاب ہدایت بھیجی: ﴿تَبَصَّرْهُ وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ﴾ (ق) یہ سب کچھ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہمارے رسول کو بھی جھٹلادیا، ہماری کتاب کی بھی تکذیب کی اور گمراہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ تو اے بھٹکے ہوئے اور ہماری ہدایت کو جھٹلانے والے لوگو! اب جہنم کے اندر تمہاری ضیافت زقوم کے درخت سے ہی کی جائے گی۔<sup>(۱)</sup>

**آیت ۵۳** ﴿فَمَالَتُونُ مِنْهَا الْبُطُونَ﴾ (پس اسی سے تم اپنے پیٹ بھرو گے۔)  
**آیت ۵۴** ﴿فَقَسِرْبُونُ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ﴾ (پھر پیو گے اس پر کھولتا ہوا پانی۔)  
**آیت ۵۵** ﴿فَقَسِرْبُونُ شَرِبَ الْهَلِيمِ﴾ (اور ایسے پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے۔)  
 جس طرح پیاس زدہ اونٹ جلدی جلدی اپنے پیٹ میں پانی بھرتا چلا جاتا ہے تم بھی وہ کھولتا ہوا پانی اسی طرح اپنے پیٹ میں بھرو گے۔

**آیت ۵۶** ﴿هَٰذَا نَزْلُهَا يَوْمَ الدِّينِ﴾ (یہ ہوگی ان کی ابتدائی ضیافت جزا کے دن۔)

(۱) زقوم کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُوا أَنْ قُسْفَرَةَ مِنَ الزُّقُومِ قُطِرَتْ فِي دَارِ الدُّنْيَا لَا فَسَدَتْ عَلَىٰ أَهْلِ الدُّنْيَا مَعَايِشُهُمْ فَكَيْفَ يَمُنُ بِكَوْنِ طَعَامَهُ)) (سنن الترمذی، ابواب صفة جہنم، باب ما جاء فی صفة شراب اہل النار)  
 ”اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا میں پڑا دیا جائے تو دنیا والوں کے لیے ان کی زندگی برباد کر دے، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کی غذا ایسی یہی ہوگی!“

”زقوم“ صحراے عرب کا ایک درخت ہے، جس کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:  
 ”زقوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہام کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے، پونا گوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سارس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو دورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔“ (تفہیم القرآن، جلد ۳، ص ۲۸۹)

اس کے بارے میں مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں:

”بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں، لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے، اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی انہی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا، لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کرہہ النظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم!“ (معارف القرآن، جلد ۷، ص ۲۳۱)

یہاں پر ان تینوں گروہوں کا بیان مکمل ہو گیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمن میں جہنم اور جنت کے حوالے سے ان تینوں گروہوں کا تذکرہ سورۃ کے آخر میں آیا تھا، جبکہ یہاں ان کا ذکر سورت کے آغاز میں آیا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں کے مضامین معکوس ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اسی عکسی ترتیب کے تحت اب سورت کے دسرے رکوع میں وہ مضمون آرہا ہے جو سورۃ الرحمن کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الرحمن کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی خلاق اور صناعی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے، زمین بنائی، زمین میں دریا چلائے، سمندر پھیلانے۔ دریاؤں اور سمندروں کی تہوں میں عجیب و غریب قسم کے موتی اور مونگے پیدا کیے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے جہازوں کا پانی کی سطح پر تیرنا ممکن بنایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ اسی انداز سے یہاں اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صناعی کا ذکر ہونے جا رہا ہے، لیکن پے درپے سوالات کے ساتھ بہت ہی خوبصورت اور موثر انداز میں:

### آیات ۷۵ تا ۷۴

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تَصَدَّقُوْنَ ۝ اَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُوْنَ ۝ اَانتُمْ تَخْلُقُوْنَۙ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ عَلٰی اَنْ تُبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْاُولٰۤیٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ۝ اَانتُمْ تَزْرَعُوْنَۙ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُعْرِضُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُوْنَ ۝ اَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ اَانتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْعَزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنٰهُ اَجَاٰجًا فَلَکُمْ لَشُکْرُوْنَ ۝ اَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُورُوْنَ ۝ اَانتُمْ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذٰکِرًا ۙ وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ ۝

عج

**آیت ۷۵** ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تَصَدَّقُوْنَ ۝﴾ ”ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، تو تم لوگ تصدیق کیوں نہیں کرتے؟“

جب یہ تسلیم کرتے ہو کہ تم سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو پھر تم لوگوں کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ وہی اللہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں آخر تعجب اور شک والی کون سی بات ہے؟

**آیت ۷۸** ﴿اَفَرَأٰی تُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝﴾ ”کیا تم نے کبھی غور کیا اس پر جو (منی) تم نکال دیتے ہو؟“  
**آیت ۷۹** ﴿اَانتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝﴾ ”کیا اس کی تخلیق تم کرتے ہو یا ہم تخلیق کرنے والے ہیں؟“

تم تو پانی کی وہ بوند نکال کر فارغ ہو جاتے ہو۔ اس کے بعد رحم مادر میں ایک حیرت انگیز تخلیقی عمل کا آغاز

ہو جاتا ہے۔ وہ نطفہ علقہ میں تبدیل ہوتا ہے علقہ سے مغضہ بنتا ہے۔ پھر ہڈیاں بنتی ہیں جوڑ بند درست ہوتے ہیں آنکھوں کانوں اور دوسرے اعضاء کا نقشہ تیار ہوتا ہے اور یہ سارا عمل تین پردوں ﴿فَہِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٌ﴾ (الزمر: ۶) کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ کیا اس سارے عمل میں تمہارا بھی کوئی حصہ ہے؟ ماں کے پیٹ میں مختلف پیچیدہ تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے بچے کے کسی عضو کے بنانے میں کیا کوئی تمہارا کردار بھی ہے؟ یا اس کی تذکیر و تانیث میں تمہارا کچھ اختیار ہے؟ ظاہر ہے اس پورے تخلیقی عمل میں تمہارا حصہ یا کردار بالکل نہیں ہے اور تم تسلیم کرتے ہو کہ نہیں ہے تو پھر اس حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتے ہو کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی و نشاء اور صنای و خلاقی کا مظہر ہے۔

جب ہم ان آیات کی تلاوت کریں تو ہر سوال کے جواب میں عجز و انکساری سے عرض کرنا چاہیے: بَلْ اَنْتَ یٰاَدَبُ! کہ اے میرے پروردگار! یہ سب تیری کاریگری، تیری صنای اور تیری خلاقی کا مظہر ہے اس میں سے ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں۔ (تفسیر عثمانی کے مطابق بعض روایات کی بنا پر علماء نے یہ مستحب سمجھا ہے۔)

**آیت ۶۰، ۶۱ ﴿نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُورِیْنَ ۝ عَلٰی اَنْ تُبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ﴾**

”ہم نے تمہارے مابین موت کو ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں“

یہ مقام بھی مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بہر حال اس کی ایک توجیہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دو انسانی زندگیوں اور ان کے درمیان طے شدہ موت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک دنیا کی زندگی ہے اور دوسری آخرت کی زندگی اور درمیان میں اللہ تعالیٰ نے موت کا پردہ حائل کر دیا ہے۔ موت کی اس سرحد کے اس طرف بھی تم ہو اور دوسری طرف بھی تم ہو۔ گویا موت کے وقفے کے بعد زندگی کا تسلسل پھر سے بحال ہو جائے گا۔ بقول شاعر۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم تو مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے جبکہ اس کی روح کو موت نہیں آتی، روح زندہ رہتی ہے۔ قیامت میں انسان کو جس جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا وہ بعینہ اس کا دنیا والا جسم نہیں ہوگا، بلکہ ”اس جیسا“ جسم ہوگا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ انسان کا دنیوی زندگی والا جسم تو اس زندگی میں بھی مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ زندہ جسم کے اربوں خلیے مسلسل ختم ہوتے رہتے ہیں اور ایسے ہی نئے خلیے مسلسل بنتے رہتے ہیں۔ جلد کی جھلی بھی بدلتی رہتی ہے اور ناخن بھی لگاتار گھٹتے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ اس عمل کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایک انسان کا چند سال پہلے جو جسم تھا آج اس کا جسم وہ نہیں ہے اور جو جسم اس کا آج ہے چند سال بعد بعینہ یہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب انسان کا جسم مسلسل تبدیل ہو رہا ہے تو آخرت میں اسے بعینہ دنیا والا جسم ملنا ویسے ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان کو آخرت میں دنیا والا جسم ملے گا تو پھر اس سوال کا جواب بھی دینا پڑے گا کہ وہ اس کا کون سا جسم ہوگا؟ بیس برس کی عمر والا؟ چالیس سال کی عمر والا؟ یا ساٹھ سال کی عمر والا؟ لہذا یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف



ہے کہ انسان کو دوبارہ دنیا دالے جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔

چنانچہ آخرت میں انسان کو دنیا کے جسم جیسا جسم دیا جائے گا اور اس کی روح کو اس کے اس جسم سے ملا کر اسے نئی زندگی بخشی جائے گی۔ یہ مضمون قرآن میں تین مقامات (بنی اسرائیل: ۹۹، یس: ۸۱، الدھر: ۲۸) پر آیا ہے۔ بہر حال دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انسان کی جان اور روح جب نئے جسم میں منتقل ہو جائے گی تو اس کے شعور اور اس کی یادداشت کا دنیوی تسلسل یعنی بحال کر دیا جائے گا۔ دنیا میں وہ کیا تھا؟ وہاں اس نے کب کیا کیا تھا؟ زندہ ہوتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔ کیونکہ دنیوی زندگی کے دوران اس کا جسم تو بدلتا رہا تھا لیکن اس کے شعور ذات کا تسلسل بغیر کسی خلل کے آخر تک برقرار رہا تھا۔ اس لیے وہ سلسلہ موت کے باعث جہاں سے ٹوٹا تھا عین وہیں سے اسے جوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ان آیات کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! تمہاری دوزندگیوں کے درمیان ہم نے ہی موت کا پردہ حائل کر رکھا ہے، تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم جیسے وجود دوبارہ پیدا کر دیں۔ ﴿وَنُنشِئُكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ اور تمہیں ایسی تخلیق میں اٹھائیں جسے تم نہیں جانتے! اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ تمہیں ہم ایسے عالم میں اٹھا کھڑا کریں گے جس کی کیفیت سے آج تم واقف نہیں ہو یعنی عالم آخرت میں۔

**آیت ۲۲** ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ﴾ اور تم (اپنی) پہلی زندگی کے بارے میں تو جانتے ہی ہو“ یعنی اپنی دنیوی تخلیق سے متعلق تمام مراحل کے بارے میں تو تم جانتے ہو۔ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے، سورۃ المؤمن کی یہ آیات اس موضوع پر قرآن کے ذرۂ شام کا درجہ رکھتی ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلْطَةٍ مِنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُفُفًا ۝ فَنِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّفُفَ عَلَقَةً ۝ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۝ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۝ فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝﴾

”ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔ پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل دے دی، پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پراٹھا دیا۔ پس بڑا بارکست ہے اللہ تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔“

تو جب اس حیرت انگیز اور پیچیدہ تخلیقی عمل کے مختلف مراحل تمہارے علم اور مشاہدے میں آچکے ہیں:

﴿فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ﴾ ”تو پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟“

تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ تم اس سے نصیحت اور یاد دہانی کیوں اخذ نہیں کرتے؟ — اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صنایع کے ان مظاہر کا ادراک کر لینے کے بعد بھی تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جس اللہ نے اس عمل سے گزار کر ہمیں ابتدا میں پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی ہمیں پیدا کر سکتا ہے؟ آئندہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی کی چند اور مثالیں بیان کی جا رہی ہیں:

**آیت ۶۳** ﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ﴾ ”کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو؟“

تم لوگ تو بیج کو مٹی میں دبا کر آجاتے ہو۔ اس کے بعد تم کیا جانو کہ وہ بیج کس کس مرحلے سے گزرتا ہے کس طرح اس کی جڑیں نکل کر زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور کس طرح اس کی کوٹلیں زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہیں!

**آیت ۶۴** ﴿أَأَنْتُمْ تَرْزُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الرَّزَّاعُونَ﴾ ”کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟“

یہاں ہماری زبانوں پر بے اختیار یہ الفاظ آجانے چاہئیں: بَلْ أَنْتَ يَارَبِّ! کہ نہیں! اے ہمارے پروردگار! اسے تو ہی اُگاتا ہے اس میں ہمارا کچھ بھی اختیار نہیں! علامہ اقبال کی نظم اَلْأَرْضُ لِلّٰہ کے درج ذیل اشعار میں ان ہی آیات کے اسلوب اور مضمون کی جھلک نظر آتی ہے:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟  
کون لایا کھینچ کر پچھتم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟  
کس نے بھری مودیتوں سے خوشہ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلایا ہے خوئے انقلاب؟  
دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں! تیرے آباء کی نہیں تیری نہیں میری نہیں!  
یعنی یہ زمین، یہ کائنات، کائنات کا پورا نظام یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے اور اسی کی قدرت و مشیت سے اس کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔

**آیت ۶۵** ﴿لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا﴾ ”اگر ہم چاہیں تو اسے چوراچورا کر دیں“  
اگر ہم چاہیں تو کسی آسمانی آفت طوفان، بھٹکریا ڈالہ باری سے تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری لہلہاتی فصلوں کو برباد کر کے رکھ دیں۔

﴿فَقُلْنِمُ تَفْكُهُوْنَ﴾ ”پھر تم بیٹھے رہو باتیں بناتے ہوئے۔“  
**آیت ۶۶** ﴿إِنَّا لَمُعْرِضُونَ﴾ ”(کہہ لو جی!) ہم پر تو بڑا تادوان پڑ گیا۔“  
کہہ ہم نے محنت کی، ہل چلائے، بیج ڈالا، آبیاری کی اور بہت سے دوسرے اخراجات کیے، لیکن ہم پر تو الٹی جٹی پڑ گئی۔

**آیت ۶۷** ﴿بَلْ نَحْنُ مُحَرِّضُونَ﴾ ”بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو کر رہ گئے۔“  
ہمارا تو سب کچھ برباد ہو گیا۔

**آیت ۶۸** ﴿أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ﴾ ”کبھی تم نے غور کیا کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو؟“

**آیت ۶۹** ﴿أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ﴾ ”کیا بادلوں سے تم نے اسے برسیا ہے یا ہم ہیں برسانے والے؟“

**آیت ۷۰** ﴿لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا﴾ ”اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر دیں“  
﴿فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ﴾ ”تو تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟“

**آیت ۱** ﴿أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝۱﴾ ”کبھی تم نے سوچا کہ وہ آگ جو تم جلاتے ہو؟“  
**آیت ۲** ﴿إِنَّكُمْ أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ۝۲﴾ ”کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟“

بَلْ أَنْتَ بَارِكٌ أَنْوُثَ سَبَّحِيْہِ پے در پے سوالات کا یہ ٹیکھا اسلوب پورے قرآن میں اور کہیں نہیں ہے۔  
**آیت ۳** ﴿نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ ۝۳﴾ ”ہم نے بنا دیا اس کو ایک نشانی یا دولانے کو اور ایک بہت فائدہ مند چیز صحرا کے مسافروں کے لیے۔“

جیسا کہ سورہ یٰسین کی آیت ۸۰ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے، بعض صحراؤں میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن کی سبز گیلی شاخوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر شَجَرَتَهَا سے وہ مخصوص درخت بھی مراد ہے اور عام درخت بھی۔ کیونکہ درختوں کی لکڑی آگ جلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور یہ درخت ظاہر ہے اللہ نے پیدا کیے ہیں اور اسی نے ان میں جلنے کی خصوصیت رکھی ہے۔

**آیت ۴** ﴿فَمَسِجَ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝۴﴾ ”پس تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت عظمت والا ہے۔“

مُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ!

اب اگلی آیات میں قرآن کی عظمت کا بیان ہے۔ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے عظمت قرآن کے حوالے سے سورہ الرحمن کے آغاز کی یہ عظیم آیات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿الْكَرْخُفْنُ ۝۱ عِلْمُ الْقُرْآنِ ۝۲﴾  
 خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝۳ عِلْمُهُ الْبَيِّنَانِ ۝۴ قرآن کی عظمت کے اس بیان کے بین السطور میں یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اس عظیم کتاب کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہم ان آیات کے ضمن میں پڑھ آئے ہیں: ﴿خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ﴾ کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین چونکہ عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں اس لیے عظمت قرآن کا وہ مضمون جو سورہ الرحمن کے آغاز میں آیا تھا اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے اور سورہ الرحمن کی مذکورہ چار آیات کے مقابلے میں یہاں اس موضوع پر آٹھ آیات آئی ہیں۔

## آیات ۷۵ تا ۸۲

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ۝۷۵ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٍ ۝۷۶ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝۷۷ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝۷۸ لَا يَسْهَوْنَ إِلَّا الْمُبْطِرُونَ ۝۷۹ تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۸۰ أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُذْهِبُونَ ۝۸۱ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ مُكْذِبُونَ ۝۸۲

**آیت ۷۵** ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ۝۷۵﴾ ”پس نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے

ڈوبتے ہیں۔“

بعض مفسرین نے مواقع النجوم کی وضاحت شہاب ثاقب کے حوالے سے کی ہے حالانکہ شہاب ثاقب بالکل مختلف چیز ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسے شیاطین کو عالم بالا سے مار بھگانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس آیت کو نسبتاً بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اگرچہ ابھی بھی اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ حلال و حرام، جائز و ناجائز، فرائض اور دین کے عملی پہلو سے متعلق قرآنی احکام کی تفہیم و تعمیل کے حوالے سے ہمیں راہنمائی کے لیے ”دورِ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!“ کے مصداق پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظری و عملی اطاعت کا کمال یہ ہوگا کہ ہم اپنے اسلاف کا دامن تھامے رکھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کو لازم جانیں۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے خود کو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیں بقول اقبال:۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باؤ نہ رسیدی تمام بولہبی است!  
البتہ دوسری طرف کائنات کی تخلیق، کائنات میں زندگی کی ابتدا، تاریخی حوالہ جات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کے لیے ہمیں ہر دور کے اجتماعی انسانی شعور اور دستیاب حقائق و معلومات کو مد نظر رکھنا چاہیے پھر جہاں مناسب معلوم ہو ان معلومات سے استفادہ بھی کرنا چاہیے اور جب ممکن نظر آئے تکلف سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں قرآنی الفاظ و معانی کا زمینی حقائق کے ساتھ تطابق ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسی آیات کا جو مفہوم آج سے ہزار سال پہلے سمجھا گیا تھا آج ہم اس مفہوم کو ماننے اور درست جاننے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسی آیات کا تعلق حکمت سے ہے کسی حکم سے نہیں ہے۔ چنانچہ حکمت اور سائنس کے میدان میں تو نئے نئے افق تلاش کرنے کے لیے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے لیکن احکام اور دین کے عملی پہلو کو سمجھنے، سمجھانے کے لیے ماضی سے تعلق جوڑنے اور حضور ﷺ کے فرمان مَّا آتَا عَلَیْہِ وَأَصْحَابِہٖ کُمُشَلِّ رَہِہٖ بِنَاہِ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اب آئیے آیت زیر مطالعہ کو موجودہ دور کی سائنسی معلومات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ موجودہ دور میں سائنس دانوں نے کائنات کے اندر ایسے بے شمار بڑے بڑے اندھے غاروں کا کھوج لگایا ہے جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو نگل جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ان ”غاروں“ کو Black Holes کا نام دیا ہے۔ ایسے کسی ایک بلیک ہول کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ستارے پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں بلکہ ایسے کردڑوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی ایسے بلیک ہولز کے اندر گم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ کائنات کے اندر مسلسل نئے نئے ستارے جنم لے رہے ہیں اور نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں جبکہ ساتھ ہی ساتھ بے شمار کہکشائیں اپنے ان گنت ستاروں کے ساتھ مسلسل بلیک ہولز کی نذر ہو کر معدوم ہو رہی ہیں۔ اگرچہ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق آج بھی انسان کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن پھر بھی بلیک ہولز کے متعلق اب تک

حاصل ہونے والی یہ معلومات بہت ہوشربا ہیں۔

اب اگر ہم اپنی زمین کی جسامت اور وسعت کا نقشہ ذہن میں رکھیں، پھر اس کے مقابلے میں سورج کی جسامت کا اندازہ کریں، پھر یہ تصور کریں کہ کائنات میں ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اربوں کھربوں ستارے بھی موجود ہیں اور ان ستاروں کے درمیان اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں، پھر یہ تصور کریں کہ ایسے اُن گنت ستاروں پر مشتمل ان گنت کہکشائیں ہیں اور ان کہکشاؤں کے درمیانی فاصلے بھی اسی تناسب سے ہیں۔ کہکشاؤں اور ستاروں سے متعلق یہ تمام معلومات ذہن میں رکھ کر اگر ہم کائنات کے طول و عرض میں موجود لا تعداد بلیک ہولز کا تصور کریں اور پھر یہ نقشہ ذہن میں لائیں کہ ان میں سے ایک ایک بلیک ہول اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے پاس سے گزرنے والی کسی بڑی سے بڑی کہکشاں کو آں واحد میں ایسے نکل جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اور پھر ان بلیک ہولز کا اطلاق مواقع التجوّم پر کریں تو شاید ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس آیت میں جس قسم کا ذکر ہوا ہے وہ کتنی بڑی قسم ہے۔

**آیت ۷۶** ﴿وَإِنَّ لَقَسَمًا لَّو تَعْلَمُونَ عَظِيمًا﴾ ”اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!“

یعنی ابھی تم مواقع التجوّم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں ان کی حقیقت سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی، پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے یہ کس قدر عظیم قسم پیش کی ہے۔

**آیت ۷۷** ﴿إِنَّ لَقُرْآنًا كَرِيمًا﴾ ”یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔“

یہاں پر ہم میں سے ہر شخص کو پوری دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اپنی حد تک قرآن مجید کی کیا قدر کی ہے اور کس حد تک اس کے حقوق پورے کیے ہیں؟ بہر حال جہاں تک ان حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی انسان کو ہزاروں زندگیاں مل جائیں اور وہ انہیں ”قرآن“ کے لیے وقف کر دے تب بھی قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

**آیت ۷۸** ﴿فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ﴾ ”ایک چھپی ہوئی کتاب میں۔“

یہ قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اس کتاب مَّكْنُونٍ کو اُمّ الْكِتَابِ کا نام دیا گیا ہے: ﴿وَإِنَّ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيَّنَا لَعَلًى حَكِيمَةً﴾ ”اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا بہت حکمت والی!“ جبکہ سورۃ البروج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ ”فی لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ“ ”بلکہ یہ قرآن عظیم الشان (کتاب) ہے۔ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔“

**آیت ۷۹** ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾ ”اسے چھونیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔“

یعنی اسے فرشتے ہی چھو سکتے ہیں جو بالکل پاک مخلوق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں سورۃ عبس میں فرمایا گیا ہے: ﴿كَأَلَّا نَهَا تَذَكُّرًا ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝﴾ ”فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوعَةٍ ۝ مُّطَهَّرَةٍ ۝“ ”بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝“ ”ہرگز نہیں“ یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو باعزت ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں۔ ایسے کتابوں کے ہاتھوں میں

ہیں جو معزز اور نیک ہیں۔“

آیت زیر مطالعہ میں الْمُطَهَّرُونَ سے مراد فرشتے ہیں اور يَمْسُهُمْ میں ءُكِي ضمیر کا تعلق ”كِتَابٍ مَكْنُونٍ“ سے ہے۔ ”مَوَاقِعُ الْجُحُومِ“ کی قسم کا مقسم علیہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک اُس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ یعنی اس کو صرف ملائکہ مقربین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں جنات اور شیاطین وہاں پھونک بھی نہیں سکتے۔

فقہاء نے اس آیت سے یہ حکم بھی استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید کو ناپاکی کی حالت میں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو چھونے اور چھو کر پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے جبکہ زبانی تلاوت بغیر وضو بھی کی جاسکتی ہے البتہ جنابت کی حالت میں قرآن مجید کے الفاظ کو زبانی پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قرآن کے اصل لب لباب تک پہنچنے اور اس کی ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے باطنی صفائی ضروری ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ظاہر اور باطن کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں پڑھتے ہیں: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (الحديد: ۳) ”کہ وہ اول بھی ہے آخر بھی ہے ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے“۔ اسی طرح قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ قرآن کا ظاہر اس کی عبارت اور اس کے الفاظ ہیں۔ جہاں تک قرآن کے اس ظاہر کا تعلق ہے ہر عربی دان شخص اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی صرف و نحو پر بحث کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کئی ایسے غیر مسلموں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے عربی میں مہارت حاصل کر کے قرآن کے تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں۔ لیکن ایسے لوگ قرآن کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اقبال نے اسی مفہوم میں ایسی ہی بات بندۂ مؤمن کے بارے میں کہی ہے:

فرشتہ موت کا چھوٹا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

اقبال نے اس شعر میں بندۂ مؤمن کے وجود کے مرکز کا ذکر کیا ہے۔ بالکل اسی مفہوم میں قرآن مجید کا بھی ”مرکز“ ہے۔ قرآن کے مرکز سے مراد اس کی روح باطنی اس کی ہدایت اس کا اصل علم اور اس کا لب لباب ہے۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن مجید کے مرکز (nucleus) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تزکیہ باطنی ضروری ہے۔ اس تزکیہ باطنی کا ذکر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی اس دعا میں بھی ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط﴾

(البقرة: ۱۲۹)

”پروردگار! ان لوگوں میں اٹھاؤ ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔“

یہاں پر یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر پہلے کیا اور

تزکیہ کو آخر پر رکھا، لیکن جب حضور ﷺ کے حوالے سے ان ہی چار امور کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ترتیب بدل دی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین مقامات (البقرة: ۱۵۱، آل عمران: ۱۶۳، الجمعة: ۲) پر حضور ﷺ کی ان ذمہ داریوں کا ذکر کیا اور تینوں مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی روح باطنی تک رسائی کا طالب ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تکبر، حسد، خُب و نیا سیت تمام خباثتوں سے پاک کرے، ورنہ قرآن مجید کا نور اس کے باطن میں کبھی سرایت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اصل فہم اس پر کبھی منکشف ہوگا، اگرچہ بظاہر وہ قرآن کا بہت بڑا مفسر ہی کیوں نہ بن جائے۔ تزکیہ باطن کے حوالے سے یہاں سورہ یونس کی آیت ۵۷ کا پیغام بھی ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کو انسانی دل کی تمام باطنی امراض کے لیے شفا قرار دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ نُكْمٌ مِّنْ مَّوْعِظَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ

لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

”اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔“

**آیت ۸۰ ﴿تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾** ”اس کا اتارا جانا ہے رب العالمین کی جانب سے۔“

اور اس کے بعد اب یہ چبھتا ہوا سوال (piercing question) پوچھا جا رہا ہے:

**آیت ۸۱ ﴿أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُذْهِبُونَ ۝﴾** ”تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مد اہنت

کر رہے ہو؟“

اس آیت کا مفہوم ہمیں تب سمجھ آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک خود کو اس کا مخاطب سمجھے کہ یہ آیت براہ راست اس سے پوچھ رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! کیا تم اپنے ذہنی معاملات و مفادات کو اللہ کی اس نعمت کے مقابلے میں ترجیح دے رہے ہو؟ کیا تم اس عظیم کتاب کو سیکھنے سکھانے اور سمجھنے میں سستی اور کالی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟ ذرا سوچو! تم نے کیسے کیسے مشکل علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے تم نے کیسی کیسی محنت کی ہے اور کتنا وقت کھپایا ہے! اس کے مقابلے میں قرآنی زبان سیکھنے کے لیے تم نے کتنی کوشش کی ہے؟ تو کیا تم نے اپنی دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس قدر عظیم نعمت کو پس پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

**آیت ۸۲ ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكْفِرُونَ ۝﴾** ”اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ تم اس کو

جھٹلا رہے ہو!“

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی یاد رکھیں کہ قرآن کا جھٹلانا ایک تو زبانی ہے اور دوسرا عملی۔ زبانی اور نظریاتی طور پر تو قرآن مجید کو مشرکین عرب جھٹلاتے تھے یا ہر زمانے کے بہت سے غیر مسلم جھٹلاتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے۔ جبکہ عملی طور پر اسے ہم مسلمان جھٹلاتے ہیں۔ ہم نظریاتی طور پر تو اسے اللہ کا کلام مانتے ہیں اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اس کے احکام ماننے سے کھلم کھلا اعراض کرتے ہیں۔

ہماری اس کیفیت کی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ (الجمعة: ۵) کہ جو لوگ حامل تورات بنائے گئے اور پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ اگر آپ ایک گدھے پر مکالمات افلاطون اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں لادیں تو ان کتابوں کو اٹھالینے سے وہ ان کا عالم تو نہیں بن جائے گا۔ اس آیت کی روشنی میں یہودیوں کے طرز عمل کا جائزہ لیں تو انہوں نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی، بلکہ وہ ابھی تک اسے اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کی جس تکذیب کا ذکر کیا ہے وہ عملی تکذیب ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی آج قرآن مجید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کر کے مذکورہ بالا مثال کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق تو ہمارے اس طرز عمل سے قرآن مجید پر ہمارے زبانی ایمان کی بھی تکذیب ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحْلَ مَحَارِمَهُ))<sup>(۱)</sup> ”جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔“

قرآن مجید کی اس عملی تکذیب کے علاوہ آج ہم مسلمان اس کی ”تکذیب حالی“ کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ تکذیب حالی یہ ہے کہ کسی شخص کا حال اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہو کہ اس کے نزدیک فلاں چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے اپنی تکذیب حالی کو سمجھنے کے لیے آپ اپنے ہاں کے ایک عام ڈاکٹر کی مثال لے لیں۔ اس نے رات دن ایک کر کے پچیس سال کی عمر میں ایم بی بی ایس کیا۔ پھر FRCS کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ گیا، وہاں جا کر امتحان دیا۔ وہاں کے بورڈز سے یہ ڈپلومہ ڈپلومہ.....! اس پڑھائی میں اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال کھپا دیے۔ اس کے بعد وہیں ملازمت اختیار کر لی..... یا واپس آ کر اپنی ملازمت اور پریکٹس میں کوبلو کے بیل کی طرح جت گیا۔ مشن کیا ہے؟ معاش اچھی ہو جائے اور معیار زندگی بلند ہو جائے! یہ مشن تو اس نے حاصل کر لیا، لیکن اپنی زندگی کے ماہ و سال میں سے اس نے قرآن مجید سیکھنے کے لیے کوئی وقت نکالا اور اس کے لیے کوئی محنت کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو اس کا حال گویا چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں قرآن مجید کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں یقین نہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ الرحمن کی ابتدائی آیات میں قرآن کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب مثبت انداز میں دلائی گئی تھی، جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کے اختتام پر اسی ترغیب کے لیے منفی انداز اپنایا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الرحمن کی چار ابتدائی آیات کے مین السطور میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر رحمٰن نے اپنا کلام ”قرآن“ تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہیں ”بیان“ کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے تو تمہاری اس طلاق لسانی کا بہترین اور لازمی مصرف یہی ہے کہ تم اس صلاحیت کو قرآن کے لیے وقف کر دو۔ جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں یہ تنبیہ مضمر ہے کہ جو لوگ

(۱) سنن الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن ماله من الاجر، ج: ۲۹۱۸۔



قرآن کے حقوق کا حقدار نہیں کرتے آخرت میں انہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور کوتاہی ثابت ہونے پر ان کی سخت گرفت ہوگی۔

## آیات ۸۳ تا ۹۶

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ۖ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ۖ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۖ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۖ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۖ وَجِئَتْ نَجِيمُ ۖ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ فَسَلَامٌ لَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الصَّالِينَ ۖ فَنَّازِلٌ مِنْ حَمِيمٍ ۖ وَتَصْلِيَةٌ جَهِيمٍ ۖ إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۖ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۖ

جیسا کہ قبل ازیں بھی بار بار ذکر ہوا ہے کہ سورۃ الرحمن اور سورۃ الواقعة باہم جوڑا ہیں اور ان کے مضامین بھی باہم مشابہ و مربوط ہیں۔ البتہ زیر مطالعہ آیات کا مضمون صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ اس کے مقابل سورۃ الرحمن میں ایسا کوئی مضمون نہیں ہے۔ گویا یہ مضمون اس سورۃ کی اضافی شان ہے۔

**آیت ۸۳** ﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ۖ﴾ ”تو کیوں نہیں جب جان حلق میں آ (کر پھنس) جاتی ہے۔“

**آیت ۸۴** ﴿وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ۖ﴾ ”اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔“

ان آیات میں ایک انسان کے وقت نزع کی کیفیت کا عبرت انگیز نقشہ پیش کر کے دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ ذرا سوچو! جب تم میں سے کسی کی جان حلق میں پھنسی ہوتی ہے۔ تم اُس وقت کا تصور کرو جب تم میں سے کسی کے بیٹے کسی کے بھائی کسی کے والد کسی کی والدہ یا کسی کی بیوی پر نزع کا عالم طاری ہوتا ہے اور وہ بے بسی کی تصویر بنے اپنے اس عزیز کی اس کیفیت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

**آیت ۸۵** ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ۖ﴾ ”اور ہم تمہارے مقابلے میں اس

سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے۔“

یہ تو تخصیص کے ساتھ عالم نزع کی کیفیت کا ذکر ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر بندے کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ ق میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۖ﴾ ”اور ہم تو انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔“

**آیت ۸۶** ﴿فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۖ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ﴾ ”تو اگر تم

کسی کے اختیار میں نہیں ہو تو اس (جان) کو لوٹا کیوں نہیں لیتے اگر تم سچے ہو؟“

یہاں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان دونوں آیات کو ملانے سے ایک فقرہ مکمل ہوتا ہے۔ قرآن کے

خصوصی اسلوب کی وجہ سے لَوْلَا پہلی آیت کے شروع میں آ گیا ہے، لیکن اس کا مفہوم دوسری آیت کے ساتھ ملنے سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم کی وضاحت کے لیے یوں سمجھیں کہ ان دونوں آیات میں الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: **فَإِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ، لَوْلَا تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ؟** کہ تم لوگ آئے دن اپنے عزیز و اقارب کی اموات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو تم سب مل کر بھی اور اپنے تمام وسائل استعمال میں لا کر بھی اس کو بچا نہیں پاتے ہو۔ اس معاملے میں تمہارے بڑے بڑے صاحب اختیار و اقتدار لوگ بھی بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ شاہی اطباء اور ماہر ڈاکٹر زکھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور بادشاہ سلامت ان کی آنکھوں کے سامنے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ تم خود ہی پیدا ہوتے ہو اور خود ہی مرتے ہو اور تمہاری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اپنے پیاروں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر بے بسی کی تصویر بن کر کیوں رہ جاتے ہو؟ اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر انہیں بچا کیوں نہیں لیتے ہو؟

اس کے بعد اگلی آیات میں ان تین گروہوں کی جزا و سزا کا تذکرہ ہے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہوا تھا۔

**آیت ۸۸ ﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾** ”پھر اگر وہ مقربین میں سے تھا۔“

یعنی اگر مرنے والا فیض سابقوں میں سے تھا۔ اپنی زندگی میں ﴿فَاسْتَجِبُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (المائدہ: ۴۸) کے حکم پر عمل کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مثال بن رہا تھا: **آیت ۸۹ ﴿فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٌ﴾** ”تو اُس کے لیے راحت اور سرور اور نعمتوں والی جنت ہے۔“

**آیت ۹۰ ﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ﴾** ”اور اگر وہ اصحاب الیمین میں سے تھا۔“

اگرچہ وہ ”سابقوں“ میں سے تو نہیں تھا لیکن نیک تھا اور دین کی خدمت میں حسب استطاعت کوشاں رہتا تھا:

**آیت ۹۱ ﴿فَسَلَّمَ لَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ﴾** ”تو سلامتی پہنچے آپ کو اصحاب الیمین کی طرف سے۔“

اے نبی ﷺ! آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی امت کے اصحاب الیمین بھی عیش میں ہوں گے اور جنت کی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ (۱)

**آیت ۹۲ ﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ﴾** ”اور اگر وہ تھا جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے۔“

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قبل ازیں دوسرے رکوع میں جب اس گروہ کا ذکر ہوا تو وہاں ان لوگوں کو ”آئینھا

(۱) اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اصحاب الیمین کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے گا اور اسے سلام کہا جائے گا۔ جب کہ بعض مفسرین نے اس جملے میں اَنْتَ محذوف مانا ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے: فسلاّم لك انت من اصحاب الیمین کہ تیرے لیے اب سلامتی ہی سلامتی ہے تو اصحاب الیمین میں شامل ہے! (حاشیہ از مرتب)

الصَّالُّونَ الْمُكْدِّبُونَ“ کہہ کر مخاطب فرمایا گیا تھا، لیکن یہاں پر انہیں ”الْمُكْدِّبِينَ الصَّالِّينَ“ کہا گیا ہے۔ یعنی یہاں پر الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بظاہر اس کی توجیہ یہ سمجھ آتی ہے کہ سزا کے حوالے سے ان کے بڑے اور اصل جرم کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ حق کو جھٹلا دینے کے مقابلے میں گمراہی نسبتاً چھوٹا جرم ہے، کیونکہ کسی گمراہ اور بھٹکے ہوئے شخص کو اگر کوئی سیدھا راستہ دکھا دے تو ممکن ہے وہ اسے قبول کر لے۔ لیکن جو حق کو جھٹلا دے اس کا سیدھے راستے پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

آیت ۹۳ ﴿فَنَزَلَ مِنْ جَحِيمٍ ۝۹۳﴾ ”تو اس کے لیے مہمانی ہے کھولتے پانی سے۔“

آیت ۹۴ ﴿وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۝۹۴﴾ ”اور جہنم میں جلنا۔“

یعنی ان لوگوں کی ابتدائی تواضع تو کھولتے ہوئے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۹۵ ﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۝۹۵﴾ ”یقیناً یہ سب کچھ قطعی حق ہے۔“

بے شک یہ ساری باتیں سچی اور یقینی ہیں۔ یہ سب تفصیلات جو اس سورت میں بیان ہوئی ہیں ان کے بارے میں تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہنا ہے۔ قیامت کے دن تمام نوع انسانی کو مذکورہ بالا تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کے افراد کو ان کے اعمال و اعتقادات کے مطابق بدلہ دیا جانا ہے۔

آیت ۹۶ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝۹۶﴾ ”پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔“

اس کے جواب میں اتنا لال امر کے طور پر کہا جائے گا: مُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ ایہ آیت اس سورت میں دو مرتبہ آئی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((اجْعَلُوهَا فِي رُكُوعِكُمْ))<sup>(۱)</sup> کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو۔ چنانچہ حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق رکوع کی تسبیح مُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ اس آیت سے اخذ کی گئی ہے۔



(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما يقول الرجل فی رکوعه وسجوده، ح: ۸۶۹، وصحیح ابن حبان، ح: ۱۸۹۸۔ اسی طرح جب آیت ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝۱﴾ (الاعلیٰ) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اجْعَلُوهَا فِي سُجُودِكُمْ)) کہ اس کو تم لوگ اپنے سجدوں میں رکھ دو۔

# سُورَةُ الْحَدِيدِ

## تمہیدی کلمات

سورة الحمدید سے قرآن حکیم کی مکی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں کے سلسلے کا آغاز ہو رہا ہے جو سورة التحريم پر اختتام پذیر ہوگا۔ اس ضمنی گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کا حجم تقریباً سوا پارے کے برابر ہے، لیکن تعداد کے اعتبار سے یہ پورے قرآن میں مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس حوالے سے پہلے پانچ گروپس کی مدنی سورتوں کی ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں۔ پہلے گروپ میں سورة البقرة، سورة آل عمران، سورة النساء اور سورة المائدة چار مدنی سورتیں ہیں جو تقریباً سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں اور حجم کے اعتبار سے یہ مدنی قرآن کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے گروپ میں سورة الانفال اور سورة التوبة دو مدنی سورتیں ہیں۔ پھر تیسرے اور چوتھے گروپ میں صرف ایک ایک مدنی سورت ہے، یعنی تیسرے گروپ میں سورة النور اور چوتھے گروپ میں سورة الاحزاب۔ جبکہ پانچویں گروپ میں سورة محمد، سورة الفتح اور سورة الحجرات تین مدنی سورتیں ہیں۔

زیر مطالعہ گروپ کی ان مدنی سورتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سورتوں کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰهِ يَاسُبِّحُ لِلّٰهِ سے ہوتا ہے۔ یعنی ان کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا ذکر فعل ماضی میں بھی ہے اور فعل مضارع میں بھی۔ عربی کا فعل مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے معنی دیتا ہے اس لیے ماضی اور مضارع کے ان دو صیغوں سے گویا پورے زمانے کا کلی طور پر احاطہ ہو گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو چیز بھی ہے اس نے ہمیشہ اللہ کی تسبیح بیان کی ہے ہر چیز اب بھی اُس کی تسبیح بیان کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ اس کی تسبیح کرتی رہے گی۔ ان سورتوں کے آغاز کے اس مضمون کی مناسبت سے انہیں الْمُسَبِّحَاتِ کا نام دیا گیا ہے۔ بعض لوگ سورة الاعلىٰ کو بھی الْمُسَبِّحَاتِ کے اس گروپ میں شامل کرتے ہیں، لیکن یہ سورت اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ اس کے آغاز میں تسبیح کا صیغہ فعل امر ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۝۱﴾ یعنی حکم کی صورت میں آیا ہے۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مکی مدنی سورتوں کے زیر مطالعہ (چھٹے) گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں جن میں سے پانچ الْمُسَبِّحَاتِ ہیں اور سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔

ان مدنی سورتوں کے بارے میں تیسری اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہ سب سورتیں (سوائے سورة التغابن کے) آنحضور ﷺ کے مدنی دور کے نصف آخر میں یعنی سن ۵ ہجری کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی صفوں میں جوشِ جہاد، ذوقِ شہادت، جذبہ انفاق وغیرہ کے حوالے سے بحیثیت مجموعی ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب، معاذ اللہ، یہ ہرگز نہیں کہ ”السابقون الاولون“ کے جذبے

میں کوئی کمی آگئی تھی، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کی مجموعی تعداد میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ہجرت کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ سب لوگ تربیت اور آزمائش و ابتلاء کے ان تمام مراحل سے نہیں گزرے تھے جن کا سامنا کی دور کے اہل ایمان کر چکے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے مقابلے میں نئے شامل ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے جماعت کے اجتماعی کردار و عمل پر بھی ان ہی کا رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے اس رنگ کے ”اوسط معیار“ کو السابقون الاولون کے خصوصی معیار کے پیمانہ سے نہیں پرکھا جاسکتا تھا۔

مسلمانوں کی صفوں میں مذکورہ ضعف کا ذکر سورۃ الانفال کی آیت ۶۶ میں ﴿عَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا﴾ کے الفاظ میں بھی آیا ہے۔ آیات ۶۵، ۶۶ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تو ایک مؤمن دس کفار پر بھاری ہو سکتا تھا، لیکن اب چونکہ تم میں کمزوری آچکی ہے اس لیے اب ہم نے تمہارے مقابلے کے معیار میں بھی نرمی کر دی ہے۔ چنانچہ اب اگر تم اپنے سے دو گنا کفار کا مقابلہ بہادری اور جواں مردی سے کرو گے تو ہم ان پر تم لوگوں کو فتح دیں گے۔ بہر حال مذکورہ کمزوری کے اثرات کے باعث ان سورتوں میں جا بجا مسلمانوں کو جھجھونے اور ان کی گرفت کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الصف کی دوسری آیت کا اسلوب بہت واضح ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ﴾ ”اے اہل ایمان! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟“ سورۃ الحدید کی اس آیت کا انداز بھی بالکل ایسا ہی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آیت ۸) ”تمہیں کیا ہے، تم اللہ پر پختہ ایمان کیوں نہیں رکھتے؟“ پھر زیر مطالعہ سورت یعنی سورۃ الحدید کی اس آیت کا لب و لہجہ بھی ملاحظہ کریں: ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (آیت ۱۰) ”تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟“ سورۃ الجمعہ کی آخری آیت کا یہ انداز بھی بہت سخت ہے: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ ”جب انہوں نے دیکھا کسی کا رد بار یا کسی اور دلچسپی کی چیز کو تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبی ﷺ) کھڑے ہوئے۔“

اس سورت میں یقیناً روئے سخن منافقین کی طرف بھی ہے (ان سورتوں میں منافقت کے موضوع پر ایک مکمل سورت (سورۃ المنافقون) بھی موجود ہے اور پھر سورۃ الحدید میں منافقت کے مرض کی علامات سے لے کر تشخیص تک گویا پوری پتھالوجی بیان ہوئی ہے) لیکن مجموعی طور پر اصل خطاب منافقین سے نہیں بلکہ ”ضعفاء“ سے ہے۔ یعنی ان میں ان کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو ”ہرچہ با داباد“ کے سے جذبے کے ساتھ ہر حالت اور ہر قیمت پر اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے سے معذور ہیں۔ چنانچہ منافقت یا منافقین کے معاملے میں ان سورتوں کا انداز سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ جیسا نہیں ہے، کیونکہ ان دو سورتوں کی متعلقہ آیات میں اصل خطاب ہی منافقین سے ہے، جبکہ زیر مطالعہ سورتوں میں اگر کہیں مسلمانوں کی صفوں کے اندر موجود کمزوری کو موضوع بنایا گیا ہے تو وہاں اصل خطاب ضعفاء سے ہے نہ کہ منافقین سے۔

جہاں تک ایمان کی پختگی اور کمزوری کے حوالے سے اہل ایمان کے درمیان انفرادی سطح پر فرق و تفاوت کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری بات ہے اور یہ فرق شروع سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿وَالشَّاقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (آیت ۱۰۰)

”اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکو کاری کے ساتھ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ترین درجات پر فائز اہل ایمان کے درمیان بھی فرق تھا۔ کچھ لوگ ”السا بقون الاولون“ تھے اور کچھ وہ تھے جو ان کے نقش قدم پر چلے رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ! (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ کی تشریح)۔ سورۃ التوبہ کی درج بالا آیت سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اہل ایمان کے درجات کے فرق کو سمجھنا اور ان کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے: ”گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی!“ بہر حال جب تک اس فلسفے کو نہیں سمجھا جائے گا نہ ”کمزور مسلمان“ کی اصطلاح سمجھ میں آئے گی اور نہ ہی ان آیات کا مفہوم واضح ہوگا جن میں ”ضعفاء“ یعنی کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

”حفظ مراتب“ کا یہ فلسفہ آج کل ہم جیسے مسلمانوں کو ”اہل ایمان“ کی صفوں میں جگہ دلانے کا جواز اور راستہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ”نسلی مسلمان“ ہیں۔ یعنی ہم میں سے اکثر اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں ہمارے ارادے اختیار یا انتخاب کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا عام مسلمان اپنے حالات اور ماحول کے مطابق اللہ رسول آخرت نماز روزہ وغیرہ کا تعارف تو بچپن میں ہی سیکھ لیتا ہے۔ لیکن ایمان حقیقی اور عمل کے اعتبار سے اس کا دامن خالی ہی رہتا ہے (إلا ما شاء اللہ)۔ اس اعتبار سے آج ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا تعلق اس ”مسلمانی“ سے ہے جس کا ذکر سورۃ الحجرات کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (آیت ۱۴)

”یہ بد کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“

سورۃ الحجرات کے مطالعے کے دوران اس آیت کا پس منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال جس طرح اس آیت کے مخاطب لوگوں کی اکثریت نے حالات کا رخ دیکھ کر ”حادثاتی“ طور پر اسلام قبول کیا تھا اسی طرح ہم بھی اپنی پیدائش کے ”حادثے“ کی وجہ سے مسلمان ہیں۔ ہم نے اسلام کو ایک موروثی نظریے کے طور پر تو قبول کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اکثریت ایمان اور اسلام کے تقاضے پورے کرنے کی فکر سے بالکل ہی لائق ہو چکی ہے (إلا ما شاء اللہ)۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ایسے تمام لوگ حقیقی ایمان سے تہی دامن ہونے کے باوجود منافق نہیں اس لیے کہ وہ کسی کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام نہیں لائے۔ چنانچہ ان سب لوگوں کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ ”کمزور مسلمان“ ہیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ سب مسلمان ”بحیثیت مسلمان“ برابر نہیں ہیں۔ ایمان کی پختگی اور عمل کے معیار سے ان کے اپنے درجے ہیں اور ان درجات کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے

مسلمانوں کے درجات میں پائے جانے والے اس فرق کو نہیں سمجھا انہیں سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت کے بارے میں بھی مغالطہ ہوا ہے کہ اس میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ اسی آیت میں آگے ان اسلام قبول کرنے والوں کو یہ ضمانت بھی دی گئی ہے: ﴿وَأَن تَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِفْ لَكُمْ مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ ”اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں وہ مسلمان ہی تھے، کیونکہ منافق کا تو کوئی عمل قابل قبول ہے ہی نہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کی عقوبت میں منافق بھی تھے لیکن مذکورہ آیت میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو اگرچہ دیکھا دیکھی مسلمان ہوئے تھے، لیکن اس میں ان کی بدینتی شامل نہیں تھی۔

آج ہماری غالب اکثریت بلاشبہ ”کمزور مسلمانوں“ پر مشتمل ہے، اس لیے آج ہماری ہدایت کے لیے قرآن کا یہ حصہ (سورۃ الحمد یا سورۃ التحریم) بہت اہم ہے۔ آج کا مسلمان اگر ان دس سورتوں کو سمجھ لے تو اس کا یہ عمل ایسے ہوگا جیسے اس نے پورے قرآن کو سمجھ لیا۔ کیونکہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن حکیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ مثلاً منافقت اور منافقین کا تذکرہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ خصوصاً سورۃ النساء سورۃ التوبہ اور سورۃ محمد میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں شامل گیارہ آیات پر مشتمل ایک مختصری سورت یعنی سورۃ المنافقون میں اس پورے مضمون کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایمان کی بحث سے پورا قرآن بھر پڑا ہے۔ دو تہائی قرآن کی سورتوں پر مشتمل ہے اور ان کی سورتوں میں تذکیر بالاء اللہ کے علاوہ توحید رسالت اور آخرت کے موضوعات کے تحت ساری بحث ایمان سے ہی متعلق ہے۔ اس قدر وسیع اور مفصل مضمون کو اس مجموعے کی سورۃ التغابن (۱۸ آیات) میں سمودیا گیا ہے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن کے مضامین کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے چھ سورتوں (سورۃ الحمد، سورۃ الصف، سورۃ الجمعۃ، سورۃ المنافقون، سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم) کو ہم نے اپنے منتخب نصاب میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک سورۃ الحمد کے تعارف کا تعلق ہے، یہ بہت جامع اور بہت بلند مرتبہ سورت ہے۔ الْمُتَسَبِّحَات میں ممتاز مقام کی وجہ سے اسے اُمُّ الْمُتَسَبِّحَات کہا جاتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصہ ششم اسی سورت کے ۷ دروس پر مشتمل ہے۔ میں اکثر تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس سورت کا خصوصی فہم اور انشراح عطا فرمایا ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے یہ سورت عطا فرمادی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے اس پر میرا غور و فکر جاری ہے اور میں نے اس پر بہت طویل اور مفصل دروس بھی دیے ہیں۔ بہر حال اس مضمون کے لیے یہ سطور زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس سورت پر میرے سلسلہ وار دروس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔ مفصل دروس کی ریکارڈنگ ۱۵ گھنٹے پر مشتمل ہے، جبکہ نسبتاً مختصر دروس کا دورانیہ چھ گھنٹے ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات میرے ان دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔<sup>(۱)</sup>

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کے تذکرہ بالا دروس کی ترتیب و تدوین کے بعد انہیں ۳۶۸ صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان ”اُمُّ الْمُتَسَبِّحَات یعنی سورۃ الحمد کی مختصر تشریح“ کی صورت میں مکتبہ خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۶ تا ۱۲

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۚ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يُخَيِّ وَيُؤَيِّتُ ۚ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۚ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَكْبُرُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۚ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۚ يُؤَيِّجُ النَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَيِّجُ النَّيْلَ فِي اللَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۚ

**آیت ۸** ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ”سبح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔“

ان سورتوں (المُسَبِّحات) کا یہ مضمون بہت اہم ہے۔ آگے چل کر سورۃ الحشر اور سورۃ القف میں یہ آیت ”مَا فِي“ کے اضافے کے ساتھ اس طرح آئے گی: ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اور پھر سورۃ الحمد اور سورۃ التغابن میں مزید پُر زور انداز میں فعل مضارع کے ساتھ یوں آئے گا: ﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾۔ کائنات کی ہر چیز کس طرح اللہ کی تسبیح کرتی ہے؟ اس کی ایک صورت تو ”تسبیح حالی“ کی ہے جو ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز اپنی زبان حال سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایک تصویر ہے جو اپنے مصور کے کمالِ فن یا عدم مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک خوبصورت تصویر زبان حال سے اپنے مصوری کی تعریف کرتی نظر آتی ہے اسی طرح اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ میرا پیدا کرنے والا میرا صانع، میرا خالق، میرا مصور ہر عیب سے پاک، ہر نقص سے بالا اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی حکمت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسری صورت ”زبانی تسبیح“ کی ہے جو کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۃ حَمِّ السَّجْدَةِ کی آیات ۲۰ اور ۲۱ میں قیامت کے اس منظر کا ذکر ہے جب انسانوں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اس پر وہ لوگ حیرت سے اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ جواب میں ان کی کھالیں کہیں گی: ﴿أَنقَضْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (آیت ۲۱) کہ آج اُس اللہ نے ہمیں بھی زبان دے دی ہے جس نے ہر شے کو زبان دی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ



تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تسبیح کے لیے ایک طریقہ تفویض کر رکھا ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ طَوَّانٌ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (آیت ۲۴)

”اُسی کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور (وہ تمام مخلوق بھی) جو ان میں ہے۔ اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اُس کی حمد کے ساتھ، لیکن تم نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔“

بہر حال کائنات کی ہر چیز اپنی زبان حال سے بھی اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی عطا کردہ اپنی مخصوص زبان سے بھی اس کی تعریف و توصیف میں مشغول و مصروف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تسبیح کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جو کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱) ”اور وہ بہت زبردست ہے کمال حکمت والا۔“

ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء اکٹھے ایک ساتھ بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اسمائے حسنٰ کا یہ جوڑا معنوی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ العزیز وہ ہستی ہے جس کا اختیار مطلق ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی سطح پر مطلق العنانیت کا تجربہ ہمیشہ بہت تلخ رہا ہے۔ عملی طور پر ہمارے ہاں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں مطلق العنانیت آتی ہے وہاں اختیارات کا ناجائز استعمال ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ پولیٹیکل سائنس کا تو اس حوالے سے آزمودہ فارمولا یہ ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ جب کسی ملک کا آئین بنایا جاتا ہے اور معاشرے کے لیے قوانین وضع کیے جاتے ہیں تو متعلقہ ماہرین کی ساری کوشش اختیارات کو مشروط کرنے اور ان میں توازن قائم کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ایسی صاحب اختیار ہستی ہے جس کے اختیارات کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی اس کے اختیارات کسی شرط سے مشروط ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ”الحکیم“ بھی ہے۔ وہ اپنے مطلق اختیارات میں خود ہی اپنی حکمت سے توازن قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ زبردست ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات پر غالب ہے اس کے اختیارات مطلق ہیں، لیکن اس کا کوئی کام اس کا کوئی عمل اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت ۲ ﴿لَهُ مَلِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ”اُسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔“

آیت کے آغاز میں جو حرف جار ”لِ“ آیا ہے یہ تملیک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی de facto بھی اُسی کی ہے اور de jure بھی — اُسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں دین کا ذکر خصوصی طور پر بطور ایک نظام کے کیا گیا ہے اور یہ نظام صرف حکومت الہیہ کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اللہ کی ایسی صفات بار بار نمایاں کی گئی ہیں جن کا تعلق طاقت، حکومت، قدرت اور اختیار سے ہے۔

﴿يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۲) ”وہی زندہ رکھتا ہے، وہی مارتا ہے۔ اور وہ

ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس سورۃ مبارکہ کی پہلی چھ آیات پورے قرآن حکیم میں اس اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر فلسفے اور منطق کی سطح پر جامع ترین انداز میں ہوا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ موقع ایسی تفصیلات میں جانے کا نہیں۔

**آیت ۳** ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ ”وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔“

ایک انسان کے لیے اس کیفیت کو سمجھنا یقیناً مشکل ہے کہ ہر زمان، ہر مکان اگر وہ ہی وہ ہے تو پھر باقی سب کیا ہے۔ غالب نے اس صورت حال سے متعلق انسانی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس آیت کے بارے میں امام رازنیؒ کا درج ذیل قول بہت فکر انگیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس آیت کو پڑھ کر وہ جلال ذات کے رعب کے باعث ساکت و ششدر ہوئے کھڑے ہیں۔ لکھتے ہیں: ”إِعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيقٌ مُهِيبٌ“ ”جان لو کہ یہ بہت مشکل، بہت گہرا اور بڑا پُر بیت مقام ہے!“ اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ گویا بقول شاعر ع ”ہخدار کہ رہ بروم تیغ است قدم را!“ اس راستے پر خبردار ہو کر چلنا! اب تمہارا پاؤں تلوار کی دھار پر آ گیا ہے!

صوفیاء نے ”وحدت الوجود“ کا فلسفہ اسی آیت سے اخذ کیا ہے، لیکن یہ فلسفے کا بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ”وحدت الوجود“ کی تعبیر میں کچھ لوگوں نے ”ہمدوست“ کا تصور گھڑا ہے جس کے کفر و شرک ہونے میں کسی اہل علم کو اختلاف نہیں ہے۔ بہر حال ”وحدت الوجود“ کے بارے میں یہ حقیقت بھی واضح دینی چاہیے کہ یہ عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے مذکورہ دروس میں اپنی حد تک اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (۱۸۹۶ء-۱۹۸۳ء) سے مجھے اپنی اس وضاحت کی سند بھی مل چکی ہے۔ ایک مرتبہ اسی سورت کے میرے ایک درس میں پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ درس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اس ”وحدت الوجود“ کے مسئلے کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں، لیکن آپ نے اس ایک درس میں اسے جس انداز میں واضح کیا ہے میں آج تک نہیں کر سکا۔ یہاں ان سطور میں اس مسئلے کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ تفصیل معلوم کرنے کے خواہش مند حضرات سورۃ الحدید پر میرے متعلقہ دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس آیت کا آسان مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات ”حادث“ ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ موجود نہیں تھی اور جب یہ موجود نہیں تھی اس وقت کون موجود تھا؟ ظاہر ہے اللہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ تو اس کائنات کا آغاز کہاں سے ہوا؟ اللہ سے! پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کائنات میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمن) ”جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔“ تو جب یہ سب کچھ نہیں رہے گا تو اُس وقت کون موجود ہوگا؟ ﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو

الْجَلِيلِ وَالْإِكْرَامِ ﴿۵۰﴾ (الرحمن) ”اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی والا اور بہت عظمت والا ہے۔“ تو جب کچھ نہیں رہے گا تو اللہ اُس وقت بھی موجود ہوگا۔ تو پھر ”آخر“ کون ہوا؟ ظاہر ہے کہ اللہ اب یوں سمجھیں کہ اول اور آخر کے مابین ظاہر بھی وہ ہے اور باطن بھی وہ ہے۔

اس مشکل مضمون کو درج ذیل حدیث نے عام لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوَى، وَمُنْزِلَ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْفُرْقَانِ، اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ))<sup>(۱)</sup>

”اے اللہ آسمانوں اور زمین کے رب! اے عرشِ عظیم کے مالک! اے ہمارے رب اور ہر چیز کے پروردگار! اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے اور تورات، انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی تیرے بقعہ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! تو ہی اول ہے پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور تو ہی آخر ہے تیرے بعد کوئی چیز نہ ہوگی، اور تو ہی ظاہر ہے تجھ سے بالاتر کوئی چیز نہیں، اور تو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے مخفی کوئی چیز نہیں۔“

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (۵۱) ”اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

جب ہر زمان، ہر مکان وہ ہی وہ ہے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو کائنات کی کوئی ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ کیسے ہو سکتی ہے! بلکہ وہ تو انسان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ اس حوالے سے سورہ ق کی یہ آیت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْنَاهُ مَّا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (۱۶) ”اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس و سوسے ڈالتا ہے اور ہم تو اُس سے اُس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“ بچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر (عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ) ہونے کا اعلان ہوا ہے جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اُس کے علم کل کا بیان ہے کہ اُسے ہر چیز کا علم ہے ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ﴾ ”وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں، پھر وہ متمکن ہوا عرش پر۔“

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا﴾ (۲) ”وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو

کچھ چڑھتا ہے اس میں۔“

بالکل یہی الفاظ اس سے پہلے سورہ سبا کی آیت ۲ میں بھی آچکے ہیں۔ اس فقرے میں بہت سی چیزوں کا احاطہ ہو گیا، مثلاً زمین میں پانی جذب ہوتا ہے، مختلف قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں، مردے دفن ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور فرشتے احکام الہی لے کر اترتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے کی مثال بخارات کی ہے اور پھر فرشتے بھی فوت ہونے والے انسانوں کی ارواح اور دنیا کے حادثات و واقعات کی رپورٹس لے کر اوپر جاتے ہیں۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“  
جو کچھ اچھے یا برے اعمال تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ان کا چشم دید گواہ ہے۔

**آیت ۵** ﴿لَكَ الْمُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔“  
اللہ تعالیٰ کی ”بادشاہی“ کے بارے میں تکرار و تاکید کا خصوصی اسلوب ملاحظہ ہو۔ آیت ۲ کے ہو بہو الفاظ یہاں پھر دہرائے گئے ہیں۔

اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اسی طرح اس کے علاوہ کوئی اور حاکم و مقتدر بھی نہیں۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو اکیلے معبود کے طور پر ماننا ضروری ہے اسی طرح توحید کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی زمین پر صرف اُسی کی بادشاہی قائم ہو اور اُس کے تمام احکام عملاً نافذ ہوں۔  
﴿وَالِلّٰهِ تُزْجَعُ الْأُمُورُ﴾ ”اور تمام معاملات اُسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔“

**آیت ۶** ﴿يُولِجُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ﴾ ”وہ پرولاتا ہے رات کو دن میں اور پرولاتا ہے دن کو رات میں۔“

یہ مضمون ان ہی الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔  
﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ”اور وہ جانتا ہے اس کو بھی جو سینوں کے اندر ہے۔“

نوٹ کیجیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ ہوا ہے، پہلے فرمایا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ پھر فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا.....﴾ (آیت ۴) اور اب یہاں اس آیت میں بتایا گیا کہ وہ سینوں کے رازوں کا بھی علم رکھتا ہے۔

ان چھ ابتدائی آیات پر مشتمل یہ پُر شکوہ تمہید گویا ایک اعلان ہے کہ خبردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم یہ کس کا کلام پڑھ رہے ہو، کس سے ہم کلام ہو رہے ہو! ان تمہیدی آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت، اُس کی قدرت، اُس کی بادشاہی اور خصوصی طور پر اُس کے علم کا تعارف ہے۔ یہ گویا توحید فی العقیدہ کا بیان ہے۔ توحید کا یہ عقیدہ عملی میدان میں بندوں سے کیا تقاضا کرتا ہے اس کا ذکر اب آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں توحید کے دو بنیادی تقاضے بتائے گئے ہیں۔

## آیات ۷ تا ۱۱

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلِفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ  
وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ  
وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖ اٰیٰتٍ بَيِّنٰتٍ  
لِّيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝۹ وَاِنَّ اللّٰهَ يَكُوْنُ لَرَّءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ  
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْزَاتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ  
الْفَتْحِ وَقَتْلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَتْلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ  
اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَفْرِضُ اللّٰهُ قَرْضًا حَسَنًا  
فِيْضِعْهُ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۲

**آیت ۷** ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلِفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ ”ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان سب میں سے جن میں اُس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔“  
خلافت کے حوالے سے انسان کو سب سے زیادہ اختیار تو اپنے جسم پر عطا کیا گیا ہے۔ اس میں اس کے مختلف اعضاء ہیں، طاقت جسمانی، طاقت لسانی، ذہانت و فطانت اور دوسری بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ پھر مال و دولت، اولاد اور دوسری بے شمار نعمتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی ان خدا داد صلاحیتوں اور نعمتوں کو اللہ کی رضا کے لیے اس کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ واضح رہے کہ ”نفق“ کا لفظ مال و دولت خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جان خرچ کر دینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نَفَقَتِ الدَّارَ اِھِم کے معنی ہیں رقم ختم ہو گئی اور نَفَقَ الْفَرَس کے معنی ہیں گھوڑا مر گیا۔ یہاں یہ آیت پڑھتے ہوئے ضروری ہے کہ سورۃ الحجرات کی اس آیت کو بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ لَمْ يَزَالُوْا وَجَّهًا وَّوَّاجِدًا بِاَمْرِ اللّٰهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

”مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔“

ان دونوں آیات میں دو دو مطالبات آئے ہیں، پہلا مطالبہ دونوں میں مشترک ہے یعنی ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ﴾ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ جبکہ دوسرے مطالبے کے حوالے سے سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیت میں جہاد کا ذکر ہے کہ اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کرو اور زیر مطالعہ

آیت میں ہر اس چیز کے انفاق کا حکم ہے جس پر انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس میں انفاق مال بھی شامل ہے اور بذل نفس یعنی انفاق جان بھی۔

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَأَنْفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ ”پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو) خرچ کیا، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔“

جس خوش نصیب نے مذکورہ دونوں مطالبات پورے کر دیے، یعنی اسے یقین والا ایمان بھی نصیب ہو گیا اور اس نے اپنی زیر ملکیت ہر چیز کو اللہ کی رضا کے لیے پیش بھی کر دیا تو اس کے گویا وارے نیارے ہو گئے۔ وہ بہت بڑے اجر کا مستحق ٹھہرا۔ مضمون کے حوالے سے یہاں آیات کے ربط و نظم کی خوبصورتی اور مندرجات کی ترتیب ملاحظہ کیجیے کہ پہلے ایک آیت میں دو مطالبات کا ذکر کر کے ان کے بارے میں ترغیب دی گئی ہے۔ اب اس کے بعد ان میں سے ہر مطالبے سے متعلق دو دو آیات اس طرح آرہی ہیں کہ پہلی آیت میں زجر یعنی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے جبکہ دوسری میں راہنمائی اور ترغیب دی گئی ہے۔

**آیت ۸** ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ ”اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نہیں ایمان رکھتے اللہ پر!“

یہ پہلے مطالبے یعنی ”ایمان“ سے متعلق گویا زجر و ملامت اور ایک طرح سے تنبیہ کا انداز ہے۔

﴿وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ﴾ ”جبکہ رسول (محمد ﷺ) تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان رکھو اپنے رب پر“

ہمارے رسول ابھی تمہارے مابین موجود ہیں اور وہ تم لوگوں کو براہ راست ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔

﴿وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقُكُمْ﴾ ”اور دیکھو! وہ تم سے عہد بھی لے چکا ہے“

اگر تم ایمان کے دعوے دار ہو تو ذرا غور کرو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کتنے عہد کر رکھے ہیں۔ ایک عہد تو وہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے تم سے عالم ارواح میں لیا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ اور تم سب نے اس سوال کے جواب میں ﴿بلی﴾ کہا تھا (بخوالہ الاعراف: ۱۷۲)۔ اس کے بعد تم ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ (بخوالہ البقرہ: ۲۸۵ والمائدہ: ۷) کا عہد بھی کر چکے ہو۔ اس عہد اطاعت کے علاوہ تم نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اللہ کے ہاتھ بیچنے کا عہد بھی کر رکھا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآنَ لَهُمُ الْجَنَّةُ.....﴾ (التوبة: ۱۱۱) ”یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔“ تو تم لوگ اپنے رب کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدوں اور معاہدوں کا تو لحاظ کرو:

﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ ”اگر تم حقیقتاً مؤمن ہو!“

یہ ڈانٹ سننے کے بعد ہر بندہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکے اور اپنا جائزہ لے کہ کیا اس کے دل میں حقیقی ایمان موجود ہے یا کچھ غلاسا ہے؟ الحمد للہ ہم سب مسلمان تو ہیں، کسی نہ کسی درجے میں نماز روزہ وغیرہ کا تقاضا بھی پورا کر رہے ہیں، لیکن اللہ کرے ہمیں احساس ہو جائے اور ہم اپنا اپنا جائزہ لیں کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کیا ابھی تک ہمیں حقیقی ایمان بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں! اور اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے

دل میں اس پہلو سے ابھی خلا موجود ہے تو پھر اسے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی تنگ و دو کرنی چاہیے کہ وہ یقین والا ایمان کہاں سے ملے گا۔ اگلی آیت میں اس حوالے سے راہنمائی فرمائی جا رہی ہے۔

**آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾** ”وہی تو ہے جو اپنے بندے (ﷺ) پر یہ آیات بینات نازل کر رہا ہے تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔“

یعنی یقین والے ایمان کا منبع دسر چشمہ اللہ کی یہ کتاب ہے۔ اگر تم اس کتاب کو سمجھ کر پڑھو گے، اس پر فکر و تدبیر کرو گے تو تمہارے اندر ایک بالکل برپا ہو جائے گی، تمہاری روح کے تاروں میں خود بخود دسر سراہٹ پیدا ہوگی اور تم خود محسوس کرو گے۔ بقول اقبال۔

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے، تشنہ مضرب ہے ساز  
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!  
در اصل ایمان تمہاری روح کے اندر خفتہ (dormant) حالت میں پہلے سے موجود ہے۔ بس اسے فعال (active) کرنے کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کو فعال کرنے کا نسخہ پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے، یعنی آیات قرآنیہ۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ”اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں بہت رؤف اور رحیم ہے۔“  
وہ تمہارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ ایمان حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الشوریٰ میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ خود حضور ﷺ کو بھی ایمان قرآن مجید ہی سے ملا:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

”اور (اے نبی ﷺ) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔“

یعنی اس سے پہلے نہ تو آپ تورات سے واقف تھے اور نہ ہی آپ انجیل کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ آپ تو امی تھے، لیکن جب ہم نے قرآن کریم کو نور بنا کر آپ کے دل پر اتارا تو اس سے آپ کا باطن نورِ ایمان سے جگمگا اٹھا اور آپ نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا مینار بن گئے۔ اب آپ لوگوں کو ہدایت دیں گے اور انہیں سیدھے راستے کی طرف بلائیں گے۔ اسی مضمون کو مولانا ظفر علی خان نے بڑی خوبصورتی اور سادگی سے یوں بیان کیا ہے:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے

ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سپاروں میں

ان دو آیات میں پہلے مطالبے یعنی ”ایمان“ سے متعلق پہلے ڈانٹ پلائی گئی کہ تمہارا ایمان بچتے کیوں نہیں ہے؟ یہ ڈھل مل ایمان لیے کیوں پھر رہے ہو جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں؟ اگر تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو اس کمزوری کو دور کیوں نہیں کرتے ہو؟ کمزور ایمان کے ساتھ گزارا کیوں کر رہے ہو؟ پھر دوسری آیت میں راہنمائی بھی کردی گئی کہ ایمان کی کمزوری کو دور کرنے اور حقیقی ایمان کے حصول کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرو! قرآن کا یہی مطالبہ ہم سے بھی ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم بات ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لیجئے کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے نہ تو قرآن دل میں اترتا ہے اور نہ ہی اس سے جذبے کو تحریک ملتی ہے۔ ترجمہ پڑھنے سے آپ کچھ آیات کا مفہوم تو سمجھ لیں گے اور کچھ معلومات بھی آپ کو حاصل ہو جائیں گی، مگر قرآن آپ کے دل کے تاروں کو چھوئے گا نہیں اور نہ ہی اس کی تاثیر آپ کی روح تک پہنچے گی۔ لہذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن آپ کی روح کو فیوضِ ملکوتی سے سیراب اور آپ کے دل کو نورِ ایمانی سے منور کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھیں اور سمجھیں۔ بقول اقبال :-

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشف!

ظاہر ہے کسی کے ضمیر پر قرآن کا نزول بھی ممکن ہے جب وہ قرآن کی زبان یعنی عربی سے واقف ہوگا اور قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارت کو براہِ راست سمجھے گا۔ اس کے لیے وہ پڑھے لکھے حضرات جو عربی زبان سے نا بلند ہیں خصوصی طور پر اللہ کے ہاں جواب دہ ہوں گے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک علوم و فنون سیکھتے رہے لیکن قرآن کی زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے کوئی منصوبہ بندی اور کوئی کوشش نہ کی۔ ایسے تمام حضرات کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک سال اس کام کے لیے ضرور وقف کریں اور کم از کم اس حد تک عربی زبان ضرور سیکھیں کہ قرآن میں نہ پڑھتے ہوئے انہیں اس کی آیات و بیانات کا مفہوم تو معلوم ہو۔ (خواہش مند حضرات اس مقصد کے لیے قرآن اکیڈمی کے تحت چلنے والے رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔) یہ تو تھی توحید کے پہلے مطالبے (ایمان) سے متعلق ڈانٹ ڈپٹ اور راہنمائی۔ اور اب دوسرے مطالبے سے متعلق ڈانٹ:

**آیت ۱۰** ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں جبکہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت!“

یہ جو تم بڑے بڑے محل تعمیر کر رہے ہو اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں لگاتے چلے جا رہے ہو ان سے آخر کب تک استفادہ کرو گے؟ تم تو آج ہوکل نہیں ہو گے۔ تمہارے بعد تمہاری اولاد میں سے بھی جو لوگ ان جائیدادوں کے وارث بنیں گے وہ بھی اپنے وقت پر چلے جائیں گے۔ پھر جوان کے وارث بنیں گے وہ بھی نہیں رہیں گے۔ بالآخر تمہارے اس سب کچھ کا اور پوری کائنات کا حقیقی وارث تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ تم نے ادھر ہی چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر غیر ضروری دولت اکٹھی کرنے میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟ اور کیوں اسے



سینت کر رکھ رہے ہو؟ واضح رہے کہ انفاق سے مراد یہاں انفاق مال بھی ہے اور بذل نفس (جان کھپانا) بھی۔ یہ مکہ قبل ازیں آیت ۷ کے مطالعے کے دوران بھی زیر بحث آیا تھا اور اب اگلے فقرے میں مزید واضح ہو جائے گا:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلٍ﴾ ”تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے انفاق کیا اور قتال کیا فتح سے پہلے وہ (فتح کے بعد انفاق اور قتال کرنے والوں کے) برابر نہیں ہیں۔“

وضاحت کے لیے یہاں انفاق اور قتال کا ذکر الگ الگ آ گیا ہے۔ یعنی ’انفاق‘ مال خرچ کرنے کے لیے اور ’قتال‘ جان کھپانے کے لیے۔ چنانچہ یہاں واضح کر دیا گیا کہ آیت ۷ میں جس انفاق کا ذکر ہوا تھا اس سے مال و جان دونوں کا انفاق مراد تھا اور ظاہر ہے انفاق جان کا سب سے اہم موقع تو قتال ہی ہے۔ میدان جنگ سے غازی بن کر لوٹنے کا انحصار تو حالات اور قسمت پر ہے، لیکن میدان کا رزار میں اترنے کا مطلب تو بہر حال یہی ہوتا ہے کہ اس مرد مجاہد نے اپنی نقد جان تھیلی پر رکھ کر قربانی کے لیے پیش کر دی۔

اس آیت میں خاص بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اہل ایمان جنہوں نے ابتدائی دور میں اس وقت قربانیاں دیں جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی، ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اور بعد کے مسلمان جنہوں نے یہی اعمال بعد میں سرانجام دیے، ثواب و مرتبہ میں برابر نہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَتْلُوا﴾ ”ان لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کے مقابلے میں جنہوں نے انفاق اور قتال کیا فتح کے بعد۔“

﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ”اگرچہ ان سب سے اللہ نے بہت اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

حضور ﷺ کی سربراہی میں کفر و باطل سے جنگ میں پہلی واضح فتح تو صلح حدیبیہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے خود فتح مبین قرار دیا: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾ (الفتح)۔ یہ فتح مبین مسلمانوں کو ۶ ہجری میں عطا ہوئی جبکہ ظاہری فیصلہ کن فتح انہیں ۸ ہجری میں فتح مکہ کی صورت میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت میں فتح کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورۃ الحدید کم از کم ۶ ہجری یعنی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔

اب سنئے، کھلے اور بیدار دل کے ساتھ ایک اہم پکار! ذرا دھیان سے سنئے! میرا خالق، آپ کا خالق، میرا مالک، آپ کا مالک اور پوری کائنات کا مالک کیا نہا کر رہا ہے؟

**آیت ۱۱** ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ”کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟“

﴿فِيُضِعَّهُ لَهُ ۖ وَكَهٗ أَجْرُ كَرِيمٍ﴾ ”کہ وہ اس کے لیے اسے بڑھاتا رہے اور اس کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔“

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور بھلا کون اجردے سکتا ہے؟ ایسا منافع اور بھلا کہاں سے مل سکتا ہے؟ چنانچہ اے اہل ایمان! آگے بڑھو! البیک کہو اپنے رب کی اس پکار پر! اور اپنا مال اور اپنا وقت قربان کر دو اس کی رضا کے لیے! اپنی صلاحیتیں اور اپنی جان کھپا دو اس کی راہ میں!

یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر سے ذہن نشین کر لیجیے کہ انفاقی مال اور انفاقی جان ایک اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ مال اور جان کے باہمی تعلق کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک شخص اپنی جان، یعنی جسمانی قوت، ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کی مدد سے مال کماتا ہے۔ پھر اپنے اس مال سے ایک طرف وہ اپنی جان کی بقا کا سامان پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اسی کی مدد سے وہ دوسروں کی قوت، ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کو خریدنے کی استعداد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مہلت زندگی یعنی ”وقت“ بھی اُس کی دولت ہے جس کے ذریعے سے وہ مال کماتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے: time is money کہ وقت اصل دولت ہے۔ گویا انسان کی جان، اُس کا مال اور وقت باہم یوں متعلق و مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انفاق میں عملی طور پر باقی دو چیزوں کا انفاق بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں جس انفاق کی بات ہو رہی ہے اس میں آپ کا مال، آپ کا وقت، آپ کی جسمانی قوت، ذہانت، فطانت، جان وغیرہ سب شامل ہیں۔

اب اگلی آیات میں روزِ محشر کے اس مرحلے کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے جب منافقین کو چھانٹ کر سچے اہل ایمان سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس مرحلے کو ہمارے ہاں عموماً ”پل صراط“ کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ میدانِ حشر کا یہ نقشہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں مختلف مواقع پر مختلف قسم کے لوگوں کی چھاننی ہوتی چلی جائے گی۔ اس چھاننی کے عمل کو سمجھنے کے لیے بجری بنانے والے کرشرز (crushers) میں لگی چھلنیوں کی مثال ذہن میں رکھیے۔ جس طرح ان مشینوں میں لگی مختلف قسم کی چھلنیاں مختلف سائز کے پتھروں کو الگ کرتی چلی جاتی ہیں بالکل اسی طرح میدانِ محشر میں مختلف مراحل پر مختلف قسم کے انسان بھی اپنے اعتقادات و اعمال کی بنیاد پر الگ ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلی چھاننی میں تمام کفار و مشرکین کو الگ کر لیا جائے گا۔ پھر کسی مرحلے پر ایمان کے دعوے داروں میں سے سچے مؤمنین اور منافقین کو الگ کر کے لیے چھاننی کی جائے گی اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کا نقشہ آئندہ آیات میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس چھاننی کے لیے تمام مسلمانوں کو گھپ اندھیرے میں پل صراط پر سے گزرنا ہوگا جس کے نیچے جہنم بھڑک رہی ہوگی۔ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان تھا اور انہوں نے ایمان کی حالت میں نیک اعمال بھی کیے تھے ان کے قلوب اور داہنے ہاتھوں سے اس وقت نور پھوٹ رہا ہوگا اور وہ اس روشنی میں راستہ پار کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ دنیا میں سچے ایمان سے محروم رہے اور اعمالِ صالحہ کی پونجی بھی ان کے پاس نہیں ہوگی، وہ خواہ دنیا میں مسلمانوں ہی کے ساتھ شریک رہے ہوں اور خواہ وہ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین بن کر رہے ہوں اُس وقت وہ روشنی سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس حالت میں وہ ٹھوکریں کھاتے جہنم میں گرتے چلے جائیں گے۔ آئندہ آیات میں اس مرحلے کا تفصیلی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد روزِ محشر کے اس مرحلے کی ایک جھلک سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی دکھائی گئی ہے۔

## آیات ۱۲ تا ۱۵

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرُكُمُ الْيَوْمَ

جَتَّ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِدِینَ فِیْهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۖ یَوْمَ یَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِینَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتِسِ مِنْ ثَوْرِكُمْ قِیلَ ارْجِعُوا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ فَضَرَبَ بَیْنَهُمْ سُورَةً ۖ بَابٌ طَبَاطِنُهُ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۖ یُنَادُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ مُنْكَرٌ مَعَكُمْ قَالُوا بَلٰی وَلَٰكِنَّا كُنَّا نَقْتَسِمُ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصُمْ وَارْتَبِعْ غَرْبُكُمْ الْآمَانِیَّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ ۖ وَعَرْبَكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۖ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِینَ كَفَرُوا ۖ مَا وَلَكُمْ النَّارُ هٰی مَوْلٰیكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۖ

**آیت ۱۲** ﴿یَوْمَ تَرٰی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُورُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبَاَیْمَانِهِمْ﴾ ”جس دن تم دیکھو گے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف“ بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ”یوم“ سے پہلے ”اذکر“ محذوف ہے۔ یعنی ذرا تصور کرو اس دن کا جس دن مومن مردوں اور مومن عورتوں پر یہ عنایت خاص ہوگی۔ اُن کے سامنے اُن کے ایمان کا نور ہوگا جبکہ داہنی طرف اعمال صالحہ کی روشنی ہوگی۔ (یہ مضمون سورۃ التحریم میں کمر آئے گا۔ وہاں اس پر ان شاء اللہ قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔)

﴿بَشِّرْکُمْ الْیَوْمَ جَتَّ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ”(ان سے کہا جائے گا: آج تمہارے لیے بشارت ہے ان جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں تم رہو گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔“ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۖ) ”یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

**آیت ۱۳** ﴿یَوْمَ یَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتِسِ مِنْ ثَوْرِکُمْ﴾ ”جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھالیں۔“

اس صورت حال کو یوں سمجھیں جیسے کچھ مسافر ایک خطرناک جنگل کے اندر تک پگھڑی پر گھپ اندھیرے میں سفر کر رہے ہوں۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس نارنج ہے وہ تو تیز تیز قدموں کے ساتھ پگھڑی پر رواں دواں ہیں لیکن جن کے پاس نارنج نہیں ہے وہ ان کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدا را ذرا رکوڑا نہ بھرو ہم پر عنایت کرو ہمیں بھی ساتھ لے لو۔ نَقْتِسِ کا مادہ قیس ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی کی آگ سے چنگاری لے کر اپنی آگ جلانا۔ لفظ ”اقتباس“ اردو میں quotation کے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں کسی اور کی تحریر سے اقتباس شامل کیا تو گویا آپ نے کسی کے چولہے کی ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی ہے۔

﴿قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾ ”کہا جائے گا: لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نور!“

انہیں بتا دیا جائے گا کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملتا۔ اس وقت جن لوگوں کے پاس تمہیں نور نظر آ رہا ہے وہ اسے دنیا سے کما کر لائے ہیں۔ چنانچہ اب اگر تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو اس کے لیے تمہیں واپس دنیا میں جانا ہوگا اور وہاں جا کر اسے تلاش کرنا ہوگا جس کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ یہاں پر یہ لطیف نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ منافقین روشنی کے لیے درخواست تو اہل ایمان سے کریں گے لیکن اس کا جواب کوئی اور دے گا۔ کیونکہ یہاں قَالُوا نہیں بلکہ قِيلَ (کہا جائے گا) کا صیغہ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اہل ایمان کی مروت اور شرافت سے بعید ہوگا کہ وہ انہیں کو جواب دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ انہیں ان کی مذکورہ درخواست کا جواب دے گا۔

﴿فَصُورَبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ﴾ ”پھر ان کے درمیان ایک فصیل کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔“

﴿بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ ”اس (فصیل) کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔“

یعنی اس دیوار کے اندر کی طرف رحمت باری تعالیٰ کا نزول شروع ہو جائے گا، اہل ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جبکہ اس فصیل کے باہر کی طرف عذاب الہی کا نزول شروع ہو جائے گا۔ اس طرح اس چھلنی سے گزرا کر منافقین کو سچے اہل ایمان سے الگ کر لیا جائے گا۔

اب اگلی دو آیات میں منافقت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ مرض کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کی پیتھالوجی کیسے ارتقاء پاتی ہے۔

**آیت ۱۳** ﴿يَنَادُوا فِيهِمْ اَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ﴾ ”وہ (منافق) انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟“

ہم تمہارے ساتھ مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ عیدوں کی نمازوں میں بھی ہم تمہارے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم نے تمہارے ساتھ فلاں فلاں مہمات میں بھی حصہ لیا۔ ہر جگہ ہر مقام پر ہم تمہارے ساتھ ہی تو تھے۔ پھر آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق و تفاوت کیوں ہے؟

﴿قَالُوا بَلَىٰ﴾ ”وہ کہیں گے: ہاں کیوں نہیں! (تم تھے تو ہمارے ساتھ ہی)۔“

﴿وَلَكِنَّكُمْ فَتَنًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ ”لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا“

فتنہ کیا ہے؟ قرآن مجید میں فتنے کی تین نسبتیں بیان کی گئی ہیں۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے کہ ہم نے ان کو فتنے میں ڈالا ہے کہ ہم آزمائے کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے، کون کھوٹا ہے۔ دوسری نسبت ان کفار کی طرف کی گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ تیسری نسبت یہ ہے کہ

انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ یعنی جو لوگ اہل وعیال اور متاع دنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ اس فتنے کا ذکر سورۃ التغابن میں بایں الفاظ فرمایا گیا: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۱۵) ”بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں“۔ اللہ تعالیٰ اس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں اپنے مال و متاع اور اہل وعیال کو عزیز تر جاننا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہاں پر سورۃ التوبہ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۭ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تُرَضُّونَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۰۱﴾﴾

”(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)، تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندرے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ اس کے رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنادے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہِ یاب نہیں کرتا۔“

اس آیت نے گویا ایک ترازو نصب کر کے اس کے ایک پلڑے میں آٹھ اور دوسرے میں تین محبتیں رکھ دی ہیں۔ اب ہر کوئی اپنے اپنے پلڑوں کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ تو اسے گروہ منافقین! تم خود بتاؤ تم نے اپنی زندگیوں میں ان میں سے کون سے پلڑے کو جھکا کر رکھا تھا؟ آٹھ محبتوں والے پلڑے کو یا اللہ و رسولؐ اور جہاد کی محبت والے پلڑے کو؟ ظاہر ہے دنیا میں تم لوگ دنیا داری کے تقاضوں کو اپنے مال و منال اور اہل وعیال کو اللہ کی رضا اور اس کے رسولؐ کی محبت پر ترجیح دیتے رہے ہو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ یہ فیصلہ کر کے تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

﴿وَتَرَبَّصُّمُ﴾ ”اور تم گولمکی کیفیت میں مبتلا ہو گئے“

یہ وہی لفظ ہے جو سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت کے آخر میں ﴿فَتَرَبَّصُوا﴾ آیا ہے۔ ترَبَّص کے معنی انتظار کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھنک کر کھڑا ہو جائے۔ ایمان و عمل کے معاملے میں یہ ”انتظار“ ہی دراصل فتنہ ہے۔ یہ ایمان کی ڈانواں ڈول کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں! آگے بڑھتا ہوں تو جان و مال کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں اور رکتا ہوں تو باز پرس کا ڈر ہے۔ ایسی صورت حال میں وہ سوچنے لگتا ہے کہ کچھ دیر انتظار کرتا ہوں اگر خطرہ ٹل گیا تو آگے بڑھ جاؤں گا ورنہ پیچھے مڑ جاؤں گا۔ اور باز پرس ہوگی تو جھوٹ بول کر جان بچا لوں گا۔

﴿وَارْتَبِصْ﴾ ”اور تم لوگ شکوک و شبہات میں پڑ گئے“

پھر تمہاری منافقت کا مرض بڑھ کر اگلے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ یعنی پہلے اللہ کے مقابلے میں مال و اولاد

کی محبت نے فتنے میں ڈالا اس کا نتیجہ ’تَوْبُص‘ (گوگلو کی کیفیت) کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر اس کے بعد ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب بچے کچھے ایمان میں شکوک و شبہات کے کانٹے چھینے شروع ہو گئے کہ کیا پتا قیامت آئے گی بھی کہ نہیں! معلوم نہیں یہ مرکز زندہ ہونے کی باتیں سچی اور واقعی ہیں یا محض افسانے ہیں! یہ دنیا تو ایک حقیقت ہے، لیکن آخرت کا کیا اعتبار! یہاں کا عیش اور یہاں کے مزے تو نقد ہیں۔ اس آرام و آسائش کو اگر میں آخرت کے موبہوم وعدے پر قربان کر دوں تو پتا نہیں اس کا اجر ملے گا بھی یا نہیں! اس کے بعد اس مرض کی آخری نشانی بتائی گئی:

﴿وَعَزَّزْتُكُمْ بِالْأَمَانِيِّ﴾ ”اور تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تمہاری خواہشات نے“

ان خواہشات کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ وہ بڑے بڑے گناہگاروں کو بخش دیتا ہے۔ ہم جو بھی ہیں جیسے بھی ہیں اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی امت ہیں۔ بالکل ایسا ہی زعم یہودیوں کو بھی تھا کہ ہم اللہ کے محبوب و برگزیدہ بندے ہیں: We are the chosen people of the Lord۔ چنانچہ تم لوگ اپنی انہی خوش فہمیوں میں گمن رہے۔ اس مرحلے میں اگر کبھی توبہ کرنے اور روش تبدیل کرنے کا خیال تمہیں آیا بھی تو خوشنما آرزوؤں (wishful thoughts) کے تصور نے تمہارے ضمیر کو تھپک تھپک کر پھر سے سلا دیا۔

﴿حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَعَزَّزْكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ ”یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور تمہیں خوب

دھوکہ دیا اللہ کے معاملے میں اُس بڑے دھوکے باز نے۔“

یعنی شیطان لعین نے تم لوگوں کو اللہ کے نام پر دھوکہ دیا۔ اس حوالے سے سورہ لقمان میں ہم یہ تنبیہ پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَعَزَّزْكُمُ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَعْزَّزْكُمُ بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ ”تو (دیکھو!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے دنیا کی زندگی اور (دیکھنا!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے حوالے سے وہ بڑا دھوکے باز۔“

زیر مطالعہ اس آیت میں بہت جامع انداز میں منافقت کے مدارج اور مراحل کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ مرض کا لفظ آغاز مال و اولاد کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں انہماک کی وجہ سے انسان کے دل میں اللہ اس کے رسول اور جہاد کی محبت بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں تَوْبُص کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایمان کے اندر شکوک و شبہات کے رخنے پڑ جاتے ہیں اور یہ وہ مرحلہ ہے جب نفاق اپنی اصلی شکل میں نمودار ہو کر دل میں مستقل ڈیرے جمالیتا ہے۔

**آیت ۱۵** ﴿فَالْيَوْمَ لَا يُوْخِذُ مِنْكُمْ مِذْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ ”تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کافروں سے۔“

ان الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ دنیا میں تمہارا شمار بے شک مسلمانوں میں ہوتا رہا تھا لیکن یہاں تمہارا حشر کافروں کے ساتھ ہو گا۔ دنیا میں تو منافق خود کو مسلمان ہی کہتا ہے اور قانوناً بھی وہ مسلمان ہی شمار ہوتا ہے لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ اُس کا دل ایمان سے خالی ہے اور وہ صرف ایک زبانی عقیدہ (dogma) لیے پھرتا ہے۔ ظاہر ہے جب دل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے نیک اعمال بھی ریاکاری اور دکھاوے پر مبنی ہیں۔ چنانچہ

ایسے لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا بھی بالکل کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بہر حال میدانِ محشر میں یہ لوگ نور سے محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

﴿مَأْوَاكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝۱۵﴾ ”تمہارا ٹھکانہ آگ ہے وہی تمہاری غم خوار ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔“

”مأویٰ“ سے مراد ہے پناہ گاہ جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لیے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں طنز فرمایا کہ اب تمہاری پناہ گاہ اور ٹھکانہ یہی آگ ہے۔ اسی طرح یہاں ”مَوْلٰی“ کا لفظ بھی طنز استعمال ہوا ہے۔ مَوْلٰی کا مطلب ہے ہمدرد، مونس و غم خوار، غم گسار، مددگار و دوست، پشت پناہ، دمساز، ساتھی وغیرہ۔ چنانچہ فرمایا کہ اب یہی آگ تمہاری ہمدرد، غم گسار اور خبر گیری کرنے والی ہے، دکھ درد کہتا ہے تو اس سے کہو نالہ و شہیون ہے تو اس سے کرو! مزید فرمایا کہ وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ”مَصِيرُ“ کا مطلب ہے لوٹنے کی جگہ وہ جگہ جہاں انسان بانجام کار پہنچا دیا جائے — اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ!

## آیات ۱۶ تا ۱۹

اَلَمْ يٰۤاَنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۚ وَلَا يَكُوْنُوْۤا كَالَّذِيْنَ اٰتُوْۤا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶ اَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۷ اِنَّ الْمَصْدِقِيْنَ وَالْمَصْدِقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضَعْفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا وَكَذَّبُوْۤا بِآٰیٰتِنَا ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۹

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ہر اس شخص سے سوال کر رہے ہیں جس نے اب تک کی یہ سب باتیں پڑھ کر یا سن کر اپنے دل میں اتاری ہیں۔ سوال و خطاب کا یہ بہت جذباتی انداز ہے:

**آیت ۱۶** ﴿اَلَمْ يٰۤاَنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ ”کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہل ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور اس (قرآن) کے آگے کہ جو حق میں سے نازل ہو چکا ہے؟“

یہاں قرآن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ یہی بات سورہ بنی اسرائیل میں زیادہ پُر زور انداز میں فرمائی گئی ہے: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۙ﴾ (آیت ۱۰۵) ”اور ہم نے اس کو نازل کیا ہے حق کے ساتھ اور یہ نازل ہوا ہے حق کے ساتھ۔“

دین یا نیکی کے معاملے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان ہمیشہ تاخیر و تعویق سے کام لیتا ہے کہ یہ کبر لوں وہ

کرلوں! بس اس کے بعد اپنا طرز زندگی درست کرلوں گا! ابھی ذرا بچوں کے ہاتھ پیلے کرلوں! بس ذرا یہ بچوں کی تعلیم مکمل ہو لے وغیرہ وغیرہ۔ اور دیکھا جائے تو بچوں کی تعلیم ہے کیا؟ صرف دنیا بنانے اور دنیا کمانے کے علم و فن کی تحصیل! گویا جس کوئے ملامت کے طواف میں خود ساری عمر برباد کر دی انہی راستوں پر اپنی اولاد کو گامزن کرنے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں! پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ بچوں کے کیریئر بنانے کے جنون میں انہیں کچی عمر میں برطانیہ اور امریکہ بھیجے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ وہاں جا کر بچے جب ”ترقی“ کی منازل طے کرتے کرتے اس ”مقام“ پر پہنچ جاتے ہیں کہ مذہب و اخلاق سے اپنے تعلق کو باعث عار سمجھنے لگتے ہیں تو پھر یہ لوگ بیٹھ کر روتے ہیں اور لادینی تہذیب و تمدن کو کوستے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال پر لازم ہے کہ ہم سب اپنے اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش ہو کر خود سے پوچھیں کہ کیا ہماری زندگیوں میں وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم اللہ اور قرآن کے احکام کے سامنے جھک جائیں؟

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ﴾ ”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی“  
 ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ ”تو جب ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔“

یہاں پر ﴿فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۷ کا وہ حصہ بھی ذہن میں تازہ کر لیں جس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ”پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کچھ کے بعد پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔“

﴿وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ”اور ان کی اکثریت اب فاسقوں پر مشتمل ہے۔“  
 آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ﴾ میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ بنی اسرائیل بھی تمہاری طرح اپنے زمانے کی اُمت مسلمہ تھے۔ ان کی روش کو بھی تم جانتے ہو اور ان کے انجام سے بھی تم آگاہ ہو۔ دیکھ لو! اگر تم نے اب بھی توبہ نہ کی اور اپنی روش تبدیل نہ کی تو یہ مت بھولو کہ ان کی طرح تمہیں بھی نشانِ عبرت بنایا جاسکتا ہے۔

اس ڈانٹ کے بعد اب اگلی آیت میں ہمت افزائی کی جارہی ہے کہ دیکھو! اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے دل کی ”زمین“ ایمان کی فصل کے قابل نہیں رہی تو بھی تمہیں گھبرانے یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

**آیت ۷۸** ﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ”جان لو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مرنے کے بعد۔“

تم اکثر دیکھتے ہو کہ بے آب و گیاہ بنجر زمین پر جب بارش برسی ہے تو اس کے ذرے ذرے میں زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر تم لوگ بھی خلوص نیت کے ساتھ توبہ کر لو گے اور اللہ کے حضور جھک جاؤ گے تو وہ



اپنی نظر رحمت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی از سر نو زندگی بخش دے گا اور اسے پھر سے ایمان کی فصل کے قابل بنادے گا۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ ﴿۱۷﴾ ”ہم نے تو تمہارے لیے اپنی آیات خوب واضح کر دی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔“

لہذا تم عقل سے کام لیتے ہوئے اس مثال سے سبق سیکھو! تم خوب سمجھتے ہو کہ فصلیں کب برباد ہوتی ہیں اور زمینیں کیونکر بخر جاتی ہیں، تمہیں بنجر زمینوں کو پھر سے سرسبز و شاداب بنانے کا نسخہ بھی معلوم ہے۔ یہی نسخہ ذرا اپنے دل کی زمین پر بھی آزمادو اور اس زمین کو بھی پھر سے آباد کرنے پر کمر بستہ باندھو۔ تو کل علی اللہ کا سرمایہ اکٹھا کرو! اتفاق فی سبیل اللہ کے بل چلا کر حب مال کے جھاڑ جھینکاڑ سے جان چھڑاؤ، پھر اللہ کی اطاعت و محبت کے بیج بو کر اس کے ذکر کے پانی سے مسلسل آبیاری کرتے چلے جاؤ اور دل میں یقین رکھو کہ اللہ مردہ زمینوں کو پھر سے زندہ کر دیا کرتا ہے۔

**آیت ۱۸** ﴿إِنَّ الْمُصْذِقِينَ وَالْمُصْذِقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعَفَ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ﴾ ﴿۱۸﴾ ”یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو قرض دیں اللہ کو قرض حسنہ ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔“

سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۵ اور ۳۶ کے مطالعہ کے دوران بھی یہ نکتہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدیں ہیں — یعنی ایک صدقہ اور دوسری اتفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے لیے قرض حسنہ۔ چنانچہ وہ مال جو اللہ کی رضا کے لیے غرباء، مساکین، یتیموں، بیماروں، مسافروں، مقروضوں، محتاجوں اور ضرورت مند انسانوں کی مدد اور حاجت روائی کے لیے خرچ کیا جائے وہ صدقہ ہے۔ اسی مفہوم میں سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کو بھی ”صدقہ“ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ بنیادی طور پر غرباء و مساکین اور محتاجوں کے لیے ہے۔ اس میں اللہ کے لیے (فی سبیل اللہ) صرف ایک مد رکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے دوسری اصطلاح ”اتفاق فی سبیل اللہ“ یا اللہ کے لیے قرض حسنہ کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ باقاعدہ ایک اصطلاح کی بات ہو رہی ہے، ورنہ عرف عام میں تو صدقہ بھی فی سبیل اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ بھی اللہ کے لیے اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ بہر حال ایک باقاعدہ اصطلاح کے اعتبار سے اتفاق فی سبیل اللہ ایسا اتفاق ہے جو اللہ کے دین کے لیے، دین کی نشر و اشاعت کے لیے اور اس کے غلبہ و اقامت کی جدوجہد کے لیے کیا جائے اور یہی وہ اتفاق ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے۔

اللہ کی مشیت سے مردہ زمین کے زندہ ہو جانے کے ذکر کے بعد یہاں صدقہ اور اللہ کے لیے قرض حسنہ کی ترغیب میں گویا دل کی مردہ زمین کو پھر سے ایمان کی فصل کے لائق بنانے کی ترکیب پنہاں ہے۔ یعنی اگر تم نے دل کی مردہ زمین کو زندہ کرنا ہے تو اس میں اتفاق مال کا بل چلاؤ اور اس میں سے خُبت دنیا کی جڑوں کو کھود کھود کر نکال باہر کرو۔ یقین رکھو کہ جیسے جیسے تم اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے جاؤ گے، ویسے ویسے تمہارے دل کی

زمین میں ایمان کی فصل جزیں پکڑتی چلی جائے گی۔ دنیا کی محبت کو میں عام طور پر گاڑی کی بریک سے تشبیہ دیا کرتا ہوں۔ جس طرح گاڑی کو بریک لگی ہو تو وہ حرکت میں نہیں آسکتی، اسی طرح اگر دنیا کی محبت آپ کے دل میں پیوست ہو چکی ہے تو اس میں اللہ کے راستے پر گامزن ہونے کی امنگ پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دل کی گاڑی کو رضائے الہی کی شاہراہ پر رواں دواں کرنے کے لیے اس کی بریک سے پاؤں اٹھانا بہت ضروری ہے۔ یعنی اس کے لیے مال کی محبت کو دل سے نکالنا گزیر ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکالنے کی ترکیب یہی ہے کہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔

**آیت ۱۹** ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ سَوَاءٌ الشَّهَادَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ”اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے رب کے پاس۔“

یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرض حسد دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں، وہ جب ایمان حقیقی سے سرشار ہوتے ہیں تو اب ان کے لیے مقام صدیقیت اور مرتبہ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ سے اگر دل کی گاڑی کی بریک کھل گئی اور یہ گاڑی ایمان حقیقی کے راستے پر رواں دواں ہو گئی تو پھر اہل ایمان میں سے ہر کوئی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق اس راستے کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ سیاق مضمون کے اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم نے انفاق مال کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکال کر اللہ کی محبت سے اپنے دل کو آباد کر لیا تو ایمان حقیقی تمہارے دلوں میں راسخ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم اپنی اپنی کوششوں اور اپنی اپنی طبائع کے مطابق ترقی کرتے چلے جاؤ گے۔ ترقی کے اس راستے میں تم میں سے بعض لوگ شہادت کے مقام پر بھی فائز ہو سکتے ہیں اور بعض صدیقیت کا مرتبہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وہی اعلیٰ مراتب ہیں جن کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشَّاهِدَةِ وَالصَّالِحِينَ تَرْفَعُكَ رَفْعًا ۝﴾

”اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسول کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیاء کرام صدیقین، شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!“

چنانچہ تم ہمت کرو اپنے اپنے دل کی گاڑی کی بریک کھولو ایمان کا ایکسلریٹر (accelerator) دباؤ اور اللہ کے راستے پر نکل پڑو۔ اس ایکسلریٹر کو تم جتنا بڑھاتے چلے جاؤ گے اسی نسبت سے تمہاری منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ (انسانی مزاج اور طبائع کے اعتبار سے مقام صدیقیت اور مقام شہادت کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ مریم کی آیت ۴۱ کی تشریح۔)

﴿لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ﴾ ”ان کے لیے ہوگا ان کا اجر اور ان کا نور۔“

انہیں اللہ کے ہاں سے اجر بھی ملے گا اور نور بھی۔ نور تو میدانِ حشر میں پُل صراط سے گزرنے کے لیے ملے

کا جبکہ اجر جنت میں داخل اور اس میں درجات کی بلندی کے لیے ملے گا۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝۱۹﴾ ”اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں۔“

## آیات ۲۰ تا ۲۴

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهَيِّجُ فِتْرَتَهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۖ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۚ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۚ لَّيْسَ لَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۚ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

**آیت ۲۰** ﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ﴾ ”خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل، دل لگی کا سامان اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش ہے۔“

گزشتہ سطور میں دنیا کی محبت کو گاڑی کی بریک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حُبِ دنیا انسان کو اللہ کے راستے پر چلنے سے ایسے روک دیتی ہے جیسے ایک گاڑی کو اس کی بریک جامد و سست کر دیتی ہے۔ اب اس آیت میں اس بریک یعنی حُبِ دنیا کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ تو آئیے اس آیت کے آئینے میں دیکھئے انسانی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی زندگی کا آغاز کھیل کود (لعب) سے ہوتا ہے۔ بچپن میں انسان کو کھیل کود کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ باپ امیر ہے یا غریب، اس کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے یا مندے کا شکار ہے، بچے کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اسے تو کھیلنے کودنے کا موقع ملے رہنا چاہیے اور بس۔ پھر جب وہ لڑکپن کی عمر (teenage) کو پہنچتا ہے تو اس کا کھیل کود محض ایک معصوم مشغولیت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس میں کسی نہ کسی حد تک تَلَذُّز (sensual gratification) کا عنصر بھی شامل ہو جاتا

ہے۔ اس مشغولیت کو آیت میں لُھُو کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ عام طور پر قرآن میں انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کرنے کے لیے لُھُو و لَعَب کی ترکیب استعمال ہوئی ہے، لیکن یہاں ان الفاظ کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عمر کی تقسیم کے حساب سے انسانی زندگی کے مراحل کا ذکر ہو رہا ہے اور اس حوالے سے لَعَب یعنی کھیل کود کا مرحلہ پہلے آتا ہے جبکہ اس میں لُھُو کا عنصر بعد کی عمر میں شامل ہوتا ہے۔

جوانی کی اسی عمر میں انسان پر اپنی شخصیت کی ظاہری ٹیپ ٹاپ (ذِیْنَةُ) کا جنون سوار ہوتا ہے۔ عمر کے اس مرحلے میں وہ شکل و صورت کے بناء، سنگھار، ملبوسات وغیرہ کی وضع قطع، معیار اور فیشن کے بارے میں بہت حساس ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد جب عمر ذرا اور بڑھتی ہے تو تَفَاخُوْ بَيْنَكُمْ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا چوتھا اور اہم ترین مرحلہ ہے۔ اس عمر میں انسان پر ہر وقت تفاخر کا بھوت سوار ہوتا ہے، اور وہ عزت، شہرت، دولت، گھر، گاڑی وغیرہ کے معاملے میں خود کو ہر قیمت پر دوسروں سے برتر اور آگے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد جب عمر ذرا دھلتی ہے تو تَنَكُّثُوْ فِيْ الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کا دور آتا ہے۔ اس دور میں انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ تفاخر کے دور میں تو سوچ یہ تھی کہ کچھ بھی ہو جائے مونچھ نیچی نہیں ہونی چاہیے، لیکن اب سوچ یہ ہے کہ مال آنا چاہیے، مونچھ رہے یا نہ رہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس عمر میں پہنچ کر انسان اپنے مفاد کے معاملے میں بہت حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے، بلکہ جوں جوں بڑھاپے کی طرف جاتا ہے اس کے دل میں مال و دولت کی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرحلے پر اسے خود بھی محسوس ہو جاتا ہے کہ اب وہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے مگر اس کی ہَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کی خواہش ختم ہونے میں نہیں آتی۔ انسان کی اسی کیفیت کو سورۃ النکاح میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْهٰلِكُمْ اَلْكَاثِرُوْٓۤا ۝۱ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲﴾ ”(لوگو! تم کو (مال کی) کثرت کی طلب نے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔“

بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں، لیکن عمر کے ہر مرحلے میں کسی ایک چیز کی دھن اس کے ذہن پر سوار رہتی ہے۔ اس موضوع پر یہ قرآن حکیم کی واحد آیت ہے اور اس اعتبار سے بہت اہم اور منفرد ہے، مگر حیرت ہے کہ انسانی زندگی کے نفسیاتی مراحل کے طور پر اسے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ آیت کے اگلے حصے میں انسانی اور نباتاتی زندگی کے مابین پائی جانے والی مشابہت اور مماثلت کا ذکر ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے کہ نباتاتی سائیکل (Botanical cycle) اور انسانی زندگی کے سائیکل (Human life cycle) دونوں میں بڑی گہری مشابہت اور مناسبت ہے۔ اس تشبیہ سے انسان کو دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم اپنی زندگی کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو کسان کی ایک فصل کے سائیکل کو دیکھ لو۔ اس فصل کے دورانیہ میں تمہیں اپنی پیدائش، جوانی، بڑھاپے، موت اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا حقیقی نقشہ نظر آ جائے گا۔

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾ ”(انسانی زندگی کی مثال ایسے ہے) جیسے بارش برستی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی روئیدگی کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہے“

﴿ثُمَّ يَنْجِ﴾ ”پھر وہ کھتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے“

﴿فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا﴾ ”پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتی ہے“

﴿ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا﴾ ”پھر وہ کٹ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔“

اس تشبیہ کے آئینے میں انسانی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ پھر وہ جوان ہو کر اپنی پوری قوت کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر عمر ڈھلتی ہے تو بالوں میں سفیدی آ جاتی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پھر موت آنے پر اسے زمین میں دبا دیا جاتا ہے جہاں وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تشبیہ صرف دنیوی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو، نباتات نہیں ہو، تمہاری اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جو کہ دائمی اور ابدی ہے اور اس کی نعمتیں اور صعوبتیں بھی دائمی اور ابدی ہیں۔ لہذا عقل اور سمجھ کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنی آخرت کی فکر کرو۔

﴿وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ﴾ ”اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی طرف سے مغفرت اور (اس کی) رضا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور کا ایک خطبہ ”نہج البلاغہ“ میں نقل ہوا ہے۔ اس کے اختتامی الفاظ یوں ہیں:

((..... ثُمَّ لَتَحَاسِبَنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ ، ثُمَّ لَتَجْزَوْنَ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالْإِسْوَاءِ سُوءًا ، وَإِنَّهَا لَجَنَّةٌ أَبَدًا أَوْ لَنَارٌ أَبَدًا)) (۱)

”..... پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔“

﴿وَمَا الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝﴾ ”اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ نہیں ہے۔“

تمہاری دنیوی زندگی کی حقیقت تو بس یہی ہے، لیکن تم ہو کہ اس حقیقت کو فراموش اور نظر انداز کیے بیٹھے ہو۔ تمہارے دل میں نہ اللہ کی یاد ہے اور نہ آخرت کی فکر۔ بس تم اس عارضی اور دھوکے کی زندگی کی آسائشوں میں مگن اور اسی کی رنگینیوں میں گم ہو۔ یاد رکھو! یہ طرز عمل غیروں کی پہچان تو ہو سکتا ہے، ایک بندہ مؤمن کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے  
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق!

**آیت ۲۱** ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ﴾ ”ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت

آسمان اور زمین جیسی ہے۔“

دنیا کمانے میں تو تم لوگ خوب مسابقت کر رہے ہو۔ اس میدان میں تو تم ہر وقت مع ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!“ کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ عارضی دنیا کی اس مسابقت کو چھوڑ دو اپنی یہی صلاحیتیں اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کے لیے صرف کرو۔ اس مدد کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرو اور اس منزل میں بہتر سے بہتر مقام پانے کے لیے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

جنت کی وسعت کی مثال کے لیے یہاں ”كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ جبکہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں ”عَرْضُهَا السَّمُوتِ وَالْأَرْضُ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود ابھی تک ارض و سماء کی وسعت کے بارے میں انسان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہر حال اب تک میسر ہونے والی معلومات کے مطابق اس کائنات میں ارب ہا ارب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں کی وسعت اور ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں کے فاصلے کو کروڑوں نوری سالوں پر محیط تصور کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر کہکشاں میں اُن گنت ستارے ہمارے نظام شمسی (solar system) جیسے بے شمار نظام اور ہماری زمین جیسے لاتعداد سیارے ہیں۔ اسی طرح ہر ستارے کی جسامت اور ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کے فاصلے کا اندازہ بھی نوری سالوں میں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس آیت میں آسمان اور زمین کی وسعت سے مراد پوری کائنات کی وسعت ہے جس کا اندازہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہر حال اس مثال سے جنت کی وسعت کے تصور کو انسانی ذہن کی سطح پر ممکن حد تک قابل فہم بنانا مقصود ہے۔ اس حوالے سے میرا گمان یہ ہے (واللہ اعلم!) کہ قیامت برپا ہونے کے بعد پہلی جنت اسی زمین پر بنے گی اور اہل جنت کی ابتدائی مہمانی (نُزُل) بھی یہیں پر ہوگی۔ اس کے بعد اہل جنت کے درجات و مراتب کے مطابق ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ اس حوالے سے سورہ الاعراف کی اس آیت میں واضح فرما دیا گیا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَبُوا بآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ.....﴾ (آیت ۴۰) کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں تکبر کرنے والوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ بہر حال اس کے بعد اہل جنت کو ان کے مراتب کے مطابق اس جنت میں منتقل کر دیا جائے گا جس کی وسعت کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اہل جنت کو وہاں جانے کے لیے کسی راکٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی انداز سے آسمانوں پر لے جائے گا جیسے محمد رسول اللہ ﷺ سفر معراج میں زمین سے ساتویں آسمان تک چلے گئے تھے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ساتویں آسمان سے زمین پر آتے ہیں۔

﴿أَعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ﴾ ”وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے

اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔“

”اعداد“ (باب افعال) کے معنی ہیں کسی خاص مقصد کے لیے کسی چیز کو تیار کرنا۔ یعنی وہ جنت بڑے اجتماع سے تیار کی گئی ہے، سبائی اور سنواری گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر۔

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ ﴿۲۱﴾ ”یہ اللہ کا فضل ہے جس کو

بھی وہ چاہے گا دے گا۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔“

”فضل“ سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجر و اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں، جن کا مطلب ہے بدلہ جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں بالعموم جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں لفظ ”فضل“ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہ ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دست گیری نہ کرے۔ ☆

اب اگلی آیت میں دنیوی زندگی میں پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو قابل برداشت بنانے کا نسخہ بتایا جا رہا ہے۔ دراصل اہل ایمان کو جس راستے کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ بہت کٹھن اور صبر آزمایا رہا ہے۔ یہ اتفاق جہاد اور قتال کا راستہ ہے اور اس کی منزل ”اقامت دین“ ہے، جس کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے آیت ۲۵ اس سورت کے ذروہ سنام (climax) کا درجہ رکھتی ہیں۔ بہر حال اہل ایمان جب اس راستے پر گامزن ہوں گے تو آزمائشیں، صعوبتیں اور پریشانیاں قدم قدم پر ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کریں گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اہل قانون ہے جس کا ذکر قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری ہے: ﴿وَلَتَبْلُؤُنَّكُمْ بَنِيٌّ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ (آیت ۱۵۵) ”اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے“۔ جبکہ سورۃ آل عمران میں اس قانون کا ذکر ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿لَتَبْلُؤُنَّ فِيْهِ أَمْوَالَكُمْ وَأَنْفُسَكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيْرًا﴾ (آیت ۱۸۶) ”(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی، اور تمہیں لازماً سننا پڑیں گی بڑی تکلیف دہ باتیں ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا“۔ چنانچہ مشکلات و مصائب کی اس متوقع یلغار کے دوران اہل ایمان کو سہارا دینے کے لیے یہ نسخہ بتایا جا رہا ہے:

☆ اس ضمن میں یہ حدیث بھی ذہن میں رہنی چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((لَنْ يَدْخُلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) ”تم میں سے کسی شخص کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا (جب تک کہ اللہ کی رحمت اس کی دیکھری نہ فرمائے)“۔ اب کسی صحابی نے بڑی ہمت، حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! ”اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ بھی (اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے)؟“ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ)) ”نہیں، میں بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ عزوجل اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کی چادر سے مجھے ڈھانپ دے۔“ [صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب تمنی المرض الموت، ج: ۵، ۶۷۳۔ و صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لمن یدخل احد الجنۃ بعملہ.....، ج: ۲، ۸۱۸] (حاشیہ از مرتب)

**آیت ۲۲** ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا﴾  
 ”نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں  
 درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔“

أَصَابَ يُصِيبُ (آپڑنا، نازل ہونا) سے اسم الفاعل ”مُصِيبٌ“ ہے اور اس کی مؤنث ”مُصِيبَةٌ“ ہے جس کے معنی ہیں نازل ہونے یا آپڑنے والی شے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے تمام حوادث واقعات کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی، لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ، ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت کی رو سے مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو آفات ارضی و سماوی یعنی آفاقی مصیبتیں جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں مثلاً سیلاب، زلزلے، طوفانِ باد و باران وغیرہ یا انسانوں کی اپنی جانوں پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے مثلاً کوئی بیماری یا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسانوں پر اجتماعی یا انفرادی طور پر کسی بھی شکل میں کوئی مصیبت آفت یا تکلیف آتی ہے اس کے معرض وجود میں آنے سے قبل اس کی پوری تفصیل اللہ کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ ”یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔“  
 انسانوں کو یہ بات بے شک عجیب یا مشکل لگے، مگر اللہ کا علم مآ کانَ وَمَا يَكُونُ پر محیط ہے۔ اس کے لیے کائنات کی ایک ایک چیز کا پوری تفصیل سے احاطہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو بھلا کیوں بتائی جا رہی ہے؟ اس لیے:

**آیت ۲۳** ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ﴾ ”تا کہ تم افسوس نہ کیا کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے“  
 کوئی اچھا موقع ہاتھ سے نکل جانے پر انسان رہ رہ کر افسوس کرتا اور پچھتا تا ہے کہ اگر میں اس وقت یوں کر لیتا تو میرا یہ کام ہو جاتا، اگر فلاں شخص فلاں وقت فلاں رکاوٹ کھڑی نہ کر دیتا تو میں فلاں نقصان سے بچ جاتا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے پچھتاوے بعض اوقات زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ اور اس کے فیصلوں پر انسان کا ایمان مضبوط ہو تو وہ اپنے بڑے سے بڑے نقصان کو بھی یہ کہہ کر بھلا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے حق میں ایسا ہی منظر تھا اور اس چیز کے میرے ہاتھ سے نکل جانے میں ہی خیر تھی، کیونکہ میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت اس بارے میں بہت واضح ہے:

﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور اُنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“  
 ﴿وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ ”اور اس پر اترایا نہ



کہ جو وہ تمہیں دے دے اور اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں اترانے والے اور فخر کرنے والے۔“

ایسی کسی صورت میں انسان کے لیے اترانے کا جواز اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جو کچھ بھی دیا جاتا ہے دراصل اس کی آزمائش کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں اس حقیقت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں ہمیں جو نعمت، صلاحیت یا دولت ملتی ہے اس کے لیے ہمیں جواب دہ ہونا ہے۔ چنانچہ جس انسان کے پاس دنیوی نعمتوں کی جس قدر بہتات ہوگی جو اب دہی کے حوالے سے اس کی ذمہ داری بھی اسی حد تک بڑھ جائے گی۔ اکاؤنٹس کی زبان میں ایسی ذمہ داری کو liability کہا جاتا ہے۔ جب کسی محکمے یا ادارے کے balance sheet تیار ہوتی ہے تو اس ادارے کو ملنے والا سرمایہ liability کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے۔ کھاتے میں liability کا اندراج ہو جانے کے بعد اس کی ایک ایک پائی کا حساب دینا اس ادارے کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں جو کچھ دیتا ہے وہ اس کے ذمہ liability ہے۔ کل قیامت کے دن اس میں سے ہر چیز کا آڈٹ ہونا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھے گا کہ تمہیں جو مال دیا گیا تھا بتاؤ اس کا تم نے کیا کیا؟ میری طرف سے دی گئی قوت، ذہانت اور دوسری صلاحیتوں کو کہاں کہاں صرف کیا؟ دنیا بنانے میں کھپایا یا آخرت کمانے میں لگایا؟ اس احتساب یا آڈٹ کا تصور کر کے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے کھاتے کی فکر کرنی چاہیے۔ جیسے آج ہمارے بہت سے لوگ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور بین الاقوامی سطح کے دوسرے اداروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور لاکھوں ڈالرتنخواہ وصول کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یقیناً یہ بہت بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہے، لیکن ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس کی چاکری کر رہے ہیں؟ اور کس کی رتھ میں گھوڑے بن کر جتے ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے وہ باطل نظام کی خدمت کر رہے ہیں اور اسی نظام سے اپنی خدمت کا معاوضہ وصول کر رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آخرت کے آڈٹ کے وقت وہ اپنی balance sheet کو کیسے justify کریں گے۔

چنانچہ انسان کو مال و دولت اور دوسری نعمتوں پر اترانے کے بجائے ان کے حساب کتاب کی فکر کرنی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ چیزیں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دی گئی ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں ناکام ہو گیا تو یہی نعمتیں آخرت میں اُس کے گلے کا طوق بن جائیں گی۔ اس حوالے سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک واقعہ بہت عبرت انگیز ہے۔ آپ کو خلیفہ وقت کی طرف سے ”خلق قرآن“ کے مسئلے پر جیل میں ڈالا گیا۔ خلیفہ آپ سے اپنی مرضی کا نوئی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے خلیفہ کے حکم پر جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ جس انداز میں آپ کو پیٹا جاتا تھا ایسی مار کسی ہاتھی کو پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا، مگر اس بے رحم تشدد کو آپ نے ایسے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا کہ کبھی آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے۔ مگر جب نئے خلیفہ کے دور میں آپ کو جیل سے رہا کیا گیا اور خلیفہ کے ایلچی آپ کی خدمت میں اشرافیوں کے تھیلے لے کر حاضر ہوئے تو ان تھیلوں کو دیکھ کر آپ رو پڑے۔ آپ نے روتے ہوئے اللہ کے حضور عرض کی کہ اے اللہ! یہ آزمائش بہت سخت ہے! میں اس سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں ہوں، مجھے اس امتحان میں مت

ڈال! اس حوالے سے دوسری انتہا پر برصغیر کے قوم فروشن کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں، عہدوں اور خطابات کے ذریعے یہاں کے لوگوں کو خرید اور حکمرانوں کے ہاتھوں بکنے کے بعد وہ لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے اپنے آقاؤں کی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ بہر حال یہ ہر انسان کا اپنا فیصلہ ہے کہ اس کی ترجیح دنیا ہے یا آخرت؟

**آیت ۲۴** ﴿الَّذِينَ يَخُلُونُ وَيَاْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ ”جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔“

جو شخص اپنی دولت پر اترتا ہے وہ اسے بہت سنبھال سنبھال کر بھی رکھتا ہے، کیونکہ اسی دولت کے بل پر تو اس کی اکثر قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس دولت کو بچا بچا کر رکھتا ہے اور نہ صرف خود بخل سے کام لیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ دراصل اسے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ جب دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر خرچ کریں گے تو اس کے بخل کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے وہ دوسروں کو بڑے غلصانہ انداز میں سمجھاتا ہے کہ میاں ذرا اپنی ضروریات کا بھی خیال رکھو، تم نے تو اپنے دونوں ہاتھ کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔ آخر تمہارے ہاں چار بیٹیاں ہیں، ان کے ہاتھ بھی تم نے پیلے کرنے ہیں۔ آج کی بچت ہی کل تمہارے کام آئے گی.....!

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ ”اور جو کوئی رخ پھیرے گا تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔“

وہ غنی ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اگر وہ اقامت دین کی جدوجہد میں اپنے جان و مال سے شریک نہ ہوگا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ اسے کسی کی حمد و ثنا کی بھی کوئی احتیاج نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔

## آیت ۲۵

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ  
وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ  
بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ

اب آ رہی ہے وہ آیت جو اس پوری سورہ مبارکہ کا نقطہ عروج یا ذرۂ سنام (climax) ہے۔ اس آیت کا مضمون خصوصی طور پر آج کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ آج ہمارے ہاں دین کا اصل تصور مسخ ہو چکا ہے اور یہ آیت دین کے درست تصور کو اجاگر کرتی ہے۔ دراصل انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کا عام تصور یہی تھا کہ حکومت انگریز کی ہے تو ہوتی رہے، ہمیں کیا! ہم نے تو نمازیں پڑھنی ہیں اور روزے رکھنے ہیں۔ اس دور میں برصغیر کے ایک بہت بڑے عالم نے کہا تھا کہ ہمیں کوئی

ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے انگریزوں کو ہماری طرف سے کوئی تشویش لاحق ہو، اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یعنی انگریز ہمیں نمازیں پڑھنے، روزے رکھنے، حج ادا کرنے اور داڑھیاں رکھنے سے نہیں روکتا۔ مذہبی آزادی کی اسی وکالت پر علامہ اقبال نے یہ بھیبتی جست کی تھی:-

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ظاہر ہے انگریز مسلمانوں کو مراسم عبودیت ادا کرنے اور داڑھیاں بڑھانے سے کیوں منع کرتے؟ اس سے انہیں بھلا کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ملک میں قانون تو تاج برطانیہ کا نافذ تھا، دیوانی اور فوجداری عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں اسلام کہاں تھا اور قرآنی قوانین کی کیا حیثیت تھی؟ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اسی پر مسرور و مطمئن تھے کہ انہیں ”مکمل“ مذہبی آزادی حاصل ہے۔ بہر حال انگریز کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا تصور دین سکڑتے سکڑتے صرف چند عبادات اور رسومات (rituals) تک محدود ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں آج بھی تصور دین یہی ہے کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، ہو سکے تو حج کرو، قرآن خوانی کی محفلیں سجاؤ اور بس! اور جہاں تک سودی کاروبار اور حرام خوریوں کا تعلق ہے یہ دنیوی معاملات ہیں، اسلام کا ان سے کیا لینا دینا؟ ہاں سال بہ سال عمرہ کر کے پچھلے گناہوں سے پاک ہو جایا کرو، جیسے ہندو لنگا میں نہا کر اپنے زعم میں اپنے سارے پاپ دھو ڈالتے ہیں۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب آپ اس آیت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو دین کا روایتی تصور لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہوگا۔ اس آیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ڈنکے کی چوٹ انقلاب کی بات کی گئی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی بے باک اور عریاں انقلابی عبارت پوری انسانی تاریخ کے کسی انقلابی لڑچکر میں موجود نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد آئیے اب اس آیت کا مطالعہ کریں اور اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

**آیت ۲۵** ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ﴾ ”ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانوں کے ساتھ“

﴿وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ﴾ ”اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری“ یہاں تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: (۱) بینات (۲) کتاب اور (۳) میزان — ان میں سب سے پہلی چیز ”بینات“ ہے۔ ”بین“ اُس شے کو کہتے ہیں جو از خود ظاہر اور نمایاں ہو اور اسے کسی دلیل اور وضاحت کی حاجت نہ ہو۔ ع ”آفتاب آمد دلیل آفتاب!“ یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔

”کتاب“ کا لفظ عام فہم اور بالکل واضح ہے، جبکہ ”میزان“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام ہے جس میں حقوق و فرائض کا توازن موجود ہے۔ کسی معاشرے میں اگر حقوق و فرائض کے مابین توازن ہوگا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا، اور اگر اس کے اندر عدم توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم، عدوان، زیادتی اور نا انصافی ہے۔

﴿لَيَقُومَنَّ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ”تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔“

یہ ہے اس کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا

بھی جائزہ لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن کو کسی حد تک ”بے دخل“ کر چکے ہیں۔ کیا قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ قرآن خوانی کی مجالس سجالی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کر لیا جائے؟ یا اس کی آیات کی خطاطی کی نمائشیں لگائی جائیں یا چالیس من وزنی قرآن سونے کی تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے۔ اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کی جائے؟ اس حوالے سے مولانا مہر القادری کی زبان سے قرآن کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے:

یہ میری عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے  
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!

ظاہر ہے قرآن تو ایک ضابطہ زندگی اور ایک نظام حکومت لے کر آیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے نظام کو عملی طور پر اپنے ملک اور معاشرے میں قائم کریں اس کی لائی ہوئی میزان کو نصب کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں۔ ”گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!“

اس آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں درج ذیل آیات کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے۔ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَانِمًا بِالْقُسْطِ﴾ (آیت ۱۸) کہ میں عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہوں۔ سورہ النساء میں اہل ایمان کو باقاعدہ حکم دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ”اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر“۔ سورہ المائدہ میں الفاظ کی ترتیب بدل کر یہی حکم پھر سے دہرایا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۸) ”اے اہل ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ“۔ پھر سورہ الشوریٰ میں حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا: ﴿وَأْمُرْتُ بِالْعَدْلِ بَيْنَكُمْ﴾ (آیت ۱۵) ”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں“۔ پھر سورہ الشوریٰ ہی میں فرمایا گیا: ﴿اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ﴾ (آیت ۱۷) ”اللہ وہ ہستی ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ اور میزان بھی“۔ یعنی سورہ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب اور میزان نازل کرنے کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔

اس حوالے سے سورہ المائدہ کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے: ﴿قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمُ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (آیت ۶۸) ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے تورات کو اور انجیل کو اور اُس کو جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے“۔ سورہ المائدہ کی اس آیت کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ مسلمان ”تورات و انجیل“ کی جگہ لفظ ”قرآن“ رکھ کر اس آیت کو اس طرح پڑھ کر دیکھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کریں: ”قُلْ يٰٓأَهْلَ الْقُرْآنِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمُ الْقُرْآنُ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ“ کہ اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے

جب تک تم قائم نہیں کرتے قرآن کو اور اس کو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے—تم قرآن کی تلاوت کر کے سمجھ لیتے ہو کہ تم نے قرآن کا حق ادا کر دیا یا تراویح میں قرآن ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مار لیا، چاہے تم نے اس کا ایک حرف بھی نہ سمجھا ہو۔ یاد رکھو! جب تک تم قرآن کے احکام کو عملی طور پر خود پر نافذ نہیں کرتے ہو اور قرآن کے نظام عدل کو اپنے ملک و معاشرہ میں قائم نہیں کرتے ہو، قرآن پر ایمان کے تمہارے زبانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن کے نظام عدل و قسط کے حوالے سے یہ حقیقت بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کے لیے یہ نظام کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے جو نبی اس کے قیام کے لیے ٹھوس کوششوں کا آغاز ہوگا یہ طبقات ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے آ موجود ہوں گے۔ ظاہر ہے جن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات (vested interests) پرانے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کب چاہیں گے کہ معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے بھی تاریخ میں استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنیؓ اپنے معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس کے باوجود ان دونوں حضراتؓ نے اپنے مفادات، کاروبار اور سٹیٹس کی پروا کیے بغیر حق کی آواز پر بلا تاخیر لبیک کہا۔ لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ اور دولت مند طبقہ ہمیشہ نظام عدل کے قیام کی کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقات کی سر توڑ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہ آئے۔ چنانچہ باطل نظام کی منہ کنی اور نظام عدل و قسط کے قیام کی جدوجہد کے لیے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ایسے عناصر کی سرکوبی کا نسخہ بتایا جا رہا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ”اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعیتیں بھی ہیں۔“

نوٹ کیجیے! نہ کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جو بات کہنا مقصود تھی وہ دونوں انداز میں ذکنے کی چوٹ کھیں گئی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ ”عریاں ترین“ انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور جب ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سرب بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے، اس کے بغیر انقلاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نظام عدل کے لیے انقلاب کی بات ہو رہی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خود انسان عدل انسانی کے اپنے تصور کی ترویج و تحفیذ کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں، مخالف ممالک کا گھیراؤ کرتے ہیں، ان پر بے رحمانہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ”امن کے لیے جنگ“ (War for Peace) کا نعرہ لگا کر کمزوروں پر چڑھائی کرتے ہیں اور پھر ملکوں کے ملک بر باد کر کے رکھ دیتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل و غارت اور بربریت کو وہ وقت کی اہم ضرورت اور عین انصاف سمجھتے ہیں۔

اس کائنات کا خالق اور مالک بھی اللہ ہے اور زمین پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کا ہے۔ اُسی نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنایا ہے اور اُسی نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسی اختیار کی وجہ سے انسان اکثر من مانی کرتے ہوئے اُس کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین میں عدل و انصاف کی ترویج اور اپنے قانون کی حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کی مشیت یہی ہے کہ اُس کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والے باغیوں کو حق کی طاقت کے ذریعے سے کچل دیا جائے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَكْدُمُهُ فَإِذَا هُوَ دَاحِقٌ﴾ (الانبیاء: ۱۸) ”بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے“ تو جیہی وہ نابود ہو جاتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا یہ کام اُس کے نام لیوا کریں۔ اُس کے نام لیوا حق کے علمبردار بن کر اللہ کے باغیوں کا مقابلہ کریں، باطل نظام کو بزور بازو اکھاڑ پھینکیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی کو یقینی بنائیں۔

آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر اسی حوالے سے آیا ہے کہ اہل حق حالات و زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامان حرب تیار کریں رائج الوقت میکانا لوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال افرادی قوت کی فراہمی کا ہے اور اس عمل کی ابتدا دعوت و تبلیغ سے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بارہ سال تک مسلسل دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ حق کو قبول کرنے والے افراد کی تربیت کی، انہیں منظم کیا اور جب مطلوبہ افرادی قوت فراہم ہو گئی تو آپ نے اللہ کی مشیت کے عین مطابق طاقت کے اس ”کوڑے“ کو باطل کے سر پر یوں دے مارا کہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیا۔ آج بھی یہ کام اگر ہوگا تو اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا۔ آج بھی اہل حق کو اسی طرح جانیں قربان کرنا ہوں گی، تکفیس جھیلنا پڑیں گی، گھربار چھوڑنے پڑیں گے اور جان و مال کے نقصانات برداشت کرنا پڑیں گے۔ گویا یہ انتہائی مشکل کام ہے اور اہل حق کی بے دریغ قربانیوں کے بغیر اس کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

﴿وَلْيَعْلَمَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (۱۵) ”اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا بہت زبردست ہے۔“

”تاکہ اللہ جان لے“ کا مفہوم یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دکھا دے ظاہر کردے، متمیز کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ گویا حق و باطل کی جنگ کے دوران جو مردان حق لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئیں گے وہی اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہوں گے۔ دراصل اللہ کے دین کو غالب کرنا بنیادی طور پر حضور ﷺ کا فرض منصبی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

﴿الصف: ۹﴾ ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر“۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس مشن میں تمام اہل ایمان آپ کے دست و بازو بنیں، بلکہ سورۃ الصف میں تو اس کے لیے براہ راست حکم آیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ﴾ (آیت ۱۳) ”اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔“

یہ مضمون سورۃ الصف میں مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔ لیکن اس حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ سمجھ لیجیے کہ آیت زیر مطالعہ میں غلبہ دین کی تکمیل اور نظام عدل و قسط کی تحفیز کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بینات، کتاب اور میزان: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ﴾ یعنی حضور ﷺ سے پہلے رسولوں کو اس مشن کے لیے بینات (معجزات)، کتاب اور میزان کے ساتھ بھیجا جاتا رہا، جبکہ حضور ﷺ کو اس مشن کے لیے صرف دو چیزیں (الہدیٰ اور دین الحق) عطا کی گئیں: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ﴾ (التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸ اور الصف: ۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے بینات (معجزات) اور کتاب ایک ہو گئے۔ یعنی الہدیٰ (قرآن) آپ کی کتاب بھی ہے اسی میں قانون ہے اور یہی آپ کا سب سے بڑا معجزہ بھی ہے، جبکہ آپ کی رسالت میں میزان (شریعت) مکمل ہو کر ”دین الحق“ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

## آیات ۲۶ تا ۲۹

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النَّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ  
وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فُسِقُونَ ۖ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ  
وَأَتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَافَةً وَرَحْمَةً ۖ وَرَهَابِيتَةً  
إِتَّبَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا  
فَأَتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۖ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا  
اتَّقُوا اللَّهَ وَأَمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ  
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۚ لَيْسَ لَكُمُ الْكِتَابُ إِلَّا يَتَقَدَّرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ  
مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ  
الْعَظِيمِ ۚ

ج

اس سورۃ مبارکہ کا اصل مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا آیت ۲۵ پر اپنے نقطہ عروج (climax) پر پہنچ گیا ہے۔ اب آئندہ آیات میں گویا اس مضمون کا ضمیمہ اور تکرار رہا ہے (قبل ازیں کبھی میں بغرض تفہیم اس کے لیے anti climax کی اصطلاح استعمال کرتا رہا ہوں، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصطلاح مناسب نہیں ہے)۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مناسب ہو گا کہ متعلقہ آیات کے مطالعے سے پہلے اس مضمون کی روح کو اچھی

طرح سے سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی اور معاشرے میں عدل و انصاف کی ترویج شیطان پر بہت بھاری ہے۔ اس لیے اس نے اس ”انقلاب“ کا راستہ روکنے کے لیے یہ چال چلی کہ مخلص اہل ایمان کی توجہ ترک دنیا اور رہبانیت کی طرف مبذول کرا دی تاکہ اُسے انسانوں کے معاشرے میں ننگا ناچ ناپنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔

اہل ایمان کے دلوں میں اللہ کی محبت، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طلب کے جذبے کا نتیجہ تو یہ نکلتا چاہیے کہ وہ اللہ کی فوج کے سپاہی بن کر اقامت دین کی جدوجہد کے علمبردار بن جائیں اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہرزماں، ہر مکاں شیطانی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں، لیکن شیطان نے ایسے لوگوں کو رہبانیت کا سبق پڑھا دیا کہ اللہ والوں کا دنیا کے بھیمیلوں سے کیا واسطہ؟ انہیں تو چاہیے کہ وہ دنیا اور علاقہ دنیا کو چھوڑ کر جنگوں اور پہاڑوں کی غاروں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ہاں اپنے درجات بلند کریں۔ ظاہر ہے ایسی رہبانیت دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔ غلبہ دین کی جدوجہد کی راہ میں مصیبتیں جھیلنے، اس میدان میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مال و جان کی قربانیاں دینے اور خائفانہ ہوں میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت کی سختیاں برداشت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کی سختیاں برداشت کرنے سے معاشرے سے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہوتا ہے، انسانیت عدل و انصاف کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ماحول میں فلاح و خوشحالی کے پھول کھلتے ہیں، جبکہ رہبانیت کی راہ میں اٹھائی گئی تکالیف سے دنیا اور اہل دنیا کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ بہر حال شیطان کا یہ وار عیسائیت کے حوالے سے بہت کارگر ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کے ہاں نہ صرف خانقاہی نظام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ”رہبانیت“ اعلیٰ ترین ذریعہ اور وسیلہ قرار پائی۔ (History of Christian Monasticism) پر لکھی گئی یورپین مصنفین کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں عیسائی راہبوں اور رہبانیت کے بارے میں عجیب و غریب تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔)

اس کے بعد اسلام میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور احیاء خلافت کی چند کوششیں ناکامی سے دو چار ہوئیں تو مسلمانوں کے ہاں بھی رہبانیت کے طور طریقے رائج ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ مخلص اہل ایمان اور اہل علم لوگ بادشاہوں اور سلاطین کے رویے کی وجہ سے اُمت کے اجتماعی معاملات سے لاتعلق ہو کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھے۔ البتہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان سے اکتساب فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اہل اللہ اور اہل علم کی مسندوں نے خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ سلاطین و امراء نے اپنے مفاد کے لیے ان خانقاہوں کی سرپرستی کرنی شروع کر دی۔ ایسی خانقاہوں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں مختص کر دی گئیں تاکہ خانقاہ اور اس سے متعلقہ تمام لوگوں کے اخراجات احسن طریقے سے پورے ہوتے رہیں اور یہ لوگ حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ چلے کشیوں اور اپنی روحانی منازل طے کرنے میں مصروف و مشغول رہیں۔ دوسری طرف ان خانقاہوں سے متعلقہ لوگوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ دین و دنیا کا یہ تصور جز پکڑتا گیا کہ حکومت کرنا اور اجتماعی معاملات نبھانا



سلاطین و امراء کا کام ہے ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار؟ ہمارا کام تو دینی تعلیمات کی اشاعت اور لوگوں کی روحانی اصلاح کرنا ہے، تاکہ وہ اچھے مسلمان اور اللہ کے مقرب بندے بن سکیں۔ یوں دین اسلام کا اصل تصور وحدانیت اور اس کی جگہ خائفی نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ دین کا درست تصور اور انبیاء و رسل کی بعثت کا اصل مقصد تو وہی ہے جو ہم گزشتہ آیت میں پڑھ چکے ہیں: ﴿لَيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ”تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔“

چنانچہ آئندہ آیات میں ایک تو یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانیت نے ”رہبانیت“ کا غلط موڑ کب اور کیسے مڑا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! بے شک دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت بنانے کی فکر اختیار کرنا ہی دین کا اصل جوہر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم راہب بن کر تمدن کی زندگی کو خیر باد کہہ دو، بن باس لے لو اور جنگلوں میں جا کر چلے کاٹنا شروع کر دو، پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں میں جا کر تپیاں کیں کرو یا خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو جاؤ۔ تمہیں تو دنیا کی منجھدار میں رہتے ہوئے دوسروں کو زندگی کی ضمانت فراہم کرنی ہے۔ تمہیں تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ ظلم و ناانصافی کو جڑ سے اکھاڑ کر معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے اور اپنے ارد گرد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مظلوم کو اُس کا حق ملے اور ظالم کو سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے۔ اس کے لیے تمہارے سامنے اُسوۂ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قائم کردہ معیار بطور نمونہ موجود ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرب کے معاشرے کو حق و انصاف کا جو معیار عطا کیا تھا اس کی جھلک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو آپ نے لوگوں سے بیعت خلافت لینے کے فوراً بعد کی تھی۔ آپ نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنے پہلے خطاب میں عدل و انصاف کے بارے میں اپنی ترجیح واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”لوگو! تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہوگا جب تک کہ میں اسے اُس کا حق نہ دلوں اور تمہارا قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہوگا جب تک کہ میں اس سے کسی کا حق وصول نہ کر لوں۔“ اسی طرح اس ضمن میں حضرت ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادیسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

إِنَّ اللَّهَ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ الْعِبَادَ مِنَ عِبَادَةِ رَبِّ الْعِبَادَةِ وَمِنْ ضَيْقِ الدُّنْيَا إِلَى سَعَةِ الْآخِرَةِ

وَمِنْ جُورِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ

”ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔“

یہ ہے اس مضمون کا لُب لباب جو اس سورت کے آخر میں مرکزی مضمون کے ضمیمے کے طور پر بیان ہوا ہے۔

اب اگلی آیت سے اس مضمون کی تمہید شروع ہو رہی ہے۔

**آیت ۲۶** ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ﴾ ”ہم نے ہی بھیجا تھا نوحؑ کو بھی اور ابراہیمؑ کو بھی“

﴿وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ﴾ ”اور ہم نے انہی دونوں کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب“  
حضرت نوحؑ علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے بعد انسانیت کی نسل حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حضرت سامؑ حضرت حامؑ اور حضرت یافثؑ سے چلی تھی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء بھی آئے وہ آپ ہی کی نسل سے تھے۔ البتہ قرآن میں صرف سامی رسولوں کا تذکرہ ہے، آپ کے دوسرے دو بیٹوں کی نسلوں میں مبعوث ہونے والے پیغمبروں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت ابراہیمؑ خود بھی حضرت نوحؑ علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں جو انبیاء و رسل بھی آئے ان کا ذکر قرآن میں تخصیص کے ساتھ آپ کی نسل یا ذریت کے حوالے سے ہوا ہے۔ آج حضرت ابراہیمؑ کو گزرے تقریباً پانچ ہزار برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران آپ کی اولاد کہاں کہاں پہنچی اور کس کس علاقے میں آباد ہوئی؟ یہ اپنی جگہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے لیکن اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی نسل جس جس علاقے میں بھی آباد ہوئی ان تمام علاقوں میں انبیاء آتے رہے۔

﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ”تو ان (کی نسل) میں کچھ تو ہدایت یافتہ بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔“

**آیت ۲۷** ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاتَّبَعَتْهُ الْإِنجِيلَ﴾ ”پھر ہم نے بھیجے ان کے نقش قدم پر اپنے بہت سے رسول اور پھر ان کے پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو اور اسے ہم نے انجیل عطا فرمائی“

آیت ۲۶ اور ۲۷ میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام کا ذکر تمہید کے طور پر آیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اصل میں یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کے پیروکاروں نے رہبانیت کی ابتدا کی تھی۔

﴿وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً﴾ ”اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں بڑی نرمی اور رحمت پیدا کر دی۔“

رأفت اور رحمت ملتے جلتے مفہوم کے دو الفاظ ہیں۔ رأفت دراصل وہ انسانی جذبہ ہے جس کے تحت انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ بقول امیر مینائی۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!  
یعنی یہ جذبہ رأفت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کسی کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے، جبکہ رحمت کا جذبہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کی تکلیف دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ گویا رأفت کا جذبہ بنیادی طور پر انسان کے دل میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کے رد عمل (reflex action) کا اظہار جذبہ رحمت کی وجہ سے ہوتا

ہے۔ اس اعتبار سے رافت اور رحمت باہم تکمیلی (complementary) نوعیت کے جذبات ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تصدیق فرمائی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے دلوں کو خصوصی طور پر رافت و رحمت کے جذبات سے مزین کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بھی مزاج کے اعتبار سے انتہائی نرم اور رقیق القلب تھے آپ کی شخصیت میں سختی کا عنصر بالکل نہیں تھا۔ آپ کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ اس مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو چوری کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تم چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا نہیں میں چوری تو نہیں کر رہا۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو پھر میری آنکھ نے غلط دیکھا ہے۔ چنانچہ آپ کی شخصیت کے زیر اثر آپ کے حواریین کی طبیعتوں میں بھی رافت، رحمت، رقت قلب اور شفقت کے غیر معمولی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ جذبات بلاشبہ اپنی جگہ مستحسن ہیں۔ خود حضور ﷺ کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں فرمایا ہے کہ آپ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (رافت اور رءوف ایک ہی مادے سے ہیں)۔ بہر حال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ان جذبات کا رخ رہبانیت کی طرف موڑ دیا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا﴾ ”اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی تھی“

﴿مَّا كَسَبُوهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾ ”ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں“

اس فقرے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ رہبانیت انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اختیار کی تھی اس میں ان کی کسی بدعتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے تو ان پر کچھ لازم نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رضا تلاش کریں۔ لیکن انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے نفس کشی (self annihilation) 'ترک دنیا' رہبانیت اور تجرد (بغیر نکاح کے) کی زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ بہر حال حقیقت میں یہ اللہ کی رضا کا راستہ نہیں تھا۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا درست راستہ تو جہاد کا راستہ ہے: ﴿وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ﴾ (المائدہ: ۳۰) ”اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو!“، یعنی باطل کو ملیا میٹ کرنے، حق کو غالب کرنے، ظلم و نا انصافی کو اکھاڑ پھینکنے اور عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے مجاہد بن جاؤ! اس راستے پر چلتے ہوئے جان و مال کی قربانیاں دو فاقے برداشت کرو اور ہر طرح کی تکالیف و مشکلات کا سامنا کرو۔ بہر حال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو اللہ کے مقرب بننے اور اس کی رضا تلاش کرنے کا یہ راستہ ان کی نظروں سے اوجھل کر کے رہبانیت کے راستے پر ڈال دیا تاکہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تمدن کے معاملات سے لاتعلقی رہیں اور معاشرے کے اندر ابلیسیہ کے ننگے ناچ کو روکنے کوئی نہ ہو۔ دنیا میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھوٹ حاصل ہو اور ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ علامہ اقبال نے ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے کہ ابلیس نے اپنے چیلے چانوں کو ہدایات دیتے ہوئے ”مؤمن“ کے بارے میں کہا کہ۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے!

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ”پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے

کا حق تھا۔“

دراصل انسان کے لیے اپنے اوپر کوئی غیر فطری یا بندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لینا تو آسان ہے مگر پھر

ساری عمر اس فیصلے کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ یہی مشکل رہبانیت کا راستہ اختیار کرنے والے لوگوں کو پیش آئی۔

راہب اور راہبائیں بظاہر تو مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے لیکن پھر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زنا کاریوں

میں ملوث ہو جاتے۔ ان کے اس طریق عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہب خانوں کے تہ خانے حرامی بچوں کے قبرستان بن

گئے۔ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں اس بارے میں لرزہ خیز تفصیلات

ملتی ہیں۔ دراصل انسان کے جنسی جذبے کو غیر فطری طور پر دبانا ایسا ہی ہے جیسے بستے دریا پر بند باندھنا۔ دریا کے

پانی کو مناسب راستہ دے کر تو اس پر بند باندھا جاسکتا ہے لیکن دریا کے پورے پانی کو روکنا کسی طور پر بھی ممکن

نہیں۔ ظاہر ہے اگر کہیں کوئی ایسی کوشش ہوگی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ

انسان کا جنسی جذبہ بہت منہ زور ہے۔ سگمنڈ فرائڈ عیسائیوں کے گھر کا آدمی ہے اور اس کی گواہی گویا ”شہید

شَهِيدٌ مِّنْ اَهْلِهَا“ کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کے جنسی جذبے کو وہ تمام جذبات پر غالب اور باقی تمام جذبات کا

محرک قرار دیتا ہے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر فرائڈ کے اس تجزیے سے متفق نہیں ہوں اور میری یہ رائے اکیلے

فرائڈ یا اس کے اس تجزیے کے بارے میں ہی نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مغربی فلاسفر انسانی زندگی پر فلسفیانہ

بحث کے دوران اکثر غلط فہمی اور کج روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسے فرائڈ کو ہر طرف سیکس ہی سیکس نظر آیا، کارل

مارکس کی نظریں انسان کے پیٹ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جبکہ ایڈلر صاحب کو انسان کے بڑا بننے کا جذبہ (urge to

dominate) ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیا۔ بہر حال مذکورہ فلاسفر نے اپنے اپنے مطالعے اور تجزیے میں

انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور بہت سے دوسرے اہم پہلوؤں کو بالکل ہی

نظر انداز کر دیا ہے۔ لہذا ان کی ایسی آراء جزوی طور پر ہی درست تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ بہر حال اگر یہ درست نہ

بھی ہو کہ انسان کا جنسی جذبہ اس کے تمام جذباتوں پر غالب اور اس کے باقی تمام جذباتوں کا محرک ہے تو بھی اس

حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کا یہ جذبہ بہت منہ زور ہے اور اس کو غیر فطری طریقے سے قابو میں لانا ممکن

نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس جذبے کو نظم و ضبط میں لانے کے لیے نکاح کا فطری راستہ تجویز کیا ہے۔

رہبانیت کے لیے اختیار کیے گئے طور طریقے زیادہ تر چونکہ غیر فطری تھے اس لیے اسے اختیار کرنے والے لوگ

اس کا حق ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔

﴿فَا تَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ﴾ ”تو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو ان کا اجر دیا جو

ایمان لے آئے۔“

ایک رائے کے مطابق یہ عیسائیوں کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے

میں صاحب ایمان تھے، لیکن اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے انہیں ان کا اجر دیا جائے گا۔

﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝۲۷﴾ ”لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔“

**آیت ۲۸** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ!“

اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے — ایک تو یہ کہ یہاں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کا خطاب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ بلکہ صدق دل سے ایمان لاؤ اور اپنے ایمان کو پختہ کرو۔ حضور ﷺ پر سچے ایمان کا معیار آپ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان سے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ”تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔“ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اُسوہ کو دیکھو آپ کی زندگی کے معمولات کو اپنے لیے مشعل راہ بناؤ اور اپنی زندگیوں میں ویسا توازن پیدا کرو جیسا کہ آپ کی زندگی میں توازن تھا۔ دیکھو! حضور ﷺ نے ترک دنیا کا طریقہ نہیں اپنایا۔ آپ نے نکاح کیے آپ کی اولاد بھی ہوئی، آپ نے بحر پور زندگی گزاری، اس کے باوجود آپ نے اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں غلبہ دین کی جدوجہد کی نذر کر دیں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اس اُسوہ کی پیروی کرو۔

حضور ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جیسے آپ کا اتباع ضروری ہے ویسے ہی اس اتباع میں توازن قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کی تمام سنتوں کو اپنا لیا لیکن اتباع کرتے ہوئے ہر سنت کی مطلوبہ ترجیح اور اہمیت کا خیال نہ رکھا تو گویا وہ شخص حضور ﷺ کے اُسوہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا۔ اس نکتہ کو اس مثال سے سمجھیں کہ ایک طبیب نے آپ کو چند دوائیوں پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ ان میں سے ایک دوائی کا مطلوبہ وزن ایک چھٹانک ہے، دوسری کا ایک تولہ اور تیسری کا ایک ماشہ۔ اب اگر آپ اپنی پسند سے تولہ والی دوائی کا وزن ایک چھٹانک کر لیں اور چھٹانک والی دوائی کا وزن ایک تولہ کر لیں تو وہ نسخہ نسخہ شفا نہیں رہے گا، نسخہ ہلاکت بن جائے گا۔ اس لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں کہ فلاں عمل آپ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے، بلکہ سنت و سیرت نبوی کو اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی مجموعی طور پر کس طرح گزاری۔ آپ کی زندگی میں کس چیز کی کتنی اہمیت تھی؟ آپ نے کس عمل کو کتنا وقت دیا؟ آپ کی ترجیحات کیا تھیں؟ آپ کی ترجیحات میں بنیادی نوعیت کی چیزیں کون سی تھیں اور کون سی چیزوں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی؟ واضح رہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے اُسوہ کا اتباع کرتے ہوئے اس اعتبار سے توازن برقرار نہ رکھا تو اس کا طرز عمل حضور ﷺ کے اُسوہ کے اتباع کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ بن جائے گا۔

سیاق و سباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کے اس حصے کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔ پچھلی آیت میں چونکہ

اہل کتاب کا ذکر ہے اس لیے اس حوالے سے اس خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے۔ اس پہلو سے اس فقرے کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے جن لوگوں کے اندر اپنے سابقہ ایمان کی کچھ رتق موجود ہے ان سے کہا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو پہلے سے اللہ پر ایمان رکھتے ہو اب اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اُس کے آخری رسول پر بھی ایمان لے آؤ! اگر تم ایسا کرو گے تو:

﴿يُؤْتِكُمْ كَفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ﴾ ”وہ تمہیں دہرا حصہ عطا کرے گا اپنی رحمت سے“

اہل کتاب کے ایسے لوگوں کے لیے ہم سورۃ القصص میں بھی یہ خوشخبری پڑھ چکے ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرُهُمْ مَرَّتَيْنِ﴾ (آیت ۵۴) کہ اگر یہ لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لائیں گے تو انہیں دہرا اجر ملے گا۔ ﴿وَيَجْعَلُ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ﴾ ”اور وہ تمہیں ایسا نور عطا فرمائے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے“

اس سے ایک تو وہ نور مراد ہے جس کا ذکر قبل ازیں آیت ۱۲ میں ہو چکا ہے کہ پل صراط سے گزرتے وقت تمہیں نور عطا کیا جائے گا جس کی مدد سے تم آسانی سے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ لیکن اس کے علاوہ اس سے مراد یہاں ایمان بالرسول اور اُسوۂ رسول کے اتباع کا وہ نور بھی ہے جو اہل ایمان کو دنیوی زندگی میں بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ اٰمِنُوْا بِرَسُولِهِ کو ذہن میں دوبارہ تازہ کر لیں اور سمجھ لیں کہ یہاں اصل زور (emphasis) ایمان بالرسول پر ہے۔ اس حوالے سے آیت کے اس حصے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم لوگ اُسوۂ رسول کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تمہیں عملی زندگی میں ایک ایسی روشنی عطا ہوگی جو تمہیں کبھی بہتکنے نہیں دے گی۔ خاص طور پر تم رہبانیت جیسی بدعت میں طوٹ ہونے سے محفوظ رہو گے۔ چونکہ زیر مطالعہ آیات کا تعلق اقامت دین اور اقامت عدل و قسط کے مضمون سے ہے اس لیے سیاق مضمون کے اعتبار سے آیت کے اس حصے میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ اگر تمہیں نظام عدل و قسط کے قیام کی منزل پر پہنچنے کے لیے رہنمائی اور روشنی درکار ہے تو وہ تمہیں ایمان بالرسول اور منج انقلاب نبوی سے ملے گی۔ اور اگر تم نے اپنا یہ ایمان پختہ کر لیا اور منج نبوی کو اپنا راستہ بنالیا تو اس راستے پر ہم تمہیں ایسا نور عطا کریں گے جس کی راہنمائی میں تمہارے لیے کسی غلطی، کوتاہی یا منزل سے بہتکنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ چنانچہ اگر ہمیں عدل و قسط کے قیام کے لیے انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کرنی ہے (دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس جدوجہد میں اپنا تَنْسَن دھن کھپا دینے کی توفیق عطا فرمائے!) تو ہمیں اس کے لیے روشنی اور راہنمائی انقلاب نبوی کے منج سے حاصل ہوگی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہم حضور ﷺ کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کریں گے تو کبھی منزل پر نہیں پہنچ پائیں گے۔

خلاف پیبر کسے راہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ (آیت ۴۸) کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے علیحدہ علیحدہ شریعتیں اور علیحدہ علیحدہ منہاج بنائے ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری

ہے کہ ہم اپنے نبی ﷺ کا منہاج تلاش کریں اور جب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ”جائیں جاست!“ (جس جگہ کی ہمیں تلاش ہے وہ جگہ یہی ہے۔) یعنی ہمیں راہنمائی چاہیے ہدایت چاہیے یا غلبہ دین کی جدوجہد میں کامیابی چاہیے تو یہ سب کچھ ہمیں سیرت محمدی سے ہی ملے گا۔ اس یقین کے بعد ہمیں اپنا تن من دھن سیرت محمدی کے اتباع میں کھپا دینے پر کمر بستہ ہو جانا چاہیے اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں زیر زمین تیل تلاش کرنے والی کمپنی کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ ایسی کسی کمپنی کے ماہرین کو اگر کسی جگہ کے بارے میں گمان ہو کہ یہاں سے تیل ملنے کا امکان ہے تو وہ صرف اس گمان اور امکان کی بنیاد پر کروڑوں روپے اس جگہ کی ڈرائنگ پر صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا تو ایمان ہے، ہمیں تو یقین ہے کہ ”جائیں جاست“۔ تو پھر ہم کیوں نہ اپنا سب کچھ اس راہ میں نچھاو کر دیں!

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ”او وہ تمہیں بخش دے گا“ اور اللہ بہت بخشنے والا بہت

رحم کرنے والا ہے۔“

اگر تم لوگوں نے منہاج محمدی کو اپنے لیے مشعل راہ بنالیا تو تمہارا رخ سیدھا ہو گیا، مجموعی طور پر تم سیدھے راستے پر آ گئے۔ اب اگر اس راستے پر چلتے ہوئے کوئی خطا یا کوئی لغزش ہوگی تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوَاءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (النساء: ۱۷)

”اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔“

چنانچہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں اور لغزشیں معاف کرتا رہے گا۔ وہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

**آیت ۲۹** ﴿لَسَلَّا نَعْلَمَ أَهْلَ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ ”(یہ اس لیے ہے) تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے“

گزشتہ آیت کی تشریح کے دوران میں نے ذکر کیا تھا کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِوَسُوْلِهِ﴾ کے خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے۔ یہ بات اس آیت میں اب بالکل واضح ہو گئی ہے۔ جن مفسرین کا ذہن اس طرف نہیں گیا (کہ گزشتہ آیت میں خطاب کا رخ اہل کتاب کی طرف بھی ہے) انہیں زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ یہاں لَسَلَّا میں لَا زائد ہے اور اصل میں یہاں مراد لِكُنِّي يَعْلَمَ ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے نزدیک گزشتہ آیت صرف مسلمانوں سے خطاب کر رہی ہے اس لیے انہوں نے زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ”تاکہ اہل کتاب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب انہیں کوئی قدرت حاصل نہیں ہے اللہ کے فضل پر۔“

بہر حال میں نے گزشتہ آیت میں اہل کتاب سے خطاب کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے زیر مطالعہ آیت کا

جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے لیے اب اللہ کے فضل کے حصول کا کوئی راستہ رہا ہی نہیں، بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے راستہ تو اب بھی کھلا ہے۔ وہ آئیں، خود کو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں، قرآن پر ایمان لائیں اور اللہ کے فضل میں حصہ دار بن جائیں۔ یہی بات انہیں سورہ بنی اسرائیل میں بھی بایں الفاظ کہی گئی ہے: ﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُؤْخِذَكُمْ﴾ (آیت ۸) ”ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے“۔ یعنی بے شک تم اللہ کے بہت لاڈلے تھے اور اب تم اپنے طرز عمل کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گئے ہو، لیکن تمہارا رب اب بھی تم پر رحمت فرمانے پر آمادہ ہے۔ بس تم آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ اور اُس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں مزید واضح فرمادیا گیا: ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يُهْدِي لِّلنَّاسِ هِیَ اَقْوَمُ﴾ (آیت ۹) ”یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے“۔ اب ہدایت کا ”شاہ درہ“ تو بس قرآن ہی ہے، چنانچہ آؤ اور اس راستے سے ہوتے ہوئے اللہ کے قصر رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ بہر حال آیت زیر مطالعہ میں اہل کتاب پر واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے دروازے ان پر بند نہیں ہو گئے، یہ دروازے ان کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔ ﴿وَإِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (۱۶) ”اور فضل یقیناً اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔“





# سُورَةُ الْحَجَادَلَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الحجادلہ کا آغاز ایک خاص عالمی مسئلے سے ہوتا ہے، لیکن یہ مسئلہ صرف پہلی چار آیات میں ضمنی مضمون کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد اس سورت میں سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون ہی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ سورۃ الحدید کا مرکزی مضمون نظامِ عدل و قسط کے قیام سے متعلق ہے۔ اس نظام کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک منظم اور مربوط جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی اکیلے شخص یا دو چار افراد کے بس کا کام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے تعاون کے بغیر بھی اسے سرانجام دے لیتے۔ آپ نے جب اپنی قوم کو جہاد کے لیے نکلنے کا کہا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا:

﴿قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا مَا دَامُوا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هَاهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۱﴾ (المائدہ)

انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ اے موسیٰ! یہ جنگ جیسا مشکل کام ہم سے نہیں ہوتا، اگر یہ ایسا ہی ضروری کام ہے تو آپ اور آپ کا رب جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اُس وقت آپ بالکل اکیلے بھی نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ یعنی آپ کے بھائی ہارون، حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفا۔ اس کے باوجود آپ نے حکومتِ الہیہ کے قیام کا مشن ادھورا چھوڑتے ہوئے پُر حسرت انداز میں اللہ سے شکایت کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَاْفُرُقْ بَیْنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۲﴾ (المائدہ)

”موسیٰ نے عرض کیا: پروردگار مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارون) کی جان کے“ تو اب تو تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔“

تو معلوم ہوا کہ یہ کام چند افراد کے بس کا بھی نہیں، بلکہ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لیے ایک بہت مضبوط اور منظم جماعت درکار ہے۔ اب ظاہر ہے جب یہ جماعت تشکیل پائے گی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مصروفِ عمل ہوگی تو شیطان انہیں کھلی چھٹی دے کر آرام سے تو نہیں بیٹھا رہے گا کہ جاؤ بھی آپ اپنے دین حق کا قیام عمل میں لے آؤ، بلکہ وہ بھی فوری طور پر اپنے چیلہ چانوں کے ہمراہ اس جماعت کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں کود پڑے گا۔ اس طرح یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مدِ مقابل صف آرا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس سورت میں نظامِ عدل و قسط کے قیام یا اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت ”حزب اللہ“ اور اس کے مدِ مقابل شیطان کے لاؤ لشکر پر مشتمل جماعت ”حزب الشیطان“ کا بھی ذکر آیا ہے اور اس حوالے سے حزب اللہ کے کارکنوں کو کچھ مفید ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ حزب اللہ کا وجود چونکہ

شیطان کو بہت کھلتا ہے اس لیے وہ اس میں پھوٹ ڈالنے اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایسے شیطانی مصلوں کے توڑ کے لیے اہل ایمان کو قرآن میں جا بجا ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ الحجرات میں دی گئی معاشرتی اور اخلاقی ہدایات کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو ان کے اتحاد کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں اہل ایمان کو ایک دوسرے کا تسخر اڑانے، باہم الزام تراشی کرنے، دوسروں کو برے ناموں سے پکارنے، اپنے بھائی بندوں کے بارے میں بدگمانی کرنے، ان کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے، انوایہوں پر کان دھرنے اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی حرکات سے بالآخر مسلمانوں کی وحدت اور یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الحجرات میں اہل ایمان کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اگر ان کے دگر وہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرادی جائے تاکہ ”حزب اللہ“ مضبوط و مستحکم رہے۔ بہر حال سورۃ المجادلہ کا مرکزی مضمون حزب اللہ سے متعلق ہے۔ حزب اللہ بھلائی کی علامت اور نیکی کی طاقت ہے۔ اگر یہ جماعت مضبوط ہوگی تو نیکی کا بول بالا ہوگا اور اگر یہ کمزور ہو جائے گی تو پھر ظاہر ہے معاشرے میں حزب الشیطان ہی کا ڈنکا بجے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## آیات ۴ تا ۱۴

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كَلَامٍ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝ الَّذِينَ يَظْهَرُونَ مِنْكُمْ مِنْ نِّسَابِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ ۖ إِنَّ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ ۖ وَانْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَزُورًا وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ۝ وَالَّذِينَ يَظْهَرُونَ مِنْ نِّسَابِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لَهَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَنَاسَا ۖ ذَلِكَ لَكُمْ تَوَعظُونَ بِهِ ۖ وَاللّٰهُ يَمَّا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَنَاسَا ۖ فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَاطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ۖ ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

اللّٰهُ سَمِيعٌ بَصِيرٌ  
وَالَّذِينَ يَظْهَرُونَ  
مِنْكُمْ مِنْ نِّسَابِهِمْ  
مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ  
إِنَّ أُمَّهَاتُهُمْ  
إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ  
وَالَّذِينَ يَظْهَرُونَ  
مِنْ نِّسَابِهِمْ  
ثُمَّ يَعُودُونَ  
لَهَا قَالُوا  
فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ  
مِنْ قَبْلِ أَنْ  
يَتَنَاسَا ۖ  
ذَلِكَ لَكُمْ  
تَوَعظُونَ بِهِ  
وَاللّٰهُ يَمَّا  
تَعْمَلُونَ  
خَبِيرٌ ۖ  
فَمَنْ لَمْ يَجِدْ  
فَصِيَامُ  
شَهْرَيْنِ  
مُتَتَابِعَيْنِ  
مِنْ قَبْلِ أَنْ  
يَتَنَاسَا ۖ  
فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ  
فَاطْعَامُ  
سِتِّينَ  
مِسْكِينًا ۖ  
ذَلِكَ  
لِتُؤْمِنُوا  
بِاللّٰهِ  
وَرَسُولِهِ ۖ  
وَتِلْكَ  
حُدُودُ  
اللّٰهِ  
وَلِلْكَافِرِينَ  
عَذَابٌ  
أَلِيمٌ ۝

**آیت ۱** ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا﴾ ”اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات (جو

اے نبی ﷺ!) آپ سے جھگڑ رہی ہے اپنے شوہر کے بارے میں“

﴿وَتَشْتَكِي إِلَى اللّٰهِ﴾ ”اور وہ اللہ سے بھی فریاد کر رہی ہے۔“

﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كَلَامٍ﴾ ”اور اللہ سن رہا ہے آپ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو۔“

﴿إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ①﴾ ”یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“

”قَدْ سَمِعَ اللَّهُ“ کے معنی یہاں محض سن لینے کے نہیں، بلکہ قبول کر لینے اور فریاد رسی کرنے کے ہیں۔ یہ ”ظہار“ کے معاملے کا ذکر ہے جو ایک صحابی حضرت اوس بن صامت انصاری اور ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ کے درمیان پیش آیا۔ کسی شخص کا اپنی بیوی کو اپنی ماں یا اپنی ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دینا اصطلاحاً ”ظہار“ کہلاتا ہے، مثلاً کسی کا اپنی بیوی کو یوں کہہ دینا کہ تم میرے لیے میری ماں کی طرح ہو یا میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ عربوں کے ہاں اس کے لیے یہ الفاظ کہے جاتے تھے: ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي“ یعنی اب تجھ کو ہاتھ لگانا میرے لیے گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگانا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ظہار کو طلاق ہی کی طرح سمجھا جاتا تھا، بلکہ طلاق میں تو حالات و قرائن کے مطابق پھر بھی رجوع کی گنجائش تھی، لیکن ظہار کی صورت میں میاں بیوی میں عمر بھر کے لیے علیحدگی ہو جاتی تھی اور وہ دوبارہ کبھی کسی بھی صورت میں میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔

روایات میں مذکورہ معاملے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت اوس غصے کی حالت میں اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ اس پر ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ فریاد لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ حضور اوسؓ نے یہ کر دیا ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اب میں ان کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ ان کو کیسے پالوں گی؟ آپ اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ظہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں فرمایا اس لیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضور ﷺ کے توقف پر وہ بدستور اصرار کرتی رہیں کہ حضور ﷺ آپ کچھ کریں! میرا کیا بنے گا؟ میرے بچے ہلاک ہو جائیں گے! اسی کیفیت میں کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوئیں کہ اے اللہ! تو میری فریاد کو سن لے اور میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے! روایات کے مطابق اس اصرار و تکرار کے دوران ہی زیر مطالعہ آیات نازل ہوئیں۔ پہلی آیت کا انداز خصوصی طور پر بہت شفقت بھرا ہے کہ اے نبی ﷺ! اللہ نے اس خاتون کی اس بحث و تکرار کو سن لیا ہے جو وہ آپ کے ساتھ کر رہی ہے۔ حضرت خولہ بنت ثعلبہ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا موج میں آیا اور ظہار کے بارے میں مستقل قانون بنادیا گیا۔ یہ قانون اگلی تین آیات میں بیان ہوا ہے۔

**آیت ۲** ﴿الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْكُم مِّنْ نِّسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ ”(اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو مائیں کہہ بیٹھتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔“

جس طرح کسی کو کوئی بیٹا کہہ دے تو وہ اس کا بیٹا نہیں بن جاتا اور جس طرح منہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی و شرعی حیثیت نہیں اسی طرح زبان سے اگر کوئی اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دے تو ایسے کسی دعوے یا جملے کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿إِنْ أُمَّهُتُكُمْ إِلَّا اللَّيْنَىٰ وَلَذَٰلِكَ﴾ ”ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔“  
﴿وَأَنَّهُمْ لَيَقُولُنَّ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا﴾ ”البتہ یہ لوگ ایک نہایت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔“

یہ لوگ اپنی بیویوں کو اپنی مائیں کہہ کر ایک نہایت بے ہودہ، شرمناک اور نامعقول بات منہ سے نکالتے

ہیں۔ پھر یہ بات جھوٹی بھی ہے کہ ان کی بیویاں ان کے لیے اب مائیں ہو گئی ہیں۔

﴿وَأَنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ﴾ (۲) ”اور یقیناً اللہ بہت معاف فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔“

ان الفاظ میں یہ اشارہ دے دیا گیا کہ ظہار سے متعلق چونکہ ابھی تک کوئی قانون نازل نہیں ہوا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ مذکورہ صحابی کو اس معاملے میں معاف فرمادے گا، بلکہ اس سے پہلے جس کسی سے بھی یہ حرکت سرزد ہوئی، اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔

**آیت ۳** ﴿وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا﴾ ”اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں، پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے واپس لوٹنا چاہیں“

﴿فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّ﴾ ”تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہوگا“ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو مس کریں۔“

یعنی اس معاملے کا کفارہ ادا کرو اور پھر سے میاں بیوی کی طرح رہو!  
﴿ذَلِكَ تَوْعِظُونَ بِهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (۳) ”یہ بات ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

**آیت ۴** ﴿فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّ﴾ ”تو جو کوئی (غلام) نہ پائے وہ دو مہینوں کے روزے رکھے لگاتار اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوئیں۔“

یعنی دو ماہ کے روزے اس طرح متواتر رکھے جائیں کہ درمیان میں کسی دن کا روزہ چھوٹنے نہ پائے۔  
﴿فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا﴾ ”تو جو کوئی یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔“

اگر کوئی شخص کمزور ہے، ضعیف العمر ہے یا ایسا مریض ہے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تو وہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ اس کے لیے اوسط معیار وہی ہوگا جو سورۃ المائدہ کی آیت ۸۹ میں قسم کے کفارے کے ضمن میں بیان ہوا ہے: ﴿مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ﴾ یعنی جس معیار کا کھانا متعلقہ شخص اپنے اہل و عیال کو معمول کے مطابق کھاتا ہے، ویسا ہی کھانا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے۔

﴿ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ ”یہ اس لیے تاکہ تم ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر۔“  
اس فقرے پر میں بہت عرصہ سوچ بچار کرتا رہا، بالآخر مجھے اس بارے میں یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ جب کوئی شخص کفارہ کو اللہ کا قانون سمجھتے ہوئے اس کی سختی برداشت کرتا ہے تو اس کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوتا ہے، اسی طرح عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، جیسے کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يُؤْمِنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمْتَنُوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ

لَا يُؤْمِنُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۶﴾

”اے نبی ﷺ! یہ لوگ آپ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں! ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے اگر تم سچے ہو۔“

یعنی تم لوگ اسلام میں داخل ہو کر گویا ایمان کے راستے پر چل پڑے ہو۔ اس بارے میں تم اللہ کا احسان مانو کہ وہ تمہیں ایمان کے راستے پر لے آیا ہے۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس راستے پر چلتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے رہو گے تو تم ایمان تک بھی ضرور پہنچ جاؤ گے۔ یہاں ﴿ذَلِكَ لِيُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص غلطی کے بعد توبہ کرتے ہوئے کفارہ ادا کرے گا تو اللہ کے قانون پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول مزید راسخ اور پختہ ہو جائے گا۔

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ”اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔“

## آیات ۱۵ تا ۱۱

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كَيْتُوا كَمَا كَيْتَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا ۗ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَسُوءٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۱۶﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَاسِعُهُمْ وَلَا يَشْعُرُونَ ۚ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَذَلَّ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يَنْبِئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لَهَا لَهُمْ أَعْنُ وَيَتَّخِذُونَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ ۖ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ ۖ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُكُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۸﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۱۹﴾ إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزَنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۲۰﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

**آیت ۵** ﴿إِنَّ الدِّينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ”یقیناً وہ لوگ جو ٹل گئے ہیں مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی“

اس مضمون کا تعلق سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون کے ساتھ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں انبیاء و رسول کی بعثت اور کتاب و میزان کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے: لَيَقُولُنَّ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے نظامِ عدل و قسط کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ اب ظاہر ہے اہل ایمان جو نبی اس مشن کے علمبردار بن کر انھیں گے تو شیطانی قوتیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے پوری قوت سے سرگرم عمل ہو جائیں گی۔ ان حالات میں معاشرے کا سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ نظامِ عدل و قسط کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ یہ لوگ تو کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کے حقوق ملیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ روایتی (ظالمانہ) نظام کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ اس طرح فریقین کے درمیان ایک بھرپور کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ میں انہی قوتوں کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ آئندہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے کردار اور رویے کا ذکر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے آئے گا۔ واضح رہے کہ لفظ يُحَادُّونَ کا تعلق بھی حدید (سورۃ الحدید، آیت ۲۵) ہی سے ہے۔ یہ حد سے باب

مفاعلہ ہے، جیسے جہد سے مُحَاهَدَہ یا قتل سے مُقَاتَلہ۔ چنانچہ اس لفظ میں پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کی مخالفت کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مراد اللہ کا دین ہے اور یہ مخالفت جس کا یہاں ذکر ہے وہ دراصل اللہ کے دین کی مخالفت ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی نیکوئی حکومت جو پوری دنیا میں قائم ہے اسے تو کبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ سے بھی کسی کو کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں اللہ کے رسول کی مخالفت کی جاتی ہے وہ بھی اللہ کے دین کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سورۃ الانعام کی اس آیت میں یوں واضح کیا گیا ہے: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يَكْذِبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ (اے نبی ﷺ) ”یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلا رہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔“

چنانچہ باطل قوتوں کی اصل دشمنی اللہ کے دین سے ہے، اور یہ دین بھی جب تک کتابوں اور لائبریریوں تک محدود رہے تب تک اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ دینی مسائل کے بارے میں کوئی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرنے، مقالے لکھنے، کتابیں تصنیف کرے، کسی کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ لیکن جب کوئی اللہ کا بندہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم اللہ کے دین اور اس کے دیے ہوئے نظامِ عدل و قسط کی معاشرے میں بالفعل ترویج و تہذیب چاہتے ہیں تو اس کی یہ بات باطل پسند قوتوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ لوگ ایسی کسی بھی کوشش کا راستہ روکنے کے لیے ختم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔

﴿كُتِبُوا كَمَا كُتِبَ الدِّينُ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ”وہ ذلیل و خوار کر دیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے

کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں“

ان سے پہلے قوم فرعون، قوم عاد اور بہت سی دوسری اقوام نے بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں کی مخالفت کی یہی روش اختیار کر کے اپنی بربادی کو دعوت دی تھی۔ چنانچہ جو انجام مذکورہ اقوام کا ہوا ویسے ہی انجام سے اب یہ لوگ یعنی قریش مکہ بھی دوچار ہونے والے ہیں۔

﴿وَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ ۖ﴾ ”اور ہم اتار چکے ہیں روشن آیات۔“

یعنی قرآن میں گزشتہ اقوام کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو قریش مکہ کی نسبت بہت طاقتور تھیں۔ جب ایسی طاقتور اقوام بھی اپنے پیغمبروں کے انکار کی بنا پر صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں تو آج ان لوگوں کی سرکشی و نافرمانی کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

﴿وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝۵﴾ ”اور کافروں کے لیے بہت ذلت والا عذاب ہے۔“

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین کو دنیا میں بھی ہزیمت اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں بھی انہیں بہت رسوا کن عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

**آیت ۶** ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا﴾ ”جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا پھر

انہیں جتلا دے گا ان کے اعمال کے بارے میں جو انہوں نے کیے تھے۔“

﴿أَخْصَهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ﴾ ”اللہ نے ان (اعمال) کو محفوظ کر رکھا ہے جبکہ وہ انہیں بھول چکے ہیں۔“

یہ لوگ تو بھول چکے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں کیسی کیسی حرام خوریاں کی تھیں اور کس کس کے ساتھ کیا کیا زیادتی کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اللہ کے ہاں تو ہر شخص کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

﴿وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝۶﴾ ”اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔“

**آیت ۷** ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ”کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ جانتا

ہے اس سب کچھ کے بارے میں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟“

﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَٰعِيَهُمْ﴾ ”نہیں ہوتے کبھی بھی تین آدمی سرگوشیاں کرتے

ہوئے مگر ان کا چوتھا وہ (اللہ) ہوتا ہے“

﴿وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ”اور نہیں (سرگوشی کر رہے) ہوتے کوئی پانچ افراد مگر ان

کا چھٹا وہ (اللہ) ہوتا ہے“

خفیہ انداز میں سرگوشیاں کرنے کو ”نجوی“ کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں پر ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیں کہ کسی تنظیم یا جماعت کے اندر نجوی کا رجحان یا روانہ گروہ بندیوں اور فتنوں کا باعث بنتا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت کے افراد میں باہم اختلاف رائے کا پایا جانا تو بالکل ایک فطری تقاضا ہے جہاں اجتماعیت ہوگی وہاں لوگ ایک

دوسرے کی آراء سے اختلاف بھی کریں گے۔ لیکن ایسے اختلافات کا اظہار اجتماعیت کے قواعد و ضوابط کے مطابق متعلقہ فورم پر کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ تحریری ذہنیت کے حامل کچھ ارکان اپنے اپنے اختلاف کا اظہار نجوی کی صورت میں دوسرے ساتھیوں سے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بات آگے بڑھتی ہے تو چند افراد پر مشتمل ایک مخصوص لابی بن جاتی ہے اور یوں تنظیم یا جماعت کے اندر باقاعدہ گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اگر اختلافات کا اظہار مناسب فورم پر ہو تو کھلی اور تعمیری بحث کا نتیجہ ہمیشہ مثبت رہتا ہے۔ اس سے غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں، ابہام دور ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بہر حال نجوی (سرگوشیوں) کی حیثیت اجتماعیت کے لیے سم قاتل کی سی ہے اور اگر یہ زہر کسی جماعت کی صفوں میں سرایت کر جائے تو اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

﴿وَلَا أَذْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرُ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا﴾ ”اور نہیں ہوتے وہ اس سے کم (یعنی دو افراد سرگوشی میں مصروف) اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔“

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ”اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔“  
﴿ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیَمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ”پھر وہ ان کو جلد دے گا قیامت کے دن جو کچھ بھی انہوں نے عمل کیا تھا یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

**آیت ۸** ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰی ثُمَّ یَعُوْذُوْنَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾ ”کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں منع کیا گیا تھا نجوی سے، پھر وہ اعادہ کر رہے ہیں اُسی شے کا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا“  
یہ مدینہ کے منافقین کا ذکر ہے جو یہودیوں کے ساتھ مل کر ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بننے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں الَّذِیْنَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰی کے الفاظ میں سورۃ النساء کی آیت ۱۴ کے اس حکم کی طرف اشارہ ہے: ﴿لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ تَحْوِیْهِمْ﴾ کہ ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آیت زیر مطالعہ میں سورۃ النساء کی آیت کے حوالے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ المجادلہ سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی۔

﴿وَبَیِّنَۡتُ لَیْسَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَةِ الرَّسُوْلِ﴾ ”اور وہ سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی سے متعلق۔“

قبل ازیں سورۃ النساء کے مطالعے کے دوران بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت کا حکم منافقین کو بہت برا لگتا تھا۔ اس حوالے سے ان کا موقف یہ تھا کہ ہم اللہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں اللہ کی کتاب کے تمام احکام بھی تسلیم کرنے کو تیار ہیں، لیکن اپنے جیسے ایک انسان کی تمام باتوں کو من و عن تسلیم کرنے کو ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی سوچ اور اسی موقف کے تحت وہ لوگ حضور ﷺ کے فیصلوں پر گاہے بگاہے اعتراضات



بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسے ہی ایک اعتراض کا ذکر سورہ محمد کی آیت ۲۰ میں بھی آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو قریش کے ساتھ خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شروع کر کے حالات کیوں خراب کیے جا رہے ہیں؟

﴿وَإِذَا جَاءَ وَكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ﴾ ”اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس (کلمہ) سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو دعا نہیں دی“

”نَحْيَہ“ کے لغوی معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملنے وقت ”حَيَّكَ اللَّهُ“ کے جملے کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی زندگی دے یا اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی دراز کرے۔ عرف عام میں اس دعا کو ”تحیہ“ کہا جاتا تھا۔ اسلام نے دو مسلمانوں کی ملاقات کے موقع کے لیے دعائیہ کلمہ (greetings) کے طور پر السّلام علیکم کے الفاظ کا انتخاب کیا، لیکن تحیہ کا لفظ عربوں کے ہاں چونکہ بہت معروف تھا اس لیے ”السّلام علیکم“ کو بھی اصطلاحاً ”تحیہ“ ہی کہا جانے لگا۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۶ میں یہ لفظ ”السّلام علیکم“ ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں منافقین کی اس شرارت کا ذکر ہے جو وہ اس کلمہ تحیہ کے حوالے سے کرتے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تو السّلام علیکم کہنے کے بجائے ”السّام علیکم“ کہتے۔ ”سام“ کے معنی موت کے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے وہ لوگ حضور ﷺ اور آپ کی محفل میں موجود مسلمانوں کے لیے اس دعائیہ کلمہ کو (معاذ اللہ!) بددعا میں بدل دیتے تھے۔

﴿وَيَقُولُونَ فِيْۤ أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ﴾ ”اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا ہمارے اس طرح کہنے پر؟“

ایسی حرکت کرنے کے بعد وہ سوچتے کہ اگر محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہوتے تو اللہ ان کی یہ توہین کبھی برداشت نہ کرتا اور اس گستاخی پر وہ فوراً ہماری زبانیں کھینچ لیتا۔ چنانچہ ہمارے بار بار ایسا کہنے پر بھی اگر ہمیں کچھ نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہ مرض منافقت کی وہ سنج ہے جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۱۴ میں آچکا ہے۔ اس سنج پر منافق شخص کے بچے کھچے ایمان میں شکوک و شبہات کے کانٹے چھینے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایمان کی تھوڑی بہت پونجی بھی برف کی طرح پکھلنے اور ضائع ہونے لگتی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝۵﴾ ”ان کے لیے تو اب جہنم ہی کافی ہے یہ اس میں داخل ہوں گے پس وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“

**آیت ۹** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ﴾ ”اے اہل ایمان! اگر تمہیں کوئی سرگوشی کرنی ہو“  
﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْأَنفِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ﴾ ”تو گناہ زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتوں سے متعلق ہرگز سرگوشی نہ کرو“

اگر تم میں سے چند لوگوں کا علیحدہ بیٹھ کر کوئی گفتگو یا منصوبہ بندی کرنا ناگزیر ہو تو یاد رکھو تمہاری اس خفیہ

بات چیت یا سرگوشی کا موضوع ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے جس سے گناہ کسی پر زیادتی یا اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

﴿وَتَنَاجَوْا بِالْأَيْمَنِ وَالتَّقْوَىٰ﴾ ”ہاں تم نیکی اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کر سکتے ہو۔“ کسی کو علیحدگی میں لے جا کر کوئی اچھا مشورہ دینا ہو نیکی کے کسی کام کا بتانا ہو یا صدقہ و خیرات کی تلقین کرنی ہو تو ایسی سرگوشیوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ ”اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا۔“

**آیت ۱۰** ﴿إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ﴾ ”یہ نجویٰ تو شیطان کی طرف سے ہے“ منفی سرگوشیاں کرنا ایک شیطانی عمل ہے۔ جو لوگ اس میں ملوث ہوتے ہیں انہیں اس کی تحریک و ترغیب شیطان ہی کی طرف سے ملتی ہے۔

﴿لِيَحْزَنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”تاکہ وہ اہل ایمان کو رنجیدہ کرے“ ان لوگوں کی سرگوشیوں اور خفیہ ملاقاتوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اہل ایمان کو نقصان پہنچا کر انہیں رنجیدہ، دل گرفتہ اور پریشان کریں۔ آیت کے ان الفاظ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی محفل سے الگ جا کر کھسر پھسر اور سرگوشیاں اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل کو دیکھ کر مسلمان پریشان ہوں کہ یہ لوگ الگ بیٹھ کر ان کے خلاف نہ جانے کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ گویا یہ لوگ ایک نفسیاتی حربے کے طور پر بھی نجویٰ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جب بھری محفل سے تین چار لوگ الگ جا کر بیٹھ جائیں اور کھسر پھسر کرنا شروع کر دیں تو اہل محفل کو فطری طور پر تجسس تو ہوگا کہ ہونہ ہو یہ لوگ ضرور انہی کے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔

﴿وَلَيْسَ بِضَارِهِمْ شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ”حالانکہ یہ (شیطان) انہیں کچھ بھی ضرر پہنچانے پر قادر نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔“

شیطان اپنے ارادے اور اختیار سے اہل ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ اگر اللہ کی طرف سے کسی کے لیے کوئی تکلیف یا آزمائش طے ہے تو وہ ضرور آئے گی، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ ”اور اہل ایمان کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔“ اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور شیطانی حربوں یا دشمنوں کی سازشوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اسی بھروسے کے ساتھ انہیں ہر وقت اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کمر بستہ رہنا چاہیے۔

**آیت ۱۱** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ”اے مسلمانو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔“

یہ سمجھانے کا بہت عمدہ انداز ہے۔ یہ نصیحت بھی دراصل منافقین کے ایک مخصوص طرز عمل کی وجہ سے کی

جاری ہے۔ منافقین کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کی محفلوں میں ٹولیوں کی صورت میں باہم جڑ کر بیٹھتے تھے تاکہ درمیان میں کوئی اور (سچا مسلمان) نہ بیٹھ سکے۔ ایسے الگ حلقے بنا کر محفل کے دوران وہ حضور ﷺ کے فرمودات پر اپنی مرضی کے تبصرے کرتے اور استہزاء سے فقرے چست کرتے رہتے۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ عمومی ہدایت جاری کی گئی کہ محفل میں حلقے بنا کر بیٹھنے کے بجائے کھل کر بیٹھا کرو تاکہ معلوم ہو کہ یہ ایک اجتماع ہے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانْشُرُوا﴾ ”اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو“

اس حکم کا باعث بھی منافقین کا طرز عمل ہی تھا۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ وہ مجلس برخواست ہو جانے کے بعد بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے محو گفتگو رہتے تھے۔ فرض کریں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو کسی ضروری مشورے کے لیے بلایا۔ اس پر سب لوگ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، ضروری گفتگو ہوئی اور صلاح و مشورے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ محفل کو برخواست کرنے کا حکم دے کر وہاں سے تشریف لے گئے اور آپ کے حکم پر سب مسلمان بھی چلے گئے، مگر یہ منافقین ہیں کہ ابھی بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ حرکتیں نہ صرف اجتماعیت کے نظم و ضبط کے خلاف تھیں بلکہ ان سے بہت سی غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مجلس برخواست کرنے کا کہہ دیا جائے تو وہاں سے اٹھ جایا کرو۔

﴿يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ ”اللہ بلند فرما دے گا ان لوگوں کے درجات جو تم میں سے واقعی ایمان والے ہیں اور جن کو حقیقی علم عطا ہوا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ”اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔“

## آیات ۱۲، ۱۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ۚ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَظْهَرُ ۚ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ عَاشَقْتُمْ أَنْ تَقْدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَتْ ۚ فَإِذَا لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

آیت ۱۲ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ۚ﴾ ”اے اہل ایمان! جب تم رسول (ﷺ) سے تخلیہ میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔“

اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ منافقین میں سے اکثر لوگ وقتاً فوقتاً بلا وجہ حضور ﷺ سے تخلیہ میں بات کرنے کا

تقاضا کرتے تھے۔ حضور ﷺ مروت کے باعث ہر کسی کی بات مان تولیتے، لیکن منافقین کا یہ طرز عمل آپ کے لیے زحمت کا باعث تھا۔ یہ لوگ حضور ﷺ سے ایسی ملاقاتیں محض اپنی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے کرتے تھے تاکہ لوگ دیکھیں کہ حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے والا یہ شخص حضور ﷺ کے بہت قریب ہے اور حضور ﷺ کو اس پر بہت اعتماد ہے۔ جیسے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کا معمول تھا کہ حضور ﷺ جب خطبہ جمعہ کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ محض اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے فوراً اُگلی صف میں کھڑا ہو جاتا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی بات غور سے سنو! یہ شخص مدینہ کے سب سے بڑے قبیلے خزرج کا سردار تھا۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل اہل مدینہ کا اتفاق ہو چکا تھا کہ مدینہ میں ایک مستحکم ریاستی نظام قائم کیا جائے تاکہ روز روز کی جنگوں اور باہمی خون ریزی سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ اس کے لیے عبد اللہ بن ابی کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ بس رسم تاج پوشی کا انعقاد باقی تھا کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور آتے ہی مدینہ کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ اس طرح آپ ﷺ کی وجہ سے عبد اللہ بن ابی کی بادشاہت کا خواب نا تمام رہ گیا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اُس نے ظاہری طور پر تو مسلمانی کا لبادہ اوڑھ لیا لیکن عمر بھر حضور ﷺ کی مخالفت کا کوئی موقع اُس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بہر حال حالات کی مجبوری تھی کہ ایسا شخص بھی حضور ﷺ سے اپنی قربت جتانے اور اپنی خصوصی حیثیت نمایاں کرنے کے لیے جمعہ کے اجتماع میں یہ ڈرامہ رچانا ضروری سمجھتا تھا۔

منافقین کے اس طرز عمل کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے پر ایک طرح کا ٹیکس عائد کر دیا کہ اگر تمہارا حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو پہلے اپنے مال میں سے کچھ صدقہ دو اور پھر آ کر اس مقصد کے لیے حضور ﷺ سے وقت مانگو۔ منافقین چونکہ اتفاق سے گھبراتے ہیں اس لیے اس حکم کے بعد ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست نہ کی۔ یہ حکم البتہ بہت تھوڑی دیر نافذ رہا اور جلد ہی اسے اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں واحد شخص تھا جس نے اس حکم پر عمل کیا اور صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کی۔

﴿ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ﴾ ”یہ تمہارے لیے بہتر بھی ہے اور زیادہ پاکیزہ بھی۔“

﴿فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ”البتہ اگر تم (صدقہ دینے کے لیے) کچھ نہ پاؤ تو

اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔“

یعنی غریب اور نادار لوگ اس حکم پر عمل نہیں بھی کر سکتے تو کوئی مضاقتہ نہیں اللہ تعالیٰ ان کا عذر قبول فرماتے ہوئے انہیں معاف فرمائے گا۔ لیکن ظاہر ہے جن لوگوں کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا وہ تو سب کے سب متمول مرتد الحال اور بڑے لوگ تھے جو حضور ﷺ سے اپنی قربت جتانے کے واسطے مزید ”بڑے“ بننا چاہتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَعَلْنَا لَكُمُ الصَّدَقَاتِ﴾ ”کیا تم ڈر گئے اس سے کہ

(رسول کے ساتھ) اپنی تنہائی کی باتوں سے پہلے صدقات پیش کرو؟“

﴿فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾ ”پھر جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے بھی تم پر نظر عنایت فرما دی“

﴿فَاقْبِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ”تو بس نماز قائم رکھو زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔“

﴿وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۱۳) ”اور اللہ باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔“

اس آیت کے ذریعے اس حکم کو جلد ہی منسوخ بھی کر دیا گیا، لیکن اس حکم سے ان لوگوں کی قلبی کھل گئی جو محض ریاکاری کے لیے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کے شوقین تھے۔ پہلے تو وہ اس مقصد کے لیے بار بار حضور ﷺ کے پاس آتے تھے، لیکن صدقہ کے حکم کے بعد ان میں سے کسی کو بھی علیحدگی میں بات کرنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ بہر حال مذکورہ حکم کے بعد جب ان میں سے کوئی شخص بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست لے کر نہ آیا تو اس حکم کی منسوخی کے بعد اپنا پرانا طرز عمل دہراتے ہوئے وہ شرم تو محسوس کرتے ہوں گے اور یہی دراصل اس وقتی اور عارضی حکم کا اصل مقصد تھا۔

## آیات ۱۳ تا ۲۲

الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ  
وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۖ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا  
كَانُوا يَعْمَلُونَ ۖ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُتًا فَصَدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ  
مُهِينٌ ۖ لَنْ تَغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ  
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۖ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ  
وَيَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۖ اسْتَعَاذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ  
فَأَنسَهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۖ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۖ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۖ  
إِنَّ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۖ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا  
وَرُسُلِي ۖ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۖ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ  
حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۖ أُولَٰئِكَ  
كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحِهِ مِنهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا  
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۖ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۖ أَلَا إِنَّ  
حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۖ

**آیت ۱۳** ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ ”کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔“

اللہ کے غضب کے حوالے سے یہاں قوم یہود (مَعْصُوب عَلَيْهِمْ) کی طرف اشارہ ہے اور ان سے دوستیاں گانٹھنے والے اس اور خزرج کے منافقین تھے جو ان کے ساتھ اپنے پرانے طیفانہ تعلقات کو ابھی تک نباہے چلے جا رہے تھے۔

﴿مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ﴾ ”نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے ہیں“ منافقین کے اس دوغلے کردار کا ذکر سورۃ النساء (آیت ۱۳۳) میں اس طرح ہوا ہے: ﴿لَا إِلَى هَؤُلَاءِ وَلَا إِلَى هَؤُلَاءِ﴾ ”نہ تو یہ ان کی جانب ہیں اور نہ ہی ان کی جانب ہیں۔“

﴿وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكُذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔“  
**آیت ۱۵** ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا﴾ ”اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے سخت عذاب۔“  
 ﴿إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ”یقیناً بہت ہی برا ہے وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔“

**آیت ۱۶** ﴿اتَّخَذُوا آيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے“  
 یہ لوگ جھوٹی قسموں کو اپنی کمزوریوں کی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی کی کسی بات پر گرفت ہوتی، وہ فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتا کہ اللہ کی قسم اصل میں یہ معاملہ یوں نہیں تھا بلکہ یوں تھا۔ اس طرح اس کا مخاطب مروت میں آکر خاموشی اختیار کر لیتا۔

﴿فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ ”پس وہ اللہ کے راستے سے رک گئے ہیں (اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں) پس ان کے لیے ابانت آمیز عذاب ہے۔“  
 صَدَّ يَصُدُّ کے معنی خود رکنا بھی ہیں اور دوسروں کو روکنا بھی۔

**آیت ۱۷** ﴿لَنْ تَغْنَى عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَزْوَاجُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾ ”ان کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے ان کے اموال اور نہ ہی ان کی اولادیں اللہ سے بچانے کے لیے۔“

﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ ”یہ آگ والے ہیں اسی میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“  
 مقامِ عبرت ہے کہ یہ ”نویذ“ ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو بظاہر حضور ﷺ کے ماننے والے تھے آپ ﷺ کی افتدائیں نمازیں پڑھتے تھے اسلام کا دم بھرتے تھے خود کو مسلمان کہتے تھے اور زبانوں سے گواہی دیتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں ان کی اس ”شہادت“ کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ان کے جھوٹے ہونے پر مہر ثبت کی گئی ہے: ﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا لَوْ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ ”(اے نبی ﷺ) جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ

آپ اُس کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔“

**آیت ۱۸** ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ﴾ ”جس دن اللہ ان سب کو

اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے جیسے (آج) تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں“

یعنی یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھانے کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھانا شروع ہو جائیں گے کہ ہم ایسے نہیں کہتے تھے اور ہم ویسے نہیں کرتے تھے۔

﴿وَيَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ ”اور وہ سمجھیں گے کہ وہ کسی بات پر ہیں۔“

اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر بھی وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہمارے اعمال کی بھی کچھ نہ کچھ حیثیت تو ہے۔ آخر ہم مسلمان ہوئے تھے ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں روزے رکھے تھے سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر مہمات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ اس طرح ہم دنیا سے کچھ نہ کچھ نیک اعمال تو لے کر آئے ہی ہیں۔

﴿الَا أَنَّهُمْ هُمُ الْكَذِبُونَ﴾ ”آگاہ ہو جاؤ کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔“

**آیت ۱۹** ﴿اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ﴾ ”شیطان نے ان کے اوپر قابو پالیا ہے“

پس انہیں اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔“

شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ﴾ ”یہ لوگ ہیں شیطان کی جماعت۔“

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شیطان کی یہ جماعت تین گروہوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیطان کا سب سے طاقتور ہتھیار مشرکین عرب تھے۔ انہوں نے اسلام کی مخالفت اور اپنے ”دین“ کی حمایت میں ہر طرح کی قربانیاں دیں، جنگیں بھی لڑیں اور اپنے باطل معبودوں کے لیے گردنیں بھی کٹوائیں۔ دوسرا گروہ یہود مدینہ کا تھا جبکہ تیسرا گروہ منافقین پر مشتمل تھا۔ منافقین مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے ان کے خلاف fifth columnists کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آیات زیر مطالعہ میں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں بیٹھے ہیں، لیکن اصل میں یہ حزب الشیطان ہی کے ارکان ہیں۔ مسلمانوں کی مخالفت کے حوالے سے ان لوگوں کے کردار کی مزید تفصیل اگلی سورۃ یعنی سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے۔

﴿الَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ ”آگاہ ہو جاؤ! شیطان کی جماعت کے لوگ ہی

حقیقت میں خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“

**آیت ۲۰** ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ﴾ ”یقیناً جو لوگ اللہ اور اس

کے رسول کی مخالفت پر نئے بیٹھے ہیں، وہی ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔“

ذلت کے ذکر کے لیے اَذَلِّينَ (ذلیل ترین) یہاں ”تفصیل کُل“ (superlative degree) کے طور پر آیا ہے۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں بھی منافقین کے لیے بالکل یہی اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الذَّرِكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا﴾ ”یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے

طبقے میں ہوں گے اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔“

**آیت ۲۱ ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَا غِلْبَتَ لَنَا وَرُسُلِي﴾** ”اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔“

میں اور میرے رسول لازماً غالب ہو کر رہیں گے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آچکا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۵﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿۱۶﴾ وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿۱۷﴾﴾ ”اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں کہ ان کی لازماً مدد کی جائے گی اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔“

اس بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی اصول کے تحت سورۃ الصافات کے بعد یہاں پھر آیا ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۲۱﴾﴾ ”بے شک اللہ زبردست ہے، زور آور ہے۔“

حزب الشیطان کے ذکر کے بعد فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر اب اگلی آیت میں حزب اللہ کا ذکر ہے۔ یہ آیت حزب اللہ کی رکنیت کے معیار کے حوالے سے litmus test بھی ہے۔ اس ٹیسٹ کا تعلق انسان کے قلبی تعلقات اور قریبی رشتوں سے ہے۔ اگر کسی مسلمان کا کوئی رشتہ دار چاہے وہ اس کا باپ، بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو کافر و مشرک ہے اور وہ اسلام کی مخالفت میں باقاعدہ سرگرم عمل ہے تو اس مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اس کے ایمان کی تلوار اس دشمن خدا کے ساتھ موجود اپنے رشتے کو کاٹ چھینے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور کسی ایسے فرد کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کا پیوند بدستور استوار رہا جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت میں سرگرم عمل ہے تو ایسا مسلمان حزب اللہ سے خارج سمجھا جائے گا۔

**آیت ۲۲ ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾** ”تم نہیں پاؤ گے ان لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت کر رہے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی“

یہ حکم ان کفار و مشرکین کے لیے ہے جو اسلام کی مخالفت میں فعال (active) اور سرگرم عمل ہوں۔ جہاں تک ان کفار و مشرکین کا تعلق ہے جو ایسی کسی جدوجہد میں بالفعل فعال نہ ہوں ان کے بارے میں حکم آگے سورۃ الممتحنہ میں آئے گا۔

﴿وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ ”خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں۔“

آیت کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۳ کا مضمون بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ذَاتُ فَتْرٍ فَتَمُوتُهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَصُّوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۳﴾﴾



”اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)، تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے منہ کے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے، اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں، (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہِ یاب نہیں کرتا۔“

ان آیات کا پیغام بہت واضح ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے ایک بندہ مسلمان کی محبت کا اصل امتحان عشقِ رسولؐ کے زبانی دعوے اور نعتیہ اشعار میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے نہیں، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے ہوگا۔ اگر تو وہ اس آیت میں مذکور اپنی آٹھ محبتوں کو ترجیح کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر بستہ ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں سچا ہے، لیکن اگر وہ اس کے لیے عملاً تیار نہیں ہے تو اس کے زبانی دعووں کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ﴾ ”یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے“ دلوں کے اندر ایمان لکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پختہ کر دیا ہے۔ یعنی ایمان اب ان کے دلوں میں نقش کا لُحْر (پتھر پر لکیر) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ ”اور اُس نے ان کی مدد کی ہے اپنی طرف سے روح کے ساتھ“ روح سے مراد یہاں فرشتہ بھی ہو سکتا ہے، البام بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کا خصوصی فضل بھی ہو سکتا ہے۔ غرض اللہ کی طرف سے غیر مرئی انداز میں مدد کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”اور وہ داخل کرے گا انہیں ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ ”اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اُس سے راضی ہو گئے۔“ اس کا ترجمہ ایسے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ”اللہ ان سے راضی ہو جائے گا اور وہ اس سے راضی ہو جائیں گے۔“

﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ﴾ ”یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت!“

﴿الَّذِينَ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔“

سورۃ المائدہ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾ کہ یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی غالب رہنے والے ہیں۔ اگر حزب اللہ کی جدوجہد کے نتیجے میں اللہ کا دین دنیا میں غالب ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اصل اور حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے، جس کی بشارت ”حزب اللہ“ والوں کو اس آیت میں دی جا رہی ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا

مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین یاربَّ الْعَالَمین!



# سُورَةُ الْحَشْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۵

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا ۚ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرَجُونَ يُؤْمِنُ بِآيِدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ۚ وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبُكَمُ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ ثَابِتٌ ۚ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝

**آیت ۱** ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ﴾ ”سبح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمان میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔“

المُسَبِّحَاتِ کے سلسلے کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ الحدید کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ﴾۔ یہاں ”مَا فِي“ کا اضافہ ہے جس سے گویا مفہوم میں مزید زور (emphasis) پیدا ہو گیا ہے۔ باقی ساری آیت کے الفاظ وہی ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ ”اور وہ زبردست ہے کمال حکمت والا۔“

اُس کے اختیارات مطلق ہیں لیکن وہ اپنے اختیارات کا استعمال بہت حکمت سے کرتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ﴾ ”وہی ہے جس نے نکال باہر کیا ان کافروں کو جو اہل کتاب میں سے تھے ان کے گھروں سے پہلے جمع ہونے کے وقت۔“

یہ یہودی قبیلہ بنو نضیر کی مدینہ منورہ سے جلا وطنی کے واقعہ کا ذکر ہے۔ اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ حضور ﷺ کی ہجرت کے وقت مدینہ (یثرب) میں تین یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو ثعلبہ آباد تھے۔

حضور ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد ان قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں ”میثاق مدینہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر یہ مدینہ کے ”مشرک دفع“ کا معاہدہ تھا۔ ان میں سے قبیلہ بنو قریظہ نے تو معاہدے کے کچھ ہی دیر بعد مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ معاہدے کی مسلسل خلاف ورزیوں کی بنا پر حضور ﷺ نے غزوہ بدر کے بعد اس قبیلہ کو مدینہ بدر کر دیا۔ غزوہ اُحد (۳ ہجری) کے بعد قبیلہ بنو نضیر نے بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی وقتی شکست سے ان کی کمزوری کا تاثر لے کر جہاں عرب کے بہت سے دوسرے قبائل نے سر اٹھانا شروع کیا وہاں یہ قبیلہ بھی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی میں شامل ہو گیا۔ ان کے سردار کعب بن اشرف نے قریش مکہ سے گٹھ جوڑ کر انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی باقاعدہ دعوت دی اور انہیں یقین دلایا کہ تم لوگ باہر سے حملہ کرو، ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ اسی دوران کعب بن اشرف نے حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کرنے کی ایک سازش بھی تیار کی۔ اس کے لیے ان لوگوں نے حضور ﷺ کو کسی اہم بات چیت کے بہانے اپنے ہاں بلایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کسی دیوار کے بالکل ساتھ آپ کی نشست کا انتظام کیا جائے اور جب آپ وہاں بیٹھے ہوں تو دیوار کے اوپر سے چکی کا بھاری پاٹ آپ پر گرا دیا جائے۔ آپ ان کے بلانے پر ان کے محلے میں تشریف لے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے جب دجی کے ذریعے آپ کو ان کی اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کیا تو آپ واپس تشریف لے آئے۔

بنو نضیر کی ان ریشہ دوانیوں اور مسلسل بدعہدی کی وجہ سے بالآخر ربیع الاول ۴ ہجری میں حضور ﷺ نے ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ البتہ جب مسلمانوں نے ان کی گڑھیوں کا محاصرہ کیا تو انہوں نے چند دن محصور رہنے کے بعد لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کی جان بخشی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا، بلکہ آپ ﷺ نے مزید نرمی فرماتے ہوئے انہیں یہ اجازت بھی دے دی کہ جاتے ہوئے وہ جس قدر سامان اونٹوں پر لا کر لے جاسکتے ہیں لے جائیں۔ غزوہ احزاب (۵ ہجری) کے بعد بنو قریظہ کو بھی ان کی عہد شکنی اور سازشوں کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح یہود مدینہ کے تینوں قبائل میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کے باعث ایک ایک کر کے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

آیت میں لَا وَفَى الْحُشْرِ کا ایک مفہوم تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ہی جب ان پر لشکر کشی کی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ سے جلا وطنی تو ان لوگوں کا پہلا حشر ہے، پھر ایک دقت آئے گا جب انہیں خیر سے بھی نکال دیا جائے گا اور اس کے بعد انہیں جزیرہ نمائے عرب کو بھی خیر باد کہنا پڑے گا (چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تمام عیسائیوں اور یہودیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا گیا) اور پھر ایک حشر وہ ہوگا جو قیامت کے دن برپا ہوگا۔

﴿مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا﴾ ”(اے مسلمانو! تمہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ (اتنی آسانی سے) نکل

جائیں گے“

﴿وَقُتِلُوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ﴾ ”اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی پکڑ) سے بچالیں گے“

﴿فَاتَّهَمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا﴾ ”تو اللہ نے ان پر حملہ کیا وہاں سے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔“

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ ”اور ان کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا“  
اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو جس طریقے سے چاہے ہزیمت سے دوچار کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر مرعوب کر دیا کہ وہ اپنے مضبوط قلعوں کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمُ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ ”وہ برباد کر رہے تھے اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی۔“

چونکہ انہیں یہ اجازت مل چکی تھی کہ اپنے سامان میں سے جو کچھ وہ اپنے ساتھ اونٹوں پر لاد کر لے جاسکتے ہیں لے جائیں اس لیے وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور چھتوں میں سے دروازے کھڑکیاں کڑیاں شہتیر وغیرہ نکالنے کے لیے خود ہی انہیں سمار کر رہے تھے۔ ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بنایا ہوگا۔

﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾ ”پس عبرت حاصل کرو اے آنکھیں رکھنے والو!“  
یہ گویا پیچھے رہ جانے والے قبیلے کی تریضہ کو سنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے بھائی بندوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کرو اور سازشوں سے باز آ جاؤ!

**آیت ۳** ﴿وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ﴾ ”اور اگر اللہ نے پہلے سے نہ لکھ دیا ہوتا ان پر جلا وطن ہونا“  
﴿لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ﴾ ”تو انہیں سخت عذاب دیتا دنیوی زندگی میں، اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“

**آیت ۴** ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ”یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی۔“

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ ”اور جو اللہ کی مخالفت پر کمر کس لے تو (سمجھ لو کہ) اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔“

**آیت ۵** ﴿مَا قُطِعَ مِنْ لَينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمْ مَوْهَا فَأَنِمْ عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ”تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو چھوڑ دیا ان کی جڑوں پر کھڑے تو یہ اللہ کے اذن سے ہوا“

لینہ ایک خاص قسم کی کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہودیوں کی گڑھیوں اور حویلیوں کے گرد یہ درخت باز کی شکل میں کثرت سے موجود تھے۔ مسلمانوں نے جب ان کا محاصرہ کیا تو حملہ کے لیے راستے بنانے کی غرض

سے حسب ضرورت ان میں سے کچھ درختوں کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے اس عمل کو ہدف تنقید بنایا اور پروپیگنڈا کیا کہ یہ لوگ خود کو مؤمنین کہتے ہیں اور ان کے قائد اللہ کے رسول (ﷺ) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ بھل دار درختوں کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مذکورہ اقدام پر اپنی منظوری (sanction) کی مہر ثبت کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ مسلمانوں نے یہ درخت جنگی ضرورت کے تحت اللہ کے رسول ﷺ کی موجودگی میں کاٹے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی تھی۔

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾ (۵) ”اور تاکہ وہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔“

اب اگلی آیات میں مالِ فے کا ذکر آ رہا ہے جو اس سورت کا اہم ترین مضمون ہے۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مالِ فے کیا ہے اور یہ مالِ غنیمت سے کس طرح مختلف ہے۔ مالِ غنیمت تو وہ مال ہے جو باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو۔ اس سے پہلے سورۃ الانفال کی آیت ۳۱ میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں حکم آچکا ہے۔ اس حکم کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، رسول کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہوگا، جبکہ باقی چار حصے اس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے مابین تقسیم کر دیے جائیں گے، اور اس تقسیم میں سوار کو پیدل کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔ اس کے برعکس ”مالِ فے“ وہ مال ہے جو مسلمانوں کو کسی جنگ کے بغیر ہی حاصل ہو جائے، جیسے زیر مطالعہ واقعہ میں باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، مسلمانوں نے بنو نضیر کا محاصرہ کیا اور انہوں نے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ چنانچہ اس مہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زمینیں اور دوسری تمام اشیاء مالِ فے قرار پائیں۔ آگے آیت ۷ میں مالِ فے کے بارے میں واضح کر دیا گیا کہ یہ مال کُل کا کُل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ اس میں سے اللہ کے رسول ﷺ اپنی مرضی سے غرباء و مساکین کو تو دیں گے لیکن عام مسلمانوں کو اس میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

## آیات ۶ تا ۱۰

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَيِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ لَكُمُ الْغَنَاءُ ۚ لَكُمُ الدُّوْلَةُ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا أَتَاكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ۚ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۖ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ

الَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُخْجُونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقِ شَعْنَهُ نَفْسُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۚ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝

**آیت ۶** ﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ﴾ ”اور جو مال کہ ہاتھ لگا دیا ہے اللہ نے اپنے رسول کے ان (بنو نضیر) سے“

﴿فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ﴾ ”تو (اے مسلمانو!) تم نے اس پر نہیں دوڑائے گھوڑے اور نہ اونٹ“

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ﴾ ”لیکن مسلط کر دیتا ہے اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور قدرت سے بنو نضیر کے حوصلے پست کر دیے اور انہوں نے تم لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس مہم میں ان کے خلاف تمہیں جنگ تو لڑنا ہی نہیں پڑی۔ لہذا تم پر واضح ہونا چاہیے کہ بنو نضیر کی جلا وطنی کے نتیجے میں جو مال تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ مال غنیمت نہیں ہے۔ اب اگلی آیت میں اس مال کے مصارف کے بارے میں حکم دیا جا رہا ہے۔

**آیت ۷** ﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ﴾ ”جو مال بھی ہاتھ لگا دے اللہ اپنے رسول کے بستیوں والوں سے“

﴿فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ ”تو وہ ہے اللہ کے لیے رسول کے لیے قربت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے“

واضح رہے کہ اللہ اور رسول سے مراد یہاں اسلامی ریاست ہے۔ پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا ذاتی ذریعہ معاش تو کوئی تھا نہیں اس لیے یہ مال آپ کے ذاتی اخراجات مثلاً ازواج مطہرات کے نان نفقہ اور دوسری معاشرتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس میں حضور ﷺ کے قربت داروں کی مدد بھی رکھی گئی تاکہ آپ اپنے قربت داروں کے ساتھ حسن سلوک کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی طرح اس مال میں ان تمام اقسام کے ناداروں اور محتاجوں کا بھی حق رکھا گیا جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ ”تاکہ وہ تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان

گردش میں نہ رہے۔“

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور اس کی گردش کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچیں۔ یہ اسلامی معیشت کا بہت اہم اور بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے مالِ فے زیادہ تر ناداروں اور محتاجوں کی محرومیوں کے ازالے کے لیے مختص فرمادیا۔ مالِ فے بھی اگر مالی غنیمت کی طرح تقسیم کیا جاتا تو یہاں بھی سواروں کو دوہرا حصہ ملتا اور ظاہر ہے جس شخص کے پاس گھوڑا یا اونٹ ہے وہ تو پہلے ہی سے کچھ خوشحال ہے۔ تو اس تقسیم سے مالِ فے کا بھی زیادہ تر حصہ خوشحال لوگوں کو ہی ملتا۔

واضح رہے کہ اسلام کے نظام عدل و قسط میں تمام انسانوں کو معاشی طور پر برابر کر دینے کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ ظاہر ہے ایک سپاہی اور سپہ سالار کسی طرح بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کیونز م اپنے تمام تر دعوؤں اور انقلابی نعروں کے باوجود ایسی ”معاشی مساوات“ کی کوئی بلکی سی جھلک بھی دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظام معیشت معاشرے سے معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور امیر و غریب کے درمیان فرق و تفاوت کو کم سے کم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لیے اسلام ہر وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیتا ہے جس کی وجہ سے چند ہاتھوں میں ارتکازِ دولت کا خدشہ ہو اور ہر وہ راستہ کھولنے کے حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے گردشِ دولت کا رخ امراء سے غرباء کی طرف پھرنے اور معاشی محرومیوں کے ازالے کا امکان ہو۔

آج معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے جدید معاشرے میں جو گھمبیر صورتحال جنم لے رہی ہے اس کا ادراک سب سے پہلے جس عالمِ دین کو ہوا وہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ شاہ ولی اللہ ایسی صورت حال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس ملک یا معاشرے میں تقسیمِ دولت کا نظام غیر منصفانہ ہوگا وہاں کچھ لوگ دولت کے انبار جمع کر کے مسرفانہ عیاشیوں اور بد معاشیوں میں مبتلا ہو جائیں گے جبکہ محروم طبقے کے لوگ بار برداری کے جانور بن کر رہ جائیں گے۔ ایسی ہی صورت حال کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونُ كُفْرًا))<sup>(۱)</sup> کہ محرومی اور احتیاج انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا تقسیمِ دولت کا غیر منصفانہ نظام ایسی دودھاری تلوار ہے جس کی دو طرفہ کاٹ سے مذکورہ دونوں طبقوں کے افراد مذہبی و انسانی اقدار سے بگڑنے و بے نیاز ہو کر عملی طور پر معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ امراء کو تو اپنے اللوں تمللوں سے ہی فرصت نہیں ملتی جبکہ غریب و نادار عوام دنیا و مافیہا سے بے خبر صبح سے شام تک کمر توڑ مشقت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے اور محروم طبقے کے افراد کے دلوں میں ظالم استحصالی طبقے کے خلاف بغض و عداوت کی آگ سلگانا شروع کر دیتا ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (المائدة: ۹۱) ”شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے“۔ تصور کریں اگر ایک سیٹھ صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر کروڑوں روپے کا اسراف صرف بے جا نمود و نمائش کی مد میں ہو رہا ہوگا تو یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے اس غریب ملازم کے دل میں نفرت و عداوت کے کیسے کیسے جذبات پیدا ہوں گے جس کی بیٹی گھر میں بیٹھی صرف اس لیے بوڑھی ہو رہی ہے

(۱) المقاصد الحسنة للسخاوی، ج: ۳۶۸۔ اللآلی المشرقة للزرکشی (بدر الدین)، ج: ۲۰۹، [لہ شاهد]

کہ وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جب ایک کروڑ پتی کی بیٹی لاکھوں کا جیجر لے کر دوسرے کروڑ پتی کی بہو بن جاتی ہے تو دولت مال داروں ہی کے مابین گردش میں رہتی ہے۔  
 ﴿وَمَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ ”اور جو کچھ رسول تم لوگوں کو دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔“

ان الفاظ میں گویا اہل ایمان کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مالی فائدے سے متعلق نئے قانون کے تحت رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بخوشی قبول کریں۔ ظاہر ہے لشکر اسلام میں شامل لوگ تو بنو نضیر کے علاقے سے حاصل ہونے والے مال و اسباب کو مالی غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں سے حصے کی توقع کر رہے تھے۔ اب جب مذکورہ حکم کے تحت اس مال کو مال فائدے قرار دے کر اس کی تقسیم کا نیا قانون بنا دیا گیا تو لشکر کے شرکاء کو طبع بشری کے تحت ایک دھچکا تو ضرور لگا ہوگا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت بنو نضیر کے محاصرے میں شامل اہل ایمان کو بالخصوص اور تمام اہل ایمان کو بالعموم دین کا بنیادی اصول بتا دیا گیا کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ہر فیصلہ آخری حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملہ چاہے کوئی بھی ہو، اللہ کے رسول ﷺ تم لوگوں کو جو دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے آپ منع کر دیں اس سے منع ہو جایا کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ ”اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔“

اب اگلی آیات میں مال فائدے کی تقسیم کے بارے میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ جب یہ مال مذکورہ قانون کے تحت بیت المال میں آجائے گا تو اس کی تقسیم میں بنیادی طور پر ضرورت مندوں کی ضروریات کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے اللہ کے رسول ﷺ تو اس میں سے اپنے اور اپنے گھروالوں کے لیے وہی کچھ قبول کریں گے جو آپ کی انتہائی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہوگا۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذات اور ازواج مطہرات پر شروع دن سے ہی فقر طاری کر رکھا تھا۔ سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں واقعہ ایلاء کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ازواج مطہرات کی طرف سے نان نفقہ بڑھانے کے مطالبے پر حضور ﷺ نے ان سے علیحدگی اختیار فرمائی تھی۔ چنانچہ مال فائدے کا بڑا حصہ کس کے لیے مختص کیا جائے گا:

**آیت ۸** ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ﴾ ”یہ (خاص طور پر) اُن تنگ دست مہاجرین کے لیے ہے جو نکال دیے گئے اپنے گھروں اور اپنے اموال سے“  
 ﴿يَتَعَوَّنَ فُضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ”وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کر رہے ہیں۔“

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّدِيقُونَ﴾ ”یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔“  
 یہاں سورۃ الحمد کی آیت ۲۵ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلْيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ﴾ ”یعنی حق و باطل کی کشمکش سے دراصل اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون لوگ



غیب میں ہونے کے باوجود اُس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کے لیے جاں بکف ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں نہ صرف مال نے کی تقسیم کے حوالے سے فقراء مہاجرین کی ترجیح واضح کر دی گئی بلکہ ان کی بے لوث قربانیوں کی تصدیق و توثیق بھی فرمادی گئی کہ یہ لوگ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر گھردن سے نکلے ہیں۔ اب چونکہ ان کے پاس اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کچھ نہیں تو مال نے کی تقسیم میں ان کے لیے خصوصی حصہ رکھا جائے گا۔

**آیت ۹ ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾** ”اور (اس مال میں ان کا بھی حق ہے) جو آباد تھے اپنے گھروں میں اور جن کے پاس ایمان بھی تھا ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے“  
یہ انصارِ مدینہ کا ذکر ہے کہ مہاجرین کی آمد پر ان کا طرزِ عمل کیا تھا:

﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ ”وہ محبت کرتے ہیں ان سے جنہوں نے ہجرت کی ان کی طرف“  
مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے مکہ مکرمہ سے آنے والے مہاجرین کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان میں سے کسی کے دل میں قطعاً کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ ان لوگوں کے آنے سے ہماری آبادی بڑھ جائے گی اور ان کی ناداری و محرومی ہماری معیشت پر بوجھ بن جائے گی۔

﴿وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا﴾ ”اور وہ نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی حاجت اس بارے میں کہ جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے“

انصارِ مدینہ کے دل اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار و قربانی کے اعلیٰ جذبات سے لبریز ہیں اور یہ جذبات ان کے دلوں میں اس دلت ایمان کے باعث پیدا ہوئے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرہ در فرمایا ہے۔ یہ آیت دراصل انصارِ مدینہ کی تسکین و تشفی کے لیے ان کے جذبہ ایمان کو اپیل کرتے ہوئے نازل ہوئی تاکہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کے دلوں میں ہونے والے جھوڑے ہوئے مال سے متوقع حصہ نہ ملنے کے باعث کچھ لال و غیرہ کے احساسات پیدا ہوئے ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

﴿وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ ”اور وہ تو خود پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو خواہ ان کے اپنے اد پر تنگی ہو۔“

ایثار کے معنی کسی کے لیے قربانی دینے اور دوسروں کو اپنے اد پر ترجیح دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے انصارِ مدینہ میں سے بھی سب لوگ دولت مند تو نہیں تھے ان میں بھی بہت سے لوگ نادار اور تنگ دست تھے، لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنی احتیاج اور ضرورت کو پس پشت ڈال کر استطاعت بھر اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی تھی۔ ان کے اسی جذبہ ایثار کا اعتراف یہاں اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ۱۰ ﴿﴾ ”اور جو کوئی بھی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔“

اب اس کے بعد جو آیت آرہی ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایران

عراق، مصر، شام وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ ان علاقوں کی زمینیں بہت زرخیز ہیں، خصوصی طور پر عراق اور شام کے درمیان صحرا میں واقع وہ علاقہ جو Fertile Crescent کہلاتا ہے اپنی زرخیزی کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جب یہ وسیع و عریض علاقے فتح ہوئے تو ان کی زرعی زمینوں کے نظم و نسق کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس معاملے میں زیادہ تر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مالی غنیمت کی تقسیم کے اصول کے مطابق پانچواں حصہ بیت المال کے لیے مختص کر کے باقی زمینیں ہر محاذ کے مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں۔ البتہ حضرت عمرؓ اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ ان ممالک کی زمینیں مالی غنیمت کے بجائے مالی فے کے زمرے میں آتی ہیں، اس لیے ان پر مالی فے کے قانون کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مالی غنیمت صرف وہ مال ہے جو جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے بعد عین محاذ جنگ سے مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ جیسے اسلحہ، راشن، بھیڑ بکریاں، اونٹ گھوڑے، جنگی قیدی وغیرہ۔ لیکن اگر کسی ایک جنگ کے نتیجے میں کوئی پورا ملک فتح ہو جائے (جیسے ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں باہر سے صرف ایک جنگ ہارا تو اس کے نتیجے میں پورے ہندوستان پر باہر کا قبضہ ہو گیا) تو میدان جنگ سے باہر کی اراضی، الماک اور آبادی کو مالی فے شمار کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں اگلی آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا تھا: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ﴾ ”اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے“۔ پچھلی آیات کے مضمون سے اس آیت کے ان الفاظ کا ربط یوں بنتا ہے کہ مالی فے پر حق ہے اللہ و رسول کا رسول اللہ ﷺ کے عزیز و اقارب کا، غرباء و مساکین کا، انصار و مہاجرین کا (بحوالہ آیات ۷ اور ۸) اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں گے۔ ان آیات کے سیاق و سباق میں حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ آج کے مالی فے میں اس امت کے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا بھی حق ہے اور اگر آج یہ زمینیں چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو بعد میں آنے والے مسلمان گویا اس حق سے محروم رہ جائیں گے۔

حضرت عمرؓ کے اس استدلال سے بعض معتبر صحابہؓ نے اختلاف بھی کیا اور مذکورہ زمینوں کو مالی غنیمت کے قانون کے تحت متعلقہ مجاہدین میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا۔ اس اختلاف رائے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں غور و خوض کے لیے اوس، خزرج اور مہاجرین میں سے چند صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دے دیا۔ کمیشن کے ارکان نے مسئلے سے متعلق مختلف آراء اور دیگر پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے متفقہ طور پر جو فیصلہ دیا وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے عین مطابق تھا اور بعد میں اسی فیصلے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ صحابہؓ کے اس اجماع یا فیصلے کے مطابق تمام مسلم ممالک کی اراضی دو اقسام میں بٹ گئی۔ جن علاقوں کے لوگ لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ان کی زمینیں ”عشری زمینیں“ (ایسی زمین جو انفرادی ملکیت میں ہو اور اس کی پیداوار سے باقاعدہ عشر وصول کیا جاتا ہو) قرار پائیں۔ جبکہ بزدل و ریشمیش فتنے ہونے والے ممالک کی زمینوں کو ”خراجی زمینیں“ (ایسی زمینیں جو بیت المال کی ملکیت ہوں اور ان کو کاشت کرنے والے لوگ اسلامی حکومت کو خراج ادا کریں) کا درجہ دیا گیا۔ مثلاً مدینہ کو حضور ﷺ نے کسی جنگ کے نتیجے میں فتح نہیں کیا تھا بلکہ مدینہ کے لوگوں نے حضور ﷺ کو وہاں آنے کی خود دعوت دی تھی اس لیے اوس اور خزرج کی تمام زمینیں ”عشری“ قرار پائیں اور متعلقہ لوگوں کی

انفرادی ملکیت میں ہی رہیں، جبکہ ایران، عراق، مصر، شام وغیرہ ممالک کی زمینیں خراجی زمینوں کی حیثیت سے اسلامی حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ زمین کی اجتماعی ملکیت (collective ownership of land) کا نظام متعارف ہوا۔ اس وقت مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اگر مالی غنیمت کی حیثیت سے چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں تو اسلامی حکومت کے تحت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جاگیرداری وجود میں آ جاتی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہ ہوتا بلکہ جس ملک کی اراضی والملاک پر مالی غنیمت کے قانون کا اطلاق ہوتا اس ملک کی پوری آبادی کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی آتا۔

اسی قانون کے تحت کچھلی صدی تک ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں بھی یہاں کے علماء کا اجماع تھا کہ یہاں کی تمام زمینیں خراجی ہیں اور اس حیثیت سے یہ زمینیں یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں کوئی عشری زمین نہیں ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان کے عظیم مفسر و محدث قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فقہ کے مسائل سے متعلق اپنے رسالے ”مآلایہ ہند“ میں بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب موصوف بہت بڑے صوفی اور مفتی بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ”تفسیر مظہری“ جسے انہوں نے اپنے مرشد مرزا مظہر جان جاناںؒ کے نام سے منسوب کیا ہے، آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا مرتب کردہ مذکورہ رسالہ فقہ کے بنیادی اور ابتدائی مسائل پر مشتمل ہے اور برصغیر کے تمام عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے عشرے متعلق مسائل شامل ہی نہیں کیے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی عشری زمین ہے ہی نہیں اور عشرے متعلق احکام کی تنفیذ و تعمیل کا کوئی اسکان ہی نہیں تو ان مسائل کو لکھنے، پڑھنے یا سمجھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے میں جب کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو نئے بندوبست اراضی کے تحت بڑے بڑے جاگیرداروں سے وہ زمینیں واپس لی جاسکتی ہیں جو ماضی کے بادشاہوں، انگریز حکمرانوں اور سپہ سالاروں کی ”نظر کرم“ کے باعث انہیں عطا ہوئی تھیں۔

**آیت ۱۰** ﴿وَالَّذِينَ بَخَّاءُ وَمِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾  
 ”اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے (مالی فے پر ان کا بھی حق ہے) وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو بخش دے ہمیں بھی اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے“

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (۱۰)  
 ”اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے رب! بے شک تو نہایت شفیق اور رحم فرمانے والا ہے۔“

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مالی فے کی تقسیم میں حاضر و موجود لوگوں کے علاوہ بعد میں آنے والے مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کا حصہ بھی ہے۔ مزید برآں اس میں ایک اہم اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے کوئی بغض، کینہ یا کدورت نہیں ہونی چاہیے اور

مسلمانوں کے لیے صحیح طریقہ عمل یہی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں نہ یہ کہ انہیں سب و شتم کا نشانہ بنائیں۔

یہاں پر پہلا رکوع اختتام پذیر ہوا۔ اس رکوع میں بنو نضیر کے مدینہ سے انخلاء اور ان کی چھوڑی ہوئی املاک (مال نے) سے متعلق احکام کا ذکر تھا۔ اب اگلی آیات میں منافقین کا تذکرہ ہے کہ ان لوگوں نے غزوہ بنو نضیر کے حوالے سے کیا کردار ادا کیا۔

## آیات ۱ تا ۱۱

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَيْنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نَطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۚ وَّ اِنْ قُوْلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَيْنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَاِنْ قُوْلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَاِنْ نَّصُرُوْهُمْ يَكُوْنُوْنَ الْاَدْبَارُ ۚ ثُمَّ لَا يَنْصُرُوْنَ ۝ لَآ نُنْفِئُكُمْ رَّهْبَةً فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ لَا يَقَاتِلُوْكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِىْ قَرْيٍ مُّحْصَنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۚ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۚ تَحْسِبُهُمْ جَمِيْعًا وَقُلُوْبُهُمْ شَتٰى ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُوْنَ ۚ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَا قُوَا وَاَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ الْاُفْرَ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْٓ بَرِيْءٌ مِّنْكَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتُهُمْ اَنَّهُمْ فِى النَّارِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ جَزَاُ الظّٰلِمِيْنَ ۝

**آیت ۱۱** ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا﴾ ”کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو نفاق میں مبتلا ہیں“  
﴿يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ ”وہ کہتے ہیں اپنے ان بھائیوں سے جنہوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے“  
﴿لَيْنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ﴾ ”کہ اگر تم لوگوں کو (کبھی مدینہ سے) نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے“

یہودیوں کے ساتھ ان منافقین کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات اور روابط کی بنیاد پر منافقین وقتاً فوقتاً انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم آخری دم تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اگر تم لوگوں کو کبھی مدینہ سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ایسی مشکل گھڑی میں ہم شانہ بشانہ تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔

﴿وَلَا نَطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا﴾ ”اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کی بھی اطاعت نہیں کریں گے“  
﴿وَاِنْ قُوْلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ﴾ ”اور اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم لازماً تمہاری مدد کریں گے“

منافقین انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم محض وقتی طور پر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں شامل ہوئے ہیں اور یہ کہ اس وجہ سے تمہارے ساتھ ہمارے پرانے دوستانہ تعلقات بالکل متاثر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ تمہارے ساتھ حق دوستی نبھانے میں کوئی مصلحت بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہم بعض معاملات میں رسول اللہ ﷺ کا حکم مانتے بھی ہیں، لیکن تمہارے معاملے میں ہم ان کے حکم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ اگر مسلمانوں نے کبھی تمہارے خلاف کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی تو ہم ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے تمہارا ساتھ دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اَنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱﴾ ”اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔“  
**آیت ۱۲** ﴿لَیْنِ اٰخِرُ جُوًا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۝۱۲﴾ ”اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔“  
 ﴿وَلَیْنِ فَوْتُلُوْا لَا یَنْصُرُوْهُمْ ۝۱۳﴾ ”اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔“  
 ﴿وَلَیْنِ نَّصْرُوْهُمْ لَیُّوْلٰی الْاَذْبَارِہٖ ثُمَّ لَا یَنْصُرُوْنَ ۝۱۴﴾ ”اور اگر انہوں نے کبھی اُن کی مدد کی بھی تو پیٹھ دکھا دیں گے پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں ہو سکے گی۔“

منافقین اپنے کردار و عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ پست حوصلہ، بزدل اور جھوٹے لوگ ہیں۔ اگر ان میں جو امر دی اور غیرت و حمیت کی کوئی رُمق ہوئی تو یہ دو غلاظین اختیار نہ کرتے، بلکہ ایمان لانے کے بعد سچے مسلمانوں کا طرزِ عمل اختیار کرتے کہ ”ہرچہ با داباد ماکشتی در آب انداختیم!“ لہذا اپنے دعووں کے مطابق یہ کبھی بھی یہودیوں کا ساتھ نہیں دیں گے اور اگر ان میں سے کوئی اِکاؤ کا سر پھرے لوگ حق دوستی نبھانے کے جوش میں یہودیوں کے ساتھ کہیں کھڑے ہو بھی گئے تو مشکل وقت آنے پر وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

**آیت ۱۳** ﴿لَا اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ ۝۱۳﴾ ”(اے مسلمانو!) یقیناً تمہارا ڈر ان کے دلوں میں اللہ کی نسبت شدید تر ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تم لوگوں سے ڈرتے ہیں۔  
 ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝۱۴﴾ ”یہ اس لیے ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔“  
 یہ لوگ سمجھ بوجھ سے عاری ہیں۔ انسان کی اصل سمجھ اور عقل تو وہ ہے جو اسے اللہ سے متعارف کرائے اور ایمان کی راہ بھگائے۔ اسی طرح انسان کے لیے علم بھی وہی فائدہ مند ہے جو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی بس کھیل اور تماشہ ہے۔ چونکہ منافقین ایسی عقل سے بیگانہ اور ایسے علم سے نااہل ہیں اس لیے وہ اللہ سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے ہیں اور آخرت کی قیمت پر دنیا سنوارنے کی فکر میں مگن ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿لَا یُقَاتِلُوْكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرْیٰ مُحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ ”یہ کبھی اکٹھے ہو کر تمہارے خلاف جنگ نہیں کریں گے، سوائے اس کے کہ قلعہ بند ستیوں میں (رہ کر لڑیں) یا دیواروں کے

”پہچھے ہے۔“

﴿بِأْسِهِمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ﴾ ”ان کے آپس کے جھگڑے بہت سخت ہیں۔“

ان کے باہمی جھگڑوں اور محاصرت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بزدلی اور خود غرضی ان میں سے ہر ایک کے مزاج کا جزو لا ینفک بن چکی ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے مخلص نہیں ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کیسے مخلص ہو سکتے ہیں۔

﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقَلُوبُهُمْ شَتَّى﴾ ”تم انہیں متحد گمان کرتے ہو حالانکہ ان کے دل پھٹے

ہوئے ہیں۔“

ہمارے موجودہ زمانے کے سیاسی اتحاد بھی بد قسمتی سے بالکل یہی نقشہ پیش کرتے ہیں، حتیٰ کہ ”تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ“ کے نام پر بننے والے متحدہ محاذ کے راہنماؤں کے بھی باہمی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ان میں سے کئی علماء ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز تک ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾ ”یہ اس لیے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔“

**آیت ۱۵** ﴿كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرَّبُوا ذَاقُوا وَكَالَ أَمْرِهُمْ﴾ ”(ان کا وہی حال ہوگا) جیسے ان

لوگوں کا معاملہ ہوا جو ان سے پہلے قریب ہی اپنے کیے کی سزا چکے ہیں۔“

اس سے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے لوگ مراد ہیں جنہیں ۲ ہجری میں غزوہ بدر کے بعد مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا جبکہ بنو نضیر کی جلاوطنی جس کا ذکر ہم اس سورت میں پڑھ رہے ہیں ۳ ہجری کو عمل میں آئی۔ اسی طرح ۵ ہجری میں غزوہ احزاب کے بعد یہود مدینہ کا تیسرا اور آخری قبیلہ بنو قریظہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”اور ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہے۔“

**آیت ۱۶** ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ﴾ ”جیسے شیطان کی مثال جب وہ انسان کو کہتا

ہے کہ کفر کر!“

﴿فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ﴾ ”پھر جب وہ کفر کا

ارتکاب کر لیتا ہے تو وہ (شیطان) کہتا ہے میں تم سے لاتعلق ہوں، میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو تمام

جہانوں کا رب ہے۔“

**آیت ۱۷** ﴿فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ

آگ میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

﴿وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور یہی ہے بدلہ ظالموں کا۔“

انسان اور شیطان کی اس ”جوڑی“ کا ذکر سورہ ق میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ کسی کافر، مشرک اور گنہگار کا جو

قرین (ساتھی) شیطان ہوگا وہ اس کے بارے میں کہے گا: ﴿وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ﴾ ”اور اس کا

ساتھی کہے گا: (اے پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے!“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملے گا: ﴿الْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۝﴾ ”جھوٹک دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش کو“۔ اس کے بعد کی دو آیات میں اس جہنمی کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ شیطان پھر کہے گا: ﴿رَبَّنَا مَا أَطْعَمْتُهُ وَلَكِنْ كُنَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝﴾ ”پروردگار! میں نے اس کو گراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی بہت بڑی گمراہی میں مبتلا تھا“۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿لَا تَخْصِمُوهُ لَدَيْ رَبِّكَ قَدْ مُنَّ إِلَيْكُمْ بِالْوَعْدِ ۝﴾ ”ما بُيْدَلُ الْقَوْلُ لَدَيْ رَبِّكَ وَمَا أَنَا بِظَلَامٍ لِلْعَبِيدِ ۝﴾ ”اب میرے سامنے جھگڑ دمت، جبکہ میں پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا ہوں۔ میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جاسکتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔“

## آیات ۱۸ تا ۲۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْنَا أَخْيَاصًا تَتَصَدَّعُونَ ۚ خَشِيَ اللَّهُ ۖ وَبَلَكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ أَلَمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ ۖ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۖ سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۖ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ع

اب ہم اس سورت کے تیسرے اور آخری رکوع کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں جو بہت اہم آیات پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جب قرآن مجید کے کسی مقام یا کسی آیت کی خصوصی اہمیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اس مقام یا آیت کا کوئی خاص پہلو یا خاص موضوع مراد ہوتا ہے، ورنہ قرآن مجید کا تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہم ہے۔ مثلاً قرآن مجید کے بعض مقامات فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے اہم ہیں تو بعض دوسرے مقامات سائنسی حوالے سے لائق توجہ ہیں۔ بعض آیات روح دین سے بحث کرتی ہیں تو بعض ایمان کی ماہیت واضح کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر آیت اور ہر مقام کی اہمیت اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی اہمیت فلسفہ اور تصوف کے موضوع کی وجہ سے بھی ہے اور اسماء حسنیٰ کے اس عظیم الشان گلدستے کے اعتبار سے بھی جو پورے قرآن میں بالکل یکتا اور منفرد ہے۔ اس سورت کی آخری تین آیات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے ذکر کے حوالے سے سورۃ الحدید کی ابتدائی

چھ آیات کے ہم وزن ہیں۔ ان تین آیات میں ایک ساتھ سولہ اسمائے حسنیٰ آئے ہیں اور ان میں سے آٹھ اسمائے حسنیٰ تو ایک ہی آیت میں ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اسمائے حسنیٰ کے ایک مقام پر اکٹھے ہونے کی اور کوئی مثال قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

**آیت ۱۸ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾** ”اے اہل ایمان! اللہ کا

تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!“  
ظاہر ہے یہ اُس کل کے دن کی بات ہے جو بعث بعد الموت کے بعد آنے والا ہے جس دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اس دن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر اہل ایمان اپنی زندگی اللہ کے تقویٰ کے سائے میں گزارنے کا اہتمام کرے اور اپنے اعمال کا مسلسل جائزہ لیتا رہے کہ اُس نے آخرت کے حوالے سے اب تک کیا کمائی کی ہے اور کتنا ہی حکومت کے امپیریل بینک میں اپنے کل کے لیے اب تک کتنا سرمایہ جمع کرایا ہے۔

**﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۱۸)** ”اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔“

اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اور فکر آخرت۔ بلکہ اتَّقُوا اللَّهَ کا حکم یہاں خصوصی تاکید کے طور پر دہرایا ہے۔ تقویٰ سے عام طور پر اللہ کا خوف اور ڈر مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ اہم نکتہ ضرور مد نظر رہنا چاہیے کہ اس خوف میں شیر یا سانپ کے خوف کی طرح دہشت کا عنصر بالکل نہیں؛ بلکہ اس کی مثال ایسے خوف کی سی ہے جیسا خوف اولاد اپنے والد سے محسوس کرتی ہے۔ اس خوف میں محبت اور احتیاط کے جذبات غالب ہوتے ہیں کہ ہمارے والد ہم سے ناراض نہ ہو جائیں اور ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمارے والد کے جذبات و احساسات مجروح ہوں۔ چنانچہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ڈر رہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی بچنے کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ کر زندگی گزارنا۔

**آیت ۱۹ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾** ”اور (اے مسلمانو! دیکھنا!) تم ان

لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔“  
**﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۱۹)** ”یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔“

ہمارے لیے اس آیت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا فلسفہ خودی اسی آیت سے اخذ کیا تھا۔ علامہ کے اس بیان کے راوی سید نیر نیازی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے۔ (یہ واقعہ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کا نفرنس میں اپنے ایک لیکچر میں بھی بیان کیا تھا۔) وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوئی



ہیں۔ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے یہ فلسفہ نظم سے لیا ہے، کوئی اس حوالے سے کسی دوسرے مغربی فلاسفر کا نام لیتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ خود واضح فرمادیں کہ آپ کے اس فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ یہ سن کر علامہ اقبال نے انہیں فرمایا کہ آپ کل فلاں وقت میرے پاس آئیں، میں آپ کو اس کے ماخذ کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ شاعر مشرق اور حکیم الامت انہیں یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ انہیں اس موضوع پر تفصیلی ڈکٹیشن دیں گے۔ لیکن اگلے دن جب وہ کاپی پتسل ہاتھ میں لیے مقررہ وقت پر حاضر خدمت ہوئے تو علامہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ ذرا قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ پھر انہوں نے کہا کہ سورۃ الحشر کی یہ آیت (آیت ۱۹) نکال کر تلاوت کرو! اور انہیں مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہے میرے فلسفہ خودی کا ماخذ!

اب آئیے فَنَلْسُهُمْ اَنفُسَهُمْ کے مفہوم پر غور کریں۔ کیا کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح بھول سکتا ہے کہ وہ خود اپنی شخصیت سے ہی واقف نہ رہے؟ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اپنے پیٹ کا خیال نہ رہے؟ یا جسے اپنی کوئی بیماری یاد نہ رہے؟ ظاہر ہے کوئی انسان اپنے جسم اور اس کے تقاضوں سے غافل نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ حیوانی جسم کے علاوہ انسان کی کوئی اور حیثیت بھی ہے جسے وہ بھول جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ”روح“۔ جہاں تک انسان کے اللہ کو بھلانے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے: ﴿اَسْخَوْذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَنَلْسُهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ ”شیطان نے ان پر قابو پا لیا ہے، پس انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے“۔ اب آیت زیر مطالعہ میں ایسے لوگوں کی اس سزا کا ذکر ہے جو انہیں دنیوی زندگی میں ہی مل جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی اصل حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ انسان ہیں، اشرف المخلوقات ہیں یا اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بس یہی یاد رہ جاتا ہے کہ بہت سے حیوانات کی طرح وہ بھی ایک حیوان ہیں۔

آج ہماری جدید تہذیب بھی مختلف انداز سے ہمیں یہی سبق پڑھانے کی کوشش میں ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے۔ اس فلسفے کو متعارف کرانے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) نے ادا کیا ہے۔ اس تھیوری کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حیوان اور انسان میں بنیادی فرق صرف ارتقاء کے مراحل اور مدارج کا ہے۔ جیسے گدھے اور گھوڑے میں صرف یہ فرق ہے کہ گدھا نچلے درجے کا (rough & coarse) جانور ہے، جبکہ گھوڑا ارتقاء کا ایک مزید مرحلہ طے کر کے نسبتاً بہتر درجے میں چلا گیا ہے اور ایک refined اور تمکنت والا جانور ہے اسی طرح کا فرق ایک گوریلے (chimpanzee) اور انسان میں ہے۔ یعنی گوریلے کے مقابلے میں انسان نسبتاً بہتر قسم کا جانور ہے، باقی ان دونوں کے جبلی تقاضے (instincts) اور محرکات (motives) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جدید سائیکالوجی بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے۔ چنانچہ آج کے سائیکالوجسٹ کو بھی محرکاتِ عمل کے حوالے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تو جب یہ فرق مٹ گیا اور انسان اپنی اصلیت کو بھلا کر حیوان بن گیا تو گویا وہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ انیسویں صدی کے فریج لٹریچر میں بنیادی طور پر اسی نکتے کو فوکس کیا گیا ہے کہ حیوانات کی

زندگی فطرت کے عین مطابق ہے اس لیے ہم انسانوں کو ان سے سبق لیتے ہوئے اپنی زندگی کو خواہ مخواہ کے تفکرات سے آزاد کر لینا چاہیے۔ مثلاً تمام حیوانات لباس سے بے نیاز ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس فطرت کا تقاضا نہیں ہے انسان کی اپنی ایجاد ہے۔ اسی طرح بیوی بیٹی اور ماں کی تمیز بھی حیوانات میں نہیں پائی جاتی یہ پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر خود ہی عائد کی ہے۔ یہ ہے آج کے انسان کا المیہ!

بہر حال یہ آیت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جو انسان اللہ کو بھلا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ انسان کی روح خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پھونکی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ”انسان“ کے مرتبے پر فائز ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اپنی روح اور اس کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے اپنشد کا یہ جملہ بہت اہم ہے:

*Man in his ignorance identifies himself with the material sheaths that encompass his real self.*

اسی real self کا دوسرا نام ”انا“ ہے لیکن اس سے اصل مراد انسان کی ”روح“ ہی ہے جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ انداز میں ”خودی“ کا نام دیا ہے:

نقطہ نوری کہ نام او خودی ست      زیر خاک ما شرارِ زندگی ست

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں      غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حیوانی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ بقول شیخ سعدی:

آدمی زادہ طرفہ مجنون است      از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی آدمی ایک ایسی عجوبہ مرکب ہے جس میں فرشتہ اور حیوان دونوں گندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے سے مراد یہاں وہ نورانی روح ہے جو عالم امر کی چیز ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (بنی اسرائیل) ”اور (اے نبی ﷺ) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرمادیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا سا“۔ چنانچہ انسان کی روح نورانی چیز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر انسان اللہ کو بھلا دے گا تو اپنی روح یعنی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو کر محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر میں اچھے برے اور حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔ انسانی معانرے کے ایسے ہی افراد آیت زیر مطالعہ کے حکم ”أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ“ کے مصداق ہیں۔

**آیت ۲۰** ﴿لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾ ”(دیکھو!) برابر نہیں ہو سکتے آگ والے اور جنت والے۔“

﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ ”یقیناً جنت والے ہی کامیاب ہوں گے۔“

اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اللَّهُمَّ ادْخِلْنَا الْحَنَّةَ مَعَ الْآبَرَارِ! اللَّهُمَّ اجْزَنَا مِنَ النَّارِ! يَامُجِيزُ يَامُجِيزُ يَامُجِيزُ!

**آیت ۲۱** ﴿لَوْ أُنْزِلْنَا هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ ”اگر ہم

اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔“  
یہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید کی عظمت اور قرآن مجید کی افادیت دو الگ الگ موضوعات ہیں۔ ان دو موضوعات کو آپس میں گنڈا نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک قرآن مجید کی افادیت کا تعلق ہے قرآن کی متعدد آیات اس حوالے سے ہماری راہنمائی کرتی ہیں، لیکن سورہ یونس کی یہ دو آیات اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

”اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں اور وہ

کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

یہ تو قرآن مجید کی افادیت کا ذکر ہے، لیکن قرآن مجید فی نفسہ کیا ہے؟ انسان کا محدود ذہن اس موضوع کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کے تصور کو انسانی ذہن کے لیے کسی حد تک قابل فہم بنانے کے لیے آیت زیر مطالعہ میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیل کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر پیش آنے والے واقعہ کی یاد دہانی ضروری ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر گئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: ﴿رَبِّ ارْنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾ کہ اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا، میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ﴿قَالَ لَنْ تَرَانِيْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿وَلَكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ﴾ البتہ تم اس پہاڑ کو دیکھو میں اپنی تجلی اس پر ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنْ اَسْفَقَ مَكَانُهُ فَسَوْفَ تَرَانِيْ﴾ تو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہ سکا تو پھر تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ﴾ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر ایک تجلی ڈالی، یعنی نور کا پرتو جب پہاڑ پر پڑا تو ﴿جَعَلَهُ دُخَانًا﴾ اُس نے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ﴿وَاَخْرَجَ مُوسٰى صَعِقًا﴾ (الاعراف: ۱۴۳) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بالواسطہ تجلی کے مشاہدہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش کر گر پڑے۔ اس واقعہ کے ساتھ آیت زیر مطالعہ میں بیان کی گئی تمثیل کی گہری مماثلت ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ کوہ طور پر ”تجلی ذات“ کا معاملہ تھا اور یہاں اس تمثیل میں ”تجلی صفات“ کا ذکر ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اپنے متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس لیے جو تاثیر ذات باری تعالیٰ کی تجلی کی ہے عین وہی تاثیر کلام اللہ کی تجلی کی ہے۔ علامہ اقبال اپنے انداز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان یوں کرتے ہیں:

فانش گویم آنچه در دل مضمر است      ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

کہ اگر میں اپنے دل کی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ قرآن مجید محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی چیز ہے۔ کیا

چیز ہے؟ اس کی مزید وضاحت علامہ یوں کرتے ہیں:

مثلاً حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں زندہ و پابندہ و گویا ست ایں! یعنی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا حامل ہے اور اس حیثیت میں یہ پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا بھی ہے اور گویا (بولتا ہوا) بھی۔ قرآن حکیم کی عظمت کے حوالے سے سورۃ الواقعة کی آیت ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾ کی تشریح کے تحت یہ نکتہ بھی زیر بحث آچکا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی معرفت، اصل ہدایت اور روح باطنی تک رسائی کے لیے انسان کے باطن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطن کا تجزیہ کیے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس کی عبارت اور لغت کے ظاہری مطالب و معانی تک ہی رسائی حاصل کر پائے گا۔ یہی بات مولانا روم نے تعلیٰ میز الفاظ میں یوں بیان کی ہے:

ما ز قرآن مغزها برداشتیم استخوان پیش سگاں انداختیم! کہ ہم نے قرآن سے اس کا مغزلے لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَظَرٍ لِّبَهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ”اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔“

اب وہ تین عظیم آیات آرہی ہیں جن کا ذکر اس رکوع کے آغاز میں اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے ہوا تھا۔ واضح رہے کہ صفات باری تعالیٰ کے موضوع پر سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات قرآن مجید کے ذرۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔ (عربی میں اونٹ کی کوہان کو سنام اور کسی چیز کی چوٹی یا بلند ترین حصے کو ذرۂ / ذرۂ کہتے ہیں۔ چنانچہ ذرۂ سنام کا مطلب ہے کوہان کی بھی چوٹی۔ یعنی سب سے اونچا مقام یا کسی چیز کا نمایاں ترین حصہ!) جبکہ اسمائے حسنیٰ کے ذکر کے اعتبار سے سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پورے قرآن میں منفرد و ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے حوالے سے یہاں ”ایمانِ مجمل“ کے یہ الفاظ بھی اپنے حافظے میں تازہ کر لیں: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِأَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ وَقُلْتُ جَمِيعَ أَحْكَامِهِ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے تمام احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

**آیت ۲۲** ﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ”وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔“

﴿عَلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ”وہ جاننے والا ہے چھپے کا اور کھلے کا۔“

یہ پورا مرکب اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور اُسے بھی جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن میں جہاں اللہ کے لیے غیب اور شہادۃ کے الفاظ آتے ہیں، وہ ہم انسانوں کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے لیے تو سب شہادۃ ہی شہادۃ ہے، اس کے لیے تو کوئی چیز بھی غیب نہیں۔ ہم انسانوں کے لیے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی تمام اشیاء ہمارے لیے ”ظاہر“ (الشَّهَادَةِ) کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی چیز کو ہم مانگیر و سکوپ یا ٹیلی سکوپ سے بھی دیکھ لیں تو اس کی حیثیت بھی ہمارے لیے ”ظاہر“ ہی کی ہے۔ دوسری

طرف کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں ہم سے چھپا دیا گیا ہے، انہیں ہم کسی طرح بھی اپنے حواس کے احاطہ میں نہیں لاسکتے۔ ایسی سب چیزیں ہمارے لیے غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات، فرشتے، جنت، دوزخ، عالم آخرت وغیرہ سب ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الجن میں دوبارہ واضح تر انداز میں آئے گا۔

﴿هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝۲۱﴾ ”وہ بہت رحم کرنے والا نہایت مہربان ہے۔“

سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیت ان ہی دو اسمائے حسنی پر مشتمل ہے۔ لغوی اور اشتقاقی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معلقہ آیت کی تشریح۔

آیت ۲۳ ﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ”وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔“

﴿الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهِيمُنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ ”حقیقی بادشاہ، بکمر پاک، سراپا سلامتی (اور ہر اعتبار سے سالم)، امن دینے والا، پناہ میں لینے والا، زبردست (مطلق العنان)، اپنا حکم بزرور نافذ کرنے والا، سب بڑائیوں کا مالک۔“

﴿سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝۲۴﴾ ”اللہ پاک ہے ان تمام چیزوں سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔“ اس ایک آیت میں آٹھ اسمائے حسنی مسلسل بغیر حرفِ ’و‘ کے آئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ آیت پورے قرآن مجید میں منفرد ہے۔

آیت ۲۴ ﴿هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ ”وہی ہے اللہ، تخلیق کا منصوبہ بنانے والا، وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا۔“

اس آیت میں (اللہ کے علاوہ) تین اسمائے حسنی آئے ہیں۔ ان تینوں اسماء کا تعلق تخلیقی عمل کے مختلف مراحل سے ہے اور اس لحاظ سے یہاں ان کا ذکر ایک فطری اور منطقی ترتیب سے ہوا ہے۔ ”خلق“ دراصل عمل تخلیق کا وہ مرحلہ ہے جب کسی چیز کا منصوبہ یا نقشہ تیار ہوتا ہے۔ بغرض تفہیم اگر ہم انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے ایک بوہنی کی مثال سامنے رکھیں تو عمل تخلیق کے مختلف مراحل اور ان تینوں اسماء کے مابین پائے جانے والے خاص ربط کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ فرض کریں کہ بوہنی ایک میز بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے وہ مطلوبہ سائز اور مطلوبہ شکل کی میز کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ یہ اس میز کی ذہنی تخلیق ہے۔ اس کے بعد بوہنی مجوزہ نقشے کے مطابق لکڑی کا میز بنا کر اپنی ”ذہنی تخلیق“ کو عالم واقعہ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر تیرے اور آخری مرحلے میں وہ اسے finishing touches دیتے ہوئے رنگ و روغن کر کے میز کو حتمی طور پر تیار کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اسمائے حسنی کا تعلق تخلیق کے ان ہی تین مراحل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کا ایک نقشہ یا نمونہ تیار فرماتا ہے۔ اس مفہوم میں وہ الخالق ہے، پھر وہ اس تخلیق کو عدم سے عالم وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ البارئ ہے۔ (برآء کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ الحمد کی آیت ۲۲ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا﴾ ”اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔“) اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کو باقاعدہ ایک

صورت یا شکل عطا کرتا ہے۔ اس معنی میں وہ ”الْمُصَوِّر“ ہے۔

﴿لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾ ”تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔“

﴿يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے

اور زمین میں ہے۔“

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ ”اور وہ بہت زبردست ہے کمال حکمت والا۔“

اس سورت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے آغاز میں بھی اللہ کی تسبیح کا بیان ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ کی تسبیح پر ہوتا ہے۔ آغاز میں تسبیح کے حوالے سے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ) آیا ہے جبکہ اختتام پر مضارع کا صیغہ (يُسَبِّحُ) ہے۔ اسی طرح اس کی ابتدائی آیت کے اختتام پر جو دو اسمائے حسنیٰ (الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ) آئے ہیں آخری آیت کا اختتام بھی ان ہی اسمائے حسنیٰ پر ہوتا ہے۔



# سُورَةُ الْمُنْتَحَنَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ المنتحنہ کا نزول فتح مکہ سے قبل اسی زمانے میں ہوا جس زمانے میں سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جب ایک طرف رسول اللہ ﷺ مکہ پر فیصلہ کن چڑھائی کی تیاری کر رہے تھے تو دوسری طرف منافقین اس ممکنہ مہم کے خلاف پراپیگنڈے میں سرگرم عمل تھے۔ (سورۃ التوبہ کے تمہیدی کلمات میں ان حالات پر تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔) ان لوگوں کے بعض دلائل ایسے تھے جن سے نو مسلم ضغفاء بھی کسی نہ کسی حد تک متاثر ہو رہے تھے۔ مثلاً اس حوالے سے ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ قریش مکہ جیسے بھی ہیں آخر وہ حرم کے متولی ہیں اور حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں، لہذا ان کی ان نیکیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ منافقین کے ایسے اعتراضات کے جوابات سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں دیے گئے ہیں۔

اسی دوران وہ واقعہ بھی رونما ہوا جس کا ذکر اس سورہ کے آغاز میں آیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ حضور ﷺ مکہ پر چڑھائی کا منصوبہ مکمل طور پر خفیہ رکھنا چاہتے تھے، تاکہ قریش کو اس بارے میں کوئی پیشگی اطلاع نہ ملنے پائے۔ لیکن ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے سردارانِ قریش کو ایک خفیہ خط کے ذریعے اس اہم جنگی راز کی اطلاع کرنے کی کوشش کی۔ حضرت حاطبؓ انتہائی مخلص مسلمان اور بدری صحابی تھے۔ ان کے اہل و عیال اور کنبے کے کچھ لوگ اس وقت تک مکہ مکرمہ میں تھے۔ انہیں پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کی مکہ پر لشکر کشی کی صورت میں قریش ان کے اہل خانہ کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ اس اندیشے کے پیش نظر انہوں نے حملے کی پیشگی اطلاع دے کر قریش مکہ پر گویا ایک بہت بڑا احسان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت حاطبؓ نے مذکورہ خط ایک عورت کو دیا جو مکہ جا رہی تھی اور اسے تاکید کی کہ وہ اسے مکمل رازداری سے فلاں شخص تک پہنچا دے۔ اس عورت کے مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور ﷺ کو اس بارے میں مطلع فرما دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے پیچھے روانہ کیا، انہیں تیزی سے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ مکہ کے راستے میں روضہ خاخ کے مقام پر آپ لوگوں کو ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط اس سے لے کر واپس آ جاؤ۔ حضرت علیؓ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو وہ عورت وہاں موجود تھی۔ آپؐ نے خط مانگا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی دی گئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی، لہذا تم سیدھے طریقے سے خط ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم تمہیں برہنہ کر کے تمہاری تلاشی لیں گے۔ اس پر عورت نے خط اپنی

چٹیا سے نکال کر آپؐ کے حوالے کر دیا۔ حضور ﷺ نے جب حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اہل خانہ مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جو میرے اہل خانہ کو بچا سکے۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے اہل و عیال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت عمرؓ موقع پر موجود تھے انہوں نے اٹھ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! حاطبؓ سے غلطی ضرور ہوئی ہے، لیکن یہ بدری صحابی ہے اور اللہ تعالیٰ بدری صحابہؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر چکا ہے، امید ہے وہ اس کی یہ خطا بھی معاف فرما دے گا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ زیر مطالعہ سورت کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمُ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمُ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِهِمْ أَكْثِيئُكُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ إِنْ يَتَفَقَّهُكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتُهُمُ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُهُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يُفْصَلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا الْقَوْمُ هُمُ الْبَارِعُونَ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كُفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَا تُسْتَغْفَرُ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۝ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۝ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۝ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝



**آیت ۱** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ ”اے اہل ایمان! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ“

یعنی تم لوگ کفار و مشرکین کی خیر خواہی اور بھلائی کا مت سوچو۔ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے اور اچھے تعلقات بنانے کی کوشش مت کرو۔ ان آیات کا نزول اس وقت ہوا جب سردارانِ قریش کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط پڑا گیا۔

﴿تَلْقَوْنَ الْيَهُمَ بِالْمُودَّةِ﴾ ”تم ان کی طرف دوستی اور محبت کے پیغامات بھیجتے ہو“  
 ﴿وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ﴾ ”حالانکہ انہوں نے انکار کیا ہے اُس حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے۔“

﴿يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَيَآئِلُكُمْ﴾ ”وہ رسولؐ کو اور تم لوگوں کو صرف اس بنا پر جلا وطن کرتے ہیں“  
 ﴿أَنْ تَوَدُّوا بِاللَّهِ رَبَّكُمْ﴾ ”کہ تم ایمان رکھتے ہو اللہؐ اپنے رب پر۔“  
 ﴿أَنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي﴾ ”اگر تم نکلے تھے میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضا جوئی کے لیے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل اس کے منافی ہے)“  
 ﴿تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمُودَّةِ﴾ ”تم انہیں خفیہ پیغامات بھیجتے ہو محبت اور دوستی کے“  
 ﴿وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ﴾ ”اور میں خوب جانتا ہوں جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو۔“

﴿وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ①﴾ ”اور جو کوئی بھی تم میں سے یہ کام کرے تو وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔“

یہ طویل آیت مدنی سورتوں کے عمومی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔

**آیت ۲** ﴿إِنْ يَتَّقَوْكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءَ﴾ ”اگر وہ تمہیں کہیں پالیں تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کریں گے“

﴿وَيَسْطُورَ إِلَيْكُمْ يَدِيَهُمْ وَالْأَيْدِيَهُمْ بِالْسُّوءِ﴾ ”اور تمہاری طرف بڑھائیں گے وہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برے ارادے کے ساتھ“

تم تو ان کی طرف دوستی کے پیغامات بھیج رہے ہو، لیکن اگر تم کہیں ان کے ہتھے چڑھ جاؤ تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کا ہر حربہ آزمائیں گے، تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی، اور تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھائیں نہیں گے۔

﴿وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ①﴾ ”اور ان کی شدید خواہش ہوگی کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔“

**آیت ۳** ﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ ”تمہیں ہرگز نفع نہیں پہنچائیں گے

تمہارے رحمی رشتے اور نہ تمہاری اولادیں قیامت کے دن۔“

﴿يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ﴾ ”اللہ فیصلہ کر دے گا تمہارے مابین۔“

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

آیت ۴ ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ ”تمہارے لیے بہت اچھا نمونہ

ہے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (کے طرزِ عمل) میں۔“

﴿إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَاءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ ”جب انہوں نے اپنی

قوم سے ملا کہہ دیا کہ ہم بالکل بری ہیں تم سے اور ان سے جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔“

ہم تم سے بھی اور ان سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ لاتعلقی کرتے ہیں۔

﴿كُفِّرْنَا بَكُمْ وَبَدَأَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا﴾ ”ہم تم سے منکر ہوئے اور اب

ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہمیشہ کے لیے“

﴿حَتَّى تُوْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ﴾ ”یہاں تک کہ تم بھی ایمان لے آؤ اللہ پر توحید کے ساتھ“

گویا حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے ساتھی اہل ایمان (نبیؑ) اپنے کافر اعزہ و اقارب کے لیے ننگی تلوار

بن گئے۔ یہاں یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حزبِ اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے

رحمی رشتوں کو کاٹ پھینکنے کا مشکل مرحلہ بھی لازماً طے کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المجادلہ کی اس آیت میں واضح کیا

گیا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ

أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (آیت ۲۲) ”تم نہیں پاؤ گے ان لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں

اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت پر کمر بستہ ہیں اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی

خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں۔“ چنانچہ اسی اصول

کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے اہل ایمان ساتھیوں نے اپنی قومِ برادری اور رشتہ داروں سے نہ

صرف اظہارِ لاتعلقی کیا بلکہ انہیں کھلم کھلا عداوت اور مخالفت کا چیلنج بھی دے دیا۔

﴿إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبْنَيْهِ لَا يَبْنِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ ”سوائے ابراہیمؑ کے اپنے باپ سے یہ کہنے کے کہ

میں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا“

یہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنے والد کے ساتھ اس گفتگو کا حوالہ ہے جس کی تفصیل سورۃ مریم میں آئی ہے۔

اس موقع پر باپ بیٹے کے درمیان جو آخری مکالمہ ہوا وہ یہ تھا: ﴿قَالَ أَرَأَيْتَ أَنْتَ عَنِ إِلَهِتِي يَا إِبْرَاهِيمُ﴾ لَئِنْ

لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ﴿قَالَ سَلَّمَ عَلَيْكَ لَا سَتَعْلَمُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِنِي حَفِيًّا﴾

”اُس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم کنارہ کشی کر رہے ہو میرے معبودوں سے؟ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو میں

تمہیں سنگسار کر دوں گا اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ ایک مدت تک۔ ابراہیمؑ نے کہا: آپ پر سلام! میں

اپنے رب سے آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا' وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔' آیت زیر مطالعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی وعدے کا حوالہ آیا ہے۔

﴿وَمَا أَمِلْتُكَ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ”اور میں آپ کے بارے میں اللہ کے ہاں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔“

میں آپ کے لیے وعادہ کروں گا، اللہ تعالیٰ وعادہ قبول کرے نہ کرے، وہ آپ کو معاف کرے نہ کرے، یہ اس کا اختیار ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ سورہ مریم کی مذکورہ آیات ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور زیر مطالعہ آیت ۸ ہجری میں فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس وعدے کا ذکر ہے اس سے متعلق آخری حکم سورۃ التوبہ کی اس آیت میں آیا ہے، جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهٖمَ لِاَبْنِهٖ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَيَّرَ مِنْهُ ۚ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ لَآَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ ”اور نہیں تھا استغفار کرنا ابراہیم کا اپنے والد کے حق میں مگر ایک وعدے کی بنیاد پر جو انہوں نے اس سے کیا تھا اور جب آپ پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ نے اس سے اعلان بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیم بہت ور ددل رکھنے والے اور حلیم الطبع انسان تھے۔“ چنانچہ سورۃ التوبہ کی یہ آیت جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی، محکم تصور ہوگی اور پہلی آیات اس کے تابع سمجھی جائیں گی۔

﴿رَبَّنَا عَلَيْنِكَ تَوَكَّلْنَا وَآلَيْكَ اَبْنَا وَآلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ ”پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔“

**آیت ۵** ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ”پروردگار! تو ہمیں کافروں کے لیے تختہ امتحان نہ بنادینا“ اے ہمارے پروردگار! ایسا نہ ہو کہ تو کافروں کو ہمارے ذریعے سے آزمائے۔ ایسا نہ ہو کہ تو انہیں آزمانے کے لیے ہم پر ظلم کرنے کی جھوٹ دے۔ کسی کے لیے فتنہ یا تختہ مشق بننے کے مفہوم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور میں مسلمانوں اور مشرکین کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ کی رشی و راز کر کے انہیں آزمانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے تم میرے بندوں پر جتنا ظلم کر سکتے ہو کر لو! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس حد تک جاتے ہو! لیکن مشرکین کی اس آزمائش میں تختہ ستم تو ظاہر ہے مسلمان بنے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وعادہ میں اللہ تعالیٰ سے ایسی آزمائش سے بچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

﴿وَاعْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ”اور تو ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو ہی زبردست اور حکمت والا ہے۔“

**آیت ۶** ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ”تمہارے لیے یقیناً ان (کے طرز عمل) میں ایک بہت اچھا نمونہ ہے“

لیکن یہ نمونہ اور اُسوہ فائدہ مند کس کے لیے ہو سکتا ہے؟

﴿لَمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ ”اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو۔“

بالکل یہی الفاظ سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے آئے ہیں: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَذِكْرٍ﴾ یعنی حضور ﷺ کی شخصیت اور سیرت یقیناً اُسوہ کاملہ ہے، لیکن اس سے مستفیض صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہوں۔

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ ”اور جو کوئی منہ موڑ لے تو یقیناً اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔“

## آیات ۷ تا ۹

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً وَاللَّهُ قَدِيرٌ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۷﴾ لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿۸﴾ إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۹﴾

آیت ۷ ﴿عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً﴾ ”بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا کر دے۔“

ظاہر ہے اگر وہ بھی ایمان لے آئیں گے تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿قَاتِلُوا قَاتِلُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا هُمُ فِي الدِّينِ﴾ ”پھر بھی اگر وہ توبہ کر لیں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔“ اور یہ مرحلہ کوئی زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ زیر مطالعہ آیات فتح مکہ سے قبل ۸ ہجری میں نازل ہوئیں اور اس سے اگلے ہی سال فتح مکہ کے بعد ہجری میں مشرکین عرب کو چار ماہ کا ایسی میٹم دے دیا گیا کہ یا ایمان لے آؤ یا سب قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے نتیجے میں سب لوگ ایمان لا کر اسلامی بھائی چارے میں شامل ہو گئے۔ آیت زیر مطالعہ میں دوستی اور محبت کے اسی رشتے کی طرف اشارہ ہے جو ان کے درمیان ایک سال بعد بننے والا تھا۔

﴿وَاللَّهُ قَدِيرٌ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ”اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔“

آیت ۸ ﴿لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ

تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ“ ”اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرو یا انصاف کا معاملہ کرو۔“

یعنی وہ غیر حربی کافر جن کے ساتھ تمہاری جنگ نہیں ہے، تم لوگوں کو مکہ سے بے دخل کرنے میں بھی ان کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی کبھی مدد کی ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا سلوک روادار کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دیوبی معاملات کے حوالے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں۔ البدنہ ولایت کا رشتہ اور قلبی محبت کا تعلق ان کے ساتھ بھی قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝۸﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“  
**آیت ۹** ﴿إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الذِّينِ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَكَّوهُمْ“ ”وہ تو تمہیں منع کرتا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی کہ تم ان کے ساتھ ولایت اور دوستی کا رشتہ قائم کرو۔“

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝۹﴾ ”اور جو کوئی ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔“

اب اگلی آیات میں خواتین سے متعلق چند مسائل کا ذکر آ رہا ہے جو صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے نتیجے میں سامنے آئے تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے، لیکن اگر مدینہ سے کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر واپس مکہ آجائے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس معاہدے کے بعد چند مسلمان خواتین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قریش کی طرف سے مطالبہ آیا کہ انہیں واپس کیا جائے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاہدے کی متعلقہ شق مردوں (رجال) سے متعلق ہے، اس میں عورتوں (نساء) کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ان خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس مثال کے بعد مکہ سے کچھ مزید خواتین بھی آنا شروع ہو گئیں تو ایسی مہاجر خواتین کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خدشہ یہ تھا کہ ہجرت کے نام پر مشرک عورتیں جاسوسی وغیرہ کے لیے مکہ سے مدینہ آ کر آباد نہ ہو جائیں اور ان کی وجہ سے بعد میں مسلمان معاشرے میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ پھر ان میں کچھ ایسی شادی شدہ خواتین بھی تھیں جو اپنے مشرک شوہروں کو چھوڑ کر آ رہی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ سوال اپنی جگہ جواب کا متقاضی تھا کہ کیا وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مشرک شوہروں کی زوجیت میں ہیں یا کہ آزاد ہو چکی ہیں؟ اور اسی معاملے سے متعلق یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ کسی ایسی عورت کے مدینہ آ جانے کے بعد کیا کوئی مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگلی دو آیات میں ان مسائل سے متعلق ہدایات دی گئی

ہیں۔ جبکہ اس کے بعد ایک آیت میں مسلمان خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ذکر تو مردوں کی بیعت (بیعت رضوان) کا بھی ہے، لیکن اس بیعت کے الفاظ کیا تھے یا بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کا مضمون کیا تھا؟ یہ تفصیل ہمیں احادیث سے ملتی ہے، قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہاں خواتین کو مردوں پر ایک طرح سے فضیلت دی گئی ہے کہ آیت ۱۲ میں ان کی بیعت کے حکم کے ساتھ بیعت کا پورا متن بھی دے دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواتین کو یہ خصوصی انعام ان کے حقوق کے پلڑے کا توازن درست رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط اور حقوق و فرائض کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے متوازن ہیں۔ اگر کسی معاملے میں کوئی ایک حکم زیادہ سخت ہو تو اس کے پہلو میں کہیں کوئی نرم قانون بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر کہیں کسی کے فرائض کا وزن زیادہ ہو رہا ہو تو اس کے حقوق کے پلڑے میں کچھ مزید ڈال کر اس کی میزان کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض ہی کی مثال لے لیں۔ قرآن مجید نے طلاق کا حق صرف خاوند کو دیا ہے، اس کے مقابلے میں بیوی صرف خلع لے سکتی ہے، طلاق نہیں دے سکتی۔ اسی طرح اگر میاں بیوی میں طلاق ہو جائے تو اولاد قانوناً والد کی شمار ہوتی ہے۔ ان دو مثالوں سے خاوند کے حقوق یا اختیارات کا پلڑا غیر معمولی طور پر جھکتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اولاد کے لیے ماں کا حق باپ کے حق کے مقابلے میں تین گنا زیادہ رکھا گیا ہے اور جنت کی بشارت صرف ماں کے قدموں کے حوالے سے دی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے قوانین و ضوابط کو متوازن بناتے ہیں اور ہر کسی کے حقوق و فرائض کی ترازو کے ہر دو پلڑوں کو برابر رکھتے ہیں۔

## آیات ۱۱۰

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَأَمْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ  
بِإِيمَانِهِنَّ ۚ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۚ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ  
وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۚ وَاتَّوهُمُ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكَحُوهُنَّ إِذَا  
أَتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُبْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفِ ۚ وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ  
أَنْفَقُوا ۚ ذَلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۖ يُحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ وَإِنْ فَالَكُمْ شَيْءٌ مِنْ  
أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقِبْتُمْ فَأَتَا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ مِثْلُ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا  
اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝

**آیت ۱۱۰** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَأَمْتَحِنُوهُنَّ﴾ ”اے اہل ایمان! جب تمہارے پاس آئیں مومن خواتین ہجرت کر کے تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔“  
یعنی ہر خاتون سے ضروری حد تک جانچ پڑتال اور تحقیق و تفتیش کر لیا کر کہ آیا واقعی وہ سچی اور مخلص مومنہ ہے۔

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِمْ﴾ ”اللہ تو ان کے ایمان کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔“ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کتنا ایمان ہے اس کا صحیح علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ تم لوگ اپنے طور پر کسی کے ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ لیکن محض ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر مناسب طریقے سے کسی نہ کسی درجے میں ایک اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کیا کرو کہ ہجرت کرنے والی خواتین کیا واقعی مؤمنات ہیں اور کیا واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آئی ہیں۔

﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ﴾ ”پھر اگر تم جان لو کہ وہ واقعی مؤمنات ہیں“  
 ﴿فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ﴾ ”تو انہیں کفار کی طرف مت لوٹاؤ۔“  
 ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ ”نہ اب یہ ان (کافروں) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔“

﴿وَأَتَوْهُمْ مَّا أَنْفَقُوا﴾ ”اور ان (کافروں) کو ادا کر دو جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا۔“  
 یعنی ان کے کافر شوہروں نے ان کو جو مہر دیے تھے وہ انہیں بھجوا دو۔ اگر کسی مشرک کی بیوی مسلمان ہو کر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئی ہے تو اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی ان کے درمیان تعلق زوجیت ختم ہو چکا ہے، لیکن عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی وہ رقم جو وہ شخص اس خاتون کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ادا کر چکا ہے وہ اسے لوٹا دی جائے۔ اس حکم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت کسی حق دار کا حق اس تک پہنچانے کے معاملے کو کس قدر سنجیدگی سے لیتا ہے۔ اور یہ سنجیدگی یا تاکید صرف قانون سازی کی حد تک ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے قرآنی قوانین و احکام کے عین مطابق ایسا نظام عدل و قسط بالفعل قائم کر کے بھی دکھا دیا جس میں حق دار کو تلاش کر کے اس کا حق اس تک پہنچایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شام کے محاذ پر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے وہ میوں کے خلاف یرموک کے میدان میں صدی کی سب سے بڑی جنگ لڑی۔ جنگ یرموک کی تیاری کے دوران ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے تحت کچھ مفتوحہ علاقوں کو خالی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان علاقوں کی عیسائی رعایا سے مسلمان جزیہ وصول کر چکے تھے۔ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے عوض وصول کرتی ہے۔ اسی لیے یہ ٹیکس ادا کرنے والے شہری ذمہ دار کہلاتے ہیں۔ بہر حال مذکورہ علاقوں سے مسلمان وقتی طور پر چونکہ واپس جا رہے تھے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری نبھانے سے قاصر تھے اس لیے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر جزیہ کی تمام رقم متعلقہ افراد کو واپس کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اس عمل نے عیسائیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کے واپس جانے پر وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ یہ ہے اس دین کے نظام عدل و قسط کے تحت حق دار کو اس کا حق پہنچانے کی ایک مثال جس کے ماننے والوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے مہر کی رقم ان کے مشرک شوہروں کو لوٹا دیں۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ﴾ ”اور (اے مسلمانو!) تم پر

کوئی گناہ نہیں اگر تم ان خواتین سے نکاح کر لو جبکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔“

﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفَرِ﴾ ”اور تم کافر خواتین کی ناموس کو اپنے قبضے میں نہ رکھو“

یعنی اگر تم میں سے کچھ لوگوں کی بیویاں ایمان نہیں لائیں اور ابھی تک مکہ ہی میں ہیں تو تم ان کو اپنے نکاح میں روکے نہ رکھو بلکہ انہیں طلاق دے دو اور انہیں بتا دو کہ اب تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

﴿وَأَسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا﴾ ”اور تم مانگ لو وہ مال جو تم نے (بطور مہر) خرچ

کیا ہے، اور وہ (کافر) بھی مانگ لیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے۔“

یعنی جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔

﴿ذَلِكَمُ حُكْمُ اللَّهِ يُحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾ ”یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے مابین فیصلہ کر رہا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ”اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔“

**آیت ۱۱** ﴿وَأَنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ﴾ ”اور اگر تمہاری بیویوں (کے مہر میں) سے کچھ کفار کی طرف رہ جائے“

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مسلمان مرد ہجرت کر کے مدینہ آ گیا اور اس کی مشرکہ بیوی مکہ میں ہی رہ گئی۔ بعد میں اس مسلمان نے اس خاتون کو پیغام بھجوایا کہ میرا تمہارا تعلق زوجیت ختم ہو چکا ہے لہذا تم مہر کی رقم مجھے لوٹا دو۔ اب اگر اس عورت نے مہر کی رقم واپس نہیں کی تو اس مسئلے کا حل بتایا جا رہا ہے کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے۔

﴿فَعَاثِبْتُمْ فَاتُوا الَّذِينَ الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ مِثْلَ مَا أَنْفَقُوا﴾ ”تو جب تمہیں موقع ہاتھ آ جائے تو

جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں انہیں اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے خرچ کی ہے۔“

اگر کسی جنگ سے تمہیں کچھ مال غنیمت ملے تو اس میں سے ان لوگوں کو تلافی کے طور پر کچھ مال دے دو جن کی بیویاں ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کی زوجیت میں نہیں رہیں اور وہ انہیں مہر کی رقم بھی لوٹانے کو تیار نہیں تاکہ اس رقم سے مہر ادا کر کے وہ لوگ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی ان خواتین سے نکاح کر سکیں جن کے مشرک خاوند مکہ میں رہ گئے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ﴾ ”اور اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔“

## آیات ۱۲، ۱۳

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبْعِنَكَ عَلَى أَنْ لَا يَشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهَا بَيْنَ أَيْدِيْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ



وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايَعَهُنَّ وَاسْتَغْفِرَ لَهُنَّ اللَّهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَسُؤُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا بَيَّسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ۝

**آیت ۱۲** ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبَايَعُكَ﴾ ”اے نبی (ﷺ) جب آپ کے پاس آئیں مومن خواتین آپ سے بیعت کرنے کے لیے“

اب آگے بیعت کا وہ متن دیا گیا ہے جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا تھا:

﴿عَلَىٰ أَنْ لَا يُنْشِرَنَّ بِاللَّهِ شَيْئًا﴾ ”اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی“  
﴿وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ﴾ ”اور نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی“

﴿وَلَا يَأْتِينَ بَهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ﴾ ”اور نہ وہ کوئی بہتان باندھیں گی جو ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے مابین سے ہو“

یعنی یہ کہ وہ کسی پر زنا کی تہمت نہیں لگائیں گی، کوئی جنسی سیکنڈل نہیں گھڑیں گی۔ اس تہمت کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت کسی مرد پر الزام لگا دے کہ اُس نے اس کی آبروریزی کی ہے۔ ایسے الزامات انبیاء کرام ﷺ پر بھی لگتے رہے ہیں۔ اس بیعت کی آخری شق یہ ہے کہ:

﴿وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ﴾ ”اور وہ آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی معروف میں“  
﴿فَبَايَعَهُنَّ وَاسْتَغْفِرَ لَهُنَّ اللَّهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ ”تو (اے نبی ﷺ) آپ ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔“

احادیث میں بیعت عقبہ اولیٰ کا جو مضمون ملتا ہے وہ بھی خواتین کی اس بیعت کے مضمون سے ملتا جلتا ہے۔ اسی لیے بیعت عقبہ اولیٰ کو ”بیعت النساء“ بھی کہا جاتا ہے۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے زمانے تک اہل ایمان چونکہ ایک باقاعدہ جماعت کی شکل میں منظم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس بیعت کے مضمون میں جماعتی نظم و ضبط سے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء اپنے عقیدت مندوں سے جو بیعت ارشاد لیتے ہیں اس کا مضمون بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل ہوتا ہے کہ میں شرک نہیں کروں گا، چوری نہیں کروں گا، بدکاری نہیں کروں گا وغیرہ۔ گویا بیعت عقبہ اولیٰ، بیعت خواتین اور بیعت ارشاد تینوں کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ البتہ وہ بیعت جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک جماعت کے طور پر منظم ہوئے وہ بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک متفق علیہ حدیث میں اس بیعت کے مضمون کا پورا متن موجود ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں: (بَايَعَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ) کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے (عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ) اس بات پر کہ ہم آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے (فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ)

اور مشکل میں بھی (وَالْيُسْرُ) اور آسانی میں بھی (وَالْمُسْطُ) اس حالت میں بھی کہ ہماری طبیعتوں میں انشراح ہو کہ ہاں یہ کام واقعی بہت مفید ہے اور درست ہے (وَالْمَكْرَهُ) اور اس حالت میں بھی کہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔ یعنی ہمیں کسی فیصلے سے اتفاق نہ ہو تب بھی ہم آپ کا فیصلہ مانیں گے۔ (وَعَلَى أَكْثَرِ عَلَيْنَا) اور اس کے باوجود کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے۔ یعنی ہمارے مقابلے میں اگر کسی نووارد کو بھی امیر بنادیا جائے گا تب بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ (وَعَلَى أَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ) اور جنہیں آپ ذمہ دار یا امیر بنائیں گے ان سے ہم جھگڑا نہیں کریں گے، بلکہ ان کا ہر حکم مانیں گے۔ (وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ آيَسًا كُنَّا) اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے (لَا نَخَافُ فِيهِ اللَّهَ لَوْ مَنَّا لَانِي) (۱) اور ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف سے اپنی زبان بند نہیں کریں گے۔

بیعت عقبہ ثانی کے اس مضمون کو ہم نے صرف ایک فقرے کے اضافے کے ساتھ تنظیم اسلامی کی بیعت کے لیے اختیار کیا ہے اور وہ اضافی فقرہ یہ ہے: أَبَايَعُ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوفِ کہ میں بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہر وہ حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو! آج ایسی کسی بھی بیعت کے لیے اس فقرے کا اضافہ اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی اطاعت تو مطلق تھی آپ کا تو ہر حکم ہی معروف کے دائرے میں تھا، لیکن آپ کے بعد کسی بھی شخصیت کی مطلق اطاعت پر بیعت کرنا درست نہیں۔ اسی لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ بننے پر صحابہ کرامؓ سے جو بیعت لی وہ بھی مشروط تھی۔ یعنی آپ کی بیعت کرنے والا ہر شخص آپ کا صرف وہی حکم ماننے کا پابند تھا جو قرآن و سنت کے دائرے کے اندر ہو۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے مذکورہ مضمون کا تعلق ایک جماعت اور تنظیم کے نظم و نسق سے ہے۔ چنانچہ اسی بیعت کی بنیاد پر حضور ﷺ نے ایک مضبوط جماعت منظم فرمائی اور مدینہ منورہ میں بارہ نقیب (نوقبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے) مقرر فرما کر اہل ایمان کی جماعت کے ذیلی تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور تمام اہل ایمان مکہ کی حدود میں ہی رہتے تھے۔ مکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور اہل ایمان کے امیر یا سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ خود شہر میں موجود تھے۔ اس لیے کوئی نقیب یا ذیلی امیر مقرر

☆ اطاعت امراء کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَانِي))

”جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی

کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے

میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی۔“ (صحیح البخاری، کتاب

الجهاد والسير، باب يقاتل من وراء الامام ويتقى به۔ وصحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب طاعة

الامراء في غير معصية.....)

(۱) صحيح البخاری، کتاب الاحکام، باب كيف يبایع الامام الناس، و کتاب الفتن، باب قول النبي ﷺ سترون

بعدي امورا تنكرونها۔ وصحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية.....

کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مسلمان مکہ سے دور مدینہ میں بھی موجود تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا تھا اس لیے وہاں حضور ﷺ نے الگ تنظیمی ڈھانچہ تشکیل فرمایا۔

جماعتی زندگی میں عملی جدوجہد کے دوران چونکہ جہاد و قتال کے مراحل بھی آتے ہیں اور ایسے مراحل میں خواتین بالواسطہ طور پر ہی حصہ لیتی ہیں اس لیے حضرت عبادہؓ بن صامت کے روایت کردہ متن کے مطابق خواتین سے بیعت جہاد نہیں لی گئی بلکہ ان سے آیت زیر مطالعہ کے مضمون کے مطابق ہی بیعت لی گئی کہ وہ فلاں فلاں افعال نہیں کریں گی اور حضور ﷺ جو بھی بھلائی کا حکم دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

ہمارے ہاں تنظیم اسلامی میں بھی خواتین سے بیعت کے لیے بعینہ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔ دراصل خواتین کی بیعت سے مقصود یہ نہیں کہ وہ بھی غلبہ دین کی جدوجہد میں مردوں کی طرح عملی کردار ادا کریں یا جہاد و قتال میں حصہ لیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کے حکم کی مصداق بن کر جماعتی زندگی کے فیوض و برکات سے وہ بھی بہرور ہوتی رہیں اور جماعتی زندگی کے لزوم سے متعلق احکامات پر بھی ان کا عمل ہوتا رہے۔ لزوم جماعت کے حوالے سے حضور ﷺ کی درج ذیل احادیث بہت قطعی اور واضح ہیں:

(۱) ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَلِيَاكُمْ وَالْفُرْقَةُ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مِنَ الْإِنْسَانِ أُنْعَدُ))<sup>(۱)</sup>  
 ”تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے اور تم تنہا مت رہو اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے، لیکن اگر دو (مسلمان) ایک ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔“  
 حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(۲) ((بَدَأَ اللَّهُ مَعَ الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شَذَّ إِلَى النَّارِ))<sup>(۲)</sup>

”اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔“  
 جماعتی زندگی کی اہمیت اور ”جماعت“ کے دُسلپن سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی بہت واضح ہے:

إِنَّهُ لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةٌ إِلَّا بِإِمَارَةٍ وَلَا إِمَارَةٌ إِلَّا بِطَاعَةٍ<sup>(۳)</sup>

”یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نہیں ہے بغیر جماعت کے اور کوئی جماعت نہیں ہے بغیر امارت کے اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو۔“

بہر حال جماعت سازی کا مسنون، منصوص اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے، لیکن آج کل اکثر دینی جماعتوں نے یہ مسنون طریقہ ترک کر کے دوسرے طریقے اپنا لیے ہیں۔ اگرچہ رائج الوقت سب طریقے بھی مباح ہیں، لیکن ظاہر ہے مباح اور سنت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس بیعت کے نظام پر رکھی ہے۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اس اہم سنت کو زندہ کرنے

(۱) سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء في لزوم الجماعة۔

(۲) سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء في لزوم الجماعة۔

(۳) سنن الدارمی، المقدمة، باب في ذهاب العلم۔

کی توفیق عطا فرمائی جو آج کل جماعت سازی کے حوالے سے بالکل متروک ہو چکی تھی۔

**آیت ۱۳ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾** ”اے اہل ایمان! ان لوگوں

کے ساتھ دوستی مت کرو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے“

نوٹ کیجیے، جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اختتام پر وہی مضمون دوبارہ آ گیا ہے۔ قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ سے یہودی مراد ہیں اور یہاں اہل ایمان کو واضح طور پر منع کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿قَدْ يَتَّبِعُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَتَّبِعُ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ﴾ ”یہ لوگ آخرت سے

مایوس ہو چکے ہیں جیسے کہ کفار مایوس ہو چکے ہیں اصحاب قبور میں سے۔“

آیت کے اس حصے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبروں میں پڑے ہوئے کفار اپنی نجات سے مایوس ہیں۔ ظاہر ہے مرنے کے بعد کفار پر تمام حقائق منکشف ہو چکے ہیں اور ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انہیں سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مفہوم یوں ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کفار اصحاب القبور کے دوبارہ اٹھنے سے مایوس ہیں۔ یہ دونوں مفہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں اس لیے اس فقرے کے تراجم دونوں طرح سے کیے گئے ہیں۔



آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بھی تو وہ ”آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا“ کے مصداق پہلے سے بڑے ظالم کے پنجے میں جا پھنسے۔ گویا کھجور سے گر کر کسی گہری کھائی میں جا گرے۔ فرانس میں بھوکوں مرتے مظلوم مزدوروں اور کسانوں نے بادشاہوں کی لوٹ کھسوٹ اور عیاشیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور جانوں کی قربانیاں دیں تو اس کا نتیجہ انقلاب فرانس کی صورت میں سامنے آیا۔ اُن گنت قربانیوں اور خوفناک خونریزی کے نتیجے میں نظام تو بدل گیا لیکن عوام الناس کی مصیبتوں اور محرومیوں کا ازالہ نہ ہوسکا۔ کہنے کو تو بادشاہت کی جگہ عوام الناس کی اپنی حکومت (جمہوریت) نے لے لی، لیکن حقیقت میں وہ سرمایہ داروں کی آمریت ہی کا ایک بہرہ دہ تھا۔ چنانچہ ظالمانہ ٹیکسوں کا سلسلہ جمہوری حکومت کے تحت بھی حسب سابق جاری رہا اور مزدور کو اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ ملنے کا خواب اس کی ”اپنی حکومت“ میں بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے اس کی خون پسینے کی کمائی پر بادشاہ اور شہزادے عیش کرتے تھے اب ان کی جگہ کارخانہ دار اور سرمایہ دار اس کا خون نچوڑ نچوڑ کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین کرنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ”خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازِ دِلِ ناب“ کہ سرمایہ دار مزدوروں کی رگوں سے خون نچوڑ کر اپنے لیے سرخ شراب تیار کرتے ہیں۔ دوسری طرف انقلاب روس کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہاں کے عوام بھی زار کے آسنی تختے سے نکل کر یک جماعتی آمریت (one party dictatorship) کے سنہری پنجرے میں آ پھنسے۔ غرض آقا بدلتے رہے، نظاموں کے نام بدلتے رہے، لیکن نہ بدلی تو مزدور کی قسمت نہ بدلی۔ اس طبقے کی محرومیاں جیسی کھل تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں۔ کل مزدور کے بچے تخت شاہی کے سائے تلے بھوکے سوتے تھے اور آج مزدور کے بچے شجر جمہوریت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کو ترستے ہیں۔

در اصل یہ مسئلہ کسی ایک طبقے کا مسئلہ نہیں اور نہ ہی یہ کسی ایک ملک کے مزدوروں اور کسانوں کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی انصاف کا شفاف نظام پوری دنیا کی نہ رت ہے جس کی تلاش میں نسل انسانی صدیوں سے در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُس نے دنیا میں جتنے بھی رسول بھیجے ان سب کا مشن یہی تھا کہ انسانیت کو عدل و قسط کے شفاف نظام کے ثمرات سے بہرہ ور کیا جائے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فلسفہ انقلاب عریاں ترین صورت میں موجود ہے:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحديد: ۲۵)

”ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔“

سورۃ آل عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ وہ قسط (عدل) کو قائم کرنے والا ﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بحیثیت اُمت اس دنیا میں جو کردار ادا کرنے کا فریضہ سونپا وہ بھی بنیادی طور پر یہی ہے کہ وہ یہاں عدل و انصاف قائم کریں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾ (النساء: ۱۳۵) ”اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر۔“ سورۃ المائدہ میں یہی حکم الفاظ کی دوسری ترتیب کے ساتھ اس

طرح آیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدة: ۸) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ!“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ مشن کے ساتھ انبیاء و رسل تو پے درپے آتے رہے اور نسل انسانی تک اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی پہنچاتے رہے، لیکن اس کے باوجود لوگ بار بار گمراہ ہوتے رہے۔ کسی قوم نے جوش عقیدت میں اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا تو کسی نے اپنے پیغمبر کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی، لیکن معاشرے کے اجتماعی نظام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کسی نے نہ کی، تاوقتیکہ اجتماعی عدل و قسط کے قیام کا یہ مشن نبی آخر الزماں ﷺ کو سونپا گیا۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ”رسالت“ کے جس مشن کا ذکر جمع کے صیغہ (لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا) میں آیا ہے، حضور ﷺ کے حوالے سے سورۃ الصف کی اس آیت میں اس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾

(التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

”وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو الہدٰی اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظام زندگی) پر۔“

بہر حال پوری انسانی تاریخ میں یہ اعزاز صرف اللہ کے آخری رسول حضرت محمد عربی ﷺ کو حاصل ہوا کہ آپ ﷺ نے عرب معاشرے سے ظالمانہ نظام کی تیج کٹی کر کے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام عدل و قسط بالفعل قائم کر دیا۔ گویا آپ ﷺ نے تمام انبیاء و رسل ﷺ کے اس مشن کی تکمیل فرمادی جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں آیا ہے اور اسی لیے آپ رسول کامل ہیں۔ حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پوری دنیا کے حوالے سے نظام عدل و قسط کے قیام کا یہ مشن اب آپ کی امت کو منتقل ہو چکا ہے، جس کے لیے امت کو منظم اور مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔

سورۃ الصف اپنے موضوع کے اعتبار سے اس قدر جامع اور پُر تاثیر سورت ہے کہ اگر کسی بندہ مسلمان کو یہ ایک سورت بھی سمجھ میں آ جائے تو اس کے لیے زندگی کا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاد و قتال کے حوالے سے اس سورت کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اسوۂ رسول اور منہج نبوی کا اتباع ضروری ہے۔ اگر کوئی جماعت منہج نبوی کی ترتیب کو پیش نظر رکھے بغیر جوش جہاد میں ہتھیار اٹھا کر میدان میں کود پڑے گی تو اس کا یہ عمل خودکشی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ منہج نبوی سے راہنمائی لیتے ہوئے اس کٹھن راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مرحلہ وار آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے مرحلے میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے ”مردانِ کار“ کو جمع کرنا ہوگا۔ ایسے مردانِ کار جو اللہ کی محبت کے مقابلے میں دنیوی محبتوں کو چھوڑ کر کے واقعتاً آخرت کے طالب بن چکے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ایک ایک لفظ ان کی رگوں کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہو: ﴿فَمَا أَوْرِثْتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ (الشوریٰ)

”پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور

باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ پھر ان مردانِ کار کا تربیت کے ضروری مراحل سے گزرنا اور اپنے لیڈر کے ساتھ سمع و طاعت کے سخت ڈسپلن کے تحت مربوط ہونا بھی ضروری ہے۔ بہر حال جب مذکورہ صفات کے حامل افراد اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں اور تربیت و تنظیم کے ضروری مراحل بھی طے کر چکیں تب ان کے امیر یا لیڈر کو حالات و ماحول کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اقدام کے مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

مختصر آویں سمجھیں کہ منہج انقلابِ نبویؐ کے بنیادی مراحل دو ہیں، یعنی تیاری کا مرحلہ اور تصادم یا ٹکراؤ کا مرحلہ۔ میں نے اپنی کتاب ”منہج انقلابِ نبویؐ“ میں پہلے مرحلے کو منہج انقلابِ نبویؐ کا ”اساسی منہاج“ جبکہ دوسرے مرحلے کو ”تکمیلی منہاج“ کا نام دیا ہے اور ظاہر ہے اس پورے منہاج کا مرکز و محور تو قرآن ہی ہے۔ علامہ اقبال نے انقلابِ اسلامی کے ان دو مراحل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے:-

با نشء درویشی در ساز و دمام زن چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!  
جبکہ اکبر الہ آبادی نے ان دو مراحل کی ترتیب کا فلسفہ بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ان دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے:-

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!  
گویا بدر کے میدان میں اہل ایمان نے جو کامیاب معرکہ لڑا اس کی تیاری کا آغاز بہت پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں فردِ واحد کی سوچ بچار سے ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے مکہ کی گلیوں میں دعوت و تبلیغ کی صبر آزمائشیں تنہا شروع کی۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والے ”مردانِ کار“ نے آپ ﷺ کی نگرانی و راہنمائی میں ۱۴ سال تک تزکیہ و تعلیم، ذہنی و نفسیاتی تربیت، سخت سے سخت جسمانی تشدد کی برداشت، ہر صورت میں ہاتھ بندھے رکھنے کی مشق اور ایسے کئی جاں گداز مراحل کا میابی سے طے کیے تو تب کہیں جا کر وہ تصادم کے مرحلے میں قدم رکھنے اور بدر و جحش جیسے معرکے سر کرنے کے قابل ہوئے۔ آج ہمیں بھی غلبہ دین کی جدوجہد کے دوران حضور ﷺ کے اسی منہج کی پیروی کا اہتمام کرنا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیاتِ اتمہ

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهِ صَفًا كَاَنَّهُمْ يُنْفِیْنَ مُرْصُوْصًا ۝

**آیت ۱** ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اور وہ بہت زبردست ہے، کمال حکمت والا۔“

**آیت ۲** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ﴾ ”اے مسلمانو! تم کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟“

اس آیت میں زجر و تنبیہ اور جھنجھوزنے کا وہی انداز پایا جاتا ہے جو اس سے قبل ہم سورۃ الحدید میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ یہ اسلوب زیر مطالعہ مدنی سورتوں میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ قبل ازیں سورۃ الحدید کے تمہیدی کلمات میں اس اسلوب کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان سورتوں کے زمانہ نزول (۵ ہجری کے بعد) تک پرانے مسلمانوں کی نسبت نو مسلموں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ ایمان کی گہرائی اور جذبہ ایثار و قربانی کے حوالے سے نو وارد مسلمانوں کی کیفیت چونکہ ”السابقون الاولون“ اور ابتدائی دور کے اہل ایمان کی سی نہیں تھی اس لیے مسلمانوں کے ایمان و عمل کے اجتماعی معیار کے اوسط میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی اور اسی وجہ سے انہیں اس انداز میں جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ ہر زمانے کے لوگوں سے مخاطب ہے اس لیے اس آیت کو پڑھتے ہوئے یوں سمجھیں کہ آج یہ ہم سے سوال کر رہی ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ تم اللہ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے ہو اور دن رات اُس کے احکام کو پاؤں تلے روندتے بھی رہتے ہو! تم رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عشق و محبت کے دعوے بھی کرتے ہو لیکن جب عمل کے میدان میں آتے ہو تو آپ کی سنتوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہو! ذرا تصور کیجیے! آج اگر اللہ کا کلام نازل ہو تو ہمارے ایمان ہمارے کردار اور ہمارے عمل پر کیا کیا تبصرہ کرے! اور اگر آج حضور ﷺ خود تشریف لا کر اپنی امت کی حالت دیکھ لیں تو کیسا محسوس کریں!

**آیت ۳** ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ﴾ ”بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کجوجو تم کرتے نہیں۔“

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اس سے بڑی ڈانٹ اور گرفت اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اس ڈانٹ اور اظہار بیزاری کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور محبت کا معیار بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کو کیسے لوگ پسند ہیں اور یہ کہ وہ کیسے لوگوں سے محبت کرتا ہے تو سنو!

**آیت ۴** ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُمْ بَنِيَّاءُ مَرَصُوعًا ۚ﴾ ”اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔“

آج کے زمانے میں ”بنیان مرصوص“ reinforced concrete wall کو کہا جائے گا۔ ایسی دیواریں بڑے بڑے dams کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ البتہ پرانے زمانے میں اگر کسی دیوار کو غیر معمولی طور پر مضبوط کرنا مقصود ہوتا تو چٹائی کرنے کے بعد اس کے اندر پگھلا ہوا تانبا ڈالا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عام طور پر ”بنیان مرصوص“ کا ترجمہ ”سیسہ پلائی ہوئی دیوار“ کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس طریقہ سے ”سیسہ پلائی ہوئی دیوار“ بنانے کا تصور سورۃ الکہف کی آیت ۹۶ میں بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین بادشاہ نے یا جوج ماجوج کے حملوں سے حفاظت کے لیے لوہے کے تختوں کی مدد سے دیوار کھڑی کرنے کے بعد حکم دیا



تھا: ﴿اَتُوْنِیْ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قَطْرًاۙ﴾ ”اب لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں“۔ بہر حال یہاں ”مباحثہ مرصوص“ سے مراد میدان جنگ میں مجاہدین کی ایسی صفیں ہیں جن میں کوئی رخنہ یا خلا نہ ہو اور ایک ایک مجاہد اپنی جگہ پر اس قدر مضبوطی سے کھڑا ہو کہ دشمن کے لیے صف کے کسی ایک حصے کو بھی دھکیلنا ممکن نہ ہو۔

یہاں ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ نماز کے لیے ہماری صف بندی کی بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ ایک صف کے تمام نمازیوں کو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا چاہیے اور ان کے پیروں کے محاذات بھی ایک ہونے چاہئیں، یعنی تمام لوگوں کے پاؤں ایک سیدھ میں ہوں تاکہ صف سیدھی رہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جماعت کی صف میں دو نمازیوں کے درمیان خلا کی جگہ سے شیطان گزر جاتا ہے۔ جماعت کے لیے صف بندی کا اہتمام کرنا دراصل امام کی ذمہ داری ہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ائمہ مساجد اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔ البتہ اس ضمن میں ضرورت سے زیادہ شدت بھی مناسب نہیں، جیسے بعض لوگ غیر معمولی طور پر ناگئیں پھیلا کر دوسرے نمازی کے پاؤں پر اپنا پاؤں چڑھا دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بنتے ہیں۔

بہر حال ہمارے لیے اس آیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ”قال فی سبیل اللہ“ ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں سب سے اعلیٰ خیر یا نیکی کو summum bonum کہتے ہیں۔ ہر فلسفہ اخلاق میں ایک ”خیر اعلیٰ“ (summum bonum) یا بلند ترین نیکی (highest virtue) کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اصل پیغام کو اگر فلسفہ کی زبان میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ اسلام کے نظام فکر اور اس کے نظریہ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا ”خیر اعلیٰ“ (summum bonum) قال فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہو اسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنی جان اس کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ جو شخص اس قربانی کے لیے تیار نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت و قربت کا دعویٰ بھی نہ کرے۔ بقول غالب ع ”جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!“

یہاں سورت کے پہلے حصے کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ اب آئندہ چار آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا تھا۔ یہود کی تاریخ کے حوالے سے دراصل مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلو تہی ہی وہ اصل جرم تھا جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر اب تم فائز کیے گئے ہو۔

## آیات ۵ تا ۸

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ لِمَ تُوَدُّونَنِي وَكُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ إِنَّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَبَنِيَّ اسْمِعُوا لِي ۖ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا

رَسُولٌ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝  
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَى إِلَى الْإِسْلَامِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝  
يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَقْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

**آیت ۵** ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ لِمَ تُؤْذُونَنِي﴾ ”اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا دے رہے ہو؟“

یہ جس ایذا کا ذکر ہے وہ ذاتی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل بھی آخرا انسان تھے اور طبع بشری کے تحت ہر طرح کی تکلیف کو محسوس بھی کرتے تھے۔ جیسے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک تکلیف دہ معاملے کا ذکر آیا ہے یا جیسے خود حضور ﷺ کو مشرکین مکہ کی طرف سے بھی ذاتی نوعیت کی تکالیف پہنچائی جاتی رہیں اور منافقین کے طرزِ عمل سے بھی شدید ذہنی و قلبی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بنی اسرائیل کی طرف سے اصل اور سب سے بڑی ایذا وہ تھی جو حکم جہاد سے ان کے انکار کی وجہ سے آپ کو پہنچی تھی۔ اپنی قوم کے اس انکار کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی تھی اس کے ایک ایک لفظ میں شدتِ تکلیف کے احساسات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں آپ کی دعا کے یہ الفاظ:

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرِقْ بَيْنَنَا وَقَوْمَ الْمُسْرِقِينَ ۝﴾ (المائدہ)

”موسیٰ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارون کی جان) کے تو اب تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔“

﴿وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ﴾ ”جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔“

میرے نزدیک یہاں لفظ ”رسول“ نبی کے معنی میں آیا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی طرف ”نبی“ کی حیثیت سے تھی، بطور ”رسول“ نہیں تھی۔ جبکہ قوم فرعون کی طرف آپ بحیثیت ”رسول“ مبعوث ہوئے تھے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (الزخرف)

”اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰ کو اپنی نشانہوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف تو اس نے کہا کہ (دیکھو) میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔“

کسی قوم کی طرف ”رسول“ کی بعثت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہمیشہ یہ رہا ہے کہ متعلقہ قوم پر اپنے رسول کی فرمانبرداری لازم ہوتی تھی۔ چنانچہ جو قوم اپنے رسول کی دعوت کو رد کرتی تھی اسے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا اطلاق بنی اسرائیل پر نہیں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے درپے نافرمانی کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف قوم فرعون آپ کی نافرمانی کی وجہ سے

ہلاک کر دی گئی۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت نبی کی تھی جبکہ آل فرعون کی طرف آپ ”رسول“ مبعوث ہو کر آئے تھے۔

﴿قَلَمًا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۖ﴾ ”پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔“

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں لوگوں کی ہدایت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ایک بنیادی اصول اور قانون بیان ہوا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی ان آیات کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو گمراہ کرنے یا ان کے دلوں پر مہر کر دینے کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہدایت کے راستے کو پہچان لینے کے بعد بھی اسے اختیار نہ کرے بلکہ گمراہی کی روش پر ہی چلتے رہے تو ترجیح دے، پھر وہ اس راستے پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت کی حدود پھلانگ کر ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ ہو (point of no return) تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے، یعنی بندہ جب سمجھتے بوجھتے ہوئے ٹیڑھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کا دل ہمیشہ کے لیے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذلك!)

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝﴾ ”اور اللہ فاسقوں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔“

**آیت ۶** ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ﴾ ”اور یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف“

اس آیت میں بنی اسرائیل کے دوسرے دور کا ذکر ہے جب ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول بن کر آئے۔ بحیثیت رسول آپ کی بعثت کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت ۴۹ کے الفاظ ﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ﴾ میں آیا ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ﴾ ”میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اُس کی جو میرے سامنے موجود ہے تو رات میں سے“

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ ”اور بشارت دیتا ہوا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے، ان کا نام احمد (مُتَّبِعِي) ہوگا۔“

﴿قَلَمًا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝﴾ ”پھر جب وہ (عیسیٰ) آئے ان کے پاس واضح نشانوں کے ساتھ تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔“

اس کے بعد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ بنی اسرائیل کا تیسرا دور شروع ہوا۔ حضور ﷺ کی رسالت کے بعد بنی اسرائیل کو واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿عَلَيْكُمْ وَلَكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عَذَبْتُمْ عَذَابًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸) ”ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی

کچھ کریں گے۔ یعنی اے بنی اسرائیل! تم ہمارے لاڈلے تھے، ہم نے تمہیں خود برگزیدہ کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمِ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ۝۳۱﴾ (الدخان) مگر تم نے اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو رائدہ درگاہ بنالیا۔ بہر حال ہماری رحمت اور محبت کے دروازے اب بھی تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اگر تم لوگ توبہ کر کے اپنی روش درست کر لو تو ہم اب بھی تمہیں اپنی آغوش رحمت میں لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس کے لیے تمہیں خود کو محمد رسول اللہ (ﷺ) کے قدموں میں ڈالنا ہوگا اور قرآن کو اپنا راہبر ماننا ہوگا: ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ یَهْدِیْ لِلْیُسْرِ ۖ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَسِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُونَ الصَّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ۝۳۲﴾ (بنی اسرائیل) ”یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے اور بشارت دیتا ہے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔“

تم پرواضح ہونا چاہیے کہ اب ہمارے قصر رحمت کا شاہدہ قرآن ہے۔ اگر تم ہماری رحمت کی پناہ میں آنا چاہتے ہو تو تمہیں اسی شاہدہ کی راہ سے گزر کر آنا ہوگا۔ لیکن اگر تم نے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کی، اپنی نافرمانیاں اسی طرح جاری رکھیں تو پھر ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ ہوتا رہا ہے: ﴿وَإِن عُدْتُمْ عَدُوًّا ۖ﴾ جیسے ماضی میں ہمارے حکم پر تم لوگ بخت نصر (Nebukadnezar) یونانیوں، شامیوں، رومیوں، وغیرہ کے ہاتھوں بار بار نشانِ عبرت بننے رہے ہو ویسے ہی ایک مرتبہ پھر ہم تمہیں تمہاری بد اعمالیوں کی سزا دلوائیں گے۔ (بیسویں صدی میں نازیوں کے ہاتھوں یہود کا جو انجام ہوا وہ بھی عبرت انگیز ہے۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ ”ہولوکاسٹ“ میں ۶۰ لاکھ افراد مارے گئے۔)

**آیت ۷** ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ﴾ ”اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تراشے“

﴿وَهُوَ یُدْعٰی اِلَی الْاِسْلَامِ﴾ ”وہ آں حالیکہ اسے بلایا جا رہا ہو اسلام کی طرف!“  
یعنی اب اللہ کے آخری رسول ﷺ تم لوگوں کو دعوتِ ایمان و اسلام دے رہے ہیں اور تم لوگ اس دعوت پر لپک کہنے کے بجائے ان کی نبوت و رسالت اور قرآن کے بارے میں اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظَّٰلِمِیْنَ ۝۳۳﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔“  
اب اگلی آیت میں یہودیوں کی ان کوششوں اور سازشوں کا ذکر ہے جو انہوں نے حضور ﷺ اور قرآن کے خلاف شروع کر رکھی تھیں۔ یہ آیت زیرِ مطالعہ مضمون کے کلائمکس کا درجہ رکھتی ہے:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ ”وہ ٹٹلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا کر رہیں گے“

﴿وَاللّٰهُ مِنْهُمْ نُوْرٌہٗ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ ۝۳۴﴾ ”اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا“ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“

یہ آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ سورۃ التوبہ میں اس طرح آئی ہے:

﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَا أَن يُوَسِّمَ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾<sup>۱</sup>  
 ”یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔“

اللہ کے نور کو منہ کی پھونکوں سے بجھانے کے استعارے میں یہودی مدینہ کی ان بودی کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضور ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اُس وقت کر رہے تھے۔ یعنی وہ سامنے آکر براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے، افواہیں اڑاتے، درپردہ سازشوں کے جال بنتے رہتے، کبھی قریش کے پاس جاتے کہ تم مدینہ پر حملہ کرو اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کو سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کے خلاف ابھارتے۔ سورۃ الاحشر میں ان کی بزدلی اور اندرونی کمزوری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا اِلَّا فِي قَوْمٍ مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ﴾ (آیت ۱۲) کہ یہ لوگ کھلے میدان میں اکٹھے ہو کر تمہارا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، ہاں چھپ چھپا کر دیواروں کی اوٹ سے وہ تم پر ضرور وار کریں گے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس آیت کے مضمون کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں یوں کی ہے:-

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

یہاں یہ اصولی نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس آیت اور اس مضمون کی حامل قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مفہوم کا دائرہ صرف حضور ﷺ کے زمانے کے یہودیوں اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ان میں تا قیام قیامت ہر زمانے کے یہودیوں اور ان کی ان سازشوں کا ذکر ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ موجودہ دور میں اگرچہ یہ لوگ پوری عیسائی دنیا کو اپنی مٹھی میں لے کر عالم اسلام کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں، مگر قرآن بتاتے ہیں کہ ان کے فیصلے کا وقت اب قریب آگیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ کے مطابق اللہ کے نور کا اتمام یعنی روئے ارضی پر دین اسلام کا غلبہ تو ایک طے شدہ امر ہے۔ اس کے لیے قیامت سے پہلے دنیا کو ایک انتہائی خوفناک جنگ کا سامنا کرنا ہے۔ اس جنگ میں یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ احادیث میں اس جنگ کو الْمَلْحَمَةُ الْعُظْمَىٰ کا نام دیا گیا ہے جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی اصطلاح میں اسے ”ہرمجدون“ (Armageddon) کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں یہودی مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائیں گے اور اسلام واحد طاقت کے طور پر پوری دنیا پر غالب آجائے گا۔ یہ ہے آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ کے مفہوم کا خلاصہ جس کی تفصیل ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔

## آیات ۹ تا ۱۲

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۝ تَوْفِئُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٌ طَيِّبٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۚ

یہاں سے اس سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ آیت ۹ میں حضور ﷺ کی بعثت کا ذکر ہوا ہے:

**آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾** ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظام زندگی پر“

حضور ﷺ کے مقصد بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ التوبہ آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے۔ تمام انبیاء و رسل ﷺ کے لیے قرآن مجید میں بشیر، نذیر، مذکر، شاہد، معلم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں، لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔ الہدیٰ سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپ ﷺ پر کامل ہو گیا، جبکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضور ﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر ”دین الحق“ یعنی سچے اور عادلانہ نظام زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظام عدل و قسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے۔ یہ تھا حضور ﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپ ہمارے سپرد فرما گئے تھے۔ لیکن ہم نے تو اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔ ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال و حرام طریقے سے جیسے بھی ہو، دولت اکٹھی کر دو، پھر اسی دولت سے صدقہ و قربانی دو، حج کر دو اور رمضان میں ہر سال عمرے کے لیے چلے جایا کر دو۔ ہمارا سارا زور rituals پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے ہماری بلا سے! تصور کریں! اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ مگر افسوس! صد افسوس!۔

رہ گئی رسم ازاں روح بلائی نہ رہی      فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی!

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ ﴿۵﴾ ”اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!“

ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو، نظام تو حید کا نفاذ ہو اور اللہ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔ یہاں پر مُشْرِکُوْنَ کا لفظ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ اس سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے، بلکہ سب سے بڑے مشرک تو وہ ہیں جو دنیا میں خدا کی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں، جو نمرود اور فرعون کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: ﴿أَلَيْسَ لِي مَلِكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي﴾ (الزخرف: ۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا انہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ تو فرعون کے اس دعوے اور ”عوام کی حاکمیت“ کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی ناکہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ کے نظام عدل و قسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو ”اپنی حاکمیت“ کے یہ دعوے دار خرم ٹھوہک کر آپ کے مقابلے میں آکھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے موقف پر قائم رہیں گے تو ان

سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور آپ کو مال و جان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔ چنانچہ اب اگلی آیات میں اسی صورت حال کا ذکر کیا جا رہا ہے:

**آیت ۱۰ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾** ”اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلادے؟“

**آیت ۱۱ ﴿تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ﴾** ”(وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔“ یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایسے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت بھی اسی مفہوم میں اہل ایمان کو ایمان لانے کا حکم دے رہی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (آیت ۱۳۶) ”اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر۔“ گویا یہ ایمان کے دعوے داروں کے لیے ایسا مؤمن بننے کی دعوت ہے جو سورۃ الحجرات کی اس آیت کے معیار پر پورے اترتے ہوں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (آیت ۱۵) ”مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسول پر پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔“

**﴿ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾** ”یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔“

**آیت ۱۲ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾** ”وہ تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی“

**﴿وَمَسْكَنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾** ”اور بہت پاکیزہ مسکن عطا کرے گا رہنے کے باغات میں۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔“

اصل اور سب سے بڑی فوز و فلاح اور کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ ایک بندہ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کی کامیابیوں سے بے نیاز ہو کر اسی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے۔ حتیٰ کہ غلبہ دین یا اقامت دین کے لیے جدوجہد کا نصب العین بنی آخرت کی کامیابی ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس جدوجہد میں دنیوی کامیابی پر نظر رکھیں گے تو اپنی کوششوں کو کامیاب نہ ہوتے دیکھ کر یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے یا لٹے سیدھے طریقے سے (by hook or by crook) مثبت نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نتائج کو منزل سمجھ لینے کی وجہ سے اس راہ کی بڑی بڑی تحریکیں یا تو مایوسی کے قبرستان میں دفن ہو گئیں یا شارٹ کٹ لگانے کی کوشش میں غلط موڑ مڑ کر اصل راستہ ہی گم کر بیٹھیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد کے دوران ہمیں صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی پر نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی کامیابی یا ناکامی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم صرف کوشش کرنے کے مکلف ہیں اس کوشش کو کامیابی

سے ہمنگر کرنے کے ہم مکلف نہیں۔ ہاں اپنی جدوجہد کے طریق کار پر حالات و ماحول کے مطابق نظر ثانی ضرور کرتے رہنا چاہیے، لیکن بنیادی طور پر ہمارا طریقہ اور راستہ وہی رہنا چاہیے جو منج نبویؐ سے ماخوذ ہو۔ یہ منج حضور ﷺ کے توسط سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَاہٌ﴾ (المائدہ: ۴۸) ”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل طے کر دی ہے۔“ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ ہم اقامت دین کی جدوجہد کی راہیں متعین کرتے ہوئے روشنی اور راہنمائی منج محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہی حاصل کریں۔

## آیات ۱۳، ۱۴

وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۖ وَبَشِيرٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ يَٰ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِّلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ فَأَمْنَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ ۚ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ۝

اب اگلی آیت میں اس ”بونس“ کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی عطا کر دیتا ہے، چنانچہ فرمایا:

**آیت ۱۳** ﴿وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا﴾ ”اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔“

یعنی اس جہاد میں تمہیں دنیا کی کامیابی بھی مل سکتی ہے۔ اگرچہ تمہاری یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر اہم نہیں جس قدر تم اسے اہم سمجھتے ہو۔ وہ غلبہ دین کے لیے تمہاری کوششوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو آن واحد میں دین کو غالب کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو چیز اہم ہے وہ تمہاری جدوجہد اور اس جدوجہد میں تمہارا جذبہ ایثار و خلوص ہے اور یہی تمہارا اصل امتحان ہے۔ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہو تو اللہ کے ہاں کامیاب ہو چاہے دنیوی لحاظ سے تم ناکام ہی رہو۔ لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ بر بنائے طبع بشری تم لوگ اپنی اس جدوجہد کے ثبوت نتائج اس دنیا میں بھی دیکھنا چاہتے ہو اور دنیوی فتح حاصل ہونے پر تم لوگ بہت خوش ہوتے ہو اس لیے اللہ تعالیٰ تمہاری خوشی کے لیے وہ بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ ”اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔“

بس اب اللہ تعالیٰ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے اور دنیوی فتح بھی تمہارے قدم چومنے ہی والی ہے۔ یہ کس مدد اور کونسی فتح کی بشارت ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے غزوہ احزاب کے حالات و واقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ سورۃ الصف کی حیثیت سورۃ الاحزاب کے ضمیمے کی سی ہے۔

﴿وَبَشِيرٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ ”اور (اے نبی ﷺ) آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔“

غزوہ احزاب کے بعد حضور ﷺ نے صحابہؓ کو یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی تھی: ﴿لَنْ تَغْزَوْكُمْ قَوْمٌ﴾



بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُغْزَوْنَهُمْ) (تفسیر ابن کثیر: ۳۹۶/۶) کہ اب اس سال کے بعد قریش تم پر کبھی چڑھائی نہیں کر سکیں گے، بلکہ آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا، کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے، اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اگلے سال ۶ ہجری میں حضور ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کی نیت سے مکہ کا سفر اختیار فرمایا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کے مابین حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ طے پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاہدے کو فتح مبین قرار دیا: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۝١﴾ (الفتح) ”یقیناً ہم نے آپ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔“

دوسری طرف اس بشارت کا تعلق آخرت سے بھی ہے کہ اپنے مال و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کے نتیجے میں مؤمنین صادقین کو جنت کی نعمتیں بھی ملیں گی اور اللہ کے ہاں انہیں ایک خاص مقام بھی عطا ہوگا۔ اور وہ ہوگا اللہ کے مددگار ہونے کا مقام!

یہاں یہ بات خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ ان آیات میں عذاب الیم سے چھٹکارے کو ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ آیت ۱۰ میں یہ بات جس دو ٹوک انداز میں واضح کی گئی ہے اسے فزیالوجی کی زبان میں ”All or none Law“ کہتے ہیں۔ یعنی ایسی صورت حال جس میں کوئی چیز واقع ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور اگر نہیں واقع ہوتی تو بالکل نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ یا تناسب ممکن نہیں ہوتا۔ ہمارے ارادی عضلات (voluntary muscles) کے سکڑنے کا معاملہ ایسا ہی ہے، اگر محرک (stimulus) پورا مل جاتا ہے تو متعلقہ muscle کی پوری contraction ہوتی ہے اور اگر stimulus کم ہوتا ہے تو contraction بالکل نہیں ہوتی۔ اس مفہوم میں آیت ۱۰ تا ۱۳ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں گے ان کے سب گناہ بھی معاف ہو جائیں گے (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے ایمان و عمل کو درجہ قبولیت مل جائے)، انہیں عذاب الیم سے چھٹکارا بھی ملے گا اور جنت عدن میں ٹھکانہ بھی نصیب ہوگا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ دنیا میں انہیں اللہ کی مدد سے فتح بھی ملے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مددگار قرار پائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم لوگ ایمان کے دعوے تو بہت کریں اور اللہ و رسول سے محبت کے نعرے بھی لگائیں، لیکن مذکورہ دو شرائط (ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) پوری کرنے میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا وہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری کو دعوت دینے کے مترادف ہے: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٥﴾ (الصف) ”بڑی شدید بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں۔“ چنانچہ جو لوگ مذکورہ شرائط کا حق ادا کیے بغیر ہی سمجھتے ہیں کہ وہ آخرت میں نجات پا جائیں گے وہ ایک خود ساختہ خیال کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی سوچ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آیات کے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی یہ معاذ اللہ، کلام مہمل ہے۔

اس سورہ مبارکہ کی آخری آیت ایک طویل آیت ہے اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلہ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

**آیت ۱۳** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ﴾ ”اے اہل ایمان! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ“

اللہ کے مددگار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے دین کا جھنڈا سر بلند کرنے پر کمر بستہ ہو جاؤ۔ اور اگر تم اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کرو گے تو تم محمد عربی ﷺ کے مددگار بھی بن جاؤ گے، کیونکہ غلبہ دین کا یہ مشن اصل میں تو اللہ کے رسول ﷺ کا مشن ہے۔ تو اے اہل ایمان! آؤ آگے بڑھو! اللہ کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ! جان و مال کا سرمایہ لگاؤ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مددگاروں میں اپنا نام لکھوا لو۔

﴿كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ﴾ ”جیسے کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے“

﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟﴾ ”کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟“

یعنی کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟ مدد مجھے دے کر رہے، لیکن مشن اللہ کا ہے۔ اس فقرے میں وہی دوستیں نظر آ رہی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفتح کی اس آیت میں حضور ﷺ کی بیعت کے حوالے سے آیا ہے: ﴿لَا الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (آیت ۱۰)۔ یعنی بیعت حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے لیکن سودا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ گویا عملی طور پر اس بیعت میں دو کے بجائے تین ہاتھ ہیں: بیعت کرنے والے کا ہاتھ، حضور ﷺ کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔ چنانچہ اللہ کی مدد کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آپ اس ”بندے“ کی مدد کریں جو اللہ کے مشن کو لے کر اس کے راستے پر نکلا ہو۔ اسی فلسفے کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی مدد کے لیے آپ کی آواز پر لبیک کہا تھا اور اسی جذبے کے ساتھ حضور ﷺ کے صحابہؓ نے اپنا سب کچھ آپ کے قدموں میں نچھاور کر کے ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ (الفصح: ۲۹) کی فہرست میں اپنے نام لکھوائے تھے۔ چنانچہ آج بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے اللہ کا کوئی بندہ خود کو اس مشن کے لیے وقف کر کے ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟﴾ کی صدا بلند کرے کہ اے اللہ کے بندو! میں نے تو یکسو ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ مجھے تو اب اس راستے پر چلنا ہی چلنا ہے۔ کوئی ساتھی ملے گا تب بھی چلوں گا اور اگر کوئی ساتھی نہیں ملے گا تب بھی چلوں گا۔ تو آؤ آگے بڑھو اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اللہ کے مددگار بن جاؤ!

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ ”حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!“

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مددگار بن گئے۔ بنیادی طور پر اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خلوص و ایثار کا ذکر ہے کہ انہوں نے ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟﴾ کی دعوت پر بلا تامل خود کو پیش کر دیا۔

﴿فَامْتَنَّا طَائِفَةً مِنْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ﴾ ”تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ (حضرت مسیح علیہ السلام پر) ایمان لے آیا اور دوسرا گروہ کفر پر اُتر رہا۔“

﴿فَايْتَدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ﴾ ”تو ہم نے مدد کی اُن کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے خلاف“

﴿فَاصْبَحُوا ظَاهِرِينَ﴾ (۱۶) ”تو (بالآخر) وہی غالب ہوئے۔“

اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو یہ کامیابی آسانی سے نہیں ملی تھی اس کے لیے ان لوگوں کو تین سو سال تک جاں گداز جدوجہد کرنی پڑی اور بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ (اس کے مقابل حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کی ابتلاء و آزمائش کا دورانیہ چند سال کے عرصے میں سمٹ گیا تھا۔) بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے طویل عرصے تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے مخالفین کی طرف سے تکلیفیں اور سختیاں برداشت کی ہیں اس کی کوئی مثال کسی اور نبی یا رسول کے پیروکاروں میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں ان کی آزمائشوں اور قربانیوں کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورہ النہم کے آغاز میں جن تین رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ یعنی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ (رسول کے رسول) تھے۔ اسی طرح سورہ البروج میں جن اہل ایمان کا واقعہ بیان ہوا ہے وہ بھی عیسائی تھے اور انہیں بادشاہ وقت 'ابونواس' نے خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اصحاب الکہف جو رومی بادشاہ کے تشدد کے خوف سے غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ بھی عیسائی تھے۔ بہر حال حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کی تین صدیوں پر محیط لازوال قربانیوں کے بعد بالآخر ۳۰۰ عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی۔ آیت میں اسی نلبے کا ذکر ہے۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار جب گمراہ ہونے پر آئے تو انہوں نے شرک بھی بدترین ایجاد کیا۔ یعنی انہوں نے اپنے پیغمبر کو بر بنائے عقیدت اللہ کا صلیبی بیٹا بنا ڈالا (نعوذ باللہ)۔ اس ضمن میں آج ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض نعت خواں حضرات حضور ﷺ سے عقیدت اور عشق و محبت کے نام پر اتنا غلو کرتے ہیں کہ آپ کو اللہ کے برابر بٹھانے سے کم پر ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی حضور ﷺ کے لیے "اوتار" کا عقیدہ بھی گھڑ لیا ہے۔ عبرت کے لیے ملاحظہ ہوں یہ اشعار:۔  
وہی جو مستویٰ عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر!

اور:۔

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر بغیر عین کا ایک عرب ہم نے دیکھا!

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۱) کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف یہود و نصاریٰ کے لیے ہی نہیں تھا ہمارے لیے بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا اور ہر اس گناہ اور جرم میں بے دھڑک اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی جس کا ارتکاب کر کے پچھلی اُمّتیں راندہ درگاہ ہوئی تھیں۔ سوائے اس کے کہ قرآن کے متن میں ہم تحریف نہیں کر سکے اور وہ بھی اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ ورنہ اگر ممکن ہوتا تو اس میدان میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہتے۔



# سُورَةُ الْجُمُعَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا آپس میں جوڑے اور زوجیت کا تعلق بہت نمایاں ہے اس لیے کہ یہ دونوں سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی تقسیم اس طرح ہے کہ سورۃ الصف میں انقلاب کے تکمیلی منہاج (مرحلہ تصادم) جبکہ سورۃ الجمعہ میں اساسی منہاج (مرحلہ تیاری) کا ذکر ہے۔ سورۃ الصف کا مرکزی مضمون نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہے جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصد بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ الجمعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چار آیات میں قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور مردان کار کی تیاری کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چار آیات میں بنی اسرائیل کے تذکرے کے پردے میں ہمارے لیے عبرت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ جبکہ آخری تین آیات میں نماز جمعہ کا فلسفہ زیر بحث آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## آیات ۱ تا ۴

يَسْمِعُ اللّٰهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكُ الْقَدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمَمِ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ اٰتِیْہٖ وَيُزَكِّيْہُمْ وَيُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۚ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَاٰخِرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِہُمْ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِیْمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُوْنِیْہٖ مِّنْ شِیْءٍ ۖ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝

**آیت ۱** ﴿يَسْمِعُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكُ الْقَدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾  
 ”سبح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جو بادشاہ ہے (ہر عیب سے) پاک ہے بہت زبردست ہے بہت حکمت والا ہے۔“

یہ آیت گویا اس سورۃ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پُر شکوہ اور پُر جلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ سورۃ الصف کے آغاز میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے۔ اس طرح تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں گویا زمان و مکان کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے اس لیے کہ عام طور پر آیات کے اختتام پر اسماء باری

تعالیٰ دُودو کے جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں۔

**آیت ۲** ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ”وہی تو ہے جس نے انھیں امیہ میں ایک رسول ان ہی میں سے جو ان کو پڑھ کر سنا تا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب و حکمت کی۔“

﴿وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (۲) ”اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔“

اس سورت کی یہ آیت انقلابِ نبوی کے اساسی منہاج کے حوالے سے اسی طرح اہم ہے جس طرح سورۃ القف کی آیت ۹ تکمیلی منہاج کے اعتبار سے اہم ہے۔ سورۃ القف کی مذکورہ آیت میں حضور ﷺ کا مقصد بعثت بیان ہوا ہے تو آیت زیر مطالعہ میں آپ کے فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ سورۃ القف کی وہ آیت اپنی اہمیت کی وجہ سے قرآن مجید میں تین مرتبہ (سورۃ القف کے علاوہ سورۃ التوبہ آیت ۱۳۳ اور سورۃ الفتح آیت ۲۸ کے طور پر) آئی ہے تو اس آیت میں مذکور ”انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج“ قرآن حکیم میں چار مرتبہ (سورۃ الجمعہ کی اس آیت کے علاوہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۲۹، ۱۵۱ اور سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۳ میں) بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہج کے عناصرِ اربعہ بیان کیے گئے ہیں: (۱) خلاوت آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت۔

اس آیت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مطلوبہ انقلاب کی تیاری اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی کا مکمل طریقہ اور نصاب بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تعلیم، تربیت، تذکیر، ان کا تزکیہ، ان کا انداز سب کچھ قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سلیم الفطرت لوگ قرآن کی مقناطیسی تاثیر کی وجہ سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف کھینچے چلے آئے۔ کسی نے نوراً ہی لپیک کہہ دیا، کوئی قدرے تامل کے بعد راغب ہوا اور کسی نے نسبتاً زیادہ دیر بعد فیصلہ کیا۔ چنانچہ جس طرح دودھ کو بلور کرکھن نکالا جاتا ہے بالکل اسی طرح کمہ کی آبادی کو بارہ سال کے عرصے میں آیات قرآن کی تلاوت کے ذریعے سے بار بار جھنجھوڑ کر تمام سلیم الفطرت (زندہ ارواح کے حامل) افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ پھر ان منتخب افراد کا تزکیہ بھی قرآن مجید کی تلاوت سے ہی ہوا۔ قرآن مجید بلاشبہ ﴿شِفَاءً لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ (یونس: ۵۷) ہے۔ جیسے جیسے یہ کلام ان لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا دلوں کی بیماریاں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ دل کی بیماریاں تو بے شمار ہیں لیکن ان تمام بیماریوں کو اگر کوئی ایک نام یا کوئی ایک عنوان دیا جائے تو وہ ”حُبُّ دُنْیَا“ ہے۔ حُبُّ دُنْیَا کی گندگی جب کسی دل کے اندر ڈیرہ جمالیتی ہے تو اس کے تعفن سے نت نئی بیماریاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں جبکہ خود حُبُّ دُنْیَا کے جراثیم کو غذا انسان کی سوچ اور اس کے نظریے سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کا انداز اور اس کی دوڑ دھوپ کا رخ اس کا نظریہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعے ان لوگوں کے نظریات درست ہو گئے تو حُبُّ دُنْیَا سمیت تمام باطنی بیماریوں کی گویا جڑ کٹ گئی اور برے اعمال و خصائل ان کی شخصیات سے ایسے غائب ہو گئے جیسے موسم خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے جن فرائض منصبی کا ذکر ہوا ہے ان میں ”تعلیم حکمت“ کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے بلکہ یہ حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا شعبہ تخصص (area of specialization) ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں بن سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (البقرة: ۲۶۹) ”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا“ — بہر حال یہ آیت ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ حضور ﷺ کے منج انقلاب میں آلہ دعوت اور آلہ انقلاب قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت بھی قرآن کے ذریعے دی۔ ان کی تذکیر و تہذیب کے لیے بھی قرآن پر ہی انحصار کیا۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کا تذکیر بھی قرآن سے ہی ہوا اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی قرآن ہی بنا۔ آپ ﷺ نے قرآن کی بنیاد پر ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کر کے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ کر دیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دین کو غالب کرنے کا مشن امت کے سپرد کر کے آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ مشن منتقل کرتے ہوئے بھی حضور ﷺ نے امت کو جو وصیت کی تھی وہ بھی قرآن کے بارے میں تھی۔ آپ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ اِنْ اَعْتَصِمْتُمْ بِهِ كِتَابَ اللَّهِ))<sup>(۱)</sup> ”میں تمہارے درمیان وہ شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جسے تم مضبوطی سے تھام لو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!“

چنانچہ آج ہمارے لیے بلکہ تاقیامِ قیامت ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے۔ اس حیثیت میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے کئی گنا بڑا معجزہ ہے۔ عصائے موسیٰ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں معجزہ تھا، آپ کے بعد تو وہ معجزہ نہیں رہا۔ اگر آج بھی وہ کہیں موجود ہے جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس محفوظ ہے، تو اس کی حیثیت بس ایک لالچی کی سی ہے۔ اس کے برعکس حضور ﷺ کا معجزہ رسالت یعنی قرآن مجید قیامت تک کے لیے معجزہ ہے اور ہر اس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس کا حق پہچانے اور ادا کرے۔ اس حوالے سے میرا ایمان تو حق الیقین کی حد تک ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی ”محنت“ کرے کہ قرآن اس کو possess کر لے تو پھر اسے دنیا کی ہر چیز بے وقت نظر آئے گی اور قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم دنیا بھر کے علوم سیکھتے ہیں مگر اس قدر عربی نہیں سیکھ سکتے جس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جاسکے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو ہماری ترجیح ہے اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو نظر انداز کرنے کا ہمارا یہ انداز حیرت انگیز حد تک جسارت آمیز ہے۔ اس حوالے سے ذرا قرآن کی یہ وعید بھی سنئے: ﴿فَإِذَا هَذَا الْحَدِيثُ اَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ۝ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ۔ و سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب صفة حجة النبی ﷺ۔

اَنْتُمْ تُكْذِبُوْنَ ﴿۷﴾ (الواقعة) کہ اے اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو! کیا تم اس عظیم الشان کلام کے بارے میں مدہانت کرتے ہو؟ اور کیا اس کی تکذیب کو تم نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے؟

قرآن مجید تو ظاہر ہے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔ یہ آیات اپنے نزول کے وقت تو مشرکین مکہ سے مخاطب تھیں، جبکہ آج ان کے مخاطب ہم ہیں۔ وہ لوگ تو نظریاتی طور پر قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تھے اور اپنی زبانوں سے اس کی تکذیب کرتے تھے جبکہ آج ہم اپنی زبانوں سے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مقام عبرت ہے! قرآن مجید کی طرف تو پلٹ کر دیکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں جبکہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟ یہی سوال تھا جس نے ابراہیم بن ادھم کی زندگی بدل دی تھی۔ ابراہیم بن ادھم بادشاہ کی حیثیت سے غفلت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن شکار کھینے میں مصروف تھے کہ انہوں نے ایک آواز سنی: يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اٰلِهٰدَا خُلِقْتَ اَمْ لِهٰذَا اٰمُرْتُ؟ کہ اے ابراہیم ذرا سوچو! کیا تمہیں اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا تمہیں اسی کام کا حکم ہوا تھا؟ اللہ جانے یہ کسی فرشتے کی آواز تھی یا ان کے اپنے دل کی صدا۔ بہر حال جو بھی صورت حال تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بات ان کے دل میں گھر گری اور ان کی زندگی کی کاپلٹ گئی۔

**آیت ۳ ﴿۷﴾** (وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ) ”اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔“

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۵﴾﴾ ”اور وہ بہت زبردست ہے کمال حکمت والا ہے۔“

وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کا عطف اُمِّیْنَ پر ہے۔ یعنی دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپ کو مبعوث فرمایا گیا۔ حضور ﷺ کی بعثت تو قیامت تک لیے ہے۔ ظاہر ہے آپ کی امت میں ہر نسل ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوں گے۔ متفق علیہ احادیث کے مطابق حضور ﷺ سے جب اَخَرِيْنَ مِنْهُمْ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ”یہ اور اس کی قوم کے لوگ۔“ مزید فرمایا کہ دین اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کے بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ہیں جو ایرانی النسل ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایرانی قوم بحیثیت مجموعی بہت ذہین ہے۔ اس قوم نے ایک سے بڑھ کر ایک فلاسفہ پیدا کیا ہے، بلکہ ہمارے علمائے کلام تو سب کے سب ایرانی ہیں۔ اس حوالے سے ایرانی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے فلسفہ اور منطق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ ماضی میں یونان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایران بھی فلسفہ و منطق کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں جرمن قوم نے بھی اس میدان میں نام پیدا کیا۔ یہ سب اقوام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چن لیا تھا جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔





آپ کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہؓ نے بھی آپ کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انہیں کوئی اور بچہ ملا نہیں تھا۔ اس کے بعد آپ کے لڑکپن اور جوانی کا دور بھی سخت مشقت اور مزدوری میں گزرا۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں چند کنوؤں کے عوض قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ متعلقہ حدیث میں درہم یا دینار کا ذکر نہیں بلکہ ”قَرَابِطُ“ کا لفظ آیا ہے جو ریزگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا، یعنی چند نکلے یا پیسے۔ آپ کی اس دور کی زندگی کی جھلک سورۃ النحل کی ان آیات میں بھی نظر آتی ہے:

﴿اَلَمْ يَجْعَلْكُمْ يَتِيْمًا فَاُولٰٓئِیْ ۝۱ وَوَجَعَلَ صَاحٰٓٔہٖ ۝۲ وَوَجَعَلَ عَٰیِلًا فَاَعْمٰی ۝۳﴾

”کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو نکھکا نہ دیا! اور آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راہ دکھائی! اور آپ کو نادر پایا تو مال دار کر دیا!“

اس کے بعد دور نبوت میں بھی آپ کی زندگی مسلسل فقر و فاقہ اور مصائب و مشکلات میں گزری۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ کو شاعر اور مجنون کہا گیا، ادبِ اش اور آوارہ لوگوں نے پتھراؤ کر کے آپ کو لہو لہان کر دیا۔ غرض آپ کی دنیوی زندگی مجموعی طور پر سخت مشکلات اور مشقت میں گزری۔ جبکہ دوسری طرف آپ کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ کا سب سے بڑا فضل آپ پر ہے۔ چنانچہ اللہ کے فضل کے اپنے انداز اور اپنے پیمانے ہیں۔ دنیوی ناز و نعم، عیش و عشرت، عزت و شہرت وغیرہ کو اس کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہاں پر سورۃ کی پہلی چار آیات کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہے۔ ان آیات میں حضور ﷺ کی بعثت کے حوالے سے آپ کے فرائض منصبی کا ذکر ہے اور اس امت کی ”آفاقی“ حیثیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی سابقہ امت مسلمہ (بنی اسرائیل) یک نسلی (uni racial) امت تھی، جبکہ موجودہ امت مسلمہ ملّی نیشنل امت ہے، جس میں عربی، فارسی، ہندی، چینی وغیرہ قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں، بلکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی قوم یا نسل موجود ہو جس کے افراد اس امت میں شامل نہ ہوں۔ ان آیات میں دوسری بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا آلہ دعوت اور آلہ تربیت صرف اور صرف قرآن تھا۔ اسی سے آپ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسی سے انہیں انقلابی جدوجہد اور جہاد و قتال کے لیے تیار کیا۔

اب اگلی چار آیات میں بنی اسرائیل کی مثال کا آئینہ دکھا کر ہمیں ہمارے مجموعی طرزِ عمل سے آگاہ کیا جا رہا ہے:

## آیات ۵ تا ۸

مَثَلُ الَّذِیْنَ حَمَلُوا التَّوْرَۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْہَا کَمَثَلِ الْیَمَّارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ۚ یَسْ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِآیٰتِ اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ ہَادُوْا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنْکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَتَّوْا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۲ وَلَا یَتَمَنَّوْنَ اَبَدًا ۙ اِنَّمَا قَدَّمْتُ اٰیٰتِیْہُمْ ۚ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۳ قُلْ اِنْ

الْمَوْتُ الَّذِي تَقْدُونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تَرُدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ  
فَيَنْبِئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

آیت ۵ ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْبَةُ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ ”مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے، اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتا بوں کا بوجھ۔“

جب وہ لوگ حامل تورات ہو کر بھی تورات سے بے گانہ رہے تو ان میں اور اس گدھے میں کیا فرق رہ گیا جو اپنی پیٹھ پر کتا بوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک گدھے پر آپ مکالمات افلاطون لادیں یا انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی تمام جلدیں رکھ دیں، اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہوگی اور نہ ہی اس کے دماغ میں کوئی معلومات منتقل ہو سکیں گی۔ آیت کے اس حصے میں لفظ حمل مختلف صیغوں میں تین مرتبہ آیا ہے۔ حمل ایسے بوجھ کو کہا جاتا ہے جسے آدمی اٹھا کر چل سکے۔ اسی معنی میں حَمَل (قلی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بوجھ وغیرہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے اور یہی مفہوم عورت کے حمل کا بھی ہے: ﴿وَحَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ﴾ (لقمن: ۱۴) ”اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر“۔ عورت کو یہ حمل اٹھانے میں مشقت اور تکلیف کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے، لیکن اس کے لیے اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اِضْر (البقرة: ۲۸۶، الاعراف: ۱۵۷) ایسا بوجھ ہے جس کا اٹھانا انسان کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب عطا کرتا ہے اس قوم پر اس کتاب کے حقوق کا بوجھ بھی ڈالتا ہے۔ ان حقوق میں کتاب پر ایمان لانے، اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کا بوجھ بھی شامل ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لُبِئْتُكُمْ بِالنَّاسِ وَلَا تَكْفُرُونَ﴾ (آل عمران: ۱۸۷) ”اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول و قرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لازماً اُسے لوگوں کے سامنے واضح کر دو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔“ یہ ميثاق اہل تورات سے لیا گیا تھا جبکہ قرآن مجید میں اہل کتاب سے متعلق ایسے واقعات اور ایسی مثالوں کا ذکر ہمیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہے کہ اے اہل قرآن تمہیں بھی اپنی کتاب کے حقوق کا حق ادا کرنے ہیں اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے لیے عام کرنا ہے۔ ورنہ کتا بوں کا بوجھ اٹھانے والے گدھے کی مثال کا اطلاق تم پر بھی ہوگا۔ اس حوالے سے حضرت عبیدہ المطلبیؓ کا روایت کردہ حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ، وَأَتْلُوهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ مِنْ آتَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَفْشُوهُ وَتَعَنُّوهُ وَتَذَبَّرُوا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ)) (۱)

”اے قرآن والو! تم قرآن کو تکیہ (ذہنی سہارا) نہ بنالینا، بلکہ تمہیں چاہیے کہ رات اور دن کے اوقات میں

اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو پھیلاؤ اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو اور اس میں تدبیر کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔“

مقام عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیار نہیں! لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس من وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

﴿يَسْأَلُ مَثَلُ الْفُؤَمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ ”بہت بری مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔“

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعة کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصور کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! میں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (الا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے جس کے لیے وہ سات سمندر پار آ کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے! لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔“

اللہ تعالیٰ کی ہدایت معاذ اللہ کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنا ہوگی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرے گا۔

**آیت ۶** ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادَوْا إِن زَعَمْتُمْ أَنَكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہو گئے ہو اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر“

زعم کا لفظ ”خیال خام“ کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں چیز کا بوازم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَتُّوا الْمَوْتَ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ ”تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔“

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنا ہونی چاہیے اور یہ تمنا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن دہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶) میں بھی آچکا ہے۔

**آیت ۷** ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَ اَبْدًاۙ بِمَا قَدَّمْتُ اَيْدِيْهُمْۙ﴾ ”اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔“

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَۙ﴾ ”اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عَلٰى نَفْسِهٖۤ اَنْفِصُوْهُۙ﴾ (القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بد اعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے موثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے، ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی امت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہگار سہی آخرت میں ہمارے نبی یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔ اگر خدا نخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احمق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشتقتیں اٹھائے اور رشوت، چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے؟

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانا! اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو ہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ”مسلمان“ کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانا تھا، اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا۔ ہے۔

**آیت ۸** ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُۥ فَانَّهُۥ مُلْقٰیكُمْۙ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔“

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَلٰمِ الْغٰیْبِ وَالشَّهَادَةِۙ﴾ ”پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا

اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو پھیلاؤ اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو اور اس میں تدبر کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔“

مقامِ عبرت ہے! آج ہم قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کے لیے تو غور کرنے کو بھی تیار نہیں، لیکن اس کو تکیہ بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں ہم بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ایوبی دور کی یادگار سونے کی تاروں سے لکھا ہوا چالیس من وزنی قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جسے ہم نے پچھلے پچاس سال سے لاہور میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔

﴿يَسْأَلُ مَثَلُ الْفُؤَمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ ”بہت بری مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔“

یہ یہودیوں کی طرف سے کلام اللہ کی عملی یا حالی تکذیب کا ذکر ہے۔ قبل ازیں سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۲ کے حوالے سے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بالکل اسی طور سے ہم بھی قرآن مجید کو جھٹلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی زبان سے نہ تو یہودی تورات کی تکذیب کرتے تھے اور نہ ہی ہم قرآن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی قرآن مجید کی عملی یا حالی تکذیب کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک ایسے تعلیم یافتہ نوجوان کا تصور کریں جو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے امریکہ گیا ہے۔ اس نوجوان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو وہ کہے گا کیوں نہیں! میں مانتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اگر اس سے دوسرا سوال یہ کیا جائے کہ آپ نے اس کو کتنا پڑھا ہے اور اس کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ نے کس قدر محنت کی ہے تو وہ (الا ماشاء اللہ) یہی جواب دے گا کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ تو کیا اس نوجوان کا یہ عمل قرآن مجید کی تکذیب نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس کا حال چیخ چیخ کر گواہی نہیں دے رہا کہ اس کے نزدیک اس کی وہ ڈگری قرآن مجید سے زیادہ اہم ہے جس کے لیے وہ سات سمندر پار آ کر دیارِ غیر کی خاک چھان رہا ہے، لیکن قرآن مجید کو سمجھنے کی کبھی اس نے ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔“

اللہ تعالیٰ کی ہدایت معاذ اللہ کوئی ایسی حقیر شے نہیں جسے ہر شخص کی جھولی میں زبردستی ڈال دیا جائے۔ یہ تو صرف اسی شخص کو ملے گی جس کے دل میں اس کے حصول کی تمنا ہوگی اور جو اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرے گا۔

**آیت ۶** ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادَوْا إِن زَعَمْتُمْ أَنَكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ﴾ ”اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہو گئے ہو اگر تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ بس تم ہی اللہ کے دوست ہو باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر“

زعم کا لفظ ”خیال خام“ کے معنی میں ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں چیز کا بوازم ہے۔ تو اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور محبوب ہونے کا ایسا ہی زعم ہے:

﴿فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ ”تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔“

اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور دوست ہو تو تمہیں اپنے دوست سے وصل کی تمنا ہونی چاہیے اور یہ تمنا چونکہ موت کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس لیے تمہارے دلوں میں ہر وقت موت کی خواہش موجزن رہنی چاہیے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ (آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶) میں بھی آچکا ہے۔

**آیت ۷** ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ۖ بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيَهُمْ﴾ ”اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنے ان اعمال کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔“

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ﴾ (القیامۃ) کے مصداق یہ لوگ اپنے کرتوتوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ انہیں موت آئے اور وہ اپنی بد اعمالیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں۔

ہم مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات کی حیثیت ایک آئینے کی سی ہے۔ اس آئینے میں اگر ہم اپنی تصویر دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ زعم صرف بنی اسرائیل میں ہی نہیں پایا جاتا تھا بلکہ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسی سوچ کی حامل ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی کتاب سے ہمارا ذہنی و قلبی رشتہ نہ رہا تو اپنی تسلی کے لیے ہمیں خود ساختہ خوش فہمیوں (wishful thinkings) کا سہارا لینا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے موثر خوش فہمی تو یہی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے، ہم اللہ کے محبوب ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی امت ہیں اور اس رشتے سے اللہ کے بہت ہی لاڈ لے اور چہیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسے بھی گناہگار سہی آخرت میں ہمارے نبی یقیناً ہماری شفاعت کریں گے اور دوزخ سے ہماری خلاصی کو یقینی بنائیں گے۔ اگر خدا نخواستہ ہم میں سے کوئی فرد کسی بڑے جرم میں پکڑا بھی گیا تو اسے بھی بہت جلد دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ خوش فہمیاں پختہ ہو کر باقاعدہ عقائد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اب ایسی ضمانتوں کے ہوتے ہوئے بھلا کون احق ہوگا جو نیک اعمال کے لیے مشقتیں اٹھائے اور رشوت، چور بازاری اور دوسری حرام کاریوں سے اجتناب کرتا پھرے؟

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟ عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ! اقبال کا یہ شعر اس حوالے سے آج ہم پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ پہلے تو ”مسلمان“ کے پاس عمل سے بچنے کے لیے صرف تقدیر کا بہانہ تھا، اب ہم نے مذکورہ بالا عقائد کی صورت میں بہت مضبوط سہارا بھی تلاش کر لیا۔ ہے۔

**آیت ۸** ﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی“

﴿ثُمَّ تَرْدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغُيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ”پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے“

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس کا بھی اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے اس کا

بھی۔ جو کچھ بحیثیت نوع انسانی تمہارے لیے واضح کر دیا گیا ہے اس کا بھی اور جو کچھ تم سے غیب میں رکھ دیا گیا ہے اس کا بھی۔

﴿فَيَنْتَبِهُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾ ”پھر وہ تمہیں جلد دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔“

یہاں پر چار آیات پر مشتمل سورت کے دوسرے حصے کا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت ہو چکی ہے کہ ان آیات میں تذکرہ تو یہود کا ہے لیکن یاد دہانی ہماری مقصود ہے۔ چنانچہ ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن اگر تورات کے حقوق کے حوالے سے یہودیوں کا احتساب ہو گا تو ہم سے بھی پوچھا جائے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ جو کتاب تم لوگوں کے حوالے کر کے گئے تھے اس کے حقوق کی ذمہ داری کو تم نے کس حد تک نبھایا؟ حضور ﷺ نے توجہ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں کو گواہ بنا کر قرآن مجید کے پیغام کو تمام نوع انسانی تک پہنچانے کی ذمہ داری امت کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ اس حوالے سے آپ نے حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھا تھا: ((أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) کہ کیا میں نے تم لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تمام حاضرین مجمع نے جواب میں یک زبان ہو کر کہا تھا: إِنَّا نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَأَذَيْتَ وَنَصَحْتَ<sup>(۱)</sup> ”ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا، حق امانت ادا کر دیا، حق نصیحت ادا کر دیا۔“ بعض روایات میں حاضرین کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ رِسَالَاتِ رَبِّكَ، وَنَصَحْتَ لَأَمَلِكَ، وَقَضَيْتَ الَّذِي عَلَيْكَ<sup>(۲)</sup> ”ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغامات کا حق پہنچا دیا، اور اپنی امت کے لیے حق نعمت ادا کر دیا، اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا!“ لوگوں کے اس جواب پر آپ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کو بھی گواہ بنایا: ((اللَّهُمَّ اشْهَدْ، اللَّهُمَّ اشْهَدْ، اللَّهُمَّ اشْهَدْ)) کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! یہ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((فَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ الْعَالِبَ))<sup>(۳)</sup> کہ اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آپ نے قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ پوری نوع انسانی تک پہنچانے کی بھاری ذمہ داری اپنی امت کی طرف منتقل فرمادی۔ ظاہر ہے اس ذمہ داری کے بارے میں کل ہم سے پوچھا تو جائے گا۔

## آیات ۱۱ تا ۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ، سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب صفة حجة النبی ﷺ۔

(۲) مستدرک حاکم: ۱/ ۶۴۵، صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۹۷، صحیح ابن حبان: ۲۸۵۶۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب خطبة ایام منی، وصحیح مسلم، کتاب القسامة والمحارین

والنقصا والدیات، باب تغلیظ تحريم الدماء والاعراض والاموال۔

أُولَٰئِكَ أَنْفَضُوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهِو وَمِنَ التِّجَارَةِ  
وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّزُقِينَ

سورت کے تیسرے اور آخری حصے میں نماز جمعہ کا ذکر ہے۔ نماز جمعہ دراصل ”حزب اللہ“ کا ہفتہ وار تعلیمی و تربیتی اجتماع ہے۔ ایسے اجتماعات کا انعقاد ہر انقلابی تحریک کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زمانے میں کیونسٹوں کے ہاں بھی اپنے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہفتہ وار ”سٹڈی سرکلز“ کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ دراصل حزب اللہ کا نصب العین بہت عظیم اور راستہ بہت کٹھن ہے۔ اس راستے پر سفر جاری رکھنے کے لیے غیر معمولی صبر اور استقامت درکار ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انقلابی کارکنوں کے ذہنوں میں ان کے بنیادی نظریے اور نصب العین کا شعور ہر لحظہ متحضر رہے۔ چنانچہ جمعہ کے اجتماع کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہر سات دن کے بعد باقاعدگی کے ساتھ دور و نزدیک سے سب اہل ایمان اکٹھے ہوں اور اللہ کا کوئی بندہ نائب رسول کی حیثیت سے ان کے لیے ’يَسْتَلُوا عَلَيْهِمْ إِلَيْهِ وَيَرْكَبْنَهُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ‘ کا فریضہ سرانجام دے تاکہ تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس کا عمل حضور ﷺ کے بعد بھی قیامت تک جاری و ساری رہے۔

اجتماع جمعہ کے اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے لیے ظہر کی نماز مختصر کر دی گئی۔ یعنی ظہر کے چار فرائض کے بجائے صرف دو رکعتیں رہ گئیں اور باقی دو رکعتوں کی جگہ خطبہ یعنی ”تعلیم و تعلم“ کو لازم کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے اجتماع جمعہ کو تعلیم بالغاں کا ہفتہ وار پروگرام بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس پروگرام کی اہمیت پچھلے زمانے میں اور بھی زیادہ تھی جب نہ سکول کالج تھے نہ یونیورسٹیاں تھیں نہ کتابیں دستیاب تھیں نہ اخبار چھپتے تھے اور نہ ہی آڈیو ویڈیو کی سہولیات میسر تھیں۔ بر عظیم پاک و ہند میں اجتماع جمعہ کی تعلیمی اہمیت کا شعور ماضی قریب کے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جمعہ کے دن شہر کی جامع مسجد میں دور دراز دیہات سے لوگ صبح سات آٹھ بجے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس دور میں جمعہ صرف شہروں میں ادا کیا جاتا تھا، دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا تھا۔ جمعہ کے لیے فقہاء نے ”مصر جامع“ کی شرط عائد کی ہے۔ یعنی جمعہ ہر ہستی میں نہیں بلکہ صرف اس شہر میں ہو سکتا ہے جس میں بازار ہوں، قیام امن کا انتظام ہو، جامع مسجد ہو۔ لیکن جب ہر چھوٹی بڑی ہستی میں جمعہ پڑھنا شروع کر دیا گیا تو مجموعی طور پر اجتماع جمعہ کی اہمیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے جب ہر ہستی میں جمعہ ہو رہا ہو تو لوگ اس کے لیے سفر کر کے شہر کی جامع مسجد میں بھلا کیوں جائیں گے؟

جمعہ کے اجتماعات تو آج بھی منعقد ہوتے ہیں، لوگ جوق در جوق ان میں شرکت بھی کرتے ہیں، خطبہ بھی پڑھے اور سنے جاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ ایک ”رسم عبادت“ کے طور پر ہو رہا ہے، جبکہ اس اجتماع کا بنیادی فلسفہ اور اصل مقصد مجموعی طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ بقول اقبال:۔

رہ گئی رسم اذان، روحِ بلائی نہ رہی، فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی!

بہر حال آج کل اجتماع جمعہ کے حوالے سے جو ظاہری اہتمام دیکھنے میں آتا ہے اس کی حیثیت اس عمارت کے کھنڈرات کی سی ہے جو عرصہ دراز سے زمین بوس ہو چکی ہے، لیکن ان کھنڈرات کو دیکھ کر اندازہ



کیا جاسکتا ہے کہ یہ عمارت بہت عظیم الشان تھی۔

**آیت ۹ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾** ”اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔“

نماز تو بہر حال اللہ کا ذکر ہے ہی، لیکن یہاں اللہ کے ذکر سے خصوصی طور پر خطبہ جمعہ مراد ہے۔ ”اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو“ کا مطلب یہ نہیں کہ بھاگتے ہوئے آؤ، بلکہ اس سے مراد مستعدی سے چل کھڑے ہونا ہے یعنی جلدی سے جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ نماز کے لیے بھاگ کر آنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ﴿ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (۹) ”یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔“

**آیت ۱۰ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾** ”پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو“

یعنی جمعہ کے حوالے سے اسلام میں یہودیوں کے یوم سبت جیسی سختی نہیں ہے کہ پورا دن اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دو۔ بلکہ مسلمانوں سے اس دن صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ نماز جمعہ سے قبل اپنے تمام کام کاج چھوڑ دیں۔ نہا کیں دھوئیں، اچھے کپڑے پہنیں، خوشبو لگائیں اور بروقت مسجد میں پہنچ جائیں تاکہ تعلیمی و تربیتی نشست سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ اسی لیے نماز جمعہ کے لیے اول وقت مسجد میں آنے والے کو حدیث میں اونٹ کی قربانی کے برابر ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری طرف نماز جمعہ ترک کرنے والے کے لیے حضور ﷺ نے سخت وعید سنائی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمُعَاتٍ مِنْ غَيْرِ عَذْرٍ طُبِعَ عَلَىٰ قَلْبِهِ)) (۱)

”جو شخص بغیر کسی عذر کے مسلسل تین جمعے ترک کر دے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔“

اس وعیدی حکم میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو تعلیم و تربیت کے اس اجتماعی پروگرام سے مستقل طور پر کٹ کر رہ جائے۔ بہر حال جمعہ کے دن ”شرعی مصروفیت“ صرف نماز جمعہ کی ادائیگی تک ہی ہے اس کے بعد ہر کوئی اپنی دنیوی مصروفیات کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ جمعہ کے دن ”آدھی چھٹی“ قرآن مجید کے مذکورہ حکم کے مطابق کرے۔ یعنی اگر جمعہ کے دن لوگوں کو آدھی چھٹی دینا ضروری ہے تو یہ چھٹی صبح کے وقت ہونی چاہیے تاکہ لوگ آسانی سے نماز جمعہ کی تیاری کریں، نماز ادا کریں اور نماز کے بعد معمول کے مطابق اپنے کام بنائیں۔

**﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾** (۱۰) ”اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

**آیت ۱۱ ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا﴾** ”اور جب انہوں نے دیکھا تجارت کا معاملہ یا کوئی کھیل تماشا تو اس کی طرف چل دیے“

﴿وَتَرْكُوكَ قَائِمًا﴾ ”اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیا۔“

یہ خاص طور پر منافقین کے طرز عمل کا ذکر ہے کہ وہ تجارت اور کھیل تماشے کو اللہ کے ذکر پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نماز جمعہ کے وقت آیا اور اہل شہر کو اطلاع دینے کے لیے دھول بجانے شروع کر دیے۔ چونکہ قحط کا زمانہ تھا لہذا حاضرین مسجد قافلے کی آمد کی اطلاع پا کر فوراً اس کی طرف لپکے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اکثر لوگ اس دوران اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑے لوگ باقی رہ گئے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد بالکل قریبی دور کا ہے جبکہ لوگوں کو صحبت نبویؐ سے فیض یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا تھا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابتدا میں عیدین کے خطبہ کی طرح جمعہ کا خطبہ بھی نماز کے بعد ہوتا تھا اس لیے خطبہ کے دوران اٹھ کر جانے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ نماز تو پڑھی جا چکی ہے اس لیے اب اٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال اس آیت میں بھی ڈانٹ کا انداز ہے اور اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس سے بھی مسلمانوں کی صفوں میں اسی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ذکر قبل ازیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

﴿قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّزَاقِينَ ١١﴾ ”(اے نبی ﷺ!)

آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے کھیل کود اور تجارت سے۔ اور اللہ بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔“



# سُورَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

## تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ میں چوتھا جوڑا سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۃ المنافقون کے آغاز میں تسبیح کا ذکر نہیں ہے جبکہ سورۃ التغابن کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے۔ جہاں تک ان سورتوں کے مضامین کا تعلق ہے 'سورۃ المنافقون میں نفاق اور منافقین کا تذکرہ ہے جبکہ سورۃ التغابن کا بنیادی موضوع ایمان ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے 'قرآن مجید کے وہ موضوعات جو طویل سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ مختصر سورتوں میں دے دیا گیا ہے۔ نفاق اور ایمان کا تعلق بھی ایسے ہی موضوعات سے ہے۔ نفاق کا ذکر تمام مدنی سورتوں میں ملتا ہے کہیں ڈھکے چھپے انداز میں اور کہیں کھلم کھلا۔ سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں یہ موضوع اس لحاظ سے خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ اسی طرح ایمان کا موضوع پورے مکی قرآن میں پھیلا ہوا ہے بلکہ اس بحث کے خاص خاص نکات کہیں کہیں مدنی سورتوں کے اندر بھی آ گئے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت اللایات (آیت ۱۶۴) اور آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) اس موضوع پر انتہائی جامع آیات ہیں۔ اس حوالے سے زیر مطالعہ دو سورتوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں قرآن کے ان دو اہم موضوعات پر طویل بحثوں کا خلاصہ سمودیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں سورتیں اپنے اپنے موضوع پر قرآن کی جامع ترین سورتیں ہیں۔ اس سورت کے باقاعدہ مطالعہ سے پہلے نفاق کے بارے میں چند اہم نکات کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ نکات اگرچہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ زیر بحث آ چکے ہیں لیکن موضوع کے حوالے سے یہاں انہیں ایک مرتبہ پھر سے دہراینا مفید رہے گا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر نفاق کی دو قسمیں ہیں یعنی شعوری نفاق اور غیر شعوری نفاق۔ شعوری نفاق یہ ہے کہ کوئی شخص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہل ایمان کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اقرار کرے۔ ایسا شخص تو گویا شروع سے ہی منافق ہے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی ایمان نصیب نہیں ہوا۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۃ آل عمران کی آیت ۷۲ میں آیا ہے۔ وہ لوگ باقاعدہ ایک سازش کے تحت صبح کے وقت ایمان لانے کا ڈھونگ رچاتے تھے اور شام کو اسلام سے پھر جانے کا اعلان کر دیتے تھے تاکہ اسلام کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکیں۔ ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو ایمان ایک لمحے کے لیے بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت سورۃ المائدہ کی آیت ۶۱ میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكَفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ﴾ کہ وہ کفر کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے اور کفر کے ساتھ ہی نکل گئے۔ بہر حال یہ شعوری نفاق کی مثال ہے۔ عملی طور پر اس قسم کے منافقین بہت کم پائے جاتے تھے۔

اس کے برعکس غیر شعوری نفاق کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص کے پاس اسلام کی دعوت پہنچی۔ اس کے

دل نے اس کی تصدیق کی اور وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ چونکہ ایک کم ہمت شخص تھا اس لیے ایمان کے عملی تقاضے پورے کرنے اور انقلاب کے راستے کی آزمائشوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔ خاص طور پر جب باقاعدہ تصادم کا مرحلہ آیا اور اہل ایمان سے تقاضا ہوا کہ وہ اپنی نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجائیں تو ایسے کمزور لوگوں کی جان پر بن گئی۔ اب ان میں سے کچھ لوگ تو اپنی کم ہمتی کے باوجود بھی سچے دل سے مسلمانوں کے ساتھ چمے رہے۔ اس طرح کہ کبھی کوئی اچھا کام کر لیا تو کبھی کوئی نافرمانی بھی ہو گئی۔ کبھی کسی تقاضے پر لبیک بھی کہہ لیا تو کبھی بہانہ بنا کر کھسک بھی گئے، لیکن جب جو ابد ہی ہوئی تو اپنی غلطی کو تسلیم کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیا۔ سورۃ التوبہ میں ایسے لوگوں کے کردار کی کیفیت ﴿خَاطِلُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخِرَ مَسِيَّتًا﴾ (آیت ۱۰۲) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ جن لوگوں کا معاملہ یہیں تک رہا کہ ان سے جب بھی کوئی کوتاہی ہوئی انہوں نے صاف گوئی سے اسے تسلیم کر لیا اور کوئی بہانہ نہ بنایا تو وہ نفاق سے بری رہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ضعیف ایمان کے درجے میں تھے۔

البتہ ایسے معاملے میں اکثر انسان کی نام نہاد عزت نفس آڑے آ جاتی ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ﴾ (البقرہ: ۲۰۶) یعنی جب انسان کو اللہ سے ڈرنے کا کہا جاتا ہے تو اس کی عزت نفس کی عصبيت اسے نافرمانی کی طرف گھسیٹ لے جاتی ہے کہ دیکھو تم ایک عزت دار آدمی ہو اپنی زبان سے خود ہی اپنی غلطیاں تسلیم کر کر کے کب تک لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گے؟ بس بہت ہو گئی، اب اس کے بعد یہ نہیں چلے گا! چنانچہ جو شخص اپنے نفس کے اس بہکاوے میں آ کر خدا خونی کی حد پار کر گیا اور اپنی غلطیاں چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں پر اتر آیا اس نے گویا نفاق کی سرحد میں پہلا قدم رکھ دیا۔ بس یہ پہلا قدم رکھنے کی ہی دیر تھی اب یوں سمجھئے کہ وہ جھوٹ کی دلدل میں پھنس گیا۔ اس کے بعد وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اس کے لیے اس دلدل میں مزید نیچے دھستے جانے کا ہی سبب بنے گا۔ صبح جھوٹ، دوپہر جھوٹ، شام جھوٹ، بلکہ بات بات پر جھوٹ۔ پھر ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کے جھوٹ بولنے اور جھوٹے بہانے بنانے پر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں تو وہ اپنے جھوٹے بہانوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسموں کا سہارا لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر نفاق کے مرض کوئی بی کے مہلک مرض سے تشبیہ دیں تو قسموں کے اس مرحلے سے جان لینا چاہیے کہ اب متعلقہ شخص کا مرض دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

جب قسموں کو تکیہ کلام بنا لینے سے اس کی اصل حقیقت سب پر عیاں ہونے لگتی ہے اور اسے خود بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ لوگوں نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے تو رد عمل کے طور پر اس کے دل میں ایمان اور اہل ایمان کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دشمنی کا اصل ہدف اہل ایمان کے قائد کی شخصیت بنتی ہے جیسے منافقین مدینہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر ہرزہ مرانی کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں مدینے میں سب لوگ آرام و سکون سے رہ رہے تھے۔ اس ایک شخص (ﷺ) کے آجانے سے ہمارے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں اس (ﷺ) نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے، خاندانوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی رنجشیں پیدا کر دی ہیں۔ اسی (ﷺ) کی وجہ سے یہودی قبائل کے ساتھ ہمارے حلیفانہ تعلقات ختم ہو کر رہ گئے

ہیں اور پورے عرب سے ہمیں لڑائیاں مول لینا پڑی ہیں۔ بہر حال جب یہ مرحلہ آجائے تو سمجھ لیں کہ اب یہ مرض تیسری اور آخری سٹیج میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں ٹی بی کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ تیسری سٹیج پر پہنچ کر یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں ایک اہم بات یہ بھی جان لیجیے کہ منافقین صرف انقلابی تحریک کی صفوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے آج ہمارے معاشرے کے جو لوگ دین کے تحریکی اور انقلابی تصور سے آشنا ہی نہیں وہ ضعیف الایمان تو ہو سکتے ہیں منافق نہیں۔ کیونکہ ان بے چاروں کو تو دین کا صحیح تصور دیا ہی نہیں گیا۔ انہیں تو مولویوں اور ان کے پیروں نے یہی بتایا ہے کہ دین بس نماز روزہ ہی کا نام ہے اور اگر رمضان میں لیلة القدر کی عبادت نصیب ہوگئی تو سمجھو زندگی بھر کے تمام گناہ دُھل گئے۔ اور جس نے حج یا عمرہ کر لیا وہ گناہوں سے بالکل ہی پاک ہو گیا، چاہے اس نے ساری عمر حرام خوریوں میں ہی کیوں نہ گزاری ہو۔ اب جس مسلمان کے ذہن میں دین کا یہ تصور ہو اس بے چارے کو منافقت سے کیا لینا دینا۔ منافقت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں قدم قدم پر تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں دین اپنے نام لیواؤں سے ان کے عیش و آرام اور جان و مال کی قربانیاں مانگتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دین کے تحریکی اور انقلابی فلسفے کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور اقامت دین کی جدوجہد کو فرض عین سمجھتے ہوئے کسی حقیقی انقلابی جماعت یا تحریک میں شمولیت اختیار کر لے اور پھر اس کے بعد امیر کے ڈانسنے کی وجہ سے یا ایثار و قربانی کے تقاضوں سے گھبرا کر یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے پیچھے ہٹ جائے تو وہ مرض نفاق کا شکار ہو جائے گا۔ البتہ اگر اس کے پیچھے بٹنے کی وجہ کچھ اور ہو، مثلاً اس کو وہ تحریک اپنے مقصد سے ہٹتی ہوئی محسوس ہو یا تحریک کے طریق کار سے اسے اصولی اختلاف ہو جائے یا قائدین کے کردار میں اسے واضح خامیاں نظر آئیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ایسی کسی صورت میں اگر وہ اس تحریک یا تنظیم کو چھوڑ دے گا تو وہ نفاق کا مرتکب نہیں ہوگا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی وہ کسی مخصوص جماعت کو تو چھوڑ سکتا ہے، اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اقامت دین کی ضرورت، اہمیت اور فرضیت کو ایک دفعہ سمجھ لینے کے بعد اب اس جدوجہد کو جاری رکھنا اس پر فرض ہے، چاہے یہ فرض وہ کسی دوسری جماعت میں شامل ہو کر ادا کرے یا اس مقصد کے لیے خود کو نئی جماعت تشکیل دے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور ﷺ کے اس فرمان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ فجر اور عشاء کی نماز باجماعت میں شریک نہ ہونے والوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَثْقَلَ صَلَاةٍ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا، وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَمَرَ بِالصَّلَاةِ فَنُقَامَ ثُمَّ أَمَرَ رَجُلًا فَيُصَلِّيَ بِالنَّاسِ ثُمَّ أُنْطَلِقَ مَعِيَ بِرِجَالٍ مَعَهُمْ حُزْمٌ مِنْ حَطَبٍ إِلَى قَوْمٍ لَا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحْرِقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ بِالنَّارِ)) (۱)

”منافقوں پر سب سے بھاری نماز عشاء اور فجر کی نماز (باجماعت) ہے۔ اگر یہ ان دونوں نمازوں کی اہمیت کو جان جائیں تو ان میں شرکت کے لیے ضرور آئیں خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔ اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة ..... ح: ۶۵۱۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں متعدد مقامات پر کم و بیش الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

میں نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں، پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے، پھر ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز (باجماعت) میں شریک نہیں ہوتے اور میرے ہمراہ ایسے ساتھی ہوں جن کے پاس لکڑیوں کے گٹھے ہوں اور میں جماعت میں نہ پہنچنے والوں کے گھروں کو ان کے سمیت آگ سے جلا دوں۔“

اگر جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں پر حضور ﷺ کی ناراضی کا یہ عالم ہے تو جماعتی نظم کو ترک کر کے زندگی گزارنے کے انجام کا ہمیں خود اندازہ کر لینا چاہیے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۸ تا ۸

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۚ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۚ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۚ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمِعُ لِقَوْلِهِمْ ۗ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسْتَدَقَةٌ ۚ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعُدُوّ ۚ فَاحْذَرهُمْ ۚ فَتَلَهُمُ اللَّهُ أَنْ يُولُوكُونَ ۚ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۚ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّى يَنْفَضُوا ۚ وَلِلَّهِ خَزَايِنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۚ يَقُولُونَ لَنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لِيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

**آیت ۸** ﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ﴾ ”(اے نبی ﷺ) جب منافق

آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔“

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ﴾ ”اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں۔“

﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ ”اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔“

یعنی آپ کی رسالت کی گواہی یہ لوگ صرف اپنی زبانوں سے دیتے ہیں، ان کے دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے یہ لوگ جھوٹے (کاذبوں) ہیں۔ جیسا کہ تمہیدی کلمات میں ذکر ہوا ہے بات بات پر جھوٹ بولنا مرض منافقت کی پہلی سیج ہے۔

**آیت ۲ ﴿اتَّخِذُوا إِيمَانَهُمْ حُتَّةً فَصِّدُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾** ”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور یہ اللہ کے راستے سے رُک گئے ہیں۔“

جہاد و قتال سے بچنے کے لیے یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر جھوٹے بہانے بناتے تھے کہ اللہ کی قسم میری بیوی سخت بیمار ہے، گھر میں کوئی دوسرا اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ جب نوبت قسموں تک پہنچی گئی تو گویا مرض دوسری سٹیج میں داخل ہو گیا۔

**﴿إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾** ”بہت ہی برا کام ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔“

**آیت ۳ ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا﴾** ”یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے“

یعنی ان کی منافقت شعوری نہیں ہے کہ وہ بدعتی سے دھوکہ دینے کے لیے ایمان لائے ہوں۔ دین اسلام کی دعوت جب ان لوگوں تک پہنچی تھی تو ان کی فطرت نے گواہی دی تھی کہ یہ سچ اور حق کی دعوت ہے اور اس وقت وہ نیک نیتی سے ایمان لائے تھے۔ کچھ دیر کے لیے انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی تھی، لیکن ایمان لاتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ ”یہ شہادت گہر الفت میں قدم رکھنا ہے“۔ اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے: ﴿وَلَسَلَوْكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ (البقرة: ۱۵۵) کہ ہم تمہیں کسی قدر خوف، بھوک اور مال و جان کے نقصانات جیسی سخت آزمائشوں سے ضرور آزمائیں گے۔ لیکن منافقین کو اس صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔

منافقین مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے قبیلے کے سردار کے پیچھے ایمان لے آئے تھے۔ جیسے اوس اور خزرج کے قائدین ایمان لے آئے تو پورا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ عملی طور پر ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ تو برف کے تودے کی اوپری سطح (tip of the iceberg) ہی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تودے کے نیچے کیا ہے۔ بہر حال ایسے لوگ ایمان تو سچے دل سے لائے تھے، لیکن ان کا ایمان تھا کمزور۔ اسی لیے تکلیفیں اور آزمائشیں دیکھ کر ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ البتہ ضعیف الایمان مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایمان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان سے جب کوئی کوتاہی ہوئی تو انہوں نے اس کا اقرار بھی کیا اور اس کے لیے وہ معافی کے طلب گار بھی ہوئے۔ سورۃ التوبہ میں ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے اور وہاں ان کے ضعیف ایمان کا علاج بھی تجویز کر دیا گیا: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبة: ۱۰۳) ”ان کے اموال میں سے صدقات قبول فرما لیجئے، اس (صدقے) کے ذریعے سے آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے اور ان کے لیے دعا کیجئے“۔ یعنی اتفاق فی سبیل اللہ سے ان کے ایمان کی کمزوری دور ہو جائے گی۔ بہر حال جو لوگ ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مشکلات سے گھبرا کر ایمان کے عملی تقاضوں سے جی چرانے لگے اور اپنی اس خیانت کو جھوٹے بہانوں سے چھپانے لگے وہ منافقت کی راہ پر چل نکلے۔

**﴿فُطِّعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾** ”تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، پس یہ سمجھنے سے

عاری ہو گئے۔“

ان کی منافقانہ روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ چنانچہ اب ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے اور یہ حقیقی تفقہ سے عاری ہو چکے ہیں۔

**آیت ۴** ﴿وَإِذَا رَأَوْهُمْ تَبَٰعِبُكَ أَجْسَامُهُمْ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔“

جسمانی طور پر ان کی شخصیات بڑی دلکش اور متاثر کن ہیں۔

﴿وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعُ لِقَوْلِهِمْ﴾ ”اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپ ان کی بات سنتے ہیں۔“ ظاہر ہے یہ لوگ سرمایہ دار بھی تھے اور معاشرتی لحاظ سے بھی صاحب حیثیت تھے۔ اس لحاظ سے ان کی گفتگو ہر نورم پر توجہ سے سنی جاتی تھی۔

﴿كَانَتْهُمْ حُشْبٌ مُّسْتَدَّةٌ﴾ ”(لیکن اصل میں) یہ دیوار سے لگائی ہوئی خشک لکڑیوں کی مانند ہیں۔“ حقیقت میں ان لوگوں کی حیثیت ان خشک لکڑیوں کی سی ہے جو کسی سہارے کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں اور انہیں دیوار کی ٹیک لگا کر کھڑا کیا جاتا ہے۔

﴿يَحْسَبُونَ كُلَّ صَٰحِبَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ ”یہ ہرزور کی آواز کو اپنے ہی اوپر گمان کرتے ہیں۔“ اندر سے یہ لوگ اس قدر بودے اور بزدل ہیں کہ کوئی بھی زور کی آواز یا کوئی آہٹ سنتے ہیں تو ان کی جان پر ہن جاتی ہے۔ یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں اور ہر وقت کسی ناگہانی حملے کے خدشے یا جہاد و قتال کے تقاضے کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں۔

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرُوهُمْ﴾ ”(آپ کے) اصل دشمن یہی ہیں آپ ان سے بچ کر رہیں!“ یہ ان کے مرض نفاق کی تیسری سیج کا ذکر ہے۔ ان کی دشمنی چونکہ دوستی کے پردے میں چھپی ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر ان سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی جا رہی ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ لوگ آستین کے سانپ ہیں۔ مشرکین کہہ کے لشکر آپ لوگوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنے یہ اندر کے دشمن خطرناک ہیں۔ لہذا آپ ان کو ہلکا نہ سمجھیں اور ان سے ہوشیار رہیں۔ ایسی صورت حال کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول بہت اہم ہے کہ ”فاختہ کی مانند بے ضرر لیکن سانپ کی طرح ہوشیار رہو“۔ منافقین اگرچہ حضور ﷺ سے دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے لیکن حضور ﷺ کی شان یہی تھی کہ آپ ان کی غلطیاں اور گستاخیاں مسلسل نظر انداز فرماتے رہتے تھے بلکہ آپ اپنی طبیعت شرافت اور مروت کی وجہ سے ان کے جھوٹے بہانے بھی مان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوہ تبوک کی تیاری کے موقع پر جب آپ ﷺ نے بہت سے منافقین کو جھوٹے بہانوں کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آئی: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَتْ لَهُمْ حَتَّىٰ يَبَيِّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِينَ﴾ (التوبة) ”(اے نبی ﷺ!) اللہ آپ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپ کو معاف فرمادیا) آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ یہاں تک کہ آپ کے لیے واضح ہو جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور آپ (یہ بھی) جان لیتے کہ کون جھوٹے ہیں!“



﴿قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنْتَ يَؤُفَكُونُ﴾ ”اللہ ان کو ہلاک کرے یہ کہاں سے پھر اے جارہے ہیں!“ تصور کیجیے یہ لوگ کس قدر قابل رشک مقام سے ناکام و نامراد لوگ ہیں! ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کا زمانہ نصیب ہوا آپ کی دعوت ایمان پر لبیک کہنے کی توفیق ملی آپ کے قدموں میں بیٹھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ کیسی کیسی سعادتیں تھیں جو ان لوگوں کے حصے میں آئی تھیں۔ بقول ابراہیم ذوق: ”یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے“۔ مگر دوسری طرف ان کی بد نصیبی کی انتہا یہ ہے کہ یہاں تک پہنچ کر بھی یہ لوگ نامراد کے نامراد ہی رہے۔ مقام عبرت ہے! کس بلندی پر پہنچ کر یہ لوگ کس اتھاہ پستی میں گرے ہیں۔ قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا!

**آیت ۵** ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ﴾ ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (اپنی غلطی مان لو) تاکہ اللہ کے رسول تمہارے لیے استغفار کریں“

ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو نبی اکرم ﷺ کے خلاف بغض اور عناد پیدا ہو چکا تھا تو ان حالات میں وہ کیسے آتے اور کیونکر اپنی غلطی تسلیم کرتے؟

﴿لَوْ زَادُوا وَسْهُمْ﴾ ”تو وہ اپنے سروں کو منکاتے ہیں“ کہ ہاں ہاں! ٹھیک ہے ہم آئیں گے ضرور آئیں گے۔  
﴿وَرَأَيْتَهُمْ يَصْضُؤُونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾ ”اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رک جاتے ہیں تکبر کرتے ہوئے۔“

ان کے دلوں میں چونکہ تکبر ہے اس لیے وہ آپ کے پاس آ کر معافی مانگنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ دیکھیں جی آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے اب کون روز و روز ہاں جا کر مجرموں کی طرح اقبال جرم کرے اور ڈانٹ سنے!

**آیت ۶** ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔“

﴿لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ ”اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔“

یہی مضمون اس سے زیادہ سخت الفاظ میں سورۃ التوبہ میں بھی آچکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ (آیت ۸۰) ”(اے نبی ﷺ!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔“ لیکن حضور ﷺ کی نرم دلی اور مروت کی اپنی شان ہے۔ آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک موقع پر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ﴿لَوْ أَعْلَمْتُ أَنَّ زِدْتُ عَلَى السَّبْعِينَ غُفْرَةً لَهْ لَزِدْتُ عَلَيْهَا﴾ (۱) ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ

موجب استغفار کرنے سے اس کی معافی ہو سکتی ہے تو میں اس پر اضافہ کر لیتا۔“ واضح رہے کہ یہاں ستر کا عدد محاورے کے طور پر آیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اب ان کے لیے آپ کا استغفار کرنا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کے دلوں میں آپ کی عداوت اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ ان کی بخشش ممکن ہی نہیں۔

اب آئندہ آیات میں ایک واقعہ کے حوالے سے اہل ایمان کے ساتھ منافقین کی عداوت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی کے سفر میں پیش آیا تھا۔ مرئیسیع کے کنوئیں کے قریب جہاں لشکر کا پڑاؤ تھا، دو مسلمانوں کا پانی بھرنے پر آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک انصار کا حلیف تھا جبکہ دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خادم تھا جس نے جذبات میں آکر اس کو ایک لات رسید کر دی۔ اس پر منافقین نے اس کو بوجھل کر مہاجرین اور انصار کے مابین جھگڑے کا رنگ دے دیا۔ عبداللہ بن ابی نے جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا، موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ مدینہ والو! یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غزوانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ سَمِعْنَا كَلْبَكَ يَأْكُلُكَ کہ تم اپنے کتے کو کھلا پلا کر خوب مونا کر دو تاکہ وہ تم ہی کو کھا لے۔ تم نے ان بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ دی، ان کی مدد کی، انہیں کھلایا پلایا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ یہ تہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ چلے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو باعزت ہیں وہ رؤیلوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ بن ابی کی یہ بکواس وہاں موقع پر موجود ایک نو جوان صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سن رہے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو بلا کر دریافت فرمایا تو وہ صاف مکر گیا، بلکہ اس نے الٹا احتجاج کیا کہ کیا آپ میرے معاملے میں اس چھوکرے (حضرت زید بن ارقم) کی بات پر یقین کریں گے؟ اس طرح حضرت زید کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی۔ ان آیات کے نزول کے بعد جب واقعہ کی تصدیق ہو گئی تو حضور ﷺ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خصوصی طور پر دلجوئی فرمائی اور شفقت سے ان کا کان مروڑتے ہوئے فرمایا کہ لڑکے کے کان نے غلط نہیں سنا تھا۔

اس واقعہ کے حوالے سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عبداللہ بن ابی کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی حضور ﷺ نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک علماء اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس بارے میں عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے مدینہ تشریف لے جانے کے فوراً بعد ہی وہاں باقاعدہ اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تھی اور حضور ﷺ کو باقاعدہ ایک سربراہ ریاست اور سربراہ حکومت کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، لیکن اُس دور کے معروضی حقائق اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غزوہ اُحد کے موقع پر اسلامی لشکر کو چھوڑ کر جانے والے تین سو افراد سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ منافقین مدینہ اپنے فیصلے حضور ﷺ کے بجائے یہودیوں سے کر داتے تھے۔ ظاہر ہے کسی ریاست میں تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی ایک تہائی فوج دشمن کے مقابلے سے بھاگ جائے اور ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی اس بارے میں کوئی باز پرس نہ ہو اور نہ ہی کسی ریاست کی

عملداری میں یہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی شہری ریاست کی عدالت کو چھوڑ کر اپنا مقدمہ کہیں اور لے جائے۔ بہر حال اس حوالے سے اصل صورت حال یہ تھی کہ علاقے کی واحد منظم اور طاقتور جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ کو مدینہ میں معاشرتی و سیاسی لحاظ سے ایک خصوصی اور ممتاز مقام تو بھرت کے فوراً بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ آپ کے تحت ایک باقاعدہ ریاست فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ ہجری میں غزوہ تبوک سے رہ جانے والے لوگوں کا سخت مواخذہ ہوا۔

بہر حال عبداللہ بن ابی کے معاملے میں حضور ﷺ نے بہت درگزر سے کام لیا۔ واقعہ الک میں اس کے کردار سے حضور ﷺ بہت آزرده ہوئے تھے۔ اس دوران تو ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس شخص کی ایذا سے مجھے بچا سکے؟ لیکن آپ کا یہ فرمان بھی محض آپ کے جذبات کا اظہار تھا جبکہ آپ نے اس کے خلاف کسی عملی اقدام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا۔ البتہ اس موقع پر اس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! آپ مجھے حکم دیں، میں اس شخص کا کام تمام کرتا ہوں۔ اس پر خزع کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن ابی کے قتل کی بات اس لیے کی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے ہے! اور پھر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا تھا کہ حضور! آپ اس شخص کے معاملے میں نرمی سے کام لیں۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے ہم نے سونے کا تاج بھی تیار کر لیا تھا کہ اسی اثنا میں آپ مدینہ تشریف لے آئے۔ اس طرح اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ ہمارے قبیلے پر ابھی تک اس کا اثر و رسوا موجود ہے اس لیے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے خلاف سختی نہ کی جائے۔ بہر حال اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس وقت تک باقاعدہ اسلامی ریاست اور حکومت بھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ابھی قبائلی عصبیت بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں۔ یعنی مجموعی طور پر حالات ایسے نہیں تھے کہ حضور ﷺ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن ابی کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے کا حکم دیتے۔ اس لیے آپ نے اس کا یہ جرم بھی نظر انداز کر دیا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ ”یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

**آیت ۷** ﴿هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُوا﴾ ”یہی ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر جو اللہ کے رسول (ﷺ) کے گرد جمع ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ یہ منتشر ہو جائیں۔“

منافقین سمجھتے تھے کہ اگر اہل مدینہ مہاجر مسلمانوں پر خرچ کرنا بند کر دیں گے تو چند ہی دنوں میں یہ سارا بھیڑ چھٹ جائے گی۔ یہی بات عبداللہ بن ابی نے متذکرہ بالا جھگڑے کے موقع پر انصارِ مدینہ سے کہی تھی۔

﴿وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۚ﴾ ”حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ ہی کے ہیں، لیکن منافقین اس حقیقت کا فہم نہیں رکھتے۔“

یہاں آسمانوں اور زمین سے مراد پوری کائنات ہے۔

۸ ﴿تَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ ”وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو جو طاقتور ہیں وہ لازماً نکال باہر کریں گے وہاں سے ان کمزور لوگوں کو۔“

عربی میں عزت کا اصل مفہوم طاقت اور غلبہ ہے جبکہ ذلیل کے معنی کمزور اور بے حیثیت کے ہیں۔ مذکورہ واقعہ چونکہ غزوہ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے راستے میں پیش آیا تھا اس لیے منافقین کے مکالمے میں یہاں مدینہ پلٹنے کا ذکر آیا ہے۔ عبد اللہ بن ابی نے لوگوں کے جذبات بھڑکاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں تو بالکل متفق الرائے ہو کر یہ طے کر لیں کہ جو صاحب عزت ہیں جو مدینہ کے قدیم باشندے (sons of the soil) ہیں وہ ان مہاجرین کو جو بڑے کمزور ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ۸ ﴿”حالانکہ اصل عزت تو اللہ اُس کے رسول اور مؤمنین کے لیے ہے، لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔“

عبد اللہ بن ابی کے بیٹے کا نام بھی عبد اللہ رضی اللہ عنہ تھا جو بہت مخلص صادق القول اور صادق الایمان صحابی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرے باپ نے یہ بکواس کی ہے تو انہوں نے اپنے باپ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ فکرج واپس مدینہ پہنچا تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ تلوار سنت کر اپنے باپ کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے عبد اللہ بن ابی سے کہا اب جب تک تم یہ نہیں کہو گے کہ میں ذلیل ہوں اور تمام عزت اللہ اُس کے رسول اور اہل ایمان کے لیے ہے اُس وقت تک میں تمہیں شہر میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ عبد اللہ بن ابی نے اُس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فریاد کی لوگوں کے سامنے بھی دہائی دی کہ دیکھو میرا اپنا بیٹا میرے قتل کے درپے ہے۔ لیکن حضرت عبد اللہ اپنے موقف پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی مذکورہ شرط منوا کر ہی اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔

یہ آٹھ آیات تو نفاق کے مراحل اور اس کی تشخیص اور پیش بینی (prognosis) کے بارے میں تھیں۔ ان میں گویا مریض نفاق اُس کی علامات اُس کا نقطہ آغاز اُس کا سبب اُس کے مختلف مراتب و مدارج اور اس کی ہلاکت خیزی یہ تمام چیزیں زیر بحث آ گئیں۔ ان آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ نفاق کی وجہ سے بالآخر انسان کے دل میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے خلاف شدید دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بیماری انسان کو ہلاکت و بربادی کے راستے پر وہاں پر پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ کے رسول کا استغفار بھی اس کے کام نہیں آ سکتا۔

## آیات ۹ تا ۱۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

اب دوسرے رکوع کی تین آیات میں اس بیماری کا علاج بتایا گیا ہے۔ جس طرح طب میں ایک مرض کا

علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے ایک حفاظتی (preventive) قسم کا علاج ہے اور دوسرا معالجاتی (curative) طرز کا اسی طرح یہاں بھی مرض نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیماری کے حوالے سے انسان کی پہلی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اس بیماری کی چھت سے بچا رہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے اسے پرہیزی اقدام (preventive measures) اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ جیسے آج کل کی بیماری سے بچنے کا موثر طریقہ یہی ہے کہ آپ متعلقہ ویکسینیشن کا انجکشن لگوائیں۔ چنانچہ اب اگلی آیت میں اس اقدام کا ذکر ہے جسے نفاق کی بیماری سے بچنے کے لیے حفظاً مقدم کے طور پر اپنانا ضروری ہے۔

**آیت ۹ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾** ”اے اہل ایمان! تمہیں غافل نہ کرنے پائیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے۔“

یہاں دو چیزوں کو مضمین کیا گیا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں یعنی مال اور اولاد۔ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۱۵) ”جان لو تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعہ آزمائش ہیں۔“ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اہل ایمان! دیکھنا تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔

**﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾** (۴) ”اور جو کوئی ایسا کریں گے تو وہی خسارے میں رہیں گے۔“

یہاں اللہ کے ذکر سے مراد صرف یہی نہیں کہ انسان ہر وقت تسبیحات وغیرہ پڑھتا رہے بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اللہ ہر وقت یاد رہے اور اسی بنا پر وہ اپنے جملہ فرائض کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ تو اے اہل ایمان! کہیں ایسا نہ ہو کہ اموال و اولاد کے معاملات میں منہمک ہو کر تم لوگ اللہ ہی کو بھلا دو۔ جیسا کہ آج کل ہماری اکثریت کا حال ہے۔ آج اگر آپ لوگوں کو اللہ اور دین کی طرف بلائیں تو آپ کو عام طور پر یہی جواب ملے گا کہ کیا کریں جی وقت ہی نہیں ملتا! اب ظاہر ہے جو شخص ایک خاص ”معیار زندگی“ کو اپنا معبود بنا کر دن رات اس کی پوجا میں لگا ہو تو اُس کے پاس معبود حقیقی کی طرف رجوع کرنے کے لیے وقت کیونکر بچے گا؟ چنانچہ مرض نفاق کی چھت سے بچنے کے لیے پرہیزی اقدام یہ بتایا گیا کہ اللہ کی یاد کسی وقت بھی تمہیں بھولنے نہ پائے۔ اور ساتھ ہی اللہ کی یاد کو بھلانے والے دو اہم ترین عوامل کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ ظاہر ہے کسی بھی بیماری کا علاج کرنے کے لیے اس کے اصل اور بنیادی سبب کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جب بیماری کا سبب ڈھونڈ کر اس کی بیخ کنی کر دی جائے گی تو وہ بیماری دور ہو جائے گی۔ نفاق کی بیماری کا اصل سبب چونکہ دنیا کی محبت ہے اور دنیا کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مال کی محبت ہے لہذا اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل سے مال کی محبت ختم کر دی جائے اور اس محبت کو ختم کرنے کا موثر طریقہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے:

**آیت ۱۰ ﴿وَانْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾** ”اور خرچ کر دو اس میں

ہے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے“  
 ﴿فَقُولْ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ ⑩ ”پھر وہ  
 اُس وقت کہے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کرتا  
 اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا!“

گویا اتفاق کی بیماری کا بالمثل علاج اتفاق ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کے تحت وضاحت کی جا چکی ہے  
 کہ مال کی محبت کو دل سے نکالنے کے لیے دل کی زمین میں ”اتفاق“ کا بل چلانا پڑتا ہے اور جو لوگ یہ بل چلانے  
 میں کامیاب ہو جاتے ہیں اصل کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ⑪  
 وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ وَالشَّهَادَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ.....﴾

”یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرض حسد دیں ان کو کئی گنا بڑھا کر  
 دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر  
 انہی میں سے صدیق اور شہداء ہوں گے اپنے رب کے پاس.....“

زیر مطالعہ آیت میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کف افسوس ملے گا کہ  
 اے کاش! میں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں اور  
 گھروں کی آرائش و زیبائش پر بے تحاشا خرچ کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب اہل و عیال، عزیز و  
 اقارب، مال و دولت اور جائیداد سب کو چھوڑ کر یہاں سے جانا ہوگا۔ اُس وقت انسان حسرت سے کہے گا کہ  
 پروردگار! کیوں نہ تو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تو اگر ذرا اس وقت کو مال دے تو پھر میں یہ سب کچھ تیری  
 راہ میں لانا دوں، سارا مال صدقہ کر دوں اور میں بالکل سچائی اور نیکوکاری کی راہ اختیار کر لوں۔ لیکن اُس وقت اس  
 حسرت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سنت ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقت معین آجائے تو پھر اسے  
 مؤخر نہیں کیا جاتا!

**آیت ۱۱** ﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا﴾ ”اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب  
 اُس کا وقت معین آ پہنچے گا۔“

قوموں کی ”اجل“ مؤخر ہونے کی ایک مثال تو موجود ہے، حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے معاملے میں عین  
 وقت پر عذاب نازلے کا فیصلہ ہوا تھا، لیکن انسانوں کی انفرادی اجل کبھی مؤخر نہیں کی گئی۔

﴿وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ⑫ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ و شیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہوگی۔ اگر کہیں بالفرض  
 کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کئی کتراؤ گے۔



# سُورَةُ التَّغَابُنِ

## تمہیدی کلمات

سورة التغابن ایمانی مباحث کے حوالے سے قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سے پہلے سورة المنافقون میں نفاق کا بیان تھا۔ نفاق انسان کے ”باطن“ کا منفی پہلو ہے جبکہ اس کا مثبت پہلو ایمان ہے۔ مصحف میں سورة المنافقون کے بعد سورة التغابن کو لا کر گویا تصویر کے دونوں رخ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہاں میں تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ سورة الحديد کے بعد دوسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سورت عطا کی ہے۔ اس سورت کا نظم اور اس کے اسرار و رموز اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے ذہن میں بہت واضح ہیں۔ اس سورت کے نظم کا مختصر تعارف یہ ہے کہ پہلے رکوع کی ابتدائی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے، یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی گئی ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں ان کو قبول کرو، تسلیم کرو اور انہیں حرزِ جان بناؤ اور ان پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔ دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں ان کا بیان ہے۔ جیسے آم کا درخت اگر صحت مند ہوگا تو اس پر آم ضرور لگیں گے، اسی طرح ایمان حقیقی کے ظاہری و باطنی ثمرات بھی ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ ایمان کے ثمرات کے بیان کے بعد آخری تین آیات میں ایمان حقیقی کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنے کی نہایت زوردار و مؤثر ترغیب و تشویق ہے، اور ان میں تقویٰ، سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورة مبارکہ چار حصوں میں منقسم ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیاتِ اتا

يَسْمَحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۚ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَنَسَفَكُمْ ۖ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۚ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ ۚ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَيَعْلَمُ مَا تُسَبِّحُونَ ۚ وَمَا تُعْلِنُونَ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۚ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۖ فَدَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ

ذَلِكَ يَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوْا  
وَاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي  
لَيُبْعَثَنَّ ثُمَّ لَتَنَبَّؤُنَّ يَوْمَ عَلَيْكُمْ ۝ وَذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

**آیت ۱** ﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۝﴾ ”سبح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔“

سورۃ التَّكْوِينِ اَلْمُسَبِّحَاتِ کے سلسلے کی آخری سورت ہے۔ اس سلسلے کی سورتوں میں سے یہ دوسری سورت ہے جس کے آغاز میں يُسَبِّحُ کا صیغہ آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ صیغہ سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں آیا ہے۔ باقی تینوں اَلْمُسَبِّحَاتِ کی ابتدا میں سَبِّحَ کا صیغہ آیا ہے۔

﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ ”اُسی کی بادشاہی ہے اور اُسی کے لیے حمد ہے۔“  
”کل کائنات کی بادشاہی بھی اللہ ہی کی ہے اور کل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا کا مستحق حقیقی بھی صرف وہی ہے۔“  
﴿وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

**آیت ۲** ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ ”وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن۔“

ظاہر ہے تمام انسانوں کا خالق اللہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق کا شکر گزار بن کر رہے اسی کو اپنا معبود جانے اور اسی کے آگے جھکے۔ لیکن بہت سے انسان اللہ تعالیٰ کے منکر اور نافرمان ہیں۔ بظاہر تو یہ بہت عجیب بات ہے کہ مخلوق کا کوئی فرد اپنے خالق کا منکر یا نافرمان ہو لیکن واقعہ بہر حال یہی ہے۔

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“  
آیت کے مضمون کے اعتبار سے اس جملے میں بہت بڑی وعید بھی پنہاں ہے اور ایک بشارت بھی مضمر ہے۔ یعنی اللہ ایک ایک انسان کے اعتقاد و نظریہ سے باخبر ہے۔ وہ ایک ایک انسان کی ایک ایک حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ وقت آنے پر وہ اپنے سب نافرمانوں سے نپٹ لے گا۔ ان الفاظ کا بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اُس کے شکر گزار اور مطیع فرمان ہوں گے ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

**آیت ۳** ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ ”اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ“  
اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات عبث پیدا نہیں کی بلکہ یہ ایک بہت ہی بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے اور انسان اس کی تخلیق کی معراج ہے۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا:

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ ”اور اُس نے تمہاری صورت گری کی تو بہت ہی عمدہ صورت گری کی۔“



انسانی ڈھانچے کی ساخت، جسم کی بناوٹ، چہرے کے خدوخال، غرض ایک ایک عضو کی تخلیق ہر پہلو سے کامل، انتہائی متناسب اور دیدہ زیب ہے۔

﴿وَالْيَهِ الْمَصِيُوۡۤ۟﴾ ”اور اُسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے۔“

کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تخلیق کے بہترین درجے پر (فَعٰی اَحْسَنَ تَقْوِيۡمٍ) بنا کر اور بہترین صلاحیتوں سے نواز کر جانوروں اور کپڑوں مکڑوں کی سی بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا ہے؟ یا کیا تمہاری حیثیت اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک کھلونے کی سی ہے جسے اس نے صرف دل بہلانے کے لیے بنایا ہے اور اس کے علاوہ تمہاری تخلیق کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اپنی نسل کے اعتبار سے تم اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج ہو۔ تمہاری تخلیق ایک بامقصد تخلیق ہے۔ ابھی تم محض ایک وفد امتحان سے گزر رہے ہو، اس کے بعد تمہیں پلٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے۔

اگلی آیت ”ایمان بالعلم“ کے حوالے سے قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس موضوع پر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ اس ایک آیت میں آ گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تین جہتیں (dimensions) بیان ہوئی ہیں۔ پہلی جہت کیا ہے؟

**آیت ۴** ﴿يَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے“

اب دوسری جہت ملاحظہ کیجیے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعْلِنُوۡنَ﴾ ”اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر

کرتے ہو۔“

اور تیسری جہت کیا ہے؟

﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذٰتِ الصُّدُوۡرِ﴾ ”اور اللہ اُس سے بھی باخبر ہے جو تمہارے سینوں کے

اندر ہے۔“

اس آیت کے الفاظ اور مفہوم کے حوالے سے میں بہت عرصہ متر و متر رہا کہ بظاہر تو یہاں الفاظ کی تکرار نظر آتی ہے کہ جو کچھ ہم چھپاتے ہیں وہی تو ہمارے سینوں میں ہوتا ہے، لیکن ہرگز محض جو کچھ کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ آیت کے تیسرے حصے میں ضرور کوئی نئی بات بتائی گئی ہے۔ پھر یکا یک میرا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ مَا تُسِرُّوۡنَ کے لفظ میں ہمارے ان خیالات و تصورات کا ذکر ہے جنہیں ہم ارادی طور پر چھپاتے ہیں، جبکہ ”سینوں کے رازوں“ سے ہماری سوچوں کے وہ طوفان مراد ہیں جو ہمارے تحت الشعور (subconscious mind) میں اٹھتے رہتے ہیں اور جن سے اکثر و بیشتر ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان خیالات کے بارے میں ہم دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے اس حصے کا مفہوم یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تمہارے تحت الشعور کی تہوں میں اٹھنے والے ان خیالات کو بھی جانتا ہے جنہیں تم خود بھی نہیں جانتے، کیونکہ وہ تو

تمہارے جینز (genes) سے بھی واقف ہے: ﴿هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ﴾ (النجم: ۳۲) ”وہ تمہیں خوب جانتا ہے اُس وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے اٹھایا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے۔“

**آیت ۵** ﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُوءُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ﴾ ”کیا تمہارے پاس خبریں آنیں چکی ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے“

قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح اور دوسری اقوام کے واقعات کی قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔

﴿فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ﴾ ”تو انہوں نے اپنے کیے کی سزا اچھ لی“

انہوں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور اس کفر کی یاداش میں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۵) ”اور ان کے لیے دردناک عذاب بھی ہے۔“

دنیا کی سزا بھگتتے کے بعد ان اقوام کے افراد ابھی تو عالم برزخ میں ہیں، لیکن ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے وہ بھی ان کا منتظر ہے۔ اس بڑے عذاب کا سامنا انہیں آخرت میں کرنا پڑے گا۔ اب اگلی آیت میں ان کے کفر کے سبب کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

**آیت ۶** ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ ”یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول آتے رہے واضح نشانیاں لے کر“

﴿فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوْا﴾ ”تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور رخ پھیر لیا“

﴿وَأَسْتَعْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَمِيدٌ﴾ (۶) ”اور اللہ نے بھی (ان سے) بے نیازی اختیار کی۔“

اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز ستودہ صفات۔

یعنی ہر قوم کے لوگ صرف اس بنا پر اپنے رسول کا انکار کرتے رہے کہ یہ تو ہماری طرح کا بشر ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے اس رویے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ تم جدھر جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جیسے رسالت کا انکار بر بنائے بشریت (کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا) غلط ہے ایسے ہی بشریت کا انکار بر بنائے رسالت (کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا) بھی غلط ہے۔ یہ دراصل ایک ہی سوچ کے دو رخ ہیں۔ جیسے انسانی جسم کے اندر ایک بیماری کسی ایک عضو پر کینسر کی شکل میں حملہ کرتی ہے تو کسی دوسرے عضو پر اثر انداز ہونے کے لیے کسی اور روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نظریاتی بیماری کی ابتدائی صورت یہ سوچ تھی کہ ایک انسان یا بشر اللہ تعالیٰ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر قوم نے اپنے رسول پر بنیادی اعتراض یہی کیا کہ یہ تو بشر ہے، یہ بالکل ہمارے جیسا ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور ہماری طرح ہی چلتا پھرتا ہے۔ فلاں کا بیٹا ہے، فلاں کا پوتا ہے، ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ یعنی انہوں نے بشریت کی بنیاد پر رسول کی رسالت کا انکار کر دیا۔ بعد میں اس بیماری نے دوسری شکل

اختیار کر لی۔ وہ یہ کہ جس کو رسول مان لیا پھر اسے بشر ماننا مشکل ہو گیا۔ کسی نے اپنے رسول کو خدا بنا لیا تو کسی نے خدا کا بیٹا۔ صرف اس لیے کہ اسے بشر ماننا انہیں گوارا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں حضور ﷺ سے بار بار کہلوا لیا گیا: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ (الکہف: ۱۱۰) کہ اے نبی ﷺ! آپ ڈنکے کی چوٹ پر کہیے اور بار بار کہیے کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ ہاں مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ لیکن قرآن مجید کے واضح اور تاکیدی احکام کے باوجود مذکورہ نظریات کے اثرات ہماری صفوں میں بھی در آئے، بلکہ ہمارے ہاں تو یہ بھی ہوا کہ اس مسئلے کے تذکر کے نام پر کچھ لوگ دوسری انتہا پر چلے گئے۔ چنانچہ اس حوالے سے اگر کسی نے ”بڑے بھائی“ کی مثال بیان کی یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری دلیل پیش کی تو اس نے بھی حد ادب سے تجاوز کیا۔ ظاہر ہے جب فریقین ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بحث و تکرار کریں گے تو نامناسب الفاظ کا استعمال بھی ہوگا اور غلطیاں بھی ہوں گی۔

بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر انسان ہی تھے، لیکن پیغمبروں کے بعض خصائص ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام انسانوں کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی سیرت میں ایسے کئی خصائص کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ آپ خود تو صوم وصال (کئی کئی دنوں کا روزہ اور اس طرح کے یکے بعد دیگرے کئی روزے رکھنے) کا اہتمام فرماتے ہیں لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے تو آپ نے فرمایا: ((أَيُّكُمْ مِثْلِي؟ إِنْ أَيْتُ أَبَيْتُ بَطْعَمِي رَتْبِي وَيَسْقِي))<sup>(۱)</sup> ”تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے“۔ اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((قَوِ اللَّهَ مَا يَخْفَىٰ عَلَيْكَ رُكُوعُكَ وَلَا سُجُودُكَ، إِنْ لَآ رَأَيْتَكَ وَرَأَىٰ ظَهْرِي))<sup>(۲)</sup> ”اللہ کی قسم! (نماز باجماعت میں) تمہارے رکوع اور تمہارے سجدے مجھ پر مخفی نہیں ہوتے، میں تو اپنے پس پشت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہوں“۔ صحیح بخاری کی روایات میں وَلَا خُشُوعُكُمْ کے الفاظ بھی ہیں کہ نماز میں تمہارا خشوع بھی مجھ سے مخفی نہیں ہوتا۔ پھر معراج کے موقع پر آپ ﷺ کا راتوں رات مکہ سے بیت المقدس تشریف لے جانا، اس کے بعد آسمانوں کی سیر کرنا اور سدرة المنتہی کے مقام پر خصوصی کیفیات کا مشاہدہ کرنا یہ سب آپ کے امتیازی خصائص ہیں۔

دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور پر آپ انسان تھے اور انسانی داعیات و میلانات رکھتے تھے۔ آپ کو چوٹ لگتی تو درد محسوس کرتے، جنگ احد میں زخم آیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا، میثاق فوت ہوا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کبھی جذبات کی ایسی کیفیت بھی ہوئی کہ زبان سے بددعا بھی نکل گئی: ((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمًا خَصَبُوا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالْذَمِّ))<sup>(۳)</sup>

”اللہ تعالیٰ اُس قوم کو کیسے کامیاب کرے گا جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کر دیا!“

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب التَّنْكِيلُ لِمَنْ أَكْثَرَ الْوَصَالِ ح ۱، ۶۸۵، ۱۹۶۵ء۔ وصحیح مسلم،

کتاب النِّصَامِ، باب النَّهْيِ عَنِ الْوَصَالِ فِي الصَّوْمِ۔ ح: ۱۱۰۳۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصَّلَاةِ، باب الْأَمْرِ بِتَحْسِينِ الصَّلَاةِ وَاتِمَامِهَا وَالْخُشُوعِ فِيهَا۔

(۳) صحیح ابن ماجہ للالبانی، ح: ۳۲۶۹۔

بہر حال بلاشبہ آپ بشر تھے جیسا کہ قرآن مجید ہمیں تکرار کے ساتھ بتاتا ہے، لیکن آپ کی بشریت کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا تھا جو آپ کے شایان شان تھا — اب اگلی آیت میں ایمان بالآخرت کا ذکر ہے:

**آیت ۷** ﴿رَعِمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا﴾ ”کافروں کو یہ زعم ہے کہ وہ (مرنے کے بعد) ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔“

﴿قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّيْنَ بِمَا عَمِلْتُمْ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے، تم لازماً اٹھائے جاؤ گے پھر تمہیں لازماً بتلایا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں۔“

اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے انسانی زبان سے اس کا بیان ناممکن ہے! اللہ کا فرمان رسول اللہ ﷺ کی قسم اور انتہائی تاکید سیغوں کا استعمال! اس سے بڑھ کر زوردار عبارت بھلا اور کونسی ہوگی۔ حضور ﷺ نے بنو ہاشم کو دعوت کے سلسلے میں جو خطبہ دیا تھا اس کا مضمون اور اسلوب بھی اس جملے سے ملتا جلتا ہے۔ میرے کتا بچے ”دعوت الی اللہ“ میں اس خطبے کا پورا متن موجود ہے۔ اس کتا بچے کا انگریزی ترجمہ بھی Call to Allah کے عنوان سے ہو چکا ہے۔ اس خطبے کا اسلوب ملاحظہ ہو:

﴿وَاللّٰهُ لَتَمُوْنَنَّ كَمَا تَتَمَوْنَنَّ كَمَا تَسْتَفِظُوْنَ، ثُمَّ لَتَحَاسِبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتَجْزُوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالشُّوْءِ شُوْءًا، وَاِنَّهَا لَعَجَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا﴾<sup>(۱)</sup>

”خدا کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلے کا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔“

﴿وَذٰلِكَ عَلٰی اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ ”اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔“

یہ ابتدائی سات آیات ایمان کے بیان سے متعلق تھیں۔ ان میں پہلی چار آیات ذات و صفات باری تعالیٰ پر ایمان سے متعلق ہیں۔ پھر دو آیات ایمان رسالت کے بارے میں ہیں جبکہ ساتویں آیت کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ اب اگلی تین آیات میں ایمان کی زوردار دعوت دی جا رہی ہے:

## آیات ۸ تا ۱۰

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِۦ وَالنُّوْرَ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یَّوْمَ یَجْمَعُكُمْ یَوْمَ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّعٰیْنِ ۚ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یَّكْفُرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ وَیَدْخُلْهُ جَنَّتٌ تَجْرٰی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِیْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِآیٰتِنَا ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۙ خٰلِدِیْنَ فِيْهَا ۚ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۙ﴾

بچے

**آیت ۸** ﴿فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ ”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر“

یہاں آیت کے آغاز کی ”ف“ بہت اہم ہے۔ گویا گزشتہ چار آیات کے مضمون کا ربط اگلی تین آیات کے مضمون کے ساتھ اس ”ف“ سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿وَالْتَوِرَ الَّذِي أَنْزَلْنَا﴾ ”اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ۹ ﴿﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

اس آیت میں اللہ رسول اور آخرت سے متعلق تینوں ”ایمانیات“ کا ذکر آ گیا ہے۔ اللہ اور رسول کا ذکر تو واضح ہے لیکن آخرت کا ذکر آیت کے آخری حصے ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ میں اشارتا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ایک ایک عمل کی نگرانی محض تحقیق و تدقیق کی غرض سے ہی تو نہیں کر رہا ہے بلکہ آخرت میں انہیں سزا یا جزا دینے کے لیے کر رہا ہے۔ اب اگلی دو آیات خاص طور پر ایمان بالآخرت کی دعوت سے متعلق ہیں:

**آیت ۹** ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّعَابُفِ﴾ ”جس دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن کے لیے وہی ہے بار اور جیت کے فیصلے کا دن۔“

اصل جیت بھی اس دن کی جیت ہے اور اصل ہار بھی اس دن کی ہار ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہاریا جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دنیا کی ہار جیت تو کسی ڈرامے کے کرداروں کی ہار جیت کی طرح ہے جس کا متعلقہ کردار کی حقیقی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اب آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن کی جیت کس کے حصے میں آئے گی اور اس دن کی ہار کس کے گلے کا ہار بنے گی۔

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ”اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کرے“  
ان اعمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

﴿يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ ”وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

﴿ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ۱۰ ﴿﴾ ”یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔“

یہ جیت کی شرح ہوگی، یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل، واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے اگلی آیت میں واضح فرما دیا گیا:

**آیت ۱۰** ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”اور جنہوں نے

انکار کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی وہی ہوں گے جنہی وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔“

﴿وَبَشِّرِ الْمَصِيرُ﴾ ۱۱ ﴿﴾ ”اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“

گزشتہ دس آیات میں ایمانیاں ثلاثہ (ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی بہترین اور

جامع ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور پھر ایمان کے لیے زوردار دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح کہ جس موضوع کا بیان مفصل ہے اس کے لیے دعوت مختصر آدی گئی ہے اور جو موضوع مختصر طور پر بیان ہوا ہے اس کی دعوت نسبتاً مفصل انداز میں آئی ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا بیان چھ آیات میں ہوا ہے اور ان کے لیے دعوت صرف ایک آیت (آیت ۸) میں دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایمان بالاخرت کا بیان صرف ایک آیت (آیت ۷) میں ہوا ہے لیکن اس کی دعوت کا ذکر دو آیات (آیت ۹ اور ۱۰) میں نسبتاً تفصیل سے ہوا ہے۔

## آیات ۱۱ تا ۱۵

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عِدًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعَفَّوْا وَلَتَضَعُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَآ جَزَّ عَظِيمٌ ۝

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ثمرات ایمانی کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے:

**آیت ۱۱** ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ”نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔“

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ

اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

ایمان حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتہ تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے: ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ) ”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور آ نکھالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندہ سو من بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تول میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرف شکایت زبان پر لاتا ہے بلکہ وہ ہر حال میں پیکر تسلیم و رضا بن رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوش آئے یا غم! مجھے قبول ہے تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا تسلیم تم ہے! بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقام خاص تک صرف سچے اور مخلص اہل ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمان حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں ہے۔

**آیت ۸** ﴿فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ ”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر“

یہاں آیت کے آغاز کی ”ف“ بہت اہم ہے۔ گویا گزشتہ چار آیات کے مضمون کا ربط اگلی تین آیات کے مضمون کے ساتھ اس ”ف“ سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿وَالنُّورَ الَّذِي أُنْزِلُنَا﴾ ”اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

اس آیت میں اللہ رسول اور آخرت سے متعلق تینوں ”ایمانیات“ کا ذکر آ گیا ہے۔ اللہ اور رسول کا ذکر تو واضح ہے لیکن آخرت کا ذکر آیت کے آخری حصے ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ میں اشارتا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ایک ایک عمل کی نگرانی محض تحقیق و تدقیق کی غرض سے ہی تو نہیں کر رہا ہے بلکہ آخرت میں انہیں سزا یا جزا دینے کے لیے کر رہا ہے۔ اب اگلی دو آیات خاص طور پر ایمان بالآخرت کی دعوت سے متعلق ہیں:

**آیت ۹** ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ”جس دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن کے لیے وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔“

اصل جیت بھی اس دن کی جیت ہے اور اصل ہار بھی اس دن کی ہار ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہار یا جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دنیا کی ہار جیت تو کسی ڈرامے کے کرداروں کی ہار جیت کی طرح ہے جس کا متعلقہ کردار کی حقیقی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اب آگے وضاحت کی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن کی جیت کس کے حصے میں آئے گی اور اس دن کی ہار کس کے گلے کا ہار بنے گی۔

﴿وَمَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ”اور جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کرے“  
ان اعمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

﴿يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ ”وہ اس

کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

﴿ذَلِكَ الْقَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ”یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔“

یہ جیت کی شرح ہو گئی، یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا غلہ! گویا یہ ہے مستقل واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے اگلی آیت میں واضح فرما دیا گیا:

**آیت ۱۰** ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”اور جنہوں نے

انکار کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی وہی ہوں گے جنہی وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔“

﴿وَبُئِيَ الْمَصِيرُ﴾ ”اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“

گزشتہ دس آیات میں ایمانیات ثلاثہ (ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی بہترین اور

جامع ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور پھر ایمان کے لیے زوردار دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح کہ جس موضوع کا بیان مفصل ہے اس کے لیے دعوت مختصر آدی گئی ہے اور جو موضوع مختصر طور پر بیان ہوا ہے اس کی دعوت نسبتاً مفصل انداز میں آئی ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا بیان چھ آیات میں ہوا ہے اور ان کے لیے دعوت صرف ایک آیت (آیت ۸) میں دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایمان بالاخرت کا بیان صرف ایک آیت (آیت ۷) میں ہوا ہے لیکن اس کی دعوت کا ذکر دو آیات (آیت ۹ اور ۱۰) میں نسبتاً تفصیل سے ہوا ہے۔

## آیات ۱۱ تا ۱۵

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعَفَّوْا وَتَصَفَّحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَ أَجْرٍ عَظِيمٍ ۝

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ثمرات ایمانی کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا شعر یہ ہے:

**آیت ۱۱** ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ﴾ ”نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔“

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ

اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

ایمان حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے: ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ (البقرہ) ”اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور انحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔“ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندہ مؤمن بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تو دل میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرف شکایت زبان پر لاتا ہے بلکہ وہ ہر حال میں پیکر تسلیم و رضا بنا رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: يَبْدِكَ الْخَيْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوش آئے یا غم مجھے قبول ہے، تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا سر تسلیم خم ہے! بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقام خاص تک صرف سچے اور مخلص اہل ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمان حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں:۔



نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ  
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!  
علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں مقام تسلیم و رضا کی برکات کا ذکر بڑے پُر شکوہ انداز میں کیا ہے:-  
بروں کشید ز چپچاپک ہست و بود مرا  
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا!  
(اس مقام رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے ہیں اور مجھے دنیا کی کیسی کیسی پریشانیوں سے نجات دلا دی ہے۔)

خوئے تسلیم و رضا کی وجہ سے انسان اپنا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی اللہ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور جو انسان اس یقین سے محروم ہے وہ دن رات اسی بیچ و تاب میں پڑا رہتا ہے کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ آخر یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ اگر میں اس وقت ایسا کر لیتا تو اس نقصان سے بچ جاتا! اگر میرا فلاں دوست عین وقت پر ایسا نہ کرتا تو ایسا نہ ہوتا! کاش میں یوں کر لیتا! کاش! اے کاش!..... گویا انسان اگر مقام تسلیم و رضا سے نا آشنا ہو تو چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس کے دل کا روگ بن جاتے ہیں اور اس کے پیچھے تادے کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ (سورۃ الصف، سورۃ الجمعۃ، سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن) یہ چاروں سورتیں ہمارے ”مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب“ میں شامل ہیں، جس کے مفصل دروس کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔)

اس حوالے سے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور ہر سختی یا تکلیف کو اس کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے کا تعلق انسان کے ایمان اور دل سے ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کسی جرم کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کریں یا اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا بدلہ نہ لیں۔ بہر حال ایمان کے ثمرات میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے کہ حقیقی ایمان انسان کو مقام تسلیم و رضا سے آشنا کرتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق چونکہ انسان کے احساسات سے ہے اس لیے یوں کہہ لیجیے کہ یہ وہ پھول ہے جو ایک بندہ مؤمن کے دل کے اندر کھلتا ہے، باہر سے نظر نہیں آتا۔ باہر سے نظر آنے والے بڑے پھول کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

**آیت ۱۲ ﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾** ”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی۔“  
**﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلُّغُ الْمُبِينُ﴾** ”پھر اگر تم نے پیٹھ موڑ لی تو جان لو کہ ہمارے رسول (ﷺ) کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ ان احکام کے بارے میں اب ہر کوئی خود جواب دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کے مقابلے میں اب کسی انسان کی دلیل بازی نہیں چلے گی۔ جیسے سود کی حرمت کا حکم سن کر بعض لوگوں نے کہا تھا: ﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الزُّبُرِ﴾ کہ کاروبار کا منافع بھی تو رہا (سود) ہی کی مانند ہے! ایسے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا کہ: ﴿وَاحْلَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزُّبُرَ﴾ (البقرہ: ۲۷۵) کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ اب بھلا تم کون ہو اللہ کے واضح حکم کے بعد اپنی منطق بگھارنے والے؟ اگر تم اللہ کو مانتے ہو، اس کے رسول کو مانتے ہو، اس کے قرآن کو مانتے ہو تو پھر اللہ اس کے رسول ﷺ اور قرآن کے احکامات کے مقابلے میں تمہاری کوئی دلیل نہیں چلے گی۔

تمہیں سب احکام بے چون و چرا تسلیم کرنے ہوں گے۔ بقول اکبر الہ آبادی:۔

رضائے حق پر راضی رہ، یہ حرف آرزو کیسا! خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم، تو کیسا؟

اور اگر نہیں مانتے ہو تو سیدھی طرح اقرار کرو کہ ہم نہیں مانتے۔ بس تمہارے پاس یہی دوراستے ہیں یا تو اطاعت و فرمانبرداری کی روش اپناؤ یا پھر اس کے در سے اٹھ کر چلے جاؤ! (either obey or go away)۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

**آیت ۱۳** ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ ”اللہ وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پس اہل ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔“

اے اہل ایمان! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ کی مشیت اور مرضی سے ہوگا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ محنت کرو اور اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کوئی کام کرنے کی استطاعت بھی رکھتے ہو، تمہارے پاس تمام وسائل بھی موجود ہیں اور تم حالات کو بھی کئی طور پر سازگار دیکھتے ہو تو بھی کبھی مت کہنا کہ میں یہ کام ضرور کر لوں گا۔ اگر تم ایسا دعویٰ کر بیٹھو گے تو ایمان سے دور ہو جاؤ گے: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا يُعْطَىٰ مِنَّا فَعَلُوا ذَلِكَ غَدًا ۖ ﴿١٣﴾ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الکہف) ”اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کروں گا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے!“ کثرتِ وسائل کے زعم میں فتح کی امید رکھو گے تو وہی حال ہوگا جو لشکر اسلام کا وادیِ حنین میں ہوا تھا۔ وادیِ حنین میں دشمن کی تیر اندازی کی وجہ سے اہل ایمان کی صفوں میں ایسی بھگدڑ مچی تھی کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق تین چار سو اور ان کے استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے مطابق صرف تیس چالیس لوگ حضور ﷺ کے ساتھ کھڑے رہ گئے تھے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۵ میں اس کا سبب بھی بتا دیا گیا: ﴿إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ كُفِّرُوا بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ﴾ (التوبہ: ۲۵) کہ اس دن اہل ایمان میں سے بعض لوگوں کے دلوں میں اپنی کثرتِ تعداد کا زعم پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال مؤمنین کو ہر طرح کے حالات میں اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے اور صادق الایمان مؤمنین ہر حالت میں بلاشبہ اللہ پر ہی توکل کرتے ہیں۔ یہ توکل علی اللہ بھی شجرِ ایمان کا وہ پھول ہے جو اہل ایمان کے دلوں اور ذہنوں کے اندر کھلتا ہے۔ گویا یہ ایمان کا تیسرا ثمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تہذیب و تمدن کی گاڑی کو چلانے کے لیے ”علائقِ دنیوی“ کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ تو یہی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت کی طرف آگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے:

**آیت ۱۴** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ﴾ ”اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، سو ان سے بچ کر رہو۔“

یہ بہت مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ گزشتہ سورت میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی عداوت سے بھی انہی الفاظ میں خبردار کیا گیا تھا: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرُوهُمْ﴾ (المنفِقُونَ: ۴) کہ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں ان سے بھا کر رہیے! جس طرح منافقین کی دشمنی تمہارے لیے نقصان دہ ہے اسی طرح تمہارے بیوی بچوں کی محبت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نقصان بے شک کسی کی دشمنی کی وجہ سے ہو یا محبت کی وجہ سے، نقصان ہی ہے اور جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو وہ ظاہر ہے آپ کا دشمن ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں اور بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات اگر حلال کی کمائی سے پوری نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا؟ ظاہر ہے حرام میں منہ مارے گا۔ اور اگر کوئی یہ نہیں کرے گا تو ذرا اور پیروڈا رکھنے کے چکر میں ملک سے باہر چلا جائے گا۔ پیچھے سے بیوی بچے کیا کرتے ہیں؟ بوڑھے والدین کس حال میں ہیں؟ انہیں بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس کون لے کر جائے گا؟ اس کی بلا جانے! اس کی اپنی مجبوری ہے، مکان بنانا ہے، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے، ان کی شادیاں کرنی ہیں اور اس سب کچھ کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اور ظاہر ہے سرمایہ گھریٹھے تو نہیں ملتا، نہ ہی حلال کی کمائی سے ملتا ہے۔

اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ اور آخرت کی فکر عطا کی ہے اور وہ حرام سے بچتے ہوئے روکھی سوکھی کھا کر گزرا کرنا چاہتا ہے تو اسے صبح وشام بیوی کے طعنے چین نہیں لینے دیتے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، تمہیں بچوں کے مستقبل کی فکر بھی نہیں۔ ذرا ہمسائے سے ہی سبق حاصل کر لیتے، کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ وہ تم سے زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں، ان کی داڑھی بھی تم سے لمبی ہے، مگر وہ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی نبھارہے ہیں۔ ذرا دیکھو ان کے بیوی بچے کیسے عیش کر رہے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ اوپر کی کمائی سے ہو رہا ہے۔ اب تم کیا ان سے بھی بڑے دین دار ہو کہ جو سب کچھ ان کے لیے حلال ہے تم اسے اپنے اوپر خواہ مخواہ حرام کر کے بیٹھ گئے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج ہمارے ہاں کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی بچوں کی دشمنی والی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی، لیکن اگر کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہے تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جائے گی کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بنتی ہے۔ یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے اس لیے اس سخت حکم کے بعد اگلے جملے میں اس ضمن میں نرمی اختیار کرنے کی ہدایت بھی کی جا رہی ہے۔ قوانین اور احکام کا یہ توازن کلام الہی کا خاص معجزہ ہے اور اس اعتبار سے یہ آیت اعجاز قرآن کی بہت بڑی مثال ہے۔ ایک طرف متنبہ بھی کر دیا کہ تمہیں اپنے اہل و عیال کے معاملے میں سانپ کی طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیوی اور اولاد کی محبت تمہیں کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ لیکن اگلے جملے میں غفور و درگزر کا حکم بھی دے دیا کہ تم اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نبھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر صبح وشام میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے:

﴿وَإِنْ تَعَفُّواْ وَتَصْصَفُواْ وَتَغْفِرُواْ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔“

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی غفور و درگزر کا معاملہ فرمائے تو تم بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرو۔ سورۃ النور کی اس آیت میں بھی بالکل یہی اسلوب نظر آتا ہے: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔“ یہ آیت واقعہ ایک کے حوالے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ آپؓ نے اپنے ایک نادار رشتہ دار (حضرت مسطحؓ) کی کفالت کا ذمہ لے رکھا تھا، لیکن جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کچھ اچھا لنے میں اس کا بھی حصہ تھا تو آپؓ نے اس کی مدد سے ہاتھ روک لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تم خود اللہ سے معافی کے خواستگار ہو تو تم اسے معاف کر دو۔ بہر حال ان دونوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ خود بہت معاف اور درگزر کرنے والا ہے بلکہ اپنے بندوں سے بھی وہ ایسے ہی رویے کو پسند کرتا ہے۔

زیر مطالعہ آیات میں اب تک ایمان کے چار ثمرات کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے پہلے تین کا تعلق تو ایک فرد کی انفرادی زندگی سے ہے، جبکہ چوتھا اثرہ فرد کے گرد بننے والی اجتماعیت کے پہلے حلقے یعنی اس کے افراد خانہ سے متعلق ہے۔ انفرادی سطح کے تین ثمرات کو میں نے بندہ مؤمن کی شخصیت کے چمن میں کھلنے والے خوبصورت پھولوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان میں سے دو پھول تو وہ ہیں جو اس کے دل کے اندر کھلتے ہیں اور باہر سے ہر کسی کو نظر نہیں آتے، یعنی خوئے تسلیم و رضا اور توکل علی اللہ۔ جبکہ تیسرا پھول اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا پھول ہے، جو شخصیت کے خارج میں کھلتا ہے۔ ظاہر ہے اَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ کے حکم میں تو پورے کے پورے دین کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں رہتے ہوئے یہ پھول بجا طور پر بندہ مؤمن کی شخصیت کا طرہ امتیاز بنتا ہے۔

ایمان کے چوتھے ثمرے کا تعلق بندہ مؤمن کی عاقلی زندگی سے ہے۔ اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ ہمیں انتہائی متوازن اور معتدل رویے کا شعور عطا کرتی ہے۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اہل و عیال کی طبعی محبتوں کے منفی اثرات سے ہوشیار بھی رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ غفور و درگزر کی حکمت عملی اپناتے ہوئے گھر کی فضا کو محاذ آرائی اور نفرت کے ٹکدر سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہنا ہے۔ اب اسی حوالے سے دوسری اصولی اور انتہائی اہم بات:

**آیت ۱۵** ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ”تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں۔“

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں: ﴿زَيْنَ النَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ (آل عمران: ۱۴) ”مزن کی ردی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوبات دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی۔“

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں یہ محبتیں پیدا ہی ان کو آزمائش کے لیے کی ہیں۔ اس کا تو اعلان ہے کہ میرے

جس بندے کے دل میں مجھ تک پہنچنے کی تڑپ ہے اسے ان تمام رکاوٹوں اور آزمائشوں کو عبور کر کے آنا ہوگا۔  
 انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے!  
 حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ)) (۱)

”جہنم کو نفس کی مرغوب چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔“  
 ان ناپسندیدہ چیزوں میں مال و اولاد کی محبتوں کی قربانی سرفہرست ہے۔ آج اگر کسی شخص کے بارے میں آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کے دل میں کتنا ایمان ہے تو یہ دیکھ لیجیے کہ وہ اپنی اولاد کو کیا بنانا چاہتا ہے۔ بظاہر ایک شخص اگر بہت بڑا عالم دین، صوفی، مسند نشین اور پیر طریقت ہے لیکن اپنی اولاد کو وہ ایمان و آخرت کے راستے پر ڈالنے کے بجائے پیسے بنانے والی مشین بنانے کی کوشش میں ہے تو جان لیجیے کہ اس کے باطن میں دین اور دینی القدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب اس سلسلے کی تیسری بات سنئے:

﴿وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ ”اور اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔“

تمہارے اعمال کا اصل اجر اور بدلہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملے گا، لہذا کسی اور سے کسی اجر کی توقع نہ رکھنا۔  
 اولاد کے بارے میں بھی مت امید رکھنا کہ وہ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ ہو سکتا ہے یہی اولاد جس کے لیے آج تم اپنا ایمان تک داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہو بڑھاپے میں تمہیں ٹھوکرین مارے اور بعض اوقات اولاد کی زبان کی ٹھوکرین والدین کے لیے ان کی پاؤں کی ٹھوکروں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس تکلیف کی کیفیت اس باپ سے پوچھیں جس کا بیٹا اس کے سامنے سینہ تان کر کہتا ہے: ابا جان آپ ہمیشہ بے موقع بات کرتے ہیں اس معاملے میں آپ خاموش رہیں آپ کو کیا معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے!

## آیات ۱۶ تا ۱۸

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُؤَقِّ شَرَّ  
 نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْبَٰرِحُونَ ۝ إِنْ تَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ  
 وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝ عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اس سورہ مبارکہ کی آخری تین آیات ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا﴾ ”پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حد امکان

تک اور سنو اور اطاعت کرو“

گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں بلکہ امکانی حد تک جتنا اس کے حد استطاعت میں ہے۔ البتہ کسی انسان میں کتنی استطاعت واستعداد اور وسعت

وطاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلف اور جواب دہ ہے اس کا صحیح شعور و ادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا اور وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے، حالانکہ انسان کا خالق خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت، استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق ہر انسان کا محاسبہ اور مواخذہ فرمائے گا۔

ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا، لہذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا ”سمع و طاعت“ کے حوالے سے بیان ہوا، جس کا نقطہ آغاز عملی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی ذات و شخصیت ہے۔ سمع و طاعت کا تعلق اصلاً ایمان باللہ سے ہے، لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے اس لیے کہ اگرچہ مطاع حقیقی تو اللہ ہی ہے، مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اذن سے بالفعل ”مطاع“ بن کر رسول آتا ہے تو اس کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (آیت ۸۰) ”جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں پر وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا کا حکم خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قابل غور نکتہ یہ ہے کہ قبل ازیں آیت ۱۲ میں جب وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہاں کون سی اطاعت کے لیے بلایا جا رہا ہے؟ اس مسئلے کو یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں مختلف مواقع پر مختلف امور کے لیے امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے مقرر کردہ امیر کی اطاعت بھی متعلقہ اہل ایمان پر اسی طرح لازم تھی جیسے کہ خود حضور ﷺ کی اطاعت۔ اس بارے میں حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح ہے:

﴿مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي﴾ (۱)

”جس نے میری اطاعت کی اُس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی“ اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی۔“

غزوہٴ احد میں تیر اندازوں کی جس نافرمانی پر سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں بھی وعید آئی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اجتماعی سزا بھی دی گئی وہ دراصل حضور ﷺ کی براہِ راست نافرمانی نہیں تھی بلکہ آپ کے مقرر کردہ کمانڈر کے حکم کی نافرمانی تھی۔ اسی حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ امیر کی اطاعت صرف حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لازم نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے لازم ہے اور آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی اطاعت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ کہ دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے مشن کو تو قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ ہر زمانے میں اللہ کی مشیت اور توفیق سے اللہ کے بندے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اٹھتے رہیں گے اور اہل

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب تعامل من وراء الامیر وبتقی بہ۔ وصحیح مسلم، کتاب

ایمان کو دعوت دیتے رہیں گے۔ چنانچہ ہر دور کے اہل ایمان پر لازم ہے کہ جب بھی اللہ کا کوئی بندہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کا علمبردار بن کر اٹھے اور مَنْ اَنْصَارِيْ اِلٰی اللّٰہ کی صدا بلند کرے تو وہ اس کی بات سنیں۔ پھر اگر ان کا دل گواہی دے کہ اس کی دعوت خلوص و اخلاص پر مبنی ہے تو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان و انصار بنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ جیسے ماضی قریب میں سید احمد بریلویؒ، حسن البناؒ، شہیدؒ مولانا الیاسؒ اور مولانا مودودیؒ اپنے اپنے زمانے میں پورے خلوص کے ساتھ دعوت و اقامت دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے اہل ایمان نے اللہ کی توفیق سے ان کی آواز پر لبیک بھی کہا۔

یہ آیت آج ہم سے بھی تقاضا کرتی ہے کہ ہم ایسے ”داعی الی اللہ“ کی تلاش میں رہیں۔ پھر اگر ہمارا دل گواہی دے کہ اللہ کا فلاں بندہ واقعی خلوص نیت سے رسول اللہ ﷺ کے مشن کو لے کر کھڑا ہوا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی پکار پر لبیک کہیں تاکہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے سمع و طاعت کی بنیاد پر ایک مربوط و مضبوط و منظم جماعت وجود میں آ سکے۔ ظاہر ہے اگر مسلمان خود کو ایک امیر کے تحت ایسی جماعت کی شکل میں منظم نہیں کریں گے تو ان کی حیثیت ایک ہجوم کی سی رہے گی۔ ذرا تصور کریں! ہر سال حج کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا جو ”ہجوم“ اکٹھا ہوتا ہے اگر یہ لوگ کسی ایک امیر کے تحت ایک جماعت کی شکل میں منظم ہوتے تو ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیتے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال کا یہ شعر بہت بصیرت افروز ہے:-

عید آزاداں شکوہ ملک و دیں عید ٹکڑوں جھگڑاں ہجوم مؤمنین!  
ایمانیات کے ضمن میں آخر میں ایمان بالآخرت کا ذکر تھا، جس کا اہم ترین عملی مظہر اتفاق فی سبیل اللہ ہے:

﴿وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِّأَنْفُسِكُمْ﴾ ”اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔“  
﴿وَمَنْ يُؤْكَلْ شَحْ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ﴿۱۵﴾ ”اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔“

یعنی جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھا ہے وہ اس کے راستے میں نچھاور کر دو۔ جیسا کہ سورۃ الحديد میں فرمایا گیا ہے:

﴿إِٰمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِهِ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلْنٰکُمْ مُّسْتَخْلِفِیْنَ فِیْہِ فَاَلْذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَہُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ﴾ ﴿۷﴾

”ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس کے رسول پر خرچ کر دو اس سب میں سے جس پر اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو بھی) خرچ کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔“

**آیت ۷** ﴿اِنْ تَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضَعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ﴾ ”اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لیے کئی گنا بڑھا دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔“

﴿وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ﴾ (اور اللہ شکور (یعنی قد روان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔“ وہ ایسا شکور ہے کہ بندہ جو کچھ بھی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے اور حلیم ایسا ہے کہ اس کے بار بار ترغیب دلانے کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کچھ نہیں دیتا وہ فوری طور پر اس کی گردن نہیں ناپتا۔

**آیت ۱۸** ﴿عَلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”جاننے والا ہے چھپے اور کھلے سب کا“ وہ بہت زبردست ہے، کمال حکمت والا ہے۔“

یعنی وہ غائب و حاضر، چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب تقویٰ، اطاعت اور انفاق پر کاربند رہنے والے اہل ایمان کے لیے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں اور وہ تمہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے کامل غلبہ و اقتدار کا مالک ہے۔ اس لیے کہ وہ ”العزیز“ ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے اس لیے کہ جہاں وہ ”العزیز“ ہے وہاں وہ ”الحکیم“ بھی ہے۔

نوٹ کیجیے! اس سورت کا اختتام الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ پر ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء گزشتہ چاروں الْمُسْتَبَحَات (سورۃ المدید، سورۃ الحشر، سورۃ الصف، سورۃ الجمعہ) کے آغاز میں آئے ہیں۔ گویا ان اسماء کو الْمُسْتَبَحَات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ چنانچہ اس سورت (سورۃ التغابن بھی الْمُسْتَبَحَات میں سے ہے) کے آغاز میں یہ دونوں نام نہیں آئے تو اختتام پر آگئے ہیں۔





# سُورَةُ الطَّلَاق

## تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گلدستے کا آخری اور نہایت ہی حسین جوڑا سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں کی باہمی مناسبت اور مماثلت کی ایک علامت تو یہ ہے کہ دونوں کا آغاز یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ کے کلمہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مضمون بھی مشترک ہے۔ دونوں سورتوں میں اسلام کے معاشرتی نظام بلکہ خاص طور سے عائلی نظام سے متعلق نکات زیر بحث آئے ہیں۔ عائلی قوانین اور معاشرتی اقدار کی جزییات و تفصیلات کو قرآن مجید میں جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کے مسلسل چار رکوع اور سورۃ النساء کے متعدد مباحث اس موضوع کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ پھر سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں بھی اس موضوع سے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ الحجۃ کا آغاز بھی ایک عائلی مسئلے (ظہار) سے ہوتا ہے اور پھر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم دو مکمل سورتیں بھی اسی مضمون سے متعلق ہیں۔

میاں بیوی کا جوڑا چونکہ انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اس لیے معاشرے کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دو افراد کے باہمی تعلقات توازن اور اعتدال کی حدود کے اندر رہیں۔ اس کی مثالی صورت تو یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی بحیثیت مسلمان ایک طرف اللہ تعالیٰ کے حقوق کما حقہ ادا کرنے والے ہوں اور دوسری طرف وہ ایک دوسرے کے ان حقوق کی ادائیگی پر بھی کمر بستہ رہتے ہوں جو اسلام نے ان پر عائد کیے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مرد اور عورت پر اللہ کی طرف سے عائد کردہ بنیادی دینی فرائض تو ایک جیسے ہی ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام شرعی احکام و حدود کی روشنی میں اپنی اپنی جگہ دونوں کو کرنا ہے۔ البتہ دعوت و تبلیغ کی فرضیت کے حوالے سے عورت کا دائرہ عمل عورتوں اور محرم مردوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ جبکہ اقامت دین کی جدوجہد (خصوصی طور پر جہاد و قتال) میں عورتیں حسب استطاعت بالواسطہ کردار ادا کرنے کی ہی مکلف ہیں۔ مثلاً وہ اپنے بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کو ایسے سازگار حالات اور مواقع فراہم کر سکتی ہیں جن میں وہ اقامت دین کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں یکسوئی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ بہر حال ایک مثالی اور متوازن عائلی زندگی کا نقشہ یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے فرائض و ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے والے ہوں۔

اس حوالے سے دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتوں میں عدم موافقت کی وجہ سے گھر کے معاملات معمول کے مطابق نہ چل رہے ہوں اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں بھی مسلسل کوتاہی ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے کا ماحول رہے گا اور اگر یہ اختلاف بڑھتا جائے گا تو طلاق کی

نوبت بھی آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی صورت حال سے متعلق مسائل سورۃ الطلاق میں بیان ہوئے ہیں (واضح رہے کہ طلاق کے مسائل اور تو انہیں وضوابط کا ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے)۔ گھریلو زندگی میں عدم توازن کی دوسری انتہا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی اور اہل و عیال کی اس حد تک دلجوئی کرے کہ اس میں شریعت کے احکام اور دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے تقاضوں کا بھی خیال نہ رہے۔ یہ موضوع سورۃ التحریم میں آئے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اگرچہ ان دونوں سورتوں میں خصوصی طور پر **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ** کے الفاظ میں براہ راست حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے، لیکن اصل میں اس سے امت کی تعلیم مقصود ہے اور اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کو امت کے معلم کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الطلاق کی پہلی آیت کے حکم سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکم کا حضور ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ آپ نے نہ تو اپنی کسی زوجہ کو طلاق دی اور نہ ہی آپ کو طلاق دینے کی اجازت تھی۔ اس لیے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۶ میں حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کو امت کی مائیں قرار دیا گیا ہے اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ کے مطابق حضور ﷺ کے بعد بھی وہ کسی اور سے نکاح کر سکتی تھیں۔ لہذا آپ کا اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو طلاق دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے سورۃ الاحزاب ہی کی آیت ۵۰ میں آپ کو چار ازواج کے بعد مزید نکاح کرنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ ان دونوں سورتوں پر میرے مفصل لیکچرز کی ریکارڈنگ دستیاب ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند خواتین و حضرات اس ریکارڈنگ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات اتاے

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ ۚ وَبَلَّغُوا حُدُودَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ۚ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوِي عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ ذَلِكَ يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۚ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۚ وَالَّذِي يُبَيِّنَ مِنَ النِّجَاسِ مَنْ يُسْأَلُكُمْ أَنْ ارْتَبْتُمْ فَعَدَّتْهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ ۚ وَالَّذِي لَمْ يَحْضَنْ ۚ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ

مِنْ أَمْرِهٖ يُسْرًا ۚ ذٰلِكَ أَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ وَيُعْظِمْلَهٗ  
اَجْرًا ۚ اَسْكِنُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وَّجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوْهُمْ لِنَفْسِكُمْ عَلَيْهِنَّ ۚ  
وَاِنْ كُنَّ اُولٰٓئِ حَمِلًا فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ  
فَاُوْرَهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاتَّبِعُوْا اٰيٰتِنَا لَعَلَّكُمْ تَعْرِفُوْنَ ۚ وَاِنْ تَعٰسَرْتُمْ فَمَسْرُوعٌ لَّهٗ اٰخَرٰى ۚ فَلْيَنْفِقْ  
دُوْسَعَةً مِّنْ سَعَتِهٖ ۚ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُفْسِقْ ۚ فَاِنَّهٗ اِلٰهٌ لَا يَكْفِيْكَ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا  
ع ۚ مَا اٰتٰهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۚ

**آیت** ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ ”اے نبی (ﷺ) جب آپ لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا پورا لحاظ رکھو۔“  
نوٹ کیجیے! حضور ﷺ کو صیغہ واحد میں مخاطب کرنے کے بعد فوراً جمع کا صیغہ (طَلَّقْتُمْ) آ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود حضور ﷺ کی ذات سے نہیں عام اہل ایمان سے متعلق ہے اور آپ کو اہل ایمان کے نمائندہ، معلم اور ہادی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ عدت کے حساب سے طلاق دینے اور عدت کا لحاظ رکھنے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نازک اور حساس معاملے میں شریعت کی طے کردہ حدود و قیود کا لحاظ رکھو اور متعلقہ قوانین کی سختی سے پابندی کرو۔ مثلاً حیض کی حالت میں طلاق نہ دو، تینوں طلاقیں اکٹھی نہ دو، ہر طلاق کی عدت کا حساب رکھو، عدت کے دوران عورت کا نکاح نہ کرو۔ میاں بیوی کے درمیان ایک یا دو طلاقیں کے بعد ہونے والی علیحدگی کی صورت میں ان دونوں کے آپس میں دوبارہ نکاح کے حق کو تسلیم کرو وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمُ﴾ ”اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو تمہارا رب ہے۔“

﴿لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِّنْ بُيُوتِهِنَّ﴾ ”انہیں مت نکال باہر کرو ان کے گھروں سے“

ایسا نہ ہو کہ غصے میں طلاق دی اور کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے، ابھی اور اسی وقت ایہ طریقہ قطعاً غلط ہے۔

﴿وَلَا يَخْرُجُنَّ اِلَّا اَنْ يَّاتَيْنِ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ ”اور وہ خود بھی نہ نکلیں، سوائے اس کے کہ وہ

ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا۔“

عام حالات میں تو طلاق کے فوراً بعد عورت کو گھر سے نہیں نکالا جاسکتا، اور نہ ہی اسے از خود نکلنے کی اجازت

ہے۔ لیکن اس دوران اگر وہ بدکاری وغیرہ میں ملوث ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے اس گھر سے نکالا جاسکتا ہے۔

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ﴾ ”اور یہ اللہ کی حدود ہیں۔“

﴿وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ ”اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اس

نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔“

﴿لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللّٰهُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ ”تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اس کے بعد اللہ

کوئی نئی صورت پیدا کر دے۔“

طلاق کے بعد اگر عورت شوہر کے گھر میں ہی عدت گزار رہی ہو تو حالات بہتر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کیا معلوم اللہ تعالیٰ ان دونوں میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے اور وہ پہلی طلاق کے بعد ہی رجوع کر لیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حالات ہمیشہ کے لیے سازگار ہو جائیں۔

**آیت ۲** ﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ﴾ ”پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مینا کو پہنچنے لگیں تو اب ان کو یا تو (اپنے نکاح میں) روک رکھو معروف طریقے سے یا جدا کر دو معروف طریقے سے“

یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت پوری ہو جانے سے پہلے مرد کو حتمی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر تو وہ رجوع کرنا چاہتا ہے تو شریعت کے طے کردہ طریقے سے رجوع کر لے اور اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر بھلے طریقے سے عورت کو گھر سے رخصت کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ستانے کی غرض سے روکے رکھے۔

﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ”اور اپنے میں سے دو معتبر اشخاص کو گواہ بنا لو“  
یعنی اگر کوئی طلاق کے بعد رجوع کرنا چاہے تو وہ اپنے لوگوں میں سے کم از کم دو معتبر اشخاص کی موجودگی میں ایسا کرے۔

﴿وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾ ”اور گواہی قائم کرو اللہ کے لیے۔“  
﴿ذَلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ”یہ ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے ہر اُس شخص کو کہ جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخر پر۔“

اس سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ میں حضور ﷺ کے اُسوہ اور سورۃ الممتحنہ کی آیت ۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے اُسوہ کے بارے میں بھی آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضور ﷺ کا اُسوہ کاملہ تو اپنی جگہ پر موجود ہے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی زندگی بھی مثالی نمونہ ہے، لیکن کس کے لیے؟ ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾۔ یعنی حضور ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوہ حسنہ سے استفادہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور یومِ آخرت کی حاضری کی امید رکھتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے اس جملے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مسائل طلاق سے متعلق یہ وعظ اور نصیحت صرف اسی شخص کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے جو واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا﴾ ”اور جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔“

اللہ کے تقویٰ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کا یہ بہت حسین اور دلکش انداز ہے اور اس اعتبار سے یہ قرآن مجید کا منفرد مقام ہے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ حقیقی تقویٰ دل کا تقویٰ ہے، جس کے بارے میں

حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے دست مبارک سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((الْقَوَايِ هُنَا، الْقَوَايِ هُنَا، الْقَوَايِ هُنَا))<sup>(۱)</sup> کہ اصل تقویٰ یہاں (دل کے اندر) ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا براہِ راست تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ اگر دل میں تقویٰ نہیں تو مجتہد و ستار کا اہتمام اور متقیانہ وضع قطع کی حیثیت بہرہ وپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اہل تقویٰ کو بہت بڑی بشارت سنائی جا رہی ہے کہ اگر کسی بندہ مؤمن کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول و منظور ہوا تو اس کے لیے مشکل سے مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیا جائے گا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو فرعون نے انہیں ساحل سمندر پر جالیا۔ اب آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ بظاہر ہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا۔ اسی طرح جب حضور ﷺ غار ثور میں تشریف فرما تھے تو مشرکین مکہ میں سے کچھ لوگ آپ کے کھوج میں غار کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اگر ان لوگوں نے نیچے اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھ لیا تو ہم انہیں نظر آ جائیں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ((لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا)) (التوبة: ۴۰) کہ آپ فکر مت کریں، اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتِ حال پیدا فرمادی کہ مشرکین آپ کو نہ دیکھ سکے۔ حضور ﷺ کے سفر طائف کی مثال لیں تو بظاہر وہاں سے آپ خالی کا تھو والہیں آئے تھے، لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مدینہ سے کھڑکی کھولی اور ایسے حالات پیدا فرمادیے کہ آپ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے ہی وہاں انقلاب آ گیا۔ یہ مثالیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے متقی بندوں کے لیے ضرور ”مخرج“ پیدا فرماتا ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف اہل ایمان کے لیے آیت زیر مطالعہ کے ان الفاظ میں یہ خوشخبری ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اپنی کوششیں پورے خلوص سے جاری رکھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو ان کوششوں کی کامیابی منظور ہوگی تو حیرت انگیز طریقے سے منزلِ خود چل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔

**آیت ۳** ﴿وَيَزِدُّهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ”اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔“

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ہے۔ اس لیے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرمانِ الہی: ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الانعام) کو اپنا نصب العین بنانا چاہتا ہے تو اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ اندیشہ بنتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کیسے پوری ہوں گی؟ چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ اہل ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے میرے بندو! تمہارا رازق تو میں ہوں اور تمہیں رزق دینے کے

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وحذله..... وسنن الترمذی، کتاب

البر والصلة والآداب، باب ما جاء في شفقة المسلم على المسلم۔

لیے میں وسائل و اسباب کا محتاج نہیں ہوں۔ تم لوگ ایمان و یقین کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو میں تمہیں وہاں سے رزق دوں گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے :-

کار سازِ ما بہ فکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

کہ ہمارا کارساز تو اللہ ہے اور وہ ہمارے کاموں کی فکر میں مصروف ہے اس لیے ہم اپنے کاموں کی فکر کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں! ظاہر ہے اگر ہم خود اپنے کاموں کی فکر کریں گے تو غلطیاں بھی کریں گے نقصان بھی اٹھائیں گے اور ٹھوکریں بھی کھائیں گے تو کیوں نہ ہم اپنے کام اسے سونپ کر خود کو اس کے کام (اقامت دین کی جدوجہد) میں لگا دیں۔ اللہ تو ایسا قادر دان ہے کہ اگر اس کا کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے تو وہ بدلے میں اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ فِي حَاجَةٍ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ)) (۱) کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ تو اگر اللہ کا کوئی بندہ اپنی ذاتی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر خود کو براہ راست اللہ تعالیٰ کے کام میں لگ دے گا تو کیا اللہ اس کے معاملات کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! ایسا تو دنیا میں ہم انسانوں کے ہاں بھی نہیں ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت اور مروت ہوتی ہے وہ دوسرے انسان کی وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان بھی دوسرے انسان کی وفا شعاری کا صلہ دینا ضروری سمجھتا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک وفا شعار اور متوکل بندے کی کس کس انداز سے دست گیری فرمائے گا۔ یاد رکھیں! توکل کا تعلق بندے کے ایمان سے ہے۔ جس قدر گہرا اور پختہ کسی کا ایمان ہوگا اسی قدر مضبوط اس کا توکل ہوگا۔ آج ہمارے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ پور توکل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے۔ تو آئیے! ہم اپنا ایمان مضبوط کر کے اللہ پر توکل کریں۔ اپنے معاملات کی منصوبہ بندیوں کا دوسرا مول لینے کے بجائے تفویض الامر الی اللہ کی حکمت عملی اپنائیں۔ اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیں اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کے لیے اپنا تن من و دھن کھپا دیں! ————— ﴿وَأَقِمْ وَدَّعَاكَ إِلَى اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ (المومن)

﴿إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ﴾ ”اللہ تو یقیناً اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے دین کو غالب کرنا ہی ہے لیکن اس عظیم الشان کام کے لیے جدوجہد کی سعادت وہ اپنے بندوں کے نام کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے لیے ہر انسان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس منافع بخش ”کاروبار“ میں شریک ہونا چاہتا ہے یا اپنی محرومی پر قناعت کر کے بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ جیسے ابو بکرؓ عمرؓ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، ج: ۲۴۴ و

۶۹۰۱۔ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، ج: ۲۵۸۰۔

عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) اس جدوجہد میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے سرخرو ہو گئے جبکہ ابو جہل، ابولہب اور ان کے ہم نواؤں نے اس سے بے اعتنائی دکھائی اور ابدی محرومیاں اپنے نام کرالیں۔ آج ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیام قیامت سے پہلے پہلے اس کرۂ ارضی پر دین اسلام کو غالب تو ہونا ہے اور یقیناً ہم جیسے انسانوں کی کوششوں اور قربانیوں سے ہی ہونا ہے تو کیا ہم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے کو تیار ہیں یا محرومین کی صفوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا تن من دھن غرض سب کچھ اس جدوجہد میں کھپ جائے اور ہماری ہڈیاں چورابن کر بھی اسلام کی تعمیر نو میں کام آجائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہوگی۔

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۳۱) ”اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“ یہ بہت خوبصورت اور سبق آموز جملہ ہے۔ غلبہ دین کی جدوجہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے کہ اے راہِ حق کے مسافر! تمہاری محنت اور جدوجہد کس کس گھائی سے ہوتی ہوئی کب کہاں پہنچے گی اور اللہ کی مدد کب تمہارے شامل ہوگی؟ اللہ کے ہاں یہ سب کچھ طے ہے۔ یقیناً اس راستے میں کامیابی کا دار و مدار اللہ کی مدد پر ہے، لیکن اللہ کی مدد تو بھی آئے گی جب تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں منجانبِ نبوی کو اپناتے ہوئے ہر اُس راستے سے گزرنا ہوگا جس راستے سے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین گزرے اور ہر وہ سختی برداشت کرنا ہوگی جو آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برداشت کی۔ جب ان تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر آگے بڑھو گے تو خود کو ایک ایسے میدان میں کھڑا پاؤ گے جس کے نشیب و فراز سرزمینِ بدر کے نشیب و فراز سے ملتے جلتے ہوں گے۔ اس میدان کی مخالف سمت سے اسلحہ کی جھنکار اور لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی، جبکہ اس کی فضا ملکوتی تقدس کے احساس سے معمور ہوگی۔ جب تم یہ سب کچھ دیکھو اور محسوس کرو تو جان لینا کہ تمہاری جدوجہد کا فیصلہ کن موڑ آپہنچا ہے۔ بس اس موقع پر تم سجدے میں گر جانا اور رور و کر دعا کرنا کہ اے اللہ! ہم نے تیرے داعی کی دعوت پر لبیک کہا! ہم تیرے پیغام کو لے کر قریرہ قریرہ گھوئے! گلی گلی پھرے! ایک عرصہ تک ہم نے اپنی محسوس اور اپنی شائیں اسی فکر میں بتا دیں! ہم نے اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پھلانگنے اور ہر مشکل گھائی کو عبور کرنے کی کوشش کی! اے اللہ! ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا اور تیری ہی توفیق اور مشیت سے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں معلوم ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کوشش، محنت، ایثار اور قربانی کا حق ادا نہیں کر سکے! لیکن ہم سے جو ہوسکا وہ ہم نے پوری دیانت داری اور اخلاص سے کیا۔ پروردگار! ہم نے اپنی سالہا سال کی محنت کو آج اس میدان میں تیرے حضور پیش کر دیا ہے! اے گناہوں کو معاف کرنے والے! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری اس حقیر سی کمائی کو قبول فرما لے.....!

اگر یہ دعائیں مذکورہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مانگی جائیں گی تو ضرور قبول ہوں گی، تب اللہ کی مدد بھی آئے گی، فرشتے بھی اتریں گے اور دنیوی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔ لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کاروبار بھی چلتا رہے، معیار زندگی بھی برقرار رہے، معمولات زندگی میں بھی خلل نہ پڑے، مال و جان بھی محفوظ رہے، بچوں کے کیریئر بھی

بن جائیں اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اقامتِ دین کا ”کارنامہ“ بھی انجام پا جائے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ ایسے لوگ کسی جماعت کے اراکین کی فہرست میں نام لکھوا کر سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی، دین غالب ہو جائے گا اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس نے کیا قربانی دی ہے، کس نے کتنا وقت لگایا ہے، کس نے کس مرحلے پر کس مہم میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ نہیں! یہ کوئی اندھیر گری نہیں! اللہ کے ہاں ہر چیز اور ہر انسان کے ہر عمل کا حساب موجود ہے! **اَقَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا** اس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے! اب آئندہ آیات میں پھر طلاق سے متعلق مسائل کا ذکر ہے:

**آیت ۴ ﴿وَالَّذِي يَتَسَنَّ مِنَ الْمَحْضِ مِنْ نِسَائِكُمْ﴾** ”اور تمہارے ہاں کی خواتین میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں“

یعنی ایسی عمر رسیدہ خواتین جن کے حیض کا سلسلہ بند ہو چکا ہو۔

**﴿إِنْ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ﴾** ”اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہوگی“ ایسی خواتین کے معاملے میں چونکہ تین طہر اور تین حیض کا حساب کرنا ممکن نہیں اس لیے ان کی عدت کا شمار مہینوں میں کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کی عدت کی مدت تین ماہ ہوگی۔

**﴿وَالَّذِي لَمْ يَحْضَنْ﴾** ”اور (ان کی بھی) جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں۔“ اگر کسی لڑکی کا کمسنی میں نکاح ہو گیا اور ابھی اسے حیض آنا شروع نہیں ہوا تھا کہ طلاق ہو گئی تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہی شمار ہوگی۔

**﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾** ”اور حاملہ خواتین کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔“

ایسی صورت میں وضع حمل جب بھی ہو جائے گا عدت ختم ہو جائے گی، چاہے اس میں نو ماہ لگیں یا ایک ماہ بعد ہی وضع حمل ہو جائے۔ اس کے بعد پھر سے تقویٰ کے بارے میں یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل پہلی اور دوسری آیت میں بھی تقویٰ کا ذکر آچکا ہے:

**﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾** ”اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ اس کے کاموں میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔“

جیسا کہ سورۃ البیل میں فرمایا گیا ہے:

**﴿فَلَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ۝ فَسَنِّسُوهُ لِيُتْسَرَى ۝﴾**

”تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو چھ مانا، اس کو ہم

آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔“

**آیت ۵ ﴿ذَلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْنَا﴾** ”یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے نازل کر دیا ہے تمہاری طرف۔“



یعنی اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لے لی ہے کہ میرے بندوں میں سے جو کوئی میرا تقویٰ اختیار کرے گا میں اس کے معاملات میں ضرور آسانیاں پیدا فرماؤں گا۔

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ﴾ ”اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ اُس کی برائیوں کو اس سے دُور فرما دے گا“

اس حکم کا تعلق خصوصی طور پر آخرت سے ہے۔ یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے شخص کے دنیوی معاملات میں بھی آسانیاں پیدا کر دی جائیں گی اور آخرت کے احساب کے حوالے سے بھی اس کے نامہ اعمال کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا۔

﴿وَيُعْظِمُ لَهُ أَجْرًا ۝۶﴾ ”اور اسے بہت بڑا اجر و ثواب عطا کرے گا۔“

**آیت ۶** ﴿اَسْكُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وَّجْدِكُمْ﴾ ”اور ان عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود

رہتے ہو اپنی حیثیت کے مطابق“

پہلی آیت میں واضح حکم آچکا ہے: ﴿لَا تَخْرُجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾ کہ طلاق کے بعد انہیں فوری طور پر گھر سے مت نکالو اور نہ ہی وہ از خود نکلیں۔ اسی حوالے سے اس آیت میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ عدت کے دوران مطلقہ خاتون کو بدستور ویسی ہی رہائش فراہم کی جائے جیسی کہ تمہارے اپنے استعمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسے گھر سے تو نہ نکالو لیکن کسی ملازمہ کی کوٹھڑی میں ڈال دو۔

﴿وَلَا تُصَارِفُوْهُنَّ لِيُضَيِّقُوْا عَلَيْنَهُنَّ﴾ ”اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ“ انہیں تنگ کرنے کے لیے۔“

گھر سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیلے بہانے سے اسے بار بار اس قدر ستایا جائے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی گھر سے نکل جائے۔ چنانچہ بدینتی پر مبنی یہ طریقہ استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

﴿وَإِنْ كُنَّ اُولَاتٍ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ ”اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔“

دین اسلام ہمدردی اور غم گساری کا دین ہے اور اس کا ایک ثبوت مندرجہ بالا حکم ہے۔ حاملہ عورت کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر حکم دیا گیا کہ طلاق دینے کے بعد بھی حاملہ عورت کا خیال رکھتے ہوئے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے رہو۔

﴿فَإِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَانْظُرُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ”پھر اگر وہ تمہارے لیے (تمہارے بچے کو) دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کرو۔“

﴿وَاتِمِّرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ”اور آپس میں مشورہ کر لیا کرو بھلے طریقے سے۔“

یعنی دودھ پلانے کی اجرت اور عدت سے متعلق معاملات مناسب طور سے آپس کے مشورے سے طے کیے جانے چاہئیں۔ اگر طلاق کے بعد وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہے تو کیا ہوا؟ آخر دونوں انسان تو ہیں۔ چنانچہ انہیں چاہیے کہ تمام معاملات باہمی گفت و شنید سے طے کریں اور ایک دوسرے سے ایسا رویہ اختیار کریں جیسا

کہ ایک شریف انسان کو دوسرے شریف انسان سے اختیار کرنا چاہیے۔

﴿وَأِنْ تَعَاَسَرْتُمْ﴾ ”اور اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو“

مثلاً خاتون ضد میں آ کر دودھ پلانے سے انکار کر دے یا اس قدر معاوضہ مانگے جو مرد ادا نہ کر سکے یا مرد معاوضہ دینے سے انکار کر دے یا کسی اور طریقے سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرنے کی ٹھان لے:

﴿فَسَتَرْضُعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۖ﴾ ”تو پھر کوئی اور عورت اس کے لیے دودھ پلائے گی۔“

**آیت ۷** ﴿لِيُنْفِقُ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ﴾ ”چاہیے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق۔“

﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ﴾ ”اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہے وہ

خرچ کرے اس میں سے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔“

﴿لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَّا آتَاهَا﴾ ”اللہ کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا مگر اسی قدر جو اُس

نے اسے دے رکھا ہے۔“

یعنی عدت کے دوران مطلقہ کی رہائش، حمل کے دوران اس کا نان نفقہ رضاعت کی اجرت وغیرہ کے معیار کا انحصار مرد کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر کشادگی ہے تو مطلقہ پر بھی اسے اسی انداز سے خرچ کرنا چاہیے اور اگر تنگ دستی کی کیفیت ہے تو ظاہر ہے وہ اسی حد تک مکف ہے جس حد تک اس کی استطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کے حالات سے باخبر ہے۔

﴿سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۖ﴾ ”عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا۔“

## آیات ۸ تا ۱۲

وَكَايْنِ مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَدَّ بِنَهَا عَذَابًا ثَقِيرًا ۖ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۖ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۖ رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مَبِينَاتٍ لِّیَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظَّلَمَاتِ إِلَى الثَّوَرِ ۖ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۖ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِیَتَعْلَمُوا أَنَّهُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۖ

ج

**آیت ۸** ﴿وَكَايْنِ مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ﴾ ”اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہوں نے

اپنے رب کے حکم اور اُس کے رسولوں سے سرکشی کی“

﴿فَحَاسِبُنَهَا حِسَابًا شَدِيدًا ۖ وَعَذَابُهَا عَذَابًا نُّكَرًا﴾ ﴿۹﴾ ”تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا بہت شدید محاسبہ اور ہم نے ان کو عذاب دیا بہت ہولناک عذاب۔“

**آیت ۹** ﴿فَلَذِاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا﴾ ”تو انہوں نے اپنے معاملے کی پوری سزا بھگت لی“  
﴿وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا﴾ ﴿۱۰﴾ ”اور ان کے کام کا انجام خسارہ ہی تھا۔“

**آیت ۱۰** ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا﴾ ”اللہ نے ان کے لیے بہت شدید عذاب تیار کر رکھا ہے“  
﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اسے ہوش مند و جو ایمان بھی لائے ہوا۔“

نوٹ کیجیے! یہاں پھر تقویٰ کے بارے میں تاکید کی جا رہی ہے۔ قبل ازیں پہلے رکوع میں چار مرتبہ تقویٰ کا ذکر آچکا ہے۔

﴿قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا﴾ ﴿۱۱﴾ ”اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔“

**آیت ۱۱** ﴿رُسُلًا يَلْعَلُ عَلَيْكُمْ مِنْهُمْ مُبَيِّنَاتٌ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ ”(یعنی) ایک رسول جو اللہ کی آیات و بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنارہا ہے تاکہ وہ نکالے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اندھیروں سے نور کی طرف۔“  
یہاں وضاحت کر دی گئی کہ ذکر سے مراد اللہ کا رسول اور اللہ کی کتاب (الْبَيِّنَاتِ) ہے۔ سورۃ البینہ میں اس موضوع کی مزید وضاحت آئی ہے۔

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ”اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے“  
دین کے تقاضوں کا درست فہم نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے ہاں ”اعمال صالحہ“ کا تصور بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اعمال صالحہ سے اصل مراد یہ ہے کہ ایک بندہ مؤمن ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے۔ مکی دور میں جبکہ ابھی شراب، جوا، سود وغیرہ کی حرمت نہیں آئی تھی اور نماز، روزہ، جہاد و قتال وغیرہ کا حکم نہیں آیا تھا اُس دور میں اہل ایمان کے لیے ”اعمال صالحہ“ یہی تھے کہ وہ ایمان کی دعوت دیں اور اس راستے پر جو تکلیفیں اور آزمائشیں آئیں انہیں استقامت سے برداشت کریں۔ پھر مدنی دور میں جیسے جیسے مزید احکام آتے گئے ویسے ویسے ایمان کے تقاضے بھی بڑھتے گئے اور رفتہ رفتہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، عشر، حج، انفاق، جہاد و قتال وغیرہ بھی اعمال صالحہ میں شامل ہو گئے۔ گویا جس وقت ایمان کا جو تقاضا ہوا ہے پورا کرنے کا نام ”عمل صالحہ“ ہے۔ آج ایک عام مسلمان جب قرآن میں ”عمل صالحہ“ کی اصطلاح پڑھتا ہے تو اس سے اس کے ذہن میں صرف نماز، روزہ اور ذکر اذکار کا تصور ہی آتا ہے جبکہ منکرات کے خلاف جدوجہد اور اقامت دین کے لیے محنت جیسے اہم تقاضوں کو آج اعمال صالحہ کی فہرست سے ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ تو جو کوئی ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرے گا:

﴿يَذْخُلْهُ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ ”وہ اُسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی جن میں وہ لوگ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

﴿قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۝۱۱﴾ ”اللہ نے اس کے لیے بہت عمدہ رزق فراہم کیا ہے۔“  
**آیت ۱۲** ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۚ﴾ ”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے ہیں اور زمین میں سے بھی انہی کی مانند۔“

یہ آیت ”آیاتِ تشابہات“ میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکا۔ ”زمین میں سے انہی کی مانند“ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے اُس نے متعدد آسمان بنائے ہیں ویسے ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ قرآن حکیم کے بعض مقامات پر ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جاندار مخلوقات صرف زمین پر ہی نہیں ہیں، عالم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مفسرین نے اپنے اپنے اندازوں سے اس آیت کی تفسیر کی ہے، لیکن اس کا قطعی مفہوم ہم ابھی نہیں جان سکتے۔ بہر حال کسی وقت اس کی حقیقت انسان پر منکشف ہو جائے گی۔

﴿يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ ”ان کے درمیان (اللہ کا) امر نازل ہوتا ہے“  
 اس سے مراد تدبیر کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اس بارے میں مزید وضاحت سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں ملتی ہے:

﴿يُنَزِّلُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعْلَمُونَ ۝۱۳﴾  
 ”وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔“  
 گویا یہ اللہ تعالیٰ کی ہزار سالہ منصوبہ بندی سے متعلق احکام کا ذکر ہے جو زمین کی طرف ارسال کیے جاتے ہیں۔ متعلقہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان احکام کی تنفیذ عمل میں لاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہزار سال کے اختتام پر یہ ”امر“ اٹھالیا جاتا ہے اور اگلے ہزار سال کا امر نازل کر دیا جاتا ہے۔

﴿لَتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۴﴾ ”تا کہ تم یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے“  
 اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران کئی مرتبہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دو صفات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور قرآن مجید میں ان دو صفات کی بہت بکرا ملتی ہے۔ یعنی اللہ کا عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اور بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہونا۔ لہذا ان دو صفات کے بارے میں ایک بندہ مومن کا مراقبہ بہت گہرا ہونا چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اختیار کے بارے میں اس کے یقین میں کسی لمحے کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۱۵﴾ ”اور یہ کہ اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیا، وہ ہے۔“  
 پہلے اللہ کی قدرت کے بارے میں بتایا گیا اور اب اس کے علم کا ذکر آ گیا۔ یعنی کائنات کی کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ ہے۔



# سُورَةُ التَّحْرِيمِ

## تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الطلاق کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے سورۃ الطلاق میں میاں بیوی کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ سورۃ التحريم کے آغاز میں عائلی زندگی کے دوسرے رخ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کی محبت یا اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو شریعت میں جائز نہ ہو یا بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسا کام نہ کرنے کی قسم کھالے جو کہ شریعت کے مطابق جائز ہو۔ اگرچہ یہ مضمون یہاں پر حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے بیان ہوا ہے لیکن اصل مقصد اس سے امت کی تعلیم ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے تو یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ آپ اپنی کسی بیوی کی دلجوئی کے لیے کوئی خلاف شریعت عمل کرتے۔ البتہ آپ کی سیرت میں دو تین واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپ نے اپنی بیویوں کی دلجوئی کے لیے کوئی ایسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تھی جو کہ آپ کے لیے حلال تھی۔ سورت کی ابتدائی آیات میں یہی موضوع زیر بحث آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## آیات ۱ تا ۵

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ  
قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ  
وَإِذَا سَأَلَ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلْيَا نَبَأًا بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ  
عَنْ بَعْضٍ فَلْيَا نَبَأًا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَأَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ  
إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِلُ وَصَالِحُ  
الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةِ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ عَلَى رَأْيِهِ إِنْ طَلَّقْتُمْ أَنْ يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا  
مِّنْكُمْ مِّسْلِلًا مُّؤْمِنَاتٍ فَمِنْ تَبَلَّتْ بِطْنٍ أُولَاتٍ لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ عَلَيْهِنَّ فَمِيسِرٌ وَالْبَكَارُ

**آیت ۱** يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ”اے نبی (ﷺ) آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟“

﴿تَبْتَغِي مَرْضَاتِ أَرْوَاحِكَ﴾ ”آپ چاہتے ہیں اپنی بیویوں کی رضا جوئی“

﴿وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ① ”اور اللہ بہت معاف کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔“

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی، لیکن اُس نے معاف فرمادیا ہے۔

**آیت ۲** ﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ ”اللہ نے تمہارے لیے اپنی قسموں کو کھولنے کا طریقہ

مقرر کر دیا ہے۔“

یعنی کفارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ سورۃ المائدہ کی اس آیت میں بتایا گیا ہے:

﴿لَا يُوَاحِدُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَيِّدُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْإِنْسَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْفُ ثَلَاثِ رَقَبَةٍ قُلْ لَكُمْ يَجُزُّ فَيْسَامٌ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ②

”اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں لیکن وہ (ضرور) مواخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے سو اس کا کفارہ ہے کھانا کھانا دس مسکین کو اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔ پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔“

گویا آپ اپنی یہ قسم توڑ دیجیے اور اس ضمن میں کفارہ ادا کیجیے۔ بعض مترجمین نے یہاں ”قَدْ فَرَضَ“ کا ترجمہ ”فرض کر دیا ہے“ بھی کیا ہے اور اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ خلاف شرع قسم کا توڑنا فرض ہے۔

﴿وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ ③ ”اور اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ سب کچھ جاننے

والا کمال حکمت والا ہے۔“

**آیت ۳** ﴿وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَرْوَاحِهِ حَدِيثًا﴾ ”اور جب نبی (ﷺ) نے رازداری سے

اپنی کسی زوجہ کو ایک بات بتائی۔“

یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کو راز کی کون سی بات بتائی تھی یا آپ نے کن حالات میں کس چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تفاسیر میں ان آیات سے متعلق واقعات بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے کسی بھی تفسیر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہاں جو اصل بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ایک زوجہ محترمہ کو ایک بات بتائی اور فرمایا کہ یہ میرا راز ہے کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

﴿فَلَمَّا بَيَّنَّاتُ بِهِ﴾ ”تو جب اُس نے اس کو ظاہر کر دیا“

عورتوں کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ راز چھپانے کے حوالے سے طبعی طور پر کمزور ہوتی ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ کمزوری بہت سے مردوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بہر حال ”نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد“۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کمزوری انسان میں طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور اسی بنا پر اس کا صدور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بھی ہوا۔ چنانچہ جس زوجہ محترمہ کو وہ بات بتائی گئی تھی انہوں نے اس کا اظہار آپ کی کسی دوسری زوجہ محترمہ سے کر دیا۔

﴿وَ أَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ﴾ ”اور اللہ نے اس بارے میں ان کو مطلع کر دیا“

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ آپ کا وہ راز اب راز نہیں رہا۔

﴿عَرَفَ بَعْضُهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ﴾ ”تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو)

خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے چشم پوشی کی۔“

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا جزوی انداز سے ذکر فرما کر اپنی زوجہ محترمہ کو اشارتاً بتا دیا کہ مجھے اس راز کے افشا ہونے کا علم ہو چکا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ﴾ ”تو جب آپ نے اسے یہ خبر دی“

﴿قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا﴾ ”اُس نے کہا کہ آپ کو یہ کس نے بتایا؟“

عام میاں بیوی کے درمیان تو ایسے مکالمے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یہاں معاملہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں یہ تنبیہ ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَأَعْلَمُوا أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ﴾ (آیت ۷) ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول ہیں“۔ یعنی آپ کے ساتھ تم لوگ دینی تعلقات اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر معاملہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس معاملے میں محتاط طریقہ عمل تو یہی تھا کہ فوراً معذرت کر لی جاتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے واقف غلطی ہو گئی، بس بے دھیانی میں بات میرے منہ سے نکل گئی.....

﴿قَالَ نَبَّأَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ﴾ ”آپ نے کہا: مجھے اس نے بتایا ہے جو العلیم ہے اور الخبیر ہے۔“

مجھے اس اللہ نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس جواب کے اسلوب اور انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار ناراضی کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔

**آیت ۴** ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ ”اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو (یہی)

تمہارے لیے بہتر ہے، کیونکہ تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں۔“

اس آیت کی تعبیر میں اہل تشیع کا نقطہ نظر یقیناً انتہا پسندانہ ہے، لیکن مقام حیرت ہے کہ ہمارے بعض مترجمین اور مفسرین نے بھی انہی کی روش اختیار کی ہے۔ البتہ مولانا حمید الدین فراہی نے عربی اسلوب کو مد نظر رکھتے ہوئے اس آیت کی جو وضاحت کی ہے میری رائے میں وہ بہت جامع اور بالکل درست ہے۔ اس حوالے سے میں ذاتی طور پر خود کو مولانا صاحب کا احسان مند مانتا ہوں کہ ان کی اس تحریر کی بدولت مجھے قرآن کے اس مقام کا درست فہم اور شعور نصیب ہوا۔

اہل تشیع کے ہاں ﴿فَقَدْ صَعَّتْ قُلُوبُكُمْ﴾ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ دراصل صَعَّتْ ایسا لفظ ہے جس میں منفی اور مثبت دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے مَالٌ اِلٰی کے معنی ہیں کسی طرف میلان یا توجہ ہونا جبکہ مَالٌ عَنْ کے معنی ہیں کسی سے نفرت ہو جانا۔ اسی طرح لفظ رَغِبَ اِلٰی راغب ہونا، محبت کرنا اور رَغِبَ عَنْ ناپسند کرنا کے معنی دیتا ہے۔ صَعَى کا معنی ہے جھک جانا، مائل ہو جانا۔ جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو عرب کہتے ہیں: صَعَتِ النُّجُومُ۔ چنانچہ یہاں اس لفظ کا درست مفہوم مائل ہو جانا ہی ہے کہ اب تمہارے دل میں تو یہ بات آہی چکی ہے اور تمہارے دل تو خطا کو تسلیم کر رہی چکی ہیں، بس اب تم زبان سے بھی اس کا اعتراف کر لو۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خطا کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعتراف اور توبہ کے الفاظ بھی سکھادیے: ﴿فَقُلْتُ اِذْمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ فَتَابَ عَلَيَّ﴾ (البقرة: ۳۷) اور آپ نے سکھائے ہوئے طریقے سے توبہ کر لی۔

اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ مذکورہ بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ چونکہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دربار رسالت میں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل تھا اسی نسبت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہما میں ممتاز تھیں۔

﴿وَإِنْ تَطَهَّرَا عَلَيْهِ﴾ ”اور اگر تم دونوں نے ان کے خلاف گھج جوڑ کر لیا ہے“

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ قرآن مجید کے ایسے مقامات کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ الرَّبُّ رَبٌّ وَإِنْ تَنَزَّلَ وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَإِنْ تَرَفَّعَ۔ اور یہ بھی کہ جن کے مراتب جتنے بلند ہوں ان کا ہمسایہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے: أَحْسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُفْقَرِينَ یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقررین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابلِ گرفت شمار ہو جائے۔ اسی قاعدہ اور اصول کے تحت یہاں یہ سخت الفاظ آئے ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے رسول ﷺ کے خلاف کوئی عمدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سن لو:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾ ”ان کا

پشت پناہ تو خود اللہ ہے اور جبریل اور تمام صالح مؤمنین اور مزید برآں تمام فرشتے بھی ان کے مددگار ہیں۔“ لہذا بہتر تو یہ ہے کہ تم لوگ ہمارے رسولؐ کے ساتھ جو بھی معاملہ کرو ان کے مقام و مرتبہ کی مناسبت سے کیا کرو۔ تمہارا میاں بیوی کا رشتہ اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت کسی لمحہ بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور تم سب لوگ اُمتی ہو۔ تمہارا ان کے ساتھ بنیادی تعلق یہی ہے۔ اس تعلق کے مقابلے میں تمہارے باقی تمام رشتوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے بعد آگے مزید سخت الفاظ آرہے ہیں:

**آیت ۵** ﴿عَلَىٰ رَبِّنَا أَنْ يُلَاقِيَهُمْ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُمْ﴾ ”بعد نہیں کہ اگر وہ تم سب کو

طلاق دے دیں تو ان کا رب انہیں تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا کر دے“



﴿مُسْلِمٌ مُّؤْمِنٌ قَنَاطٌ نَّبِيْلٌ عَدِيْلٌ سَلِيْحٌ نَّبِيْلٌ وَابْكَاْرٌ﴾ ⑤ ”اطاعت شعائرِ ایمان والیاں فرمانبردارِ توبہ کرنے والیاں عبادت گزارِ لذاتِ دنیوی سے بیگانہ شوہر دیدہ بھی اور کنواری بھی۔“

ان الفاظ میں ازواجِ مطہرات پر عیسائی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعتِ شعائرِ ایمان والیاں ہو، فرماں بردار ہو، توبہ کرنے والیاں ہو، بد وقتاعت کرنے والیاں ہو، ان پتھریں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان اوصاف کی حامل تم سے بہتر خواتین اپنے نبی مكرم ﷺ کے لیے ازواج کے طور پر فرما کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے درمیان ”و“ بطور حرفِ عطف نہیں آیا۔ اسے ایک ”و“ کے جو کہ آخر میں آیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اسلوب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواتین ایسی شخصیات ہوں گی جن میں یہ تمام اوصاف بیک وقت موجود ہوں گے۔ سوائے آخری دو اوصاف کے کہ وہ دونوں اوصاف ایک شخصیت میں بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے، اس لیے ان کے درمیان میں ”و“ عطف آگئی ہے۔ — قَنَاط سے مراد ایسی عورتیں ہیں جنہیں نکاح کے بعد طلاق ہوگئی ہو یا وہ بیوہ ہوگئی ہوں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باقی تمام ازواجِ مطہرات قَنَاطات ہی کی حیثیت سے حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

ان ابتدائی پانچ آیات کا تعلق عائلی زندگی سے ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان روزمرہ زندگی کے معاملات کو حدِ اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال بھی رکھا جائے اور دوسرے کے حوالے سے اپنے فرائض کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تمام معاملات پر فوقیت دی جائے۔ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے تو قواعد و ضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شرافت کے ساتھ عیحدگی اختیار کر لی جائے۔ لیکن اگر گھر کے ماحول میں محبت و یکجہالت کا رنگ غالب ہو تو بھی محتاط رہا جائے کہ کہیں بے جا محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود نہ ٹوٹنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ بیوی بچوں کی محبت انسان کو غلط راستے پر لے جائے۔

اس کے بعد کی تین آیات کا تعلق خصوصی طور پر مردوں سے ہے اور یہ دراصل سورۃ الحدید ہی کے مضمون کا تسلسل ہے جو یہاں اس گروپ کی آخری سورت کے اختتام پر آگیا ہے۔

## آیات ۶ تا ۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۚ إِنَّهَا تَحْزَنُونَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۚ عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنهَرُ لَا يَجْزِي اللّٰهَ النَّبِيُّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهُ نُوْهُمْ يَنْصُرُوْهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ  
وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَنْتُمْ لَنَا نُورٌ وَّكَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾

**آیت ۶** ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ”اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے“

اس سے پہلے سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو ان کے اہل و عیال کے بارے میں اس طرح متنبہ کیا گیا ہے:  
﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (آیت ۱۴) ”اے ایمان کے  
دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں پس ان سے بچ کر رہو“۔ سورۃ التغابن کے  
اس حکم کے تحت اہل ایمان کو مافی انداز میں متنبہ کیا گیا ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں انہیں ان کے اہل و عیال کے  
بارے میں مثبت طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے  
راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالے سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریات  
زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے بلکہ ایک مومن کی حیثیت سے اپنے اہل و عیال کے حوالے سے تمہارا پہلا فرض  
یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے  
ان کے قلوب و اذہان میں دین کی سمجھ بوجھ اللہ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ  
وہ بھی جہنم کی اس آگ سے بچ جائیں:

﴿وَقُوْذُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ”جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر“

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غُلٰطٌ شِدَادٌ﴾ ”اس پر بڑے تند خو بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں“

وہ فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے اور نہ ہی وہ ان کے نالہ و شیون سے متاثر  
ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز و نعم میں پالے ہوئے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں  
کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ بہر حال ہم میں سے ہر ایک کو اس زادی سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے  
کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل و عیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟  
اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے  
والی ہے یا ان کے دلوں میں دین سے بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل و عیال کو اچھے مسلمان  
بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف  
راغب کرنے اور فکر آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے  
عداوت کر رہے ہیں۔

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ﴾ ”اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے“

اللہ تعالیٰ جس کو جیسا عذاب دینے کا حکم دے گا وہ فرشتے اسے ویسا ہی عذاب دیں گے۔ کسی کے رونے  
دھونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

﴿وَيَقْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (۶) ”اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔“  
**آیت ۷** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ ”(اُس دن کہہ دیا جائے گا: اے کافرو! آج تم عذر مت پیش کرو۔“

آج تم معذرتیں نہ تراشو! بہانے مت بناؤ!  
 ﴿إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۷) ”آج تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم عمل کر کے لائے ہو۔“

**آیت ۸** ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ ”اے اہل ایمان! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔“

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے زیر مطالعہ سورتوں کے گروپ میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں پل صراط کے اس ماحول کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے جس کی تفصیل سورۃ الحدید میں آئی ہے۔ اس آیت کے ابتدائی حصے میں اہل ایمان کو توبہ سے متعلق جو حکم دیا گیا ہے اس حکم میں بہت جامعیت ہے۔ اس سے مراد صرف کسی ایک برے عمل کی توبہ نہیں کہ کوئی شخص شراب نوشی سے توبہ کر لے یا کوئی رشوت خوری سے باز آ جائے بلکہ اس سے مراد غفلت کی زندگی اور معصیت کی روش سے توبہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ زندگی کا رخ بدلنے کا حکم ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! ذرا اپنی زندگی کے شب و روز پر غور کرو کہ تمہارا رخ کس طرف ہے؟ تمہاری زندگی کے سفر کی منزل کیا ہے؟ تم محمد رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چل رہے ہو یا کسی اور کی پیروی کر رہے ہو؟ ﴿فَإِنَّ تَذَبُّوْنَ﴾ (۸) (النکویں) — تو اے اللہ کے بندو! اپنی زندگی کے شب و روز اور معمولات کا جائزہ لو! اپنی دوڑ دھوپ اور اپنی ترجیحات پر غور کرو۔ پھر اگر تم محسوس کرو کہ تم غلط رخ پر جا رہے ہو تو اپنے بڑھتے ہوئے قدم فوراً روک لو ﴿فَقِفُّوا إِلَى اللَّهِ﴾ (الذاریات: ۵۰) اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ! تمہارے پلٹنے کے لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک تمہاری موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ چنانچہ ابھی موقع ہے کہ اس کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرو، زندگی کے جو غماہ، غفلت کی نذر ہو گئے ہیں ان پر اشکِ ندامت بہاؤ، صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے معافی مانگو اور غلط روش کو ترک کرنے کے بعد زندگی کا سفر از سر نو شروع کرو۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجئے کہ سفرِ زندگی کی سمت درست کرنے کے لیے فرائضِ دینی کا درست فہم اور ادراک بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے دین صرف نمازیں پڑھنے اور رمضان کے روزے رکھنے ہی کا نام نہیں بلکہ ایک بندہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور معیشت کو بھی ”مسلمان“ کرے۔ پھر یہ کہ جو ہدایت اسے نصیب ہوئی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے اور کسی جماعت میں شامل ہو کر دین کے سب سے ہم فرض کی ادائیگی یعنی باطل نظام کے خاتمے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں سرگرم عمل

ہو جائے۔ اس کے لیے انقلابِ نبویؐ کے منہج کو سمجھنا اور اس منہج کی پیروی کرنا بہت ضروری ہے۔ آج ہماری جدوجہد میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محنت اور کوشش کی سی کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی کہ ”وہ رتبہ بلدا جس کو مل گیا!“ لیکن ہمیں آپ کے منہج پر چلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں سہی آپ کی تحریک کے ساتھ اپنی جدوجہد کی کچھ نہ کچھ مماثلت اور مشابہت تو پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد تک دعوت پہنچانے کا اہتمام، دعوت پر لیک کئے والوں کی تنظیم و تربیت کا انتظام، صبر و مصابرت کی حکمت عملی، جیسے ضروری مراحل ہمیں اسی طریقے سے طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس طریقے سے خود حضور ﷺ نے یہ مراحل طے فرمائے تھے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری کتاب ”منہج انقلابِ نبویؐ“ اور اسی عنوان سے تقاریر کی ریکارڈنگ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يَخْفَوْا عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ ”امید ہے تمہارا رب تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے گا“

تمہارے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے نامہ اعمال سے تمام دھبے دھو ڈالے گا اور تمہارے دامنِ کردار کے تمام داغ صاف کر دے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((الْثَّانِي مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ))<sup>(۱)</sup> کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ ہو۔

﴿وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ ”اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی“

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ ”جس دن اللہ اپنے نبی (ﷺ) کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔“

﴿نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ﴾ ”(اُس دن) ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور ان کے دائیں طرف“

یہ مضمون اس سے پہلے انہی الفاظ میں سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ میں بھی آچکا ہے۔ نور ایمان ان کے سامنے ہوگا جبکہ اعمالِ صالحہ کا نور دائیں طرف ہوگا۔

﴿يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورَنَا﴾ ”وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کر دے“

﴿وَاعْفُوْا لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾<sup>(۸)</sup> ”اور تو ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے۔“  
بر بندہ مؤمن کا نور اس کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہوگا۔ حضرت قتادہؓ سے مرسل روایت

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبۃ - صحیح الجامع للالبانی، ج: ۸، ۳۰۰ - راوی: عبد اللہ بن

مسعود و ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہما۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۰/۱۵۴۔

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نور مدینہ سے صنعاء تک اور کسی کا اس سے کم یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا جس کا نور اس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔“ (ابن جریر) <sup>(۱)</sup>

حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تصور کریں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نور کا کیا عالم ہوگا۔ بہر حال ہم جیسے مسلمانوں کو اس دن اگر تاراج کی روشنی جیسا نور بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس دن کچھ لوگوں کا نور کم کیوں ہوگا۔ یقیناً وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے ایمان میں کسی پہلو سے کوئی کمزوری رہ گئی ہوگی اور اعمال میں کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ یقیناً انہوں نے اپنی استعداد کو اپنے مال کو اور اپنی خدا واد صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھا ہوگا اور اللہ کے راستے میں انہیں اس حد تک خرچ نہیں کیا ہوگا جس حد تک خرچ کرنے کے وہ مکلف تھے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کی یہ نصیحت ہمیں حزن و جاں بنالیں چاہیے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں!  
بہر حال پل صراط کے کشمن اور نازک راستے پر جن اہل ایمان کا نور کم ہوگا وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ اے اللہ! تو اپنے فضل اور اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو ڈھانپ لے اور ہمارے نور کو بھی مکمل فرما دے۔

## آیت ۹

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَيْسُ الْمَصِيرِ

**آیت ۹** ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ”اے نبی (ﷺ)! جہاد کیجیے کافروں سے بھی اور منافقوں سے بھی اور ان پر سختی کیجیے۔“

یہ آیت جوں کی توں سورۃ التوبہ میں (آیت ۷۳ کے طور پر) بھی آچکی ہے۔ منافقین چونکہ بظاہر مکمل گواہ اور

(۱) اس ضمن میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

(( يَسْتَمِعُونَ نُورَهُ مِثْلَ الْحَبْلِ الْعَظِيمِ يَسْمَعُونَ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطَى نُورَهُ أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطَى مِثْلَ النَّخْلَةِ بِيَدِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُعْطَى أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ حَتَّى يَكُونُوا آخِرُهُمْ يُعْطَى نُورُهُ عَلَى إِيْنِهِمْ قَدِيمُهُ يُضِيءُ مَرَّةً وَيُطْفَأُ مَرَّةً )) [الترغيب والترهيب للمعتمدی: ۲۹۶/۴ راوی: عبد اللہ بن مسعود رحمہ اللہ امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

”پس ان میں سے بعض کو اتنا نور عطا کیا جائے گا جو بہت بڑے پہاڑ کی مانند ہوگا اور وہ ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا اور کسی کو اس سے کم نور عطا کیا جائے گا۔ اور ان میں کسی کو اتنا نور عطا کیا جائے گا گویا اس کے ہاتھ میں سمجھور کا درخت ہے اور کسی کو اس سے کم نور عطا ہوگا۔ حتیٰ کہ ان میں سے سب سے آخری شخص کا حال یہ ہوگا کہ اس کو بس اتنا نور عطا کیا جائے گا جو اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہوگا جو کبھی جلتا اور کبھی بجھتا ہوگا۔“ (حاشیہ از مرتب)

قانونی لحاظ سے مسلمان تھے، اس لیے حضور ﷺ ان سے مسلمانوں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے ان کی بہت سی شرارتوں کو نظر انداز بھی فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنی مسلسل سازشوں پر جواب دی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کے بارے میں گستاخانہ جملے بھی کہتے رہتے تھے۔ مثلاً کہتے: ﴿هُوَ أَذُنٌ﴾ (التوبہ: ۶۱) کہ آپ تو نرے کان ہیں۔ ہر بات سن لیتے ہیں، سمجھتے کچھ بھی نہیں (معاذ اللہ)۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کو ان لوگوں پر سختی کرنے کا کہا جا رہا ہے۔

﴿وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَبُسَ الْمَصِيرُ ۙ﴾ ”ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔“

## آیات ۱۰ تا ۱۲

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطَ ۖ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ۝ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتْ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ لَهَا فَتْنٌ ۖ وَكَانَتْ مِنَ الْغَافِلِينَ ۝

ان آیات میں عورتوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے زیر بحث آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ ان دونوں سورتوں (الطلاق اور التحریم) کی ایک مشترک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں عورتوں کے معاملات بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب عورتوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ خود کو اپنے شوہروں کے تابع سمجھتے ہوئے آخرت کے حساب سے نچت نہ ہو جائیں۔ اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہے۔ لہذا عورتیں اپنے دین و ایمان اور اعمال و فرائض کی خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا ایمان درست ہوگا اور اعمال صالحہ کا پلڑا بھاری ہوگا تبھی نجات کی کوئی صورت بنے گی۔ ان کے شوہر خواہ اللہ کے کتنے ہی برگزیدہ بندے کیوں نہ ہوں اس معاملے میں وہ ان کے کچھ کام نہیں آسکیں گے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان آیات میں چار خواتین کی مثالیں دی گئی ہیں:

**آیت ۱۰** ﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطَ ۖ﴾ ”اللہ نے مثال بیان کی ہے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی۔“

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ﴾ ”وہ دونوں ہمارے دو بہت صالح بندوں کے عقد میں تھیں“

﴿فَخَانَتْهُمَا فَلَمَّ يُعْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾ ”تو انہوں نے ان سے خیانت کی تو وہ دونوں اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے“

وہ جلیل القدر پیغمبر ﷺ اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہ تو دنیا میں بچا سکے اور نہ ہی آخرت میں بچا سکیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی سیلاب میں غرق ہو گئی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ پتھراؤ کے عذاب سے ہلاک ہوئی۔ واضح رہے کہ یہاں جس خیانت کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کردار کی خیانت نہیں ہے اس لیے کہ کسی نبی کی بیوی کبھی بدچلن اور بدکار نہیں رہی ہے۔ ان کی خیانت اور بے وفائی دراصل دین کے معاملے میں تھی کہ وہ دونوں اپنے شوہروں کی جاسوسی کرتی تھیں اور ان کے راز اپنی قوم کے اوگوں تک پہنچاتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت کی عصمت اس کے شوہر کی عزت و ناموس ہے جس کی حفاظت کرنا شوہر کی طرف سے اس پر فرض ہے لیکن اس کے علاوہ ایک بیوی اپنے شوہر کے رازوں اور اس کے مال و غیرہ کی محافظ بھی ہوتی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں نیک اور مثالی بیویوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت لَحِظْتُ لَلْغَيْبِ بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ نیک بیویاں اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے گھر بار اور حقوق کی محافظ ہوتی ہیں۔ اب ظاہر ہے اس حفاظت میں شوہر کی عزت و ناموس کے ساتھ ساتھ اس کے مال اور اس کے رازوں و غیرہ کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہاں خیانت سے صرف عزت و ناموس ہی کی خیانت مراد لینا درست نہیں۔

﴿وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ﴾ ”اور (آخرت میں) کہہ دیا جائے گا کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے سب داخل ہونے والوں کے ساتھ۔“

ان دو عبرت انگیز مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر جنہوں نے سائے ہوئے نوسوسال اللہ تعالیٰ کے پیغام کی دعوت میں صرف کیے وہ اگر اپنی بیوی کو برے انجام سے نہیں بچا سکے تو اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے کسی عزیز رشتے دار کی سفارش کر سکے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں قبیلہ قریش بالخصوص اپنے قریبی عزیز و اقارب کو جمع کر کے فرمایا تھا:

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشِ! اشْتَرُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ اللَّهِ لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، يَا صَفِيَّةَ عَمَّةَ رَسُولِ اللَّهِ! لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، يَا فَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ! سَلِّبُنِي بِمَا شِئْتَ لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا))<sup>(۱)</sup>

”اے قریش کے لوگو! اپنے آپ کو اللہ (کی گرفت) سے بچانے کی کوشش کرو میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب هل يدخل النساء والولد فی الاقارب، ج: ۲۷۵۳ و ۴۷۷۱۔

و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی قوله تعالى وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، ج: ۲۰۶ (واللفظ له)

آسکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے ضیہ اللہ کے رسول کی پھوپھی! میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے فاطمہ اللہ کے رسول کی بیٹی! تم مجھ سے (میرے مال میں سے) جو چاہو طلب کر لو لیکن میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

((يَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) انْفِذِي نَفْسَكَ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا)) (۱)

”اے محمد (ﷺ) کی لخت جگر فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، کیونکہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔“

**آیت ۱۱** ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ﴾ ”اور اہل ایمان (خواتین) کے لیے اللہ نے مثال بیان کی ہے فرعون کی بیوی کی۔“

اُن کا نام حضرت آسیہ (بنت مزاحم) بیان کیا جاتا ہے۔ دریائے نیل سے حضرت موسیٰ کا صندوق ان ہی نے نکالا تھا اور حضرت موسیٰ کی پرورش کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئی تھیں اور ہمیشہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف داری کیا کرتی تھیں۔ جب فرعون کو پتا چل گیا کہ آسیہ اسے خدا نہیں مانتی اور موسیٰ پر ایمان لا چکی ہے تو اُس نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

﴿إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ ”جب اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! تو میرے لیے بنادے اپنے پاس ایک گھر جنت میں“

﴿وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ﴾ ”اور مجھے نجات دے دے فرعون سے بھی اور اس کے عمل سے بھی“

﴿وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (۱۱) ”اور مجھے اس ظالم قوم سے (جلد از جلد) چھٹکارا دلادے۔“

حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کی اس دعا سے ان کی دینی اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مطلق العنان فرمانروا کی بیوی تھیں۔ اس حیثیت سے انہیں عزت، دولت، شہرت اور محلات میں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ لیکن ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر اور اس کے کافرانہ اعمال سے بیزار ہو کر موت کی آرزو مند تھیں۔

ان دو مثالوں میں دو انتہاؤں کی تصویر دکھادی گئی ہے۔ یعنی ایک طرف بہترین شوہروں کے ہاں بدترین انجام والی بیویاں ہیں اور دوسری طرف ایک بدترین مرد کے گھر میں بہترین سیرت و کردار کی حامل بیوی ہے۔ ظاہر ہے حضرت آسیہ قیامت کے دن حضرت مریم، حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی عظیم مراتب کی حامل خواتین میں شامل ہوں گی۔

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب فی قوله تعالیٰ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، ج: ۲۰۴، و صحیح ابن حبان، ج: ۶۴۶، (واللفظ له)



**آیت ۱۳** ﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ ”اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی“

یہ تیسری مثال ایسی خاتون کی ہے جو خود بھی نیک تھیں اور ان کی تربیت بھی انتہائی پاکیزہ ماحول میں ہوئی: ﴿وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ (آل عمران: ۳۷)۔ یعنی انہوں نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور یوں ان کی سیرت نور علی نور کی مثال بن گئی۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا﴾ ”تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا“  
﴿وَصَدَقَتْ بِكَ لِمَلِئَتْ رَجُوعًا وَكُتِبَ﴾ ”اور اُس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اُس کی کتابوں کی“

حضرت مریم سلام علیہا کو وحی کے ذریعے فرشتے جو کچھ بتاتے رہے انہوں نے وہ سب باتیں دل و جان سے تسلیم کیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے تمہیں دنیا بھر کی عورتوں میں سے چُن لیا ہے اور یہ کہ اللہ کے حکم سے تمہارے ہاں بیٹا ہوگا۔ اسی طرح حضرت مریم نے زبورِ تورات اور عہد نامہ قدیم سمیت تمام الہامی کتب اور صحائف کی تصدیق بھی کی۔

﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ۝۱۴﴾ ”اور وہ بہت ہی فرمانبرداروں میں سے تھیں۔“

ان تین مثالوں کے ذریعے خواتین کے حوالے سے تین ممکنہ صورتیں بیان کی گئی ہیں، یعنی بہترین شوہر کے ہاں بدترین بیوی، بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی اور بہترین ماحول میں بہترین خاتون۔ چوتھی ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شوہر بھی بدطینت ہو اور اس کی بیوی بھی بدطینت ہو۔ یعنی میاں بیوی دونوں کا ظاہر و باطن ﴿ظَلُمْتُ، بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (النور: ۶۰) کا نقشہ پیش کرتا ہو اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ ان دونوں میں کون زیادہ بدطینت اور بدسرشت ہے۔ اس ممکنہ صورت کی مثال سورۃ اللہب میں ابولہب اور اُس کی بیوی (اُمّ جمیل) کی بیان ہوئی ہے۔



# سُورَةُ الْمُلْكِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ التحریم کی مدنی سورتوں کے چھپے گروپ کی آخری سورت تھی۔ یاد دہانی کے لیے ایک مرتبہ پھر نوٹ کر لیجیے کہ اس گروپ کا آغاز سورۃ ق سے ہوتا ہے (سورۃ ق سے ہی قرآن مجید کی ساتویں اور آخری منزل کا آغاز بھی ہوتا ہے)۔ اس گروپ میں سورۃ ق سے سورۃ الواقعة تک سات کئی سورتیں اور سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ اب سورۃ الملک کے مطالعہ کے آغاز کے ساتھ ہم پھر سے قرآن کی ”سبکی جنت“ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سورت سے کئی سورتوں کے آخری گروپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس گروپ کی پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس میں تقسیم ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں جن میں ایک منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ سورۃ الملک پہلے ضمنی گروپ کی منفرد سورت ہے۔ اپنے مضمون کی جامعیت کے اعتبار سے اس گروپ میں اس سورت کا وہی مقام ہے جو پچھلے گروپ میں سورۃ ق کا تھا۔ سورۃ الملک نبی اکرم ﷺ کو بہت عزیز تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اس سورت کی تلاوت کرنا حضور ﷺ کا مستقل معمول تھا۔ آپ نے امت کو بھی اس عمل کی خصوصی تلقین فرمائی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۱۴

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۚ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَوُّتٍ ۚ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۚ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَيُئْسُ الْمَصِيرُ ۝ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورٌ ۚ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۚ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۚ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ ؕ إِنَّا أَننُمُّ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۚ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۚ

فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ  
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝ وَأَسِرُوا قَوْلَكُمْ وَأَجْهَرُوا بِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ أَلَا  
يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝

**آیت ۱** ﴿تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ ”بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے“  
یہ دین اسلام کے سیاسی منشور کی بنیادی شق ہے۔ یعنی پوری کائنات کا اقتدار اور اختیار کئی طور پر اللہ تعالیٰ  
کے دست قدرت میں ہے۔ دنیا میں اگر انسانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کے احکام سے کہیں بغاوت دکھائی دیتی ہے تو  
وہ بھی دراصل اسی کے عطا کردہ اختیار کی وجہ سے ہے۔ اس میں ایمان کے دعوے داروں کا امتحان بھی ہے کہ وہ  
بھلا اللہ کے اقتدار کو پہنچ کرنے والوں کے مقابلے میں کیا طریقہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ سورج، چاند ستارے  
کہکشائیں، ہوائیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند اور تابع ہے۔

پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور قدرت کی کیفیت یہ ہے کہ کہیں کوئی ایک ذرہ بھی اس کی مرضی کے  
بغیر حرکت نہیں کر سکتا اور حرکت کرتا ہوا کوئی ذرہ اس کی مشیت کے بغیر ساکن نہیں ہو سکتا۔ اپنی تمام مخلوق میں  
صرف انسان کو اس نے ایک حد تک ارادے اور عمل کا اختیار دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اس میں انسان کی  
آزمائش مقصود ہے۔ لیکن انسان ہے کہ ہلکی کی یہ گانٹھ ل جانے پر پنساری بن بیٹھا ہے۔ اب کہیں وہ فرعون بن  
کر اللہ کے مقابلے میں ”میری حکومت، میرا ملک اور میرا مثالی نظام“ جیسے دعووں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو کہیں کسی  
فرعون کی چاکری اور وفاداری کی دھن میں مقننہ حقیقی کے احکام کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں انسان  
کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ خود اپنے جسم پر بھی اسے کوئی اختیار نہیں۔ ظاہر ہے انسان کے جسم کی فزیالوجی اور  
انٹومی کا سارا نظام بھی تو اللہ تعالیٰ کے طے کردہ قانون کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ اپنے دل کو آرام  
دینے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بند کر دے اور پھر اپنی مرضی سے دوبارہ رداں کر لے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔  
﴿وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱﴾ ”اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

**آیت ۲** ﴿إِنَّ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لَيَبْلُوْكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾ ”جس نے موت اور  
زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔“

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝۲﴾ ”اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔“  
یہ ہے انسانی زندگی اور موت کی تخلیق کا اصل مقصد۔ جو کوئی اس فلسفے کو نہیں سمجھے گا اسے زندگی، موت اور  
موت کے بعد پھر زندگی کی یہ باتیں محض افسانہ معلوم ہوں گی۔ جیسے ایک معروف جاہلی شاعر نے اپنی بیوی کو  
مخاطب کر کے کہا تھا:

حَيَاةٌ ثُمَّ مَوْتُ ثُمَّ بَعْتُ حَدِيثُ خَرَّافَةٍ يَا أُمَّ عَمْرُو!

”کہ یہ زندگی، پھر موت، پھر زندگی! اے ام عمرو! یہ کیا حدیث خرافات ہے؟“ (معاذ اللہ!) انسانی زندگی کا سفر  
دراصل عالم ارواح سے شروع ہو کر ابد الابد کی سرحدوں تک جاتا ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی، موت اور بعث

بعد الموت اس طویل سلسلہ حیات کے مختلف مراحل ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَكُنْتُمْ أََمْوَآتًا فَآَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (البقرة) ”اور تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر جلّائے گا، پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے“۔ زندگی کے اس تسلسل کے اندر موت کے مرحلے کی توجیہ میر تقی میر نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

بہر حال انسان کی دنیوی زندگی ایک وقفہ امتحان ہے اور موت اس وقفے کے اختتام کی گھنٹی ہے: ﴿نَحْنُ قَدْزَنَّا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾ (الواقعة)۔ اس وقفہ امتحان کا انداز بالکل اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات جیسا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ان امتحانات کے لیے چند گھنٹوں کا وقت دیا جاتا ہے جبکہ انسانی زندگی کے حقیقی امتحان کا دورانیہ اوسطاً تیس چالیس برس پر محیط ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس برس تو بچپن اور غیر سنجیدہ رویے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کسی کو بڑھاپا دیکھنا نصیب ہو تو اپنی آخری عمر میں وہ ﴿لَكِنِّي لَا يَعْلَمُ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ (الحج: ۵) کی عبرت ناک تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ لے دے، کرا ایک انسان کو عمل کے لیے شعور کی عمر کے اوسطاً تیس چالیس سال ہی ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم خضر راہ میں ”زندگی“ کے عنوان کے تحت زندگی کے اس فلسفے پر کمال مہارت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۔ برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی!

۔ تو اسے پیانہ امروز و فردا سے ناپ جاو داں، پییم دو اں ہر دم جو اں ہے زندگی!

۔ قلم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی!

ان اشعار میں علامہ اقبال نے دراصل قرآنی آیات ہی کی ترجمانی کی ہے۔ مندرجہ بالا آخری شعر (قلم ہستی.....) آیت زیر مطالعہ کے مفہوم کا ترجمان ہے جبکہ پہلے شعر میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۴ ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَآتٌ أَبَدًا﴾ کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے عام طور پر تو زندہ جان کو ہی زندگی کا نام دیا جاتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی اور دائمی زندگی جان دے دینے (تسلیم جاں) سے حاصل ہوتی ہے۔

**آیت ۳** ﴿الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا﴾ (وہ اللہ کہ) جس نے بنائے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر۔“

یہ آیت آیات مشابہات میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

﴿مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ﴾ ”تم نہیں دیکھ پاؤ گے رحمن کی تخلیق میں کہیں کوئی فرق۔“ اس کائنات کا نظام اور اس میں موجود ایک ایک چیز کی تخلیق اس قدر خوبصورت، محکم، مربوط اور کامل ہے

کہ اس میں کسی خلل، نقص، رخنے، بد نظمی یا عدم تناسب کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت کی گواہی نسل انسانی نے اپنے اجتماعی علم کی بنیاد پر ہر زمانے میں دی ہے۔ ہر زمانے کے سائنس دانوں نے فلکیات، رضیات، طبیعیات، حیوانیات، نباتات غرض سائنس کے تمام شعبوں میں حیران کن تحقیقات کی ہیں، لیکن آج تک کوئی ایک محقق یا سامعین انہیں یہ نہیں کہہ سکا کہ قدرت کی بنائی ہوئی فلاں چیز میں فلاں نقص ہے یا یہ کہ فلاں چیز اگر ایسے کی بجائے ویسے ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتی۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ۚ﴾ ”پھر لوٹاؤ نگاہ کو، کیا تمہیں کہیں کوئی رخ نہ نظر آتا ہے؟“  
**آیت ۴** ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَوتَبَيْنِ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝﴾ ”پھر لوٹاؤ نگاہ کو بار بار (کوئی رخ نہ دھونڈنے کے لیے) پلٹ آئے گی نگاہ تمہاری طرف ناکام تھک ہار کر۔“

اندازہ کیجیے کہ کس قدر رُپر زور اسلوب ہے اور کتنا بڑا چیلنج ہے! بار بار دیکھو، ہر پہلو اور ہر زاویے سے دیکھو! اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تمہیں کہیں کوئی خلل، نقص یا رخ نہ نظر نہیں آئے گا! ظاہر ہے یہ چیلنج پوری انسانیت کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ بہر حال آج تک کوئی سائنس دان اور کوئی دانشور اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔ گویا اب تک پوری نوع انسانی اس نکتے پر متفق ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ایک ایک تخلیق مثالی اور کامل ہے۔ دراصل دنیا بھر کے داناؤں اور دانشوروں کی توجہ اس مثالی تخلیق کی طرف دلا کر انہیں پیغام تو یہ دینا مقصود ہے کہ اے عقل کے اندھو! کائنات کی خوبصورتی اور کاملیت کو دیکھ کر اس پر حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کے خالق کو پہچاننا اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سر نیا زخم کرو۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار و عجائب کا کھوج لگانے والے بڑے بڑے سامعین اور ماہرین فلکیات بھی اس معاملے میں اپنے ناک تلمے کے پتھر سے ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے دوران بہت کچھ دریافت بھی کیا اور بہت کچھ دیکھا بھی، لیکن اس ساری چھان بین میں انہیں اگر نہیں نظر آیا تو اس کائنات کا خالق کہیں نظر نہیں آیا۔ بقول اقبال :-

دھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

**آیت ۵** ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ﴾ ”اور ہم نے سب سے قریبی آسمان کو سجا دیا ہے چراغوں سے“

یعنی زمین سے قریب ترین آسمان کو ستاروں سے مزین کر دیا گیا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ﴾ ”اور ان کو بنا دیا ہے ہم نے شیاطین کو نشانہ بنانے کا ذریعہ“  
 ان ستاروں میں ایسے میزائل نصب کر دیے گئے ہیں جو غیب کی خبروں کی ٹوہ میں عالم بالا کی طرف جانے والے شیاطین جن کو نشانہ بناتے ہیں۔

﴿وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝﴾ ”اور ان کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے جلا دینے والا عذاب۔“  
**آیت ۶** ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝﴾ ”اور جو لوگ اپنے رب کا

کفر کریں (چاہے وہ انسان ہوں یا جنات) ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے، اور وہ بہت ہی بڑا ٹھکانہ ہے۔“  
**آیت ۷** ﴿إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورٌ ۝﴾ ”جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اسے سنیں گے دھاڑتے ہوئے اور وہ بہت جوش کھا رہی ہوگی۔“

جہنم انہیں دیکھ کر غصے سے دھاڑ رہی ہوگی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے غراتا ہے۔ سورہ ق میں جہنم کے غیظ و غضب کی ایک کیفیت یوں بیان ہوئی ہے: ﴿يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ۝﴾ ”جس دن کہ ہم پوچھیں گے جہنم سے کہ کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟“

**آیت ۸** ﴿تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۝﴾ ”قریب ہوگا کہ وہ غصے سے پھٹ جائے۔“

ایسے معلوم ہوگا کہ ابھی شدت غضب سے پھٹ پڑے گی۔

﴿كَلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝﴾ ”جب بھی ڈالا جائے گا اس میں کسی ایک گروہ کو تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟“

قیامت کے دن ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ حساب ہوگا، جیسا کہ سورۃ النمل کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَيَوْمَ نُحْشِرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝﴾ ”اور ذرا تصور کرو اس دن کا جس دن ہم جمع کریں گے ہر امت میں سے ایک فوج اُن لوگوں میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔“ گویا جیسے جیسے حساب ہوتا جائے گا اسی ترتیب سے ہر قوم کے مجرمین کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ ہر گروہ کے پیچھے پر جہنم پر متعین فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟

**آیت ۹** ﴿قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۝﴾ ”وہ کہیں گے کیوں نہیں! ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا“

﴿فَكَذَّبْنَا﴾ ”لیکن ہم نے اسے جھٹلادیا“

﴿وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۝﴾ ”اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی شے نہیں اتاری۔“

ہم نے اپنے رسولوں سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف کوئی کتاب وغیرہ نہیں بھیجی، بلکہ ہم نے تو انہیں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

﴿إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۝﴾ ”تم تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہو۔“

**آیت ۱۰** ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ ۝﴾ ”اور وہ کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے“

﴿مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝﴾ ”تو ہم نہ ہوتے ان جہنم والوں میں سے۔“

اس آیت میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کے اصل گناہ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے تمام لوگوں کا بنیادی اور اصل جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت سنی اُن سنی کر دی تھی۔ اس دعوت پر انہوں نے کبھی تنجیدگی سے غور ہی نہ کیا اور نہ ہی

پیغمبروں کی باتوں کو کبھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا کی۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے، سننے سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے تودی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں کو کام میں لائے اور اپنے نفع و نقصان کے حوالے سے درست فیصلے کرے۔ اسی بنیاد پر آخرت میں انسان کی ان تمام صلاحیتوں کا احتساب بھی ہوگا: ﴿لَإِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (بنی اسرائیل) ”یقیناً سماعت، بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی“۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو یہ صلاحیتیں استعمال میں لانے کے لیے دی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق کی دعوت کے جواب میں اکثر لوگ ان صلاحیتوں سے بالکل بھی کام نہیں لیتے۔ بلکہ اگر بات سمجھ میں آ بھی جائے اور دل اس کی صداقت کی گواہی بھی دے دے تب بھی عملی طور پر قدم آگے نہیں بڑھتا۔ صرف اس لیے کہ آباء و اجداد کے اعتقادات و نظریات ہیں برادری کے رسم و رواج ہیں! انہیں کیسے چھوڑ دیں؟ اور اگر چھوڑیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اسی نوعیت کی ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ پرانے مسلک سے روگردانی بھلا کیونکر ممکن ہے؟ اتنے عرصے سے اس جماعت میں ہیں اب یکدم اس سے کیسے بے وفائی کر دیں؟

**آیت ۱۱** ﴿فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ﴾ ”پس وہ اپنے اصل گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔“

﴿فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (۱۱) ”پس پھٹکار ہے جہنمی لوگوں کے لیے۔“

اب تقابل کے طور پر آگے اہل جنت کا تذکرہ آ رہا ہے۔

**آیت ۱۲** ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ﴾ ”بے شک وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب

میں رہتے ہوئے“

﴿لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ (۱۲) ”ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔“

**آیت ۱۳** ﴿وَأَسْرَوْا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ﴾ ”اور (دیکھو!) چاہے تم اپنی بات کو چھپا کر بیان کر دیا

بلند آواز سے بیان کرو (وہ اس کو جانتا ہے)۔“

﴿إِنَّهُ عَلَيْهِم بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (۱۳) ”وہ تو اس سے بھی واقف ہے جو تمہارے سینوں کے اندر

پنہاں ہے۔“

**آیت ۱۴** ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ ”کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟“

یہ آیت اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق دی ہے انہیں ایسی آیات آرزو ہونی چاہئیں۔ ایک شخص نے اگر گھڑی بنائی ہے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر بھلا اور کون اس گھڑی کے بارے میں جان سکتا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ جو انسان کا خالق ہے اس سے اس کے ظاہر اور باطن کا کوئی پہلو بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے!

﴿وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (۱۴) ”اور وہ بہت باریک بین ہے ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔“

## آیات ۱۵ تا ۳۰

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ  
 النُّشُورُ ۚ ءَأَمِنْتُمْ مِنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورٌ ۚ ءَأَمِنْتُمْ  
 مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٍ ۚ وَلَقَدْ كَذَّبَ  
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۚ ءَأَمِنْتُمْ أَنْ يُكَلِّمَ الْوَيْلِ إِلَى الطَّيْرِ فَيُوقَهُمْ صَوتًا وَيَقْبِضَ  
 مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۚ ءَأَمِنَ هَذَا الَّذِينَ هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ  
 يَنْصَرُّكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ ۚ إِنَّ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ۚ ءَأَمِنَ هَذَا الَّذِينَ يَزُفُّكُمْ إِنْ  
 أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَلْ تَجْأَوْنِ فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ۚ ءَأَمِنَ يَنْشِئُ مَكِينًا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَى أَمِّنٌ  
 يَنْشِئُ سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۚ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ  
 وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۚ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ  
 تُحْشَرُونَ ۚ وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ  
 اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۚ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيَّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَذَا  
 الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدْعُونَ ۚ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمَنَا ۚ فَمَنْ  
 يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۚ قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنًا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا  
 فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۚ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا ۚ فَمَنْ  
 يَأْتِيَكُمُ بِمَاءٍ مَعِينٍ ۚ

ج

**آیت ۱۵** ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذُلُولًا﴾ ”وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنا دیا ہے زمین کو پست“

اُس نے زمین کو تمہارے ماتحت اور تابع حکم کر رکھا ہے۔

﴿فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا﴾ ”تو تم چلو پھرو اس کے کندھوں کے مابین“

زمین کے کندھوں سے مراد اس کے وہ میدان ہیں جو انسان کو بہت وسیع اور کشادہ نظر آتے ہیں۔ جیسے  
 ایک چوٹی اگر باقی کے کندھوں کے درمیان چل پھر رہی ہوگی تو ظاہر ہے اس جگہ کو وہ بہت وسیع میدان سمجھے گی۔  
 ﴿وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ﴾ ﴿۱۵﴾ ”اور اُس کے (دیے ہوئے) رزق سے کھاؤ پیاؤ اور  
 (یاد رکھو کہ تم نے) اسی کی طرف زندہ ہو کر جانا ہے۔“

**آیت ۱۶** ﴿ءَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ﴾ ﴿۱۶﴾ ”کیا تم بے خوف

ہو گئے ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور وہ یکا یک لرز نے لگے۔“



کیا تم اس بات سے خائف نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر زلزلہ آجائے، زمین شق ہو جائے اور تم اس کے اندر دھنس جاؤ؟

**آیت ۱۷** ﴿أَمْ أَمِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا﴾ ”کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسائے والی آندھی بھیج دے؟“

﴿فَسَعَلُمُونَ كَيْفَ نَذِيرٌ﴾ ”پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا خبردار کرنا کیسا تھا!“

**آیت ۱۸** ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ﴾ ”اور یقیناً ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا تو کیسا ہوا (ان پر) میرا عذاب؟“

**آیت ۱۹** ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفْتٍ وَيَقْبِضْنَ﴾ ”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے ہوئے) کبھی پروں کو پھیلائے ہوئے اور کبھی سیٹے ہوئے؟“

﴿مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ﴾ ”نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) مگر رحمن!“

﴿وَأَنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بِصِيرٌ﴾ ”یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے!“

یعنی اس کائنات کی ایک ایک مخلوق اور ایک ایک چیز جس قانون طبعی پر چل رہی ہے وہ اللہ ہی کا وضع کردہ ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿أَمِنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ﴾ ”بھلا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کرے رحمن کے مقابلہ میں؟“

﴿إِنَّ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ﴾ ”نہیں ہیں یہ کافر مگر دھوکے میں مبتلا ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین صرف دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

**آیت ۲۱** ﴿أَمِنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ﴾ ”پھر بھلا کون ہے وہ جو تمہیں رزق دے سکے اگر اللہ اپنے رزق کو روک لے؟“

﴿بَلْ لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ﴾ ”بلکہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور حق سے گریز میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔“

اگلی آیت فلسفہ و حکمت قرآن کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

**آیت ۲۲** ﴿أَفَمَنْ يَمَسُّ مِثْكَ عَلَى وَجْهِهِ أَهْلًا مِّنْ يَّمَسُّ سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

”تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل گھسٹ رہا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا ہو کر چل رہا ہے ایک سیدھے راستے پر؟“

اس آیت میں دو قسم کے انسانوں کے ”طرز زندگی“ کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ایک قسم کے انسان وہ ہیں جو انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جیسے ان کی حیوانی جبلت انہیں چلا رہی ہے بس اسی طرح وہ چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر تو وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندیاں بھی کرتے ہیں، معاشی دوز دھوپ میں بھی

سرگرم عمل رہتے ہیں، کھاتے پیتے بھی ہیں اور دوسری ضروریات بھی پوری کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے جلی داعیات کے تحت کرتے ہیں۔ جلی داعیات کی تعمیل و تکمیل کے علاوہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں۔ ان لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص فاصلہ طے کرنے کے لیے چو پایوں کی طرح اوندھا ہو کر منہ کے بل خود کو گھسیٹ رہا ہو۔ ظاہر ہے ایسا شخص نہ تو راستہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنی منزل کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ دوسری مثال اُس شخص کی ہے جو سیدھے راستے پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑے ہو کر چل رہا ہے۔ اس مثال کے مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی منزل طے کر رکھی ہے۔ وہ طے شدہ منزل پر پہنچانے والے درست راستے کا تعین بھی کر چکے ہیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس راستے پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے دنیا میں ان لوگوں کی منزل اقامت دین ہے جبکہ آخرت کے حوالے سے وہ رضائے الہی کے حصول کے متمنی ہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے اس کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز و ممتاز کرتی ہے وہ اس کا نظریہ اور اس کی سوچ ہے۔ گویا انسان حقیقت میں وہی ہے جس کا کوئی نظریہ ہو، کوئی آئیڈیل اور کوئی نصب العین ہو۔ جو انسان کسی نظریے اور نصب العین کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان **اَوَّلَئِكَ كَانَا لَنِعَامٍ بَلٰی** **هُم اَضَلُّ سُلٰی** (الاعراف: ۱۷۹) کے مصداق ہیں، یعنی وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے جانوروں کو تو شعور کی اس سطح پر پیدا ہی نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کر سکیں۔ ان کی تخلیق کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی طور پر انہیں اپنے کام میں لائیں اور بس۔ سورۃ الحج کی مذکورہ آیت (آیت ۷۳) میں بتوں اور ان کے پجاریوں کی تمثیل کے پردے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس انسان کا نظریہ یا آئیڈیل بلند ہوگا اس کی شخصیت بھی بلند ہوگی، جبکہ گھٹیا آئیڈیل کے پیچھے بھاگنے والے انسان کی سوچ اور شخصیت بھی گھٹیا ہو کر رہ جائے گی۔

**آیت ۲۳** **قُلْ هُوَ الَّذِي اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۗ** ”کہہ دیجیے کہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔“

لفظی اعتبار سے لفظ **اَنْشَاَ** اٹھانے اور پرورش کرنے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ لفظ ”فواد“ کے مفہوم کی وضاحت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ عام طور پر اس لفظ کا ترجمہ ”دل“ کیا جاتا ہے لیکن اصل میں اس سے مراد انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کی مدد سے وہ دستیاب معلومات کا تجزیہ کر کے نتائج اذکر کرتا ہے۔ چنانچہ اس لفظ میں عقل یا سمجھ بوجھ کا مفہوم بھی شامل ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں جب انسان کی طبعی صلاحیتوں یا حواس کا تذکرہ ہوتا ہے تو **السَّمْعَ** (سماعت) کا ذکر پہلے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی علم کے ذرائع میں پہلا اور بنیادی ذریعہ اس کی سماعت ہے۔ پچھلی نسلوں کے علمی آثار اور تجرباتی علم سے استفادہ کرنا ہر دور کے انسان کی ضرورت رہی ہے۔ اس علم کو بھی نسل در نسل منتقل کرنے کا بنیادی ذریعہ انسان کی سماعت ہی ہے۔ دوسرے حواس یا ذرائع اس

میں اپنا اپنا حصہ بعد کے مراحل میں شامل کرتے ہیں۔

﴿قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ (۲۲) ”بہت ہی کم شکر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔“

**آیت ۲۳** ﴿قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ (۲۳) ”کہہ دیجیے اُسی نے تمہیں

بھیلا دیا ہے زمین میں اور اُسی کی طرف تم اکٹھے کر دیے جاؤ گے۔“

**آیت ۲۵** ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (۲۵) ”وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ؟

اگر تم سچے ہو (تو بتاؤ)!“

**آیت ۲۶** ﴿قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۲۶) ”کہہ دیجیے کہ یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے“

قیامت کے وقوع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی کچھ نہیں جانتا: ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾

(نعمان: ۳۹) ”یقیناً اللہ ہی ہے جس کے پاس ہے قیامت کا علم۔“

﴿وَأَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (۲۷) ”اور میں تو بس ایک واضح طور پر خبردار کر دینے والا ہوں۔“

**آیت ۲۷** ﴿فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۷) ”پھر جب وہ دیکھیں گے اس کو اپنے

قریب آتے تو ان کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے“

﴿وَقِيلَ هَذَا الَّذِي كُنتُمْ بِهِ تَدَّعُونَ﴾ (۲۸) ”اور کہا جائے گا‘ یہ ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ

کرتے تھے۔“

ہماری وعیدوں اور تنبیہات کے جواب میں تم لوگ طنزیہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ لاؤ دکھاؤ کیسی ہے وہ

جہنم! لاؤ ابھی لے آؤ ہمارے اوپر وہ عذاب موعود! تو لو دیکھ لو اب‘ یہ ہے جہنم! تمہارا اصل اور دائمی ٹھکانہ!

**آیت ۲۸** ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكْنِي اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ

الْهِمِّ﴾ (۲۸) ”(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اگر اللہ مجھے اور جو لوگ میرے ساتھ ہیں ان کو ہلاک

کر دے یا وہ ہم پر رحم کرے‘ تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟“

یعنی ہم نے تو اپنا معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ہم اللہ کے بتائے ہوئے جس راستے پر چل رہے

ہیں اس میں یا تو ہماری جانیں چلی جائیں گی یا ہم فتح یاب ہوں گے۔ ان میں سے جو صورت بھی ہو‘ ہمارے لیے

تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ بلکہ ہماری اصل اور ابدی کامیابی تو وہ ہے جسے تم ہلاکت سمجھتے ہو۔ بہر حال

صورت حال جو بھی ہو ان دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی (الْحُسْنَى الْحُسْنَى) (الثبوتہ: ۵۲) تو ہمیں مل کر ہی

رہے گی۔ ہمارے نجبے اور فتح کی صورت میں تو تم بھی ہمیں کامیاب قرار دو گے‘ لیکن ہم اگر بقول تمہارے ہلاک

بھی ہو گئے تو تم اپنے بارے میں بھی تو سوچو کہ تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟

**آیت ۲۹** ﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنٌ بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا﴾ (۲۹) ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ وہ تو رحمن

ہے‘ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اُسی پر ہمارا توکل ہے۔“

یاد رہے کہ زیر مطالعہ کی سورتیں بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھیں اسی لیے ان میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کے ساتھ کفار و مشرکین کی بالکل ابتدائی رد و قدح کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کشمکش کا نقطہ عروج سورۃ الانعام سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود میں دیکھا جاسکتا ہے۔

﴿فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي صَلَاتٍ مُّبِينٍ ۝۳۵﴾ ”تو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون تھا!“

آنے والا وقت واضح کر دے گا کہ ہم گمراہ تھے یا تم۔

**آیت ۳۰** ﴿قُلْ اَرَاَيْكُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَاتِيْكُمْ بِمَاءٍ مَّعِيْنٍ ۝۳۰﴾ ”آپ کہیے کہ ذرا سوچو! اگر تمہارا پانی گہرائی میں اتر جائے تو کون ہے جو لائے گا تمہارے پاس صاف، نھرا ہوا پانی؟“

آج کے دور میں اس آیت کا مفہوم واضح تر ہو کر دنیا کے سامنے آیا ہے۔ آج متعلقہ ماہرین بار بار اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ پانی کے بڑھتے ہوئے استعمال اور بارشوں کی کمی کے باعث مستقبل قریب میں زیر زمین پانی کی سطح خطرناک حد تک نیچے جاسکتی ہے۔ بیشتر علاقوں میں انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کا زیادہ تر دار و مدار زیر زمین پانی پر ہی ہے جو عموماً آسانی سے دستیاب بھی ہے۔ صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ”زندگی“ کے لیے قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ اگر یہ پانی واقعی ایسی گہرائی میں چلا جائے جہاں سے اس کا نکالنا ناممکن یا مشکل ہو جائے تو اس کے نتائج کا تصور بھی روح فرسا ہے۔



# سُورَةُ الْقَلَمِ

## تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الملک کے تعارف میں بھی بیان ہو چکا ہے، زیر مطالعہ کی سورتوں میں سے پہلی چھ سورتیں دو ضمنی گروپس پر مشتمل ہیں۔ ہر ضمنی گروپ میں تین سورتیں ہیں، جن میں ایک سورت منفرد ہے اور دو جوڑے کی شکل میں ہیں۔ پہلے ضمنی گروپ کی پہلی سورت یعنی سورۃ الملک منفرد تھی جبکہ اس کے بعد کی دو سورتیں یعنی سورۃ القلم اور سورۃ الحاقہ جوڑے کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں انباء الرسل کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ سورۃ القلم اپنے گروپ کی تمام سورتوں میں اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بعد حضور ﷺ پر نازل ہونے والی دوسری وحی اس سورت کی ابتدائی سات آیات پر مشتمل تھی۔ ذاتی طور پر مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ ان سات آیات میں اہل مکہ کے اس رد عمل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جس کا اظہار انہوں نے حضور ﷺ کی پہلی وحی کی خبر پر کیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے پہلی مرتبہ لوگوں کو بتایا کہ میرے پاس اللہ کی طرف سے فرشتہ وحی لے کر آیا ہے تو لوگوں کا پہلا تاثر یہی تھا کہ آپ پر کسی جن یا بدروح کا اثر ہو گیا ہے۔ ان میں بیشتر لوگ اپنی اس رائے کا اظہار آپ سے ہمدردی کی بنا پر بھی کرتے تھے کہ دیکھیں یہ اچھے بھلے آدمی تھے، بیٹھے بٹھائے ان کے ساتھ یہ کیا معاملہ پیش آ گیا ہے۔ البتہ کچھ لوگ یہی باتیں آپ کو تنگ کرنے کے لیے طرہ اور استہزائیہ انداز میں بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے لیے یہ صورت حال بہت تکلیف دہ تھی کہ آپ کی اپنی ہی برادری کے وہ لوگ جو کل تک آپ کے قدموں میں نگا ہیں بچھاتے تھے اور آپ کو اپنی آنکھوں کا تار اکھتے تھے آج آپ کو دیوانہ اور مجنون کہہ رہے تھے۔ چنانچہ اس تکلیف دہ صورت حال میں حضور ﷺ کی دلجوئی کے لیے یہ آیات نازل فرمائی گئیں۔ اس سورت کا آغاز اکیلے حرف ”ن“ سے ہوتا ہے۔ سورہ ص اور سورہ ق کے بعد ایک حرف سے شروع ہونے والی یہ تیسری اور آخری سورت ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۳۳

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۚ مَا أَنْتَ بِمُعْجِزٍ ۚ إِنَّكَ لَآجِرٌ غَيْرٌ مُّنُونٍ ۚ وَاتَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۚ فَتَبَصَّرْ وَبَيِّصُرُونَ ۚ بِأَيْكُمُ الْمُقْتُونُ ۚ إِنَّ

رَبِّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِهِنَّ صَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۖ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ۖ  
 وَدُّوا لَوْ تُدْرِكُنْ فَيَذَرُوكَ ۖ وَلَا تُطِعِ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۖ هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِمِمْ ۖ مَتَّاعٍ  
 لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۖ عُتِلَ بَعْدَ ذَلِكَ زَيْمٌ ۖ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۖ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ  
 آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۖ سَنِيهْ عَلَى الْحَرْطُومِ ۖ إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ  
 الْجَنَّةِ ۖ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۖ وَلَا يَسْتَشْنُونَ ۖ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ  
 رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِبُونَ ۖ فَأَصْبَحَتِ كَالصَّرِيمِ ۖ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۖ أَيْنَ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ  
 إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ۖ أَنْ لَا يَدْخُلَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ  
 مَسْكِينٌ ۖ وَغَدُوا عَلَىٰ حَرْدٍ ۖ قَدَرِينَ ۖ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُونَ ۖ بَلْ لَمْ نَحْنُ  
 تَحَرُّوْمُونَ ۖ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۖ قَالُوا سُبْحَنَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا  
 ظَالِمِينَ ۖ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ ۖ قَالُوا يَٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طُغْيَانٌ ۖ عَلَىٰ  
 رَبِّنَا أَنْ يُّبَدِّلَنَا حَيْرًا ۖ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۖ كَذَلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ  
 أَكْبَرُ ۖ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُونَ ۖ

یعنی

**آیت ۱** اِنَّ وَالْقَلَمُ وَمَا يَسْطُرُ ۝ ۱ ﴿۱﴾ ”ن“ قسم ہے قلم کی اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں۔“

یعنی قلم بھی اور جو مٹی ذریعہ نوع انسانی کے ہاں اب تک وجود میں آیا ہے وہ بھی اس حقیقت

پر گواہ ہے کہ:

**آیت ۲** اَمَّا اَنْتَ بِعَمَلِكَ رَبِّكَ بِمَحْجُونٍ ۝ ۲ ﴿۲﴾ ”آپ اپنے رب کے فضل و کرم سے مجنون نہیں ہیں۔“

اے نبی ﷺ! جو لوگ آپ کو مجنون کہہ رہے ہیں وہ خود احمق ہیں جو یہ تک نہیں جانتے کہ مجنون کیسے ہوتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو آپ کی پاکیزہ اور اعلیٰ اخلاق کی حامل سیرت نظر نہیں آتی؟ کیا یہ لوگ واقعتاً سمجھتے ہیں کہ مجنون لوگوں کی زندگی کا نقشہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟ تو اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی فضول اور لاعلمی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔

**آیت ۳** اَوَلَاِنَّ لَكَ لَآخِرًا غَيْرَ مَسْنُونٍ ۝ ۳ ﴿۳﴾ ”اور یقیناً آپ کے لیے تو وہ اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی

منقطع نہیں ہوگا۔“

**آیت ۴** اَوَلَاِنَّكَ لَعَلٰی خَلْقٍ عَظِيمٍ ۝ ۴ ﴿۴﴾ ”اور آپ یقیناً اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔“

آپ اپنے اخلاق اور کردار کے بلند ترین معیار کے باعث پہلے سے ہی معراج انسانیت کے مقام پر فائز تھے جبکہ اب آپ معراج نبوت و رسالت کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔

**آیت ۵** فَاسْتَبْصِرْ وَيَصْرُوكَ ۝ ۵ ﴿۵﴾ ”تو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔“

یہ بڑا پیارا اور ناصحانہ انداز ہے۔ جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے کو سمجھاتا ہے کہ آپ مخالفانہ باتوں پر آزر دہ نہ ہوں کچھ جی دنوں کی بات ہے اصل حقیقت بہت جلد کھل کر سامنے آ جائے گی۔ پھر کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا:

**آیت ۶ ﴿يَا أَيُّكُمُ الْمُفْتُونُ﴾** ”کہ تم میں سے کون فتنے میں مبتلا تھا!“

بہت جلد دنیا پر واضح ہو جائے گا کہ تم دونوں فریقوں میں سے کون فتنے میں مبتلا ہو گیا تھا اور کون راہِ راست پر تھا۔ کیا محمد بن عبداللہ (ﷺ) کو جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا (معاذ اللہ!) یا آپ کے مخالفین جوشِ تعصب میں پاگل ہو گئے تھے؟

**آیت ۷ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ﴾** ”یقیناً آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے“

”وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ“ ﴿۸﴾ ”اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔“  
یہ وہ آیات تھیں جو اکثر مفسرین کے نزدیک دوسری وحی میں نازل ہوئی تھیں۔ یہاں سے آگے نیا مضمون شروع ہو رہا ہے۔

**آیت ۸ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ﴾** ”تو (اے نبی ﷺ) آپ ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔“

**آیت ۹ ﴿وَذُوَا لَوْ نُذِهْنُ فَيَكْدُھُنُونَ﴾** ﴿۹﴾ ”وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ ذرا ڈھیلے پڑیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔“

باطل کا تو وطیرہ ہے کہ پہلے وہ حق کو جھٹلاتا ہے پھر جب اس کے مقابلے میں کھڑے ہونا مشکل نظر آتا ہے تو وہ ہمت (compromise) پر اتر آتا ہے۔ لیکن حق کسی قسم کی ہدایت یا کسی درمیانی راستے کو نہیں جانتا۔ بقول اقبال۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!  
اگلی آیات میں نام لیے بغیر انتہائی سخت الفاظ میں ایک کردار کا ذکر ہوا ہے۔ کسی معتبر روایت سے تو ثابت نہیں لیکن زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات کا مصداق ولید بن مغیرہ تھا:

**آیت ۱۰ ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّھِینٍ﴾** ﴿۱۰﴾ ”اور آپ مت مانے کسی ایسے شخص کی بات جو بہت قسمیں کھانے والا انتہائی گھٹیا ہے۔“

ان دونوں خصوصیات کا آپس میں فطری تعلق ہے۔ اپنی شخصیت کے بندہ پن کی تلافی کرنے کے لیے بات بات پر قسمیں کھانا بھر گھٹیا آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ ”مہین“ ذلیل و حقیر اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

**آیت ۱۱ ﴿ھَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِیمٍ﴾** ﴿۱۱﴾ ”رودرُ و طعنے دیتا ہے چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔“

**آیت ۱۲** ﴿مَتَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اِيْمٌ﴾ ”خیر سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار۔“

**آیت ۱۳** ﴿عَقْلٌ يُّعَدُّ ذَلِكَ رِزِيْمٌ﴾ ”بالکل گنوار ہے اس کے بعد یہ کہ بداصل بھی ہے۔“

یعنی مذکورہ بالا خصلتیں تو اس کی شخصیت میں ہیں ہی سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بے نسب بھی ہے۔

**آیت ۱۴** ﴿اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٌ﴾ ”صرف اس گھمنڈ پر کہ وہ مال و دولت اور بیٹوں والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کو کثیر مال و دولت کے علاوہ بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ اور بیٹے بھی ایسے کہ ان میں سے ایک کو قبول اسلام کے بعد ”سَيِّفٌ مِّنْ سَيُّوفِ اللّٰهِ“ کا مرتبہ ملا۔ یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ!

**آیت ۱۵** ﴿اِذَا تَنَلَّٰى عَلَيْهِ الْيَتٰى قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ ”جب اسے ہماری آیات پڑھ کر سنائی

جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔“

**آیت ۱۶** ﴿سَنَسِيْمُهُ عَلٰى الْخُرْطُوْمِ﴾ ”ہم عنقریب اس کی سوند پر داغ لگائیں گے۔“

ممکن ہے اس کی ناک زیادہ لمبی اور نمایاں ہو۔ وہ خود بھی ازراہ تکبر اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا جس کے لیے حقارت کے طور پر سوند کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ناک پر داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔

اب آئندہ آیات میں ایمان والا آخرت کے حوالے سے بہت عمدہ اور عام فہم تمثیل کے طور پر باغ والوں کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔

**آیت ۱۷** ﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ﴾ ”یقیناً ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمایا

ہے جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔“

اللہ تعالیٰ لوگوں کو طرح طرح کے امتحانات سے آزماتا رہتا ہے۔ ایک انسان کو اگر دولت کی آزمائش میں

ڈالا جاتا ہے تو کسی دوسرے کو غربت کے امتحان سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ سورۃ الملک کی اس آیت میں تو

انسان کی زندگی اور موت کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش بتایا گیا ہے: ﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ

اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَفُوْرُ﴾ ”اس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں

آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔ اور وہ بہت زبردست بھی ہے اور بہت بخشنے والا بھی۔“

﴿اِذَا اَقْسَمُوْا لَيَصْرِفْنَهَا مَصْرِحِيْنَ﴾ ”جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس کا پھل اُتار

لیں گے صبح سویرے۔“

**آیت ۱۸** ﴿وَلَا يَسْتُوْنُ﴾ ”اور انہوں نے (اس پر) ان شاء اللہ بھی نہ کہا۔“

باغ کے پھل یک کر تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک رات پروگرام طے کر لیا کہ وہ صبح سویرے جائیں

گے اور سارا پھل اُتار لائیں گے۔ گویا وہ اپنے اسباب و وسائل کے گھمنڈ میں مست بہ حقیقی کو بالکل ہی بھول گئے۔

**آیت ۱۹** ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُوْنَ﴾ ”پس ایک پھرنے والا پھر گیا اس

(باغ) پر آپ کے رب کی طرف سے جبکہ وہ ابھی سوئے ہوئے ہی تھے۔“



**آیت ۲۰** ﴿فَاصْبِرْ كَمَا الصَّابِرِينَ﴾ ”تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کئی ہوئی فصل ہو۔“

یعنی رات کو وہ باغ کسی بگولے کی زد میں آیا اور بھل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

**آیت ۲۱** ﴿فَتَنَادُوا مُضِرِّجِينَ﴾ ”اب صبح ہی صبح انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔“

**آیت ۲۲** ﴿أَنِ اعْبُدُوا عَلٰی حَزَنِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ ”کہ صبح سویرے چلو اپنے کھیت کی طرف اگر تم بھل توڑنا چاہتے ہو۔“

وہ صبح سویرے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق پھل توڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے جبکہ ان کا باغ رات کو بھل کر تباہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح انسان اپنی دھن میں لگن طرح طرح کے منصوبے بناتا رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کے سامنے اس کے سارے منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی جان لیوا مرض لاحق ہو چکا ہوتا ہے مگر وہ اس سے بے خبر اپنی لمبی لمبی امیدوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رات دن ایک کیے رہتا ہے۔ پھر جب مرض کی تشخیص ہوتی ہے تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

**آیت ۲۳** ﴿فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ﴾ ”چنانچہ وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے یہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔“

**آیت ۲۴** ﴿اَنْ لَا يَدْخُلَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ﴾ ”کہ دیکھو آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں برگز داخل نہ ہونے پائے۔“

دراصل انہوں نے پھل اتارنے کے لیے منہ اندھیرے جانے کا پروگرام بنایا ہی اس لیے تھا تا کہ ایسے مواقع پر آجائے والے غرباء و مساکین کو چکمہ دے سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ باغ پر سارا سال محنت ہم نے کی ہے اس کی حفاظت کی ہے اب پھل اتارنے کے موقع پر ہم اس میں سے غرباء و مساکین کو کس لیے دیں؟ وہ ہمارے کیا لگتے ہیں؟ یہ تھا ان کا اصل جرم جس کی انہیں سزا ملی۔ انسان کے کردار میں ایسی پستی آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے۔

**آیت ۲۵** ﴿وَعَدُوا عَلٰی حَرْدٍ فَلِدْرِيْنِ﴾ ”اور وہ صبح سویرے چلے جلدی جلدی (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر پوری طرح قادر ہیں۔“

یہ آیت لفظی تصویر کشی کی بہترین مثال ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی جو ذہنی نفسیاتی اور ظاہری کیفیت تھی ان الفاظ میں اس کی بوجہ تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ انہیں زعم تھا کہ انہوں نے بڑی کامیاب منصوبہ بندی کی ہے ابھی تھوڑی ہی دیر میں وہ پھل اتار کر لے جائیں گے اور بھیک منگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ [حَرْد کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ یعنی انہوں نے جو یہ ارادہ کیا تھا کہ آج کسی غریب کو باغ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور صبح سویرے باغ کا پھل اتار لیں گے وہ خیال کر رہے تھے کہ ہم اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔]

**آیت ۲۶** ﴿فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُونَ ۝۲۶﴾ ”پھر جب انہوں نے اس (باغ) کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو کہیں بھٹک گئے ہیں۔“

فوری طور پر تو وہ یہی سمجھے کہ وہ اندھیرے میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گئے ہیں اور یہ ان کا باغ نہیں ہے۔ پھر جب انہیں اصل صورت حال کا ادراک ہوا تو کہنے لگے:

**آیت ۲۷** ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝۲۷﴾ ”نہیں نہیں (باغ تو یہی ہے) ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔“  
ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔

**آیت ۲۸** ﴿قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۝۲۸﴾ ”ان کے درمیان والے نے کہا: میں تمہیں کہتا نہ تھا کہ تم (اپنے رب کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے؟“

یہ انہی کے کسی نیک فطرت بھائی کا ذکر ہے جو گاہے بگاہے انہیں روکتا ٹوکتا تھا اور انہیں یاد دہانی کراتا رہتا تھا کہ تم اللہ کو بھولے ہوئے ہو اور اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے ہو۔

**آیت ۲۹** ﴿قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝۲۹﴾ ”انہوں نے کہا (واقعی تم ٹھیک کہتے ہو) ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ہی ظالم تھے۔“

**آیت ۳۰** ﴿فَاقْبَلْ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَوْهُمُ ۝۳۰﴾ ”پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔“

اب وہ اپنی گمراہی اور شوخی قسمت کی ذمہ داری آپس میں ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے۔

**آیت ۳۱** ﴿قَالُوا يٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝۳۱﴾ ”(بالآخر اعتراف کرتے ہوئے) وہ کہنے لگے: ہائے ہماری بدبختی! اصل میں ہم سب ہی اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے تھے۔“

**آیت ۳۲** ﴿عَلٰى رَبِّنَا اَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُونَ ۝۳۲﴾ ”اُمید ہے ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر عطا کر دے گا، اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“

اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔ اب ہم اپنی روش تبدیل کر لیں گے اور آئندہ باقاعدگی سے اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق ادا کیا کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے ہمارا رب ہمارے گناہوں کو معاف کرتے ہوئے ہمارے نقصان کی بھی تلافی کر دے گا اور اگلے سال ہمارا باغ اس سے بہتر پیداوار دے گا۔

رَغِبَ جب الٰہی کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کی طرف رغبت کرنے کے ہوتے ہیں لیکن یہی لفظ عَنْ کے صلے کے ساتھ آئے تو بالکل متضاد معنی دیتا ہے۔ چنانچہ رَغِبَ عَنْ کے معنی ہوں گے: رُخ پھیر لینا اور پہلو تہی کرنا۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۰ میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ يُّرَغَّبْ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ ”اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے طریقے سے منہ موڑے؟ سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو!“

اب اگلی آیت میں گویا اس تمثیل یا واقعہ کا اخلاقی سبق (moral lesson) بیان ہوا ہے:

**آیت ۳۳** كَذٰلِكَ الْعَذَابُ الْاِخِرَةُ اَكْبَرُ مِنْ هٰذَا اِذْ يَصْرَخُونَ لَا تَرْجِعْ عَلَيْنَا عَذَابَہٗمْ اَوْ رَاہُمْ اَوْ يَنْتَظِرُوہُمْ اَوْ يَحْتَفِلُوہُمْ اَوْ يَتَمَنَّوْنَ اَنْ یَّکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَزَّلْنَا عَلَیْہِمْ سُلٰطٰنًا مِّنْ سَمٰوٰتٍ فَمَا یَسْمَعُوْنَ اِلَّا صَوْتَہُمۡ وَیَنۡصُرُوْہُمْ اِلَّا جُنۡدٌ لِّہِمۡ مُّسَوَّمٰتٌ ۚ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ ہُمْ فِيْہَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۸

عذاب تو یقیناً بہت ہی بڑا ہے۔“

اس واقعے میں تو دنیا کے عذاب کا ذکر ہے۔ لیکن یاد رکھو دنیا کے عذاب تو نسبتاً چھوٹے اور وقتی ہوتے ہیں اور توبہ کرنے پر عمل بھی جاتے ہیں۔ مثلاً ایک سال اگر بیکاری کی فصل برباد ہو گئی تو اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے اگلے سال اس کی مدد فی ہو جائے، لیکن آخرت کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ آخرت کا عذاب بہت بڑا ہوگا اور اس وقت ملنے کا راستہ اور توبہ کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔

﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (۳۳) ”کاش کہ یہ لوگ (اس حقیقت کو) جانتے!“

آیات ۳۴ تا ۵۲

إِنَّ الْيَتِيمَ عِنْدَ رَبِّهِمْ حَتَّى التَّيْمِ ۖ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْجُرْمِينَ ۚ مَا لَكُمْ  
كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۚ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۚ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَبَآ تَحْتَرُونَ ۚ أَمْ لَكُمْ  
إِيمَانٌ عَلَيْنَا بِالْآخِرَةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ لَكُمْ لَبَآ تَحْكُمُونَ ۚ سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ ۚ  
أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۚ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا عَادِقِينَ ۚ يَوْمَ يُلْقَى عَنْ سَاقٍ  
وَيُدْعَوْنَ إِلَى السَّجْدِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ۚ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُقُهُمْ ذُلًّا ۚ وَقَدْ كَانُوا  
يُذْعَوْنَ إِلَى السَّجْدِ وَهُمْ سَلِيمُونَ ۚ فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبْ ۚ بِهَذَا الْحَدِيثِ ۚ  
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۚ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۚ أَمْ كَسَلْتُمْ  
أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرِمٍ مُثْقَلُونَ ۚ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ لَا يَخْتَبِرُونَ ۚ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ  
وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۚ إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ ۚ لَوْلَا أَنْ تَدْرِكُهُ نِيعَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ  
بِالْعُرَاقِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ۚ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۚ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا  
لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَبَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۚ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ  
لِّلْعَالَمِينَ ۚ

**آیت ۳۲** اِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتِ الْجَنَّةِ (۳۲) ”مؤمنین کے لیے یقیناً ان کے رب کے پاس

انعمت والے بانگات ہیں۔“

آیت ۳۵: فَجَعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۵﴾ ”کیا ہم اپنے فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر

”کروں گے؟“

اگر بعث بعد الموت کے منکرین کی منطق بہت تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیوکار اور

بحرین میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ جی طور پر تو موت بلاشبہ سب کو برابر کر دیتی ہے جیسا کہ شہرِ اُمریٰ لکھ کر Death the Leveller میں بتایا گیا ہے۔ یعنی کوئی پادشاہ ہو کر کی تعمیر کوئی شریف ہو کوئی بزم ہو مرنے کو ہے۔ اس اعتبار سے تو قیمتا موت کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔ لہذا کہ موت آنے پر اخلاقی لحاظ سے بھی سب انسان برابر ہو جائیں گے انتہائی غیر منطقی اور احمقانہ سوچ ہے۔

**آیت ۳۶** ﴿مَا لَكُمْ سَعِيدًا تَحْكُمُونُ﴾ (۳۶) ”تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم کرنے لگے ہو؟“

کیا تمہاری ضرورت اسی ہے جو اہل کی برائے بناتے ہو؟ کیا اللہ کے ہاں ایسا ہی انداز ہوگا ہے کہ وہاں مسلمان اور نجرین برابر ہو جائیں گے؟ کیا دنیا میں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکومت دیکھنا نہ دیکھوں اور اپنے وفاداروں کو ایک ہی وقت میں گھبرا کر مرنے دے؟

**آیت ۳۷** ﴿إِنَّمَا لَكُمْ كَلِمَةٌ فِيهِ وَلَقَدْ قَرَأْتَ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ (۳۷) ”کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو؟“

**آیت ۳۸** ﴿إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ﴾ (۳۸) ”کہ اس (آخرت) میں تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تم پسند کرو گے!“

**آیت ۳۹** ﴿إِنَّمَا لَكُمْ اِيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَّا تَحْكُمُونَ﴾ (۳۹) ”کیا تم نے ہم سے کوئی قسم لے رکھی ہے جو باقی رہنے والی ہو قیامت کے دن تک کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے؟“

**آیت ۴۰** ﴿سَلِّمُوا اَيْتُم بِذَلِكَ رَعِيْمٌ﴾ (۴۰) ”(اے نبی ﷺ) ذرا ان سے پوچھئے کہ ان میں سے کون ہے جو اس کا خا من ہو؟“

**آیت ۴۱** ﴿اَمْ لَيْسَ شُرَكَاءُ﴾ (۴۱) ”کیا ان کے کوئی شریک ہیں؟“  
 ﴿فَلْيَاْتُوا بِسُورَةٍ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ (۴۲) ”تو لائیں یہ اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں!“  
**آیت ۴۲** ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۴۲) ”جس دن پنڈلی کھولی جائے گی“

پنڈلی کھولے جانے کا مفہوم ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ ممکن ہے یہ اللہ تعالیٰ کی کسی خاص تجلّی کا ذکر ہو جس کا ظہور میدانِ محشر کے کسی مرحلے پر لوگوں کی چھائی کرنے کے لیے ہونا ہو۔ واللہ اعلم! اس اعتبار سے یہ آیت آیاتِ تشابہات میں سے ہے۔ (۱)

(۱) عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آپ نے کو بھی کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھمسان کی لڑائی شروع ہونے پر کہا جاتا ہے: شَمَرَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کہ جنگ نے اپنی پنڈلی سے تہ بند اوپر اٹھالیا۔ بعض مفسرین نے کشفِ ساق سے مراد حقائق سے پردہ اٹھانا بھی لیا ہے۔ یعنی جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ (حاشیہ از مرتب)

﴿وَيَذْعُونَ إِلَى التَّسْجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ ﴿۳۲﴾ ”اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے تو وہ کر نہیں سکیں گے۔“

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الحمد کی آیت ۱۱ کے تحت بھی ذکر ہو چکا ہے، میدانِ حشر میں اچھے اور برے لوگوں کو الگ الگ کرنے کے لیے بنی نوع انسان کو مختلف مراحل میں سے گزرا جائے گا۔ ”پنڈی کا ظہور“ بھی ایسا ہی کوئی مرحلہ ہوگا۔ وہ صاحبِ ایمان لوگ جو اپنی دنیوی زندگی میں نماز کی پابندی کرتے رہے تھے اس تجلی کو دیکھتے ہی سجدے میں سر جانیں گے، لیکن وہ لوگ جن کی گردنیں اکڑی رہتی تھیں اور جو نماز کی پابندی کا اہتمام نہیں کرتے تھے وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اس وقت سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ گویا اس مرحلے پر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے لوگوں سے الگ کر لیا جائے گا۔

**آیت ۳۳** ﴿وَنَحْشِعُهُمْ بَصَارًا هُمْ﴾ ”ان کی نگاہیں زمین پر گڑی رہ جائیں گی“

﴿تَرَوْهُم ذِلَّةً﴾ ”ان (کے چہروں) پر ذلت چھاری ہوگی۔“

﴿وَقَدْ كَانُوا يَدْعُونَ إِلَى التَّسْجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ﴾ ﴿۳۳﴾ ”اور ان کو (دنیا میں) پکارا جاتا تھا سجدے کے لیے جبکہ یہ صحیح سالم تھے۔“

دنیا میں وہ لوگ اذان کی آواز پر کبھی توجہ ہی نہیں کرتے تھے اور کوئی مجبوری و معذوری نہ ہونے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتے تھے۔ قیامت کے دن میدانِ حشر میں وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن نہیں کر سکیں گے۔

**آیت ۳۴** ﴿فَقَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ﴾ ”تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور ان لوگوں کو جو اس کلام کی تکذیب کر رہے ہیں۔“

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے اس گروپ کی سورتوں میں یہ کلمہ (قَذَرْنِي، قَذَرْنِي) اور یہ اسلوب بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی کا پہلو ہے تو دوسری طرف آپ کے مخالفین کے لیے بہت بڑی وعید ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، ان کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے ان سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ﴿۳۴﴾ ”ہم انہیں رفتہ رفتہ وہاں سے لے آئیں گے جہاں سے انہیں علم تک نہیں ہوگا۔“

علماء کے ہاں ”استدراج“ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذمیل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے باعث کسی قوم یا کسی فرد پر درجہ بدرجہ (درجہ تدریج) اور استدراج کا مادہ ایک ہی ہے (مسلط ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی بٹ دھری کی وجہ سے غلط راستے پر جا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کچھ دیر کے لیے ذمیل دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس راستے پر اسے طرح طرح کی کامیابیوں سے بھی نوازتا ہے تاکہ اس کے اندر کی خباثت پوری طرح سے ظاہر ہو جائے۔ جب وہ شخص اپنی روش کو کامیاب دیکھتا ہے تو سرکش میں مزید دیدہ دلیری دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مہلت کا وقت پورا ہو جاتا ہے اور پھر اچانک اسے عذاب

کے نکلنے میں کس لیا جاتا ہے۔

استدراج کی مثال کاٹنے کے ذریعے مچھلی کے شکار کی سی ہے۔ شکاری جب دیکھتا ہے کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے تو وہ ڈور کو ڈھینچا اچھوڑ دیتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے ڈور کھینچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ لفظ استدراج کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں مجھے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول یاد آ گیا ہے جس میں انہوں نے قیام پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ استدراج بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا صاحب رمضان ہیئتہ سلہٹ میں گزارتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے رمضان میں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ملاء اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد اگلے رمضان (لیلۃ القدر) میں پاکستان کا قیام و اتغافل میں آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مدنی کو بذریعہ کشف قیام پاکستان کے بارے میں جس فیصلے کا علم ہوا تھا ملاء اعلیٰ میں وہ فیصلہ ۱۹۴۶ء کی لیلۃ القدر میں اس اصول کے تحت ہوا تھا جس کا ذکر سورۃ الدخان کی آیت ۴ میں آیا ہے۔ اس آیت میں لیلۃ القدر (لَیْلَۃٌ مَّبْرُورَۃٌ) کے بارے میں فرمایا گیا ہے ﴿فَیْضُهَا یُفْکَرُ کُلُّ اَمْرِ حَکِیْمٍ﴾ کہ اس رات میں آئندہ سال کے دوران رونما ہونے والے اہم امور کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں۔

مولانا صاحب نظریاتی طور پر قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ ان کے اس انکشاف کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے بجا طور پر ان سے پوچھا کہ اس فیصلے کا علم ہو جانے کے باوجود بھی آپ قیام پاکستان کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟ اس پر مولانا صاحب نے جو جواب دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نگوینی (کائنات کی سلطنت کا انتظامی) فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا منظور ہے؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہمیں چیزوں کے ظاہر اور سامنے نظر آنے والے حالات کو دیکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے سننے سمجھنے وغیرہ کی صلاحیتیں اسی لیے دی ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے فیصلے کرے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمیں وہی موقف اپنانا چاہیے جس میں ہمیں مسلمانان بر صغیر کی بہتری نظر آتی ہو۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق کیا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ”استدراج“ کی غرض سے کیا گیا ہو۔ یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خطے کے مسلمانوں کو دھمیل دے کر انہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہو۔

قیام پاکستان کے بعد کے حالات کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مدنی کا خدشہ کافی حد تک درست تھا۔ اہل پاکستان پر عذاب کا ایک کوزہ اتوار ۱۹۷۱ء میں برسا تھا۔ اس کے بعد بھی ملک کی مجموعی صورت حال کبھی تسلی بخش نہیں رہی بلکہ پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ اب ایک فیصلہ کن عذاب ہمارے سر پر آیا کھڑا ہے۔ لیکن میری رائے میں اس کا سبب ”قیام پاکستان نہیں“ بلکہ بحیثیت قوم ہمارا وہ مجموعی طرز عمل ہے جو قیام پاکستان کے بعد ہم نے نظام اسلام کے حوالے سے اختیار کیا ہے۔

**آیت ۳۵** ﴿وَاُمْلِئْ لَہُمْ مِنْہٗ﴾ ”اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔“

﴿اِنَّ کَیْدَیْ مَتِیْنٌ﴾ ”بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔“

**آیت ۳۶** ﴿اَمْ تَسْئَلُہُمْ اَجْرًا فَمِنْہُمْ مَنْ مَّعْرُوْمٌ مُّثْقَلُوْنَ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) کیا آپ ان سے

کوئی اجرت مانگتے ہیں جس کے تاوان کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہیں؟“

ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آپ سالہا سال سے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ اپنی اس محنت کے عوض جب آپ ان سے کسی معاوضے یا اجرت کے طلب گار بھی نہیں ہیں تو یہ لوگ آخر کس لیے پریشان ہیں؟

**آیت ۲۷** ﴿إِنَّمَا عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ﴾ ﴿۲۷﴾ ”یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟“

یہ دونوں آیات (۲۷-۲۶) جوں کی توں سورۃ الطور میں (آیت ۴۰ اور ۴۱ کے طور پر) بھی آچکی ہیں۔

**آیت ۲۸** ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ”(تو اے نبی ﷺ!) آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا“

”وَلَا تَكُنْ مِّنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ“ ”اور دیکھئے“ آپ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا!“

”مچھلی والے“ سے یہاں حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں۔ آپ کی قوم پر جب عذاب کا فیصلہ ہو گیا تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی قوم کا ملا تہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس طرح آیا ہے: ﴿إِذْ ذَهَبَ مُغَاصِبًا﴾ ”جب وہ چل دیا غصے میں بھرا ہوا“۔ آپ کا یہ غصہ حیات حق میں تھا اور قوم کی طرف سے مسلسل ہٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے تھا۔ لیکن اس میں خطا کا پہلو یہ تھا کہ آپ نے ہجرت کرنے سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار نہ کیا۔

﴿إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ﴾ ﴿۲۸﴾ ”جب اُس نے پکارا (اپنے رب کو) اور وہ اپنے غم کو اندر ہی اندر پی رہا تھا۔“

حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں انتہائی رنجیدہ حالت میں اللہ سے فریاد کر رہے تھے: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ مُبْطِحَتَكَ﴾ ”تیرے سوا کوئی معبود نہیں“ تو پاک ہے اور یقیناً میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔“

**آیت ۲۹** ﴿لَوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ﴾ ﴿۲۹﴾ ”اگر اُس کی دست گیری نہ کرتا اُس کے رب کا ایک انعام (اور احسان) تو وہ ملامت زدہ ہو کر پھینک دیا جاتا کسی چٹیل زمین پر۔“

حضرت یونس علیہ السلام قدیم عراق کے شہر نینوا میں مبعوث ہوئے تھے۔ یہ شہر بعلبک کے شمال میں واقع تھا۔ دریائے فرات اور دریائے درجلہ اس علاقہ سے گزرتے ہوئے خلیج فارس میں آ کر گرتے ہیں۔ آج کل تو یہ دونوں دریا سکر کر چھوٹی چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن پرانے زمانے میں تو ظاہر ہے یہ بہت بڑے بڑے دریا ہوں گے۔ حضرت یونس علیہ السلام نینوا شہر سے نکل کر ان میں سے کسی دریا کو پار کرنے کے لیے کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی میں آپ کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اشارتا سورۃ الصُّفَّت کی آیت ۴۱ میں آیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ کو کسی وہیل مچھلی نے نگل لیا۔ وہ مچھلی خلیج فارس سے بوتی ہوئی کمران کے ساحل پر پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ساحل کے کسی مقام پر اس نے آپ کو اگل دیا۔ اس وقت آپ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس موقع پر آپ کو سایہ اور غذا وغیرہ فراہم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ’یَقْطِین‘ کا وہ پودا لگایا جس کا ذکر سورۃ الصُّفَّت آیت ۴۱ میں آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اسی پودے کی حرف اشارہ ہے جو اس وقت آپ کے

لیے واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ یَقُطِّعْنَ کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۴۶ کی تشریح۔

**آیت ۵۰** ﴿فَاجْبِسْهُ رَبُّهُ فَفَجَعَلَهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ ⑤ ”تو اُس کے رب نے اُس کو چن لیا اور اسے پھر صالحین میں سے کر دیا۔“

حضرت یونس علیہ السلام کے ذکر کے حوالے سے یہاں حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی سن لیجیے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تَقْصِلُونَنِي عَلَى يُونُسَ بْنِ مَتَّى)) ① ”کہ مجھے یونس ابن متی پر بھی فضیلت نہ دو۔“ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنا جوش خطابت اور زور و رقم دوسرے انبیاء کرام پیر پر حضور ﷺ کی فضیلت ثابت کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ بلاشبہ پوری نوح انسانی سے افضل اور سید الانبیاء والمرسلین ہیں۔ لیکن ”حاجت مخاطبیت صورت دل آرام را“ آج پوری دنیا آپ ﷺ کی عظمت کی قائل ہے۔ اس حقیقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آج ایک عیسائی دانشور مائیکل ہارٹ اپنی کتاب ”The 100“ میں یہ لکھتے پر مجبور ہے:

“My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.”

”حضرت محمد (ﷺ) کو دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں سر فہرست رکھنے کے میرے اس فیصلے پر کچھ قارئین کو حیرت ہوگی اور بعض اس پر سوال بھی اٹھائیں گے لیکن پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف آپ (ﷺ) ہی واحد شخص ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں محاذوں پر پوری طرح کامیاب رہے۔“

**آیت ۵۱** ﴿اَوَاْنِ يَكْذِبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ﴾ ”اور یہ کافر تو نلتے

ہوئے ہیں اس پر کہ اپنی نگاہوں کے زور سے آپ کو بھٹکلا دیں گے جب وہ قرآن سنتے ہیں“

مشرکین مکہ نے حضور ﷺ کی قوت ارادی کو توڑنے کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمایا اور اس مقصد کے لیے آپ کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک مرحلے پر انہوں نے اس مقصد کے لیے ایسے عاموں کی خدمات بھی حاصل کیں جو اپنی نگاہوں کی خصوصی طاقت کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ شاید طبعی طور پر ایسا ممکن ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص خصوصی مشقوں (exercises) کے ذریعے اپنی آنکھوں میں اپنی قوت ارادی کو اس انداز میں مجتمع کرنے میں کامیاب ہو جا تا ہو کہ اس کے بعد جب وہ کسی دوسرے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے تو وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکے۔ بہر حال اس آیت میں مشرکین مکہ کے ایسے ہی اوچھے ہتھکنڈوں کا ذکر ہے۔

﴿وَيَقُولُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ﴾ ⑤ ”اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔“

سورت کے آغاز اور اختتام کا باہمی رابطہ نوٹ کیجیے۔ جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اسی پر اس کا



اختتام ہو رہا ہے۔ کفار حضور ﷺ کو مجنون کہتے تھے۔ ان کے اس الزام کی تردید سورت کے ابتدا میں بھی کی گئی اور آخر میں بھی۔ پھر یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں حرف ن کیوں آیا ہے۔ دراصل ن کے معنی ”مچھلی“ کے ہیں جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ذوالنون (مچھلی والے) کے لقب سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ حرف ن کا معنوی ربط سورت کی ان اختتامی آیات کے ساتھ ہے جن میں صاحب الحوت (حضرت یونس) کا ذکر آیا ہے۔

**آیت ۵۲** ﴿وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾ ”اور نہیں ہے وہ“ مگر ایک یاد دہانی تمام جہان والوں کے لیے۔“

یہاں پر هُو کی ضمیر قرآن کے لیے بھی ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی۔ قرآن مجید کے ذکر (یاد دہانی اور نصیحت) ہونے کا تذکرہ تو قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے جبکہ اپنی ذات میں حضور ﷺ بھی قیامت تک کے لوگوں کے لیے یاد دہانی ہیں بلکہ آپ ﷺ اپنی ذات میں مجسم قرآن ہیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ((كَأَنَّ خُلُقَهُ الْقُرْآنُ)) ”آپ ﷺ کا اخلاق قرآن ہی تو تھا۔“

[بعض مترجمین نے یہاں ”ذکر“ کا ترجمہ ”شرف“ بھی کیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ سارے جہانوں کے لیے وجہ شرف ہیں۔ (مرتب)]



# سُورَةُ الْحَاقَّةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آیات ۱ تا ۳۷

الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا أَذْرَكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنَّارِ ۝ فَأَمَّا  
ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ  
سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَنِيَةً أَيَّامٍ ۝ حُسُومًا ۝ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى ۝ كَانَتْهُمْ أَعْجَارُ تُخَلِّ  
خَافِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ۝ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكَتُ  
بِالْخَاطِئَةِ ۝ فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَابِيَةً ۝ إِنَّا لَبِئْسَ طَغَا الْبَاءُ  
حَمَلْنَكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أَذُنٌ ۝ وَاعْيَةٍ ۝ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ  
نَفْعَةٌ وَاجِدَةٌ ۝ وَخُحِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ  
الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ۝ وَالْمَلِكُ عَلَى أَرْجَائِهَا ۝ وَيَحْمِلُ  
عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَةٌ ۝ يَوْمَئِذٍ نَعْرُضُونَ لَا تُخْفِي مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝ فَأَمَّا  
مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَيَقُولُ هَؤُلَاءِ أَقْرَبُوا كِتَابِيهِ ۝ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ  
حِسَابِيهِ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا  
هَيْنًا ۝ بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۝ فَيَقُولُ لِيَلَيْتَنِي  
لَمْ أُوْتِ كِتَابِيهِ ۝ وَلَمْ أَدرْ مَا حِسَابِيهِ ۝ لِيَلَيْتَنِي كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَا  
لِيهِ ۝ هَلْكَ عَنِّي سُلْطَانِيَّتُهُ ۝ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۝ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ  
ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ وَلَا يَحْضُ عَلَى  
طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۝ فَنُفِثَ لَهُ الْيَوْمَ هَهْنَا حَمِيمٌ ۝ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ لَا  
يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۝

ع

آیت ۱ ﴿الْحَاقَّةُ ۝﴾ ”وہ حق ہو جانے والی!“

یعنی قیامت جس کا وقوع پذیر ہونا حق ہے اس کا واقع ہونا ایک مسلمہ صداقت اور اٹل حقیقت ہے جس میں

قطعاً کوئی شک نہیں۔

**آیت ۲ ﴿مَا الْحَاقَّةُ﴾** ”کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟“

**آیت ۳ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ﴾** ”اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟“

**آیت ۴ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ﴾** ”جھٹلایا تھا ثمود نے بھی اور عاد نے بھی اس کھڑکھرا

دینے والی کو۔“

القارعة سے مراد بھی قیامت ہے۔ قَرَعَ کا معنی ہے ایک سخت چیز کو دوسری چیز سے ٹکرانا، کوٹنا، ریزہ ریزہ کر دینا، کھڑکھرا دینا، یا بہت زور سے کھٹکھٹانا۔ الحاقہ اور القارعة ان دونوں الفاظ کے مابین ایک نسبت یہ بھی ہے کہ یہ دو سورتوں کے نام ہیں اور ان دونوں سورتوں کے آغاز کا انداز بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ القارعة کا آغاز بھی بالکل اسی طرح ہو رہا ہے: ﴿الْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳﴾

**آیت ۵ ﴿فَإِنَّمَا ثَمُودُ فَأَهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ﴾** ”پس ثمود تو ہلاک کر دیے گئے ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے۔“

الطاغیہ کے لغوی معنی حد سے گزر جانے والی چیز کے ہیں۔ یعنی انتہائی شدت والی چیز۔ اس کے لیے قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر الزحفۃ (زبردست زلزلہ)، الصیحة (زور کا دھماکہ یا کڑک)، صاعقۃ (گرج) الفاظ مذکور ہیں جو عذاب کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

**آیت ۶ ﴿وَأَمَّا عَادٌ فَأَهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ﴾** ”اور عاد ہلاک کر دیے گئے ایک جھکڑ والی تیز آندھی سے۔“

**آیت ۷ ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَنَعًا لَّيَالٍ وَتَمْلِيَةً أَيَّامٍ حُسُومًا﴾** فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أُعْجَازٌ نُّحْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿۷﴾ ”اللہ نے مسلط کر دیا اسے اُن پر مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ان کی بیخ کنی کے لیے، تو تم دیکھتے ان لوگوں کو کہ وہاں ایسے چھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔“  
قوم عاد کے لوگ بہت قد آور تھے اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

**آیت ۸ ﴿فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ﴾** ”تو کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو باقی بچا ہوا؟“

**آیت ۹ ﴿وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكُ بِالْخَاطِئَةِ﴾** ”اور (اسی طرح) فرعون اور اس سے پہلے والوں نے، اور الٹ دی جانے والی بستیوں (کے بستیوں) نے بھی خطا کاری کی روش اختیار کی تھی۔“

الثانی جانے والی بستیوں سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں۔

**آیت ۱۰ ﴿فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ﴾** ”تو انہوں نے نافرمانی کی اپنے رب کے رسولوں کی“

﴿فَآخَذَهُمْ آخِذَةٌ رَابِئَةٌ﴾ ”تو اللہ نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔“

**آیت ۱۱** ﴿إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ ”جب (سیلابِ نوح کا) پانی طغیانی پر آیا تھا تو ہم نے تمہیں سوار کرالیا تھا کشتی پر۔“

اس سیلاب کے بعد نوح انسانی کی نسل حضرت نوح علیہ السلام کے انہی تین بیٹوں سے چلی جو اس کشتی میں سوار تھے اس لیے آیت کے اسلوب سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے پوری نوح انسانی کشتی میں سوار تھی۔

**آیت ۱۲** ﴿لَنَجْجِلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ﴾ ”تاکہ ہم اس کو تمہارے لیے ایک یاد دہانی بنادیں اور وہ کان جو حفاظت کرنے والے ہیں اس کو پوری حفاظت سے یاد رکھیں۔“

ان آیات میں ”التَّذْكِرُ بِآيَاتِ اللَّهِ“ کا بیان تھا۔ اس کے بعد اب آخرت کا ذکر آ رہا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بھی آیاتِ اللہ ہی کے تذکرے کا حصہ ہے، کیونکہ وقت کی ڈور میں ایک طرف اگر گزشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات پروئے ہوئے ہیں تو اسی ڈور کا دوسرا سر آخرت ہے۔

**آیت ۱۳** ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ﴾ ”تو جب صور میں پھونکا جائے گا یکبارگی۔“

یعنی اُس وقت کو یاد رکھو جب ایک ہی بار صور میں پھونک مار دی جائے گی۔

**آیت ۱۴** ﴿وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً﴾ ”اور جب زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا۔“

**آیت ۱۵** ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ ”تو اُس روز وہ واقعہ رونما ہو جائے گا۔“

**آیت ۱۶** ﴿وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ﴾ ”اور آسمان پھٹ جائے گا۔“

﴿فَیْہِ یَوْمَئِذٍ وَاہِیَةٌ﴾ ”تو وہ اُس دن بہت بودا سا ہو جائے گا۔“

**آیت ۱۷** ﴿وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهَا﴾ ”اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر۔“

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشُ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمَلِيَّةً﴾ ”اور اُس دن تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے۔“

**آیت ۱۸** ﴿یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ﴾ ”اُس دن تمہاری پیشی ہوگی“

﴿لَا تَخْفَى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ ”تمہاری کوئی مخفی سے مخفی بات بھی چھپی نہیں رہے گی۔“

**آیت ۱۹** ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِیَمِينِهِ﴾ ”تو وہ شخص جس کو اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اس کے داہنے ہاتھ میں“

﴿فَیَقُولُ هَآؤُمْ أَقْرَأْ وَآکِیْبَہُ﴾ ”تو وہ کہے گا: آؤ آؤ! دیکھو میرا اعمال نامہ!“

اَللّٰہُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْہُمْ اٰمِیْن!

**آیت ۲۰** ﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنْتَیْ مُلْقٰی حِسَابِہٖ﴾ ”(وہ کہے گا:) مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب سے

دو چار ہونا ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ مجھے میرے اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔

**آیت ۲۱** ﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ ”پس وہ پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔“

وہ خوش نصیب دل پسند عیش میں ہوگا۔ اسے ایسی زندگی عطا کی جائے گی جس میں ہر طرح کی رضائی رضا ہوگی۔

**آیت ۲۲** ﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ ”بڑے ہی بلند باغ میں۔“

**آیت ۲۳** ﴿فَقُطُوفُهَا دَانِيَةٌ﴾ ”اس کے خوشے جھکے ہوئے ہوں گے۔“

**آیت ۲۴** ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ ”(کہہ دیا جائے گا) کھاؤ اور پیو رہتا بچتا ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔“

**آیت ۲۵** ﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ﴾ ”اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔“

﴿يَقُولُ يَا نَسِيتُ لَمْ أُوتِ كِتَابِي﴾ ”وہ کہے گا: اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا۔“

ع ”مرا اے کاش کہ مادرِ نژادے“ کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا!

**آیت ۲۶** ﴿وَلَمْ أَذِرْ مَا حِسَابُهُ﴾ ”اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے!“

**آیت ۲۷** ﴿يَلِيَّتُهَا كَانَتِ الْقَاصِيَةَ﴾ ”اے کاش کہ وہی موت قصہ پاک کر دینے والی ہوتی!“

کاش کہ وہی موت جو مجھے دنیا میں آئی تھی فیصلہ کن ہوتی، اُس موت کے بعد میں معدوم ہو گیا ہوتا اور میرے دوبارہ زندہ ہونے کی نوبت نہ آتی۔

**آیت ۲۸** ﴿مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِي﴾ ”میرا مال و اسباب کچھ بھی میرے کام نہ آیا۔“

**آیت ۲۹** ﴿هَلَكْتُ عَنِّي سُلْطَانِي﴾ ”میرا اقتدار بھی مجھ سے چھن گیا۔“

میرے دُنیوی اختیار و اقتدار اور میری شان و شوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا، سب کچھ نیست و نابود ہو گیا۔ ایسے شخص کے لیے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا:

**آیت ۳۰** ﴿خُذُوهُ فَغُلُّوهُ﴾ ”پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو!“

**آیت ۳۱** ﴿ثُمَّ الْجَحِيمِ صَلُّوهُ﴾ ”پھر اسے جہنم کے اندر جھونک دو!“

**آیت ۳۲** ﴿ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾ ”پھر ایک زنجیر میں اس کو باندھ دو جس کا طول ستر گز ہے۔“

**آیت ۳۳** ﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ﴾ ”یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا جو عظمت والا ہے۔“

**آیت ۳۴** ﴿وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ﴾ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔  
 اسے خود تو کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی کسی دوسرے شخص کو بھی اس نے بھلائی کے اس کام کی کبھی ترغیب نہیں دی۔

**آیت ۳۵** ﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَهُنًا حَمِيمٌ﴾ ”تو اس کے لیے یہاں کوئی گرم جوش دوست نہیں ہے۔“

**آیت ۳۶** ﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ﴾ ”اور نہ ہی کچھ کھانے کو ہے سوائے زموں کے دھوون کے۔“

**آیت ۳۷** ﴿لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ﴾ ”نہیں کھائیں گے اس کو گمروہی جو خطا کرتے۔“

## آیات ۳۸ تا ۵۲

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصَرُونَ ۖ وَمَا لَا تُبْصَرُونَ ۖ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۖ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۖ قَلِيلًا مَّا تُوْمَنُونَ ۖ وَلَا يَقُولُ كَا هِنَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَدَّكَّرُونَ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۖ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۖ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۖ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۖ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۖ وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ كِرَامٍ لِّلْمُتَّقِينَ ۖ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ ۖ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ۖ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۖ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۖ

سورۃ الحاقہ کے دوسرے رکوع کی سورۃ الواقعة کے آخری رکوع سے گہری مشابہت ہے۔ چنانچہ اگلی آیات کو پڑھتے ہوئے سورۃ الواقعة کی ان آیات کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ النُّجُومِ﴾ ۵۰ **آیت ۳۸** **وَأِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوُ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ** ۵۱ **﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾** ۵۲ ”تو نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔“

**آیت ۳۸** ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصَرُونَ﴾ ۵۳ ”تو میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو تم دیکھتے ہو۔“

**آیت ۳۹** ﴿وَمَا لَا تُبْصَرُونَ﴾ ۵۴ ”اور اُس کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔“

**آیت ۴۰** ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ۵۵ ”یہ قول ہے ایک رسول کریم کا۔“

اصل میں تو یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت جبرائیل نے سنا۔ پھر حضرت جبرائیل سے حضرت محمد ﷺ نے سنا اور اب وہ لوگوں کو سنارہے تھے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے یہ جبرائیل کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے حضور ﷺ کا قول۔

**آیت ۴۱** ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾ ۵۶ ”اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔“

﴿قَلِيلًا مَّا تُوْمِنُونَ ۝﴾ ”کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔“

**آیت ۲۲** ﴿وَلَا يَقُولُ كَافِرٌ﴾ ”اور نہ ہی یہ کسی کا ہن کا کلام ہے۔“

﴿قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝﴾ ”کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔“

**آیت ۲۳** ﴿تَنْزِيلُ مِنَ رَبِّ الْعَلَمِينَ ۝﴾ ”اس کا اتاراجانا ہے تمام جہانوں کے رب کی طرف سے۔“

یہ آیت جوں کی توں سورۃ الواقعة (آیت ۸۰) میں بھی ہے۔

**آیت ۲۴** ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۝﴾ ”اور اگر یہ (نبی ﷺ) خود گھڑ کر بعض باتیں

ہماری طرف منسوب کرتا۔“

تَقَوَّلَ باب تفعیل ہے، اس باب میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ارادے، محنت اور کوشش سے کوئی

بات کہنا۔

**آیت ۲۵** ﴿لَا خِذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝﴾ ”تو ہم پکڑتے اس کو داہنے ہاتھ سے۔“

اس فقرے کے مفہوم میں دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے دائیں ہاتھ سے اسے پکڑتے یا یہ کہ ہم

اسے اس کے داہنے ہاتھ سے پکڑتے۔

**آیت ۲۶** ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝﴾ ”پھر اس کی گردن کاٹ ڈالتے۔“

اس اسلوب اور لہجے میں جو سختی ہے یہ دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو قرآن کو کلام اللہ ماننے کے لیے

تیار نہیں تھے اور کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) خود اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ انہیں

بتایا جا رہا ہے کہ بد بختو! تم ہمارے رسول کریم ﷺ کے مرتبے کو کیا سمجھو! کسی رسول کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اپنے

رب کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ کرے۔ وہ تم لوگوں تک ٹھیک ٹھیک وہی کچھ پہنچا رہے ہیں جو ہمارا

کلام ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو یہ کوئی معمولی سا جرم

نہیں ہے جس کا نوٹس نہ لیا جائے۔

**آیت ۲۷** ﴿فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝﴾ ”پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے

والا نہ ہوتا۔“

**آیت ۲۸** ﴿وَإِنَّهُ لَنَذِكْرٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝﴾ ”اور یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے متقین کے لیے۔“

یہ کلام ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت

رکھتے ہیں۔

**آیت ۲۹** ﴿وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِينَ ۝﴾ ”اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے

والے بھی ہیں۔“

وہ ہمارے کلام کو جھٹلانے پر کمر بستہ ہو چکے ہیں کہ جو چاہے ہو وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانیں گے۔

**آیت ۵۰** ﴿وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝﴾ ”اور یقیناً یہ کافروں کے لیے حسرت کا باعث بن جائے گا۔“

ایک وقت آئے گا جب قرآن ان جھٹلانے والوں کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا سبب بن جائے گا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((الْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ أَوْ عَلَيْكَ))<sup>(۱)</sup>۔ کہ یہ قرآن حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف۔ اگر تو تم اس کے حقوق ادا کرو گے اس پر ایمان لاؤ گے اسے اپنا امام بنا کر اس کے پیچھے چلو گے اور اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرو گے تو یہ قیامت کے دن تمہاری شفاعت کرے گا اور اگر تم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرو گے تو قیامت کے دن یہ تمہارے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہوگا۔

**آیت ۵۱** ﴿وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۝﴾ ”اور یقیناً یہ (قرآن) بالکل یقینی حق ہے۔“

یہ ایسا یقین ہے جو سراسر حق ہے جس میں باطل کی ذرا ملاوٹ تک نہیں۔

**آیت ۵۲** ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝﴾ ”پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔“

نوٹ کیجیے، سورۃ الواقعة کا اختتام بھی اسی آیت پر ہوتا ہے۔





## سُورَةُ الْمَعَارِجِ

سورۃ المعارج تین سورتوں پر مشتمل دوسرے معنی گروپ کی پہلی سورت ہے۔ اس گروپ میں پہلی دو سورتیں یعنی سورۃ المعارج اور سورۃ نوح جوڑے کی شکل میں ہیں جبکہ تیسری سورت (سورۃ الجن) منفرد ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### آیات ۱ تا ۳۵

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۝ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۝ مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝ تَعْرَجُ  
الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ۝ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝  
إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَكَذَلِكَ قَرِيبًا ۝ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْلِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ  
كَالْعِهْنِ ۝ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝ يُبْصِرُونَهُمْ يَوْمَ الْغُجْرِ لَوْ يَقْتَدِي مِنْ عَذَابٍ  
يَوْمَئِذٍ بَيْنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيِّدُ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا  
ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ كَلَّا ۝ إِنَّهَا لَظَى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوْىِ ۝ تَدْعُو مَنْ أَذْبَرَ وَكُؤْلَى ۝ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۝  
إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا  
الْبَصِلِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝  
لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بَيِّمَاتِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ  
رَّبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَا تُظُنُّونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَعْمَارِهِمْ حَفِظُونَ ۝  
إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ  
بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ  
مُّكْرَمُونَ ۝

آیت ۲۹ ﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۝ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۝﴾ ”ماں کا ایک مانگنے والے نے ایک ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہو کافروں کے لیے جس کو کوئی ٹال نہ سکے گا۔“

یہاں مَسْأَلٍ سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ میری رائے بہت پہلے سے یہ تھی کہ یہ عذاب طلب کرنے والے خود حضور ﷺ ہیں، لیکن مجھے اپنی رائے پر اطمینان اس وقت ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ عام مفسرین میں سے بہت کم لوگ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس آیت میں حضور ﷺ کی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے دراصل اس دور کا نقشہ ذہن میں لانا ضروری ہے جب حضور ﷺ پر ہر طرف سے طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور کئی گلیوں میں آپؐ کو شاعر، مجنون، ساحر اور کذاب جیسے ناموں سے پکارا جا رہا تھا (معاذ اللہ)۔ اعلان نبوت کے بعد تین سال تک تو یوں سمجھئے کہ پورے شہر کی مخالفت کا نشانہ صرف حضور ﷺ کی ذات تھی۔ مشرکین کا خیال تھا کہ اگر وہ آپؐ کی قوت ارادی اور ہمت توڑنے یا کسی بھی طریقے سے آپؐ کو آپؐ کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اس دور میں عام اہل ایمان کو نظر انداز کر کے صرف آپ ﷺ کی ذات کو نشانے پر رکھا گیا تھا۔ اس دوران اگرچہ آپؐ کو کوئی جسمانی اذیت تو نہ پہنچائی گئی لیکن باقاعدہ ایک منظم مہم کے تحت آپ ﷺ کے خلاف ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ ان لوگوں کی اس مذموم مہم کی وجہ سے حضور ﷺ مسلسل ایک کرب اور تکلیف کی کیفیت میں تھے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ اور جملوں سے بھی ہوتا ہے جو اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں آپؐ کی تسلی کے لیے جگہ جگہ آئے ہیں۔

بہر حال حضور ﷺ بھی تو آخر انسان تھے۔ مسلسل شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرتے ہوئے ردِ عمل کے طور پر آپؐ کے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کہ اب ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جانا چاہیے۔ چنانچہ ان آیات میں آپ ﷺ کی اسی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی مدنظر رہے کہ اس سورت کا سورہ نوح کے ساتھ جوڑے کا تعلق ہے اور سورہ نوح میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جس میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے سخت عذاب مانگا تھا۔ گویا ان دونوں سورتوں کے اس مضمون کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں یہ مناسب بھی بہت اہم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول اور حضور ﷺ آخری رسول ہیں۔ (۱)

(۱) اس مقام پر مجبور مفسرین کی رائے حضرت شاہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب رحمہما اللہ کی رائے سے مختلف ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں ”مَسْأَلٍ“ کو دریافت کرنا کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مضموم یہ ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے کن لوگوں پر نازل ہوگا؟ تو اس سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ کفار پر نازل ہوگا اور جب نازل ہوگا تو کوئی اس کو نال نہیں سکے گا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ ”مَسْأَلٍ“ کو مانگنے اور طلب کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان الفاظ میں نضر بن حارث کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ الانفال میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي كَانُ لَهَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ إِنَّا بِعَذَابِكَ أَلِيمٌ﴾ (۲) ”اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری ہی طرف سے برحق ہے تو برہمادے ہم پر بچتر آسمان سے یا بھیج دے ہم پر کوئی دردناک عذاب۔“

**آیت ۳** ﴿مَنْ لِّلّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝۳﴾ ”(وہ عذاب اپنے وقت پر آئے گا) اُس اللہ کی طرف سے جو بہت بلند درجات والا ہے۔“

**آیت ۴** ﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴﴾ ”پڑھتے ہیں فرشتے اور روح اس کی جانب ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔“

یہ آیت ہمارے لیے آیات تشابہات میں سے ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے ”ذی المعارج“ ہونے کی وضاحت ہے کہ اس کی بارگاہ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریل کو بھی پچاس ہزار سال کی مسافت کے برابر فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ پچاس ہزار برس کے دن سے یہاں قیامت کا دن مراد ہے جو کفار کے لیے تو بہت طویل اور سخت ہوگا، البتہ اہل ایمان کو وہ دن ایسے محسوس ہوگا جیسے انہوں نے دن کا کچھ حصہ یا ایک فرض نماز ادا کرنے کے برابر وقت گزارا ہو۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ اِنَّهُ لَيُخَفَّفُ عَلٰی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی يَكُوْنُ اَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنْ صَلَاةٍ مَّكْتُوبَةٍ يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا)) ”اُس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! یہ دن مؤمن کے لیے بہت مختصر کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ جتنے وقت میں وہ دنیا میں ایک فرض نماز ادا کرتا ہے اس سے بھی اسے مختصر معلوم ہوگا۔“

**آیت ۵** ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵﴾ ”تو آپ بڑی خوبصورتی سے صبر کیجیے۔“

یہ ہے وہ اصل پیغام جو ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کو دینا مقصود تھا کہ ابھی تو سفر کا آغاز ہوا ہے آنے والا وقت اور بھی کھن ہوگا۔ لہذا آپ اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل کا صبر اور استقامت کے ساتھ سامنا کریں۔ اس سے پہلے سورۃ القلم میں بھی آپ کو ایسی ہی ہدایت کی گئی ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْاُخُوْتِ﴾ (آیت ۴۸) ”تو آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا“ اور دیکھئے! آپ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا!“

**آیت ۶** ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا ۝۶ وَتَرٰهُ قَرِيْبًا ۝۷﴾ ”یہ لوگ تو اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔“

ظاہر ہے انسان تو صرف اپنے سامنے کی چیز کو ہی دیکھ سکتا ہے، مستقبل میں جہاں تکنا تو اس کے بس میں نہیں ہے۔ اسی لیے مستقبل کی چیزیں یا خبریں اسے عام طور پر دور محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تو

◀ مزید برآں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کفار مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں وہ لے کیوں نہیں آتے! اس مطالبے کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ عذاب کفار کے لیے تیار ہے، وہ ضرور انہیں چکھایا جائے گا، لیکن اپنے وقت پر۔ اور جب وہ مقررہ گھڑی آجائے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اس عذاب کو نال نہیں سکے گی۔ (حاشیہ از مرتب)



آج تم سے نہ تو کوئی نذریہ قبول کیا جائے گا، اور نہ ہی کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ آج جہنم کی اس شعلہ فشاں آگ کا سامنا تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ مریم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ إِنِّي يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَرْدٌ﴾ (۶۵) ”اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اس کے پاس اکیلے اکیلے۔“

**آیت ۱۶ ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوْىِۗ ۝۱۶﴾** ”جو کھجیوں کو کھینچ لے گی۔“

شدت کے اعتبار سے جہنم کی آگ کا دنیا کی آگ سے کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ سورۃ البقرہ میں جہنم کی آگ کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْافْتِنَةِ﴾ (۵) کہ وہ براہ راست دلوں میں جلن پیدا کرے گی۔ آج کل اس کیفیت کو ultra violet rays کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان شعاعوں کی حرارت کھال کے اندر پہنچ کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

**آیت ۱۷ ﴿تَدْعُوْنَ مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلَّى ۝۱۷﴾** ”وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھے موڑ لی تھی اور رُخ پھیر لیا تھا۔“

جہنم کی آگ ہر اُس شخص کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کرے گی جس نے حق سے اعراض کیا تھا اور اللہ کے کلام کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ دین کی دعوت اور نبی کریم ﷺ کے مشن کو کبھی لائق اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

**آیت ۱۸ ﴿وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۝۱۸﴾** ”اور جو مال جمع کرتا رہا پھر اسے سینت سینت کر رکھتا رہا۔“ جس نے اپنی ساری زندگی مال جمع کرنے اور اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے میں بتا دی تھی۔

**آیت ۱۹ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خَلِیْقٌ هَلُوْغًا ۝۱۹﴾** ”یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑ دلا۔“

یہ انسان کی فطری اور جبلتی کمزوری ہے کہ وہ تھڑ دلا اور بے صبر ہے۔ قرآن مجید میں انسان کی کئی اور کمزوریوں کا ذکر بھی آیا ہے مثلاً: ﴿وَخُلِیْقُ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾ (النساء) کہ انسان فطری طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ میں انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا قرار دیا گیا ہے، جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ میں انسان کی طبعی غلبت پسندی کا ذکر آیا ہے: ﴿خُلِیْقُ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾۔ ظاہر ہے ایک انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔ انسان کے جسم کا تعلق عالم خلق سے ہے، جبکہ انسانی روح کا تعلق عالم امر سے ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ فَقُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (نبی اسرائیل: ۸۵) ”اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے۔“ چنانچہ مذکورہ سب کمزوریوں کا تعلق انسان کی جسمانی خلقت سے ہے۔ جہاں تک انسانی وجود کے اصل حصے یعنی اس کی روح کا تعلق ہے، بنیادی طور پر اس کا مقام بہت بلند ہے اور اس میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ انسان کی تخلیق کے اس پہلو کا ذکر سورۃ التین کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ ”بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔“ لیکن افسوس کہ ہم انسانوں کی اکثریت اپنی روح سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اللہ کی یاد سے غفلت ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ

مرزا کے طور پر اسے خود اپنی ذات (روح) سے غافل کر دیتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہل ایمان کو اس حوالے سے یوں متنبہ کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا تَكَالُفِینَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ ”(اے مسلمانو! دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔“

اگلی دو آیات ھَلُوْغَا کی وضاحت پر مشتمل ہیں:

**آیت ۲۰** ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰﴾ ”جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔“

جب کوئی انسان اپنی روح سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ نرا حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حیوان نما انسان کو جب کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ صبر کرنے کی بجائے فوراً چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے اور جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

**آیت ۲۱** ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝۲۱﴾ ”اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔“

جب اسے کشادگی حاصل ہوتی ہے تو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب اگلی آیات میں ان انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے ان آیات (آیت ۲۲ تا ۳۵) کا سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ قرآن مجید کے یہ دو مقامات نہ صرف باہم مشابہ ہیں بلکہ ”الْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا“ کے اصول کے مطابق ایک مقام کی بعض آیات دوسرے مقام کی بعض آیات کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ”مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب انصاب“ کے تیسرے حصے کا پہلا سبق ان ہی دو مقامات کی آیات (سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور زیر مطالعہ سورۃ کی آیت ۲۲ سے آیت ۳۵ تک چودہ آیات) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں دراصل بندۂ مؤمن کی سیرت و کردار کے ان اوصاف کی فہرست دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔ گویا یہ اوصاف وہ اینٹیں ہیں جنہیں کام میں لا کر ایک بندۂ مؤمن کو اپنی سیرت کی عمارت تعمیر کرنا ہے۔ اگر یہ اینٹیں کبھی ہوں گی تو ان سے بنائی گئی عمارت کمزور اور بودی ہونے کے باعث کفر والحاد کے سیلاب کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ سیل باطل کی بلا خیزیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان ”اینٹوں“ کو خوب پختہ کر کے اپنی سیرت کی عمارت استوار کریں۔ بقول اکبر الہ آبادی:

تو آگ میں جل اور خاک میں مل، جب خشت بنے تب کام چلے

ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر!

بہر حال گزشتہ آیات میں جن انسانی کمزوریوں کا ذکر ہے، عمومی طور پر انسان ان میں مبتلا ہو کر ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ پیدائشی کمزوریاں ناقابلِ تعمیر و تبدل نہیں، بلکہ انسان ان سے نجات پاسکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل لوگ ان سے مستثنیٰ ہیں:

**آیت ۲۲** ﴿اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝۲۲﴾ ”سوائے نمازیوں کے۔“

ان کمزوریوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے والی ایک چیز نماز ہے۔ گویا نماز تعمیر سیرت کی بنیاد کا پہلا پتھر

ہے۔ لیکن صرف وہ نماز جو خاص اہتمام سے مداومت کے ساتھ ادا کی جاتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ استثناء کے اہل صرف وہی نمازی ہوں گے:

**آیت ۲۳ ﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَانِمُونَ﴾** ”جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں۔“  
یعنی وہ لوگ جو اپنے روزمرہ معمولات میں نماز کو اولین ترجیح دیتے ہیں اور کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسے ”نمازی“ اس وصف کے مصداق نہیں بن سکتے جو ”فارغ وقت“ میں تو نماز ادا کر لیتے ہیں لیکن جب کوئی اور مصروفیت ہو تو انہیں نماز کا خیال تک نہیں آتا اور نہ ہی انہیں نماز کے ضائع ہو جانے کا دکھ ہوتا ہے۔ اس آیت کے مشابہ سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے: ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ ”وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔“

**آیت ۲۴ ﴿وَالَّذِينَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ﴾** ”اور وہ جن کے اموال میں معین حق ہے مانگنے والے کا اور محروم کا۔“

ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یا جو کچھ بھی انہیں مل گیا ہے وہ سب ان کا ہے بلکہ وہ اپنے اموال میں سے ایک معین حصہ معاشرے کے ان محروم اور نادار افراد کے لیے مختص کیے رکھتے ہیں جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ دراصل اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے بعض لوگوں کے حصے کا کچھ رزق بعض دوسرے لوگوں کے رزق میں شامل کر دیتا ہے۔ چنانچہ متول افراد کو چاہیے کہ وہ اپنے اموال میں سے مساکین و فقراء کا حصہ الگ کر کے ”حق بہ حق دار رسید“ کے اصول کے تحت خود ان تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ یاد رہے سورۃ المؤمنون میں اس آیت کے مقابل یہ آیت ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فِعْلُوْنَ﴾ ”اور وہ جو ہر دم اپنے ترکے کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں۔“ ان دونوں آیات پر غور کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ (غریب و مساکین کا حق) ادا کر دینے سے نہ صرف بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ یہ اتفاق انسان کے تزکیہ باطن کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت سورۃ المائدہ کی آیت ۱۱۷ اور ۱۱۸ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔ دراصل مال کی محبت جب کسی دل میں گھر جاتی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس دل میں گندگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں دل کی صفائی یعنی تزکیہ باطن کا موثر ترین طریقہ یہی ہے کہ اتفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکالا جائے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے مال کو تو سینت سینت کر رکھتا ہے اور محض مراقبوں کے بل پر اپنے باطن اور نفس کا ”تزکیہ“ چاہتا ہے وہ گویا سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو بلیکان کر رہا ہے۔

**آیت ۲۶ ﴿وَالَّذِينَ يُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ﴾** ”اور جو فیصلے کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔“  
زیر مطالعہ آیات کی سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسبت کے حوالے سے اس آیت کا تعلق سورۃ المؤمنون کی اس آیت سے ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعَصِّمُونَ﴾ ”اور جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔“ گویا زیر مطالعہ آیت سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیت کی وضاحت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے

نیک بندے لغویات سے اعراض کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ قیامت اور جزا و سزا کے دن پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے تو اس زندگی کا ایک لمحہ آخر (کبھی نہ مرنے والا) دائمی (ہے)۔ بظاہر تو انسان کی یہ زندگی فانی (finite) ہے، لیکن درحقیقت بالقوہ (potentially) یہ دائمی (infinite) ہے۔ اس لیے کہ اس فانی زندگی کے اعمال کا نتیجہ آخرت کی دوامی زندگی میں نکلے گا۔ دنیا میں انسان اچھے برے جو اعمال بھی کمائے گا، ان اعمال کے اثرات و نتائج آخرت کی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوں گے۔ چنانچہ آخرت کی دوامی زندگی کے لیے جو بونجی انسان کو درکار ہے وہ تو دنیوی زندگی کے ”اوقات“ میں ہی کمائی جاسکتی ہے۔ سورۃ العصر کی پہلی آیت میں تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی قسم کے پردے میں بھی دراصل یہی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ گویا انسان کا اصل سرمایہ اس کی مہلت عمر یعنی زندگی کے وہ قیمتی لمحات ہیں جو تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔

غافل تجھے گھڑیاں یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی!

**آیت ۲۷** ﴿وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝۲۷﴾ ”اور جو اپنے رب کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔“

**آیت ۲۸** ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝۲۸﴾ ”یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا نہیں ہے کہ کوئی اس سے نذر ہو جائے۔“

**آیت ۲۹** ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِقُرُوحِهِمْ حَفِظُونَ ۝۲۹﴾ ”اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

**آیت ۳۰** ﴿إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝۳۰﴾ ”سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں کے تو ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔“

**آیت ۳۱** ﴿فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۝۳۱﴾ ”تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کچھ چاہے گا تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔“

**آیت ۳۲** ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لَا مَتِّبِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝۳۲﴾ ”اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔“

یہ چاروں آیات سورۃ المؤمنون میں بھی (آیت ۶۵، ۷ اور ۸ کے طور پر) جوں کی توں آئی ہیں۔ البتہ اگلی آیت میں اہل ایمان کی سیرت کی ایک اضافی صفت کا ذکر ہے جو سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیات میں بیان نہیں ہوئی:

**آیت ۳۳** ﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ۝۳۳﴾ ”اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔“

دراصل گواہی بھی ایک امانت ہے اور جو شخص غلط گواہی دیتا ہے یا گواہی کو چھپا لیتا ہے وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنْ



اللَّهُ (آیت ۱۴۰) ”اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اس نے چھپا لیا؟“ علمائے یہود کے پاس نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے بارے میں اللہ کی طرف سے گواہی تھی انہوں نے اس گواہی کو چھپا کر اللہ کی امانت میں خیانت کی۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اسی گواہی کو چھپانے کا ذکر ہے۔

**آیت ۳۳** ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝﴾ ”اور وہ لوگ کہ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔“

**آیت ۳۵** ﴿أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ ۝﴾ ”یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزاز و اکرام ہوگا۔“

### آیات ۳۶ تا ۴۴

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُهْطِعِينَ ۖ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ۖ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ۚ كَلَّا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ ۖ فَلَا أَقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ۚ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۚ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۖ فَذَرْنَهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ۚ يَوْمَ يُخْرِجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا ۖ كَانَهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِصُونَ ۚ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۚ

**آیت ۳۶** ﴿فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُهْطِعِينَ ۝﴾ ”(تو اے نبی ﷺ!) ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔“

**آیت ۳۷** ﴿عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ۝﴾ ”دائیں اور بائیں سے غول درغول۔“  
دراصل مشرکین کو ہر وقت یہ دھڑکا لگتا رہتا تھا کہ جس کسی نے بھی حضور ﷺ سے قرآن سن لیا وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس لیے حضور ﷺ جب لوگوں کو قرآن سنانے کے لیے کہیں کھڑے ہوتے تو وہ ہر طرف سے دوڑیں لگا کر آپ کے پاس پہنچ جاتے۔ ایسا دراصل وہ لوگوں کو حضور ﷺ کے گرد جمع ہونے سے روکنے کے لیے کرتے تھے تاکہ وہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن نہ سن سکیں۔

**آیت ۳۸** ﴿أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ۝﴾ ”کیا ان میں سے ہر ایک واقعتاً اس کا خواہش مند ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کیا جائے گا؟“

**آیت ۳۹** ﴿كَلَّا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ ۝﴾ ”ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اُس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔“

یعنی ہر انسان جانتا ہے کہ اس کی تخلیق گندے پانی کی ایک بوند سے ہوئی ہے۔

**آیت ۲۰ ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾** ”تو نہیں! قسم ہے مجھے مشرقوں اور مغربوں کے رب کی“

قرآن مجید میں صیغہ واحد کے طور پر تو مشرق اور مغرب کا ذکر بہت مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ الرحمن کی آیت ۱۷ میں رَبِّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبِّ الْمَغْرِبَيْنِ بھی ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں دونوں سمتوں کے لیے جمع کے صیغہ آئے ہیں۔ مشرق و مغرب سے متعلق ان تینوں صیغوں (واحد، تثنیہ اور جمع) کی وضاحت سورۃ الرحمن کی آیت ۱۷ کے تحت کی جا چکی ہے۔

**﴿إِنَّا لَقَادِرُونَ﴾** ”یقیناً ہم قادر ہیں۔“

**آیت ۲۱ ﴿عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ﴾** ”اس پر کہ ہم ان کو ہٹا کر ان سے بہتر لوگ لے آئیں“

یعنی ہم انہیں ختم کر کے ان کی جگہ کسی اور قوم کے افراد کو لے آئیں گے جو ان سے بہتر ہوں گے۔ جیسے قوم نوح کو ختم کر کے قوم عاد کو پیدا کیا گیا اور پھر قوم عاد کے بعد قوم ثمود کو عروج بخشا گیا۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آخرت میں ہم انہیں جو جسم دیں گے وہ ان کے موجودہ جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس بارے میں سورۃ الواقعة آیت ۶۱ اور سورۃ الدھر آیت ۲۸ میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخرت میں انسانوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہوں گے، لیکن زیر مطالعہ آیت کے مذکورہ مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کو آخرت میں دیے جانے والے جسم ان کے دنیا والے جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ جسم ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہی ہوں گے، لیکن برداشت وغیرہ کے حوالے سے ان سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔ مثلاً جہنم کی آگ جو دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ گرم اور شدید ہوگی جب انسانوں کو جلائے گی تو وہ جل کر راکھ نہیں بن جائیں گے، بلکہ اس کی تپش کو برداشت کریں گے۔ اہل جہنم کے جسموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ ان کی کھالیں جل جانے کے بعد پھر سے اپنی اصل حالت پر آ جائیں گی۔ بہر حال آخرت میں ان لوگوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ خصوصی طور پر آخرت کی سختیاں جھیلنے کے لیے بنائے جائیں گے۔ وہ سختیاں جو دنیا کی سختیوں سے کہیں بڑھ کر ہوں گی۔

**﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾** ”اور (اس معاملے میں) ہم ہارے ہوئے نہیں ہیں۔“

ہم ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں وہ ہماری گرفت سے نکل نہیں سکیں گے۔

**آیت ۲۲ ﴿فَلَدَرُّهُمْ يُحْضَرُونَ وَيَلْعَبُونَ﴾** ”تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے انہیں، یہ لگے رہیں بے ہودہ باتوں اور کھیل کود میں“

**﴿حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ﴾** ”یہاں تک کہ یہ ملاقات کریں اپنے اُس دن سے

جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔“

قبل ازیں سورۃ الطور آیت ۲۵ میں بھی ہم یہی الفاظ ﴿فَلَدَرُّهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا﴾ پڑھ آئے ہیں۔ یہ

اسلوب ابتدائی دور کی سورتوں میں عام ملتا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی اور تسلی کا پہلو ہے تو دوسری طرف مشرکین سے نفرت اور غصے کا اظہار بھی ہے۔

**آیت ۴۳** ﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَانَهُمْ إِلَى نُصْبٍ يُؤْفُضُونَ﴾ ”جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کہ وہ مقرر نشانوں کی طرف بھاگے جارہے ہوں۔“  
 ”نُصْب“ سے مراد وہ نشان ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں تاکہ ہر دوڑنے والا دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

**آیت ۴۴** ﴿خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ”ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔“

﴿ذَلِكَ الْيَوْمَ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ﴾ ”یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔“



# سُورَةُ نُوحٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آیات ۲۸ تا ۲۰

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ قَالَ لَقَوْمٍ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۚ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُوا ۖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۚ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۖ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَنِلَّا وَنَهَرًا ۖ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاؤِي إِلَّا فِرَارًا ۖ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصْرَوْا وَاسْتَكْبَرُوا ۖ وَاسْتَكْبَرُوا ۖ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَمَاعًا ثُمَّ إِنِّي أَهْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۖ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۖ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۖ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيُنِينَ ۖ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ ۖ يَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۖ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۖ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۖ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا ۖ وَجَعَلَ الْفُجْرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الْقَمَرَ سِرَاجًا ۖ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۖ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۖ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۖ لِيَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَا جًا ۖ

**آیت ۱** ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ﴾ ”ہم نے بھیجا تھا نوح کو ان کی قوم کی طرف“  
 ﴿أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ﴾ ”کہ خبردار کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ آدھکے ان پر ایک دردناک عذاب۔“  
**آیت ۲** ﴿قَالَ لَقَوْمٍ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۚ﴾ ”آپ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے واضح طور پر ایک خبر دار کرنے والا ہوں۔“  
**آیت ۳** ﴿إِنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُوا ۖ﴾ ”کہ تم لوگ اللہ کی بندگی کرو! اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔“

یہاں نبی اور رسول میں فرق کے حوالے سے یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اپنی

اطاعت کا مطالبہ اللہ کے ”رسول“ کی حیثیت سے کیا تھا۔ کسی نبی علیہ السلام نے اپنی قوم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم لوگ میری اطاعت کرو۔ سورہ یوسف میں ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے تفصیلی حالات پڑھ چکے ہیں۔ حضرت یوسف نبی تھے۔ آپ نے مصر کے بادشاہ کو یہ نہیں کہا کہ میں نبی ہوں، تم میری اطاعت کرو اور نہ ہی آپ نے مصر کے لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ ورنہ تم پر اللہ کی طرف سے عذاب آجائے گا۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دو ربوبت میں بادشاہ اپنی جگہ پر بادشاہ رہا۔ آپ اس کی بادشاہی میں ایک بڑے عہدے پر کام بھی کرتے رہے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ گویا انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت عمومی نوعیت کی تھی کہ تم لوگ اللہ کے نیک بندے بنو اللہ کا حق مانو وغیرہ۔ لیکن جب کسی نبی کو کسی قوم کی طرف کوئی خاص مشن دے کر بھیجا گیا تو وہ اللہ کے ”رسول“ اور اللہ کے نمائندے بن کر اُس قوم کی طرف گئے اور اسی حیثیت سے انہوں نے متعلقہ قوم سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (النساء: ۶۴) ”ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔“ اس لحاظ سے رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے: ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: ۸۰) ”جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔“

**آیت ۴** ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ﴾ ”اللہ تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے گا“

یہاں پر حرف مِنْ (تبعیضیہ) بہت معنی خیز ہے۔ یعنی سب کے سب گناہ معاف ہونے کی ضمانت نہیں! البتہ کچھ گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو جسے چاہے گا اور جب چاہے گا معاف کر دے گا، لیکن حقوق العباد کے تنازعات کے حوالے سے وہ انصاف کے تقاضے پورے کرے گا۔ اس کے لیے روزِ محشر متعلقہ فریقوں کے درمیان باقاعدہ لین دین کا اہتمام کرایا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے اگر کسی کا حق غصب کیا ہوگا، کسی کی عزت پر حملہ کیا ہوگا یا کسی بھی طریقے سے کسی پر ظلم کیا ہوگا تو ایسے ظالم کی نیکیوں کے ذریعے سے متعلقہ مظلوم کی تلافی کی جائے گی۔ اس لین دین میں اگر کسی ظالم کی نیکیاں کم پڑ جائیں گی تو حساب برابر کرنے کے لیے اس کے ظلم کا شکار ہونے والے مظلوموں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔

﴿وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ ”اور تمہیں مہلت دے دے گا ایک وقت معین تک۔“

یعنی اگر تم لوگ اللہ کو معبود ماننے ہوئے اس کا تقویٰ اختیار کرو گے اور میرے احکام کی تعمیل کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ کچھ مدت کے لیے تمہیں بحیثیت قوم دنیا میں زندہ رہنے کی مزید مہلت عطا فرما دے گا۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مہلت بھی ایک وقت معین تک ہی ہوگی۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے قوانین بہت سخت اور اٹل ہیں۔

﴿إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۚ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ”اللہ کا مقرر کردہ وقت جب

آجائے گا تو اسے مؤخر نہیں کیا جاسکے گا۔ کاش کہ تمہیں معلوم ہوتا!“

جب کوئی قوم اپنے رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیتی ہے اور اسے غور و فکر کرنے کے لیے جو مہلت دی گئی ہو وہ ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق اس قوم کو نیست و نابود کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر کوئی طاقت اس فیصلے کو مؤخر نہیں کر سکتی۔

آئندہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کے انداز دعوت کا پورا نقشہ نظر آتا ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کے لیے خود کو کس کس طرح سے ہلکان کیا۔ قوم کو دعوت و تبلیغ کرتے اور پیغامِ حق سناتے ہوئے نوصدیاں بیت گئیں لیکن قوم اس دعوتِ حق پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ جب آپ کو ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرضداشت پیش کی۔

**آیت ۵** ﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝﴾ ”نوح نے عرض کیا: پروردگار! میں نے تو اپنی اس قوم کو رات دن دعوت دی ہے۔“

**آیت ۶** ﴿فَلَمَّا بَرَ دُھُم دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا ۝﴾ ”لیکن میری اس دعوت نے ان میں کچھ اضافہ نہیں کیا سوائے فرار کے۔“

یعنی میری اس شب و روز کی دعوتی مساعی کے نتیجے میں ان کے گریز اور فرار ہی میں اضافہ ہوا۔ جتنا جتنا میں ان کو پکارتا گیا اتنے ہی زیادہ یہ دور بھاگتے گئے۔

**آیت ۷** ﴿وَرَأَيْتُ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ﴾ ”اور میں نے جب بھی انہیں پکارتا کہ تو ان کی مغفرت فرما دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں“

﴿وَأَسْتَغْفِرُوا لَكُمْ﴾ ”اور اپنے کپڑے بھی اپنے اوپر پلٹ لیے“  
﴿وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝﴾ ”اور وہ ضد پر اڑ گئے اور انہوں نے استکبار کیا بہت بڑا استکبار۔“

أَصْرَ بَصْرًا صَرًا کے معنی اپنی روش پر اڑ جانے کے ہیں۔ کفر کی روش پر اڑ جانے اور جم جانے کے علاوہ ان کا رویہ اپنے رسول کے ساتھ از حد متکبرانہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کیسے آپ کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیں جبکہ نچلے درجے کے ذلیل قسم کے لوگ آپ کے متبعین ہیں! ——— اردو میں لفظ اصرا اسی معنی میں مستعمل ہے۔

**آیت ۸** ﴿ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ۝﴾ ”پھر (اے پروردگار) میں نے انہیں بلند آواز سے بھی پکارا۔“

**آیت ۹** ﴿ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝﴾ ”پھر میں نے انہیں علانیہ دعوت بھی دی اور خفیہ طور پر بھی سمجھایا۔“

أَسْرَرْتُ إِسْرَارًا کے معنی مجھ میں چھپانا یا چپکے سے بیان کرنا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو کھلم کھلا تبلیغ بھی کرتے اور لوگوں سے تنہائی میں انفرادی ملاقاتیں کر کے بھی ایک ایک کو سمجھاتے۔

**آیت ۱۰** ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ﴾ ”پس میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے رب سے استغفار کرو۔“

﴿إِنَّهٗ كَانَ عَقَّارًا ۝۱۰﴾ ”یقیناً وہ بہت بخشتے والا ہے۔“

**آیت ۱۱** ﴿يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝۱۱﴾ ”وہ ہم پر آسمان سے خوب بارشیں برساتے گا۔“  
یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بن کر رہو گے تو وہ تمہاری دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے لیے آسائیاں پیدا کر دے گا اور تمہارے علاقے میں خوب بارشیں برسائے گا جس سے تمہارے رزق میں اضافہ ہوگا۔ ان الفاظ سے یوں لگتا ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے بعد کسی دور میں اس قوم پر خشک سالی اور قحط کا عذاب آیا تھا۔ جیسے قوم فرعون پر قحط اور دوسرے عذاب بھیجے گئے تھے (الاعراف: رکوع ۱۶)۔ یا جیسے حضور ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں بہت سخت قحط پڑا تھا (سورۃ الدخان: رکوع ۱)۔ ایسے چھوٹے چھوٹے عذاب دراصل ہر رسول کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم کے لوگوں پر وقتاً فوقتاً اس لیے مسلط کیے جاتے تھے تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگ جائیں اور اپنے رسول کی دعوت کو سنجیدگی سے سنیں۔

**آیت ۱۲** ﴿وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَنْصِلْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝۱۲﴾ ”اور وہ بڑھادے گا تمہیں مال اور بیٹوں سے“  
﴿وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝۱۲﴾ ”اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے (چشمتے اور) نہریں رواں کر دے گا۔“

**آیت ۱۳** ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳﴾ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے امیدوار نہیں ہو؟“

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اور دوسرا یہ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت و سطوت سے خوف کیوں نہیں آتا؟ فی الحال اللہ تعالیٰ تمہیں ڈھیل دے رہا ہے، لیکن اس کی ڈھیل کی بھی ایک حد ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۴﴾ (البروج) کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ تم ان سب باتوں کا خیال کیوں نہیں کرتے ہو؟ آخر تم لوگ اس کی نافرمانیاں کرتے ہوئے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہوئے اس کے غضب اور اس کی گرفت سے بے خوف کیوں ہو گئے ہو؟

**آیت ۱۴** ﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝۱۴﴾ ”اور اس نے تمہیں پیدا کیا ہے سب درجہ بدرجہ۔“  
اللہ تعالیٰ نے رحم مادر کے اندر تمہیں خلقت کے کئی مراحل سے گزرا کر، سورۃ میں ذکر کیا ہے۔

**آیت ۱۵** ﴿أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَلَوَاتٍ طِبَاقًا ۝۱۵﴾ ”یا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہہ بہ تہہ؟“

**آیت ۱۶** ﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۝۱۶﴾ ”اور ان کے اندر اُس نے چاند کو روشنی اور سورج کو (درخشاں) چراغ بنایا!“

**آیت ۱۷** ﴿وَاللَّهُ أَنْتَبَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ بَنَاتًا ۝۱۷﴾ ”اور اللہ نے تمہیں اُگایا ہے زمین سے جیسے (بزہ)“

اُگایا جاتا ہے۔“

اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔ نہ صرف تمہارے جسم کے تمام اجزاء زمین سے لیے گئے ہیں بلکہ اس جسم کی پرورش اور بقا کے لیے تمہیں خوراک بھی اسی زمین سے مل رہی ہے۔ نظریہ ارتقاء (evolution theory) کے ماننے والے لوگ اس آیت کو اپنے حق میں دلیل کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زمین سے اُگانے کے مفہوم میں پہلے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تخلیق کے آغاز اور پھر رفتہ رفتہ اس مخلوق کے مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر انسانی نسل (Homo sapiens) تک پہنچنے کا اشارہ موجود ہے۔

**آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝۱۸﴾** ”پھر وہ تمہیں لوٹا دے گا اسی میں اور پھر نکالے گا تمہیں جیسے نکالا جاتا ہے۔“

**آیت ۱۹ ﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بَسَاطًا ۝۱۹﴾** ”اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھا دیا ہے بچھونے کی طرح۔“

**آیت ۲۰ ﴿لَتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰﴾** ”تا کہ تم چلو پھرو اس میں کشادہ راستوں پر۔“  
اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عرضداشت اور روادا الم پیش کرتے ہوئے آخر کار حضرت نوح علیہ السلام یوں فریاد کناں ہوئے:

## آیات ۲۱ تا ۲۸

قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالًا وَوَلَدَهُ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكُرُوا مَكْرًا كِبَارًا ۝ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَا اِهْتِكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَاَدًا وَلَا سُوَاعَاةً وَلَا يَعْقُوْتَ وَيَعْقُوْنَ وَنَسَرًا ۝ وَقَدْ اَصْلَحْنَا كَيْفِيَّةً وَلَا تَزِدُ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا ضَلَالًا ۝ مِمَّا خَطِيئَتُهُمْ اُغْرِقُوْا فَاَدْخَلُوْا نَارًا ۝ فَاَلَمْ يَجِدُوْا اَلِهَٰمُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝ وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ عَلٰى الْاَرْضِ مِنْ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْنِيْمْ يَضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۝ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝

بَیِّن

**آیت ۲۱ ﴿قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي﴾** ”نوح نے کہا: پروردگار! انہوں نے میری نافرمانی کی“  
**﴿وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالًا وَوَلَدَهُ اِلَّا خَسَارًا ۝۲۱﴾** ”اور انہوں نے ان لوگوں کی پیروی کی

جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں بڑھایا۔“

پروردگار! تو نے مجھے ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور ان پر کسی پس و پیش کے بغیر میری اطاعت لازم تھی، لیکن انہوں نے تو میری جی بھر کر نافرمانی کی اور اپنے ان سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کرتے رہے جن



کے مال و اولاد کی کثرت نے انہیں غرور و تکبر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔

**آیت ۲۲ ﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبِيرًا﴾** ”اور ان لوگوں نے ایک چال بھی چلی بہت بڑی چال۔“

یہ قوم نوح کے بڑے بڑے سرداروں کی اس چال کا ذکر ہے جس کے تحت انہوں نے مذہبی اور نسل عصیت کا سہارا لے کر عوام کو حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف بھڑکایا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلاف میں سے بڑے بڑے اولیاء اللہ کے بت بنا کر رکھے ہوئے تھے اور انہی بتوں کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں ان بتوں کو چھوڑنے اور ایک اللہ کو معبود ماننے کی دعوت دی تو قوم کے سرداروں کو آپ کے خلاف یہ دلیل مل گئی کہ آپ ان کے بزرگوں اور اولیاء اللہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ اس ”مضبوط اور موثر“ دلیل کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنے عوام کو اس نعرے پر متحد کر لیا کہ اب جو ہوسو ہو ہم اپنے ان معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے۔

**آیت ۲۳ ﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ﴾** ”اور انہوں نے کہا کہ تم اپنے ان معبودوں کو ہرگز چھوڑ نہ بیٹھنا۔“

اس سے ملتا جلتا نعرہ سردارانِ قریش نے بھی حضور ﷺ کے خلاف اپنے عوام کو سکھایا تھا: ﴿وَأَنطَلَقْنَا مَعَهُ مِنْهُمْ أَنِ امْكُسُوا وَأَصْبِرُوا عَلَىٰ الصِّبْغِ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ﴾ (ص) ”اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جے رہو اپنے معبودوں پر یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔“

﴿وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ ”ہرگز مت چھوڑنا وُد، سُوَاع، یغوث، یعوق و نسر کو۔“

یہ سب اس قوم کے بتوں کے نام ہیں اور ان میں سے بیشتر اولیاء اللہ کی شخصیات کے بت تھے۔ یغوث کے تلفظ میں ”غیاث“ یا ”غوث“ کی مشابہت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اولیاء اللہ میں سے کسی ایسی شخصیت کا بت تھا جسے وہ لوگ اپنا فریادرس سمجھتے تھے۔ دراصل حضرت آدم اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں بہت سے انبیاء کرام گزرے ہیں۔ حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہ السلام اسی دور کے نبی ہیں۔ ظاہر ہے ان پیغمبروں کے پیروکاروں میں بہت سے نیک لوگ اور اولیاء اللہ بھی ہوں گے۔ چنانچہ بعد کی نسلوں کے لوگوں نے عقیدت و احترام کے جذبے کے تحت ان اولیاء اللہ کی مورتیاں بنالیں۔ شروع شروع میں وہ ان مورتیوں کو احتراماً سلام کرتے ہوں گے، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ ان کی باقاعدہ پوجا شروع کر دی گئی۔ اسی طرح آج ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اپنے گھروں میں اولیاء اللہ اور پیروں کی تصاویر بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں کرتے ہیں بلکہ ان تصویروں کے گلوں میں باقاعدہ بار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک صاحب کے گھر میں ایک تصویر آویزاں دیکھی جس میں خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت غنیار کا کی اور بابا فرید شکر خاں علیہ السلام تینوں بیک وقت جمع تھے اور تصویر پر بار ڈالے گئے تھے۔ ایسی روایات جب نسل در نسل آگے بڑھتی ہیں تو تدریجاً بت پرستی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ظاہر ہے عقائد و نظریات میں بگاڑ ایک دم تو پیدا نہیں ہوتا بلکہ ملتان کی زبان میں اس عمل کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”بندہ تھنڈا تھنڈا تھی ویندا اے“۔ بہر حال بعض اوقات انسان نظریاتی طور پر رفتہ رفتہ اس قدر بدل جاتا ہے کہ اسے خود بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

**آیت ۲۴** ﴿وَقَدْ أَصَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا﴾ ”اور انہوں نے تو بہتوں کو بہکا

دیا ہے۔ اور (اے اللہ!) اب تو ان ظالموں کے لیے سوائے گمراہی کے اور کسی چیز میں اضافہ نہ فرما!“  
حضرت نوح علیہ السلام کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر آپ کے سیر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔  
اب آپ کی حیات دینی کو اس ناہنجار قوم کا ایمان لانا بھی گوارا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کناں ہیں کہ  
پروردگار! اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ فرما۔ بالکل ایسی ہی کیفیت کی جھٹک حضرت  
موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا میں بھی نظر آتی ہے:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَتْهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ رَبَّنَا لِيُضِلُّهُ عَنِ سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا أَخْرِجْهُ مِنْهُ عَلَىٰ أَمْرٍ إِلَهُمْ وَأَسْأَدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَوْرُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ (یونس)

”اور موسیٰ نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامانِ زیب و  
زینت اور اموال عطا کر دیے ہیں دنیا کی زندگی میں۔ پروردگار! اس لیے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں تیرے  
راستے سے! اے ہمارے رب! اب ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں میں سختی پیدا کر دے  
کہ یہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ یہ کھلم کھلا دیکھ نہ لیں عذابِ الیم کو۔“  
**آیت ۲۵** ﴿مِمَّا خَطَبْتُمْ لَهُمْ آغْرَقُوا فَأَدْحِلُوا نَارًا﴾ ”اپنی خطاؤں کی وجہ سے ہی وہ غرق کیے گئے اور  
داخل کر دیے گئے آگ میں“

﴿فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا﴾ ”تو نہ پایا انہوں نے اپنے لیے اللہ کے مقابل  
کوئی مددگار۔“

حضرت نوح علیہ السلام کی اس فریاد کا سخت ترین حصہ آگے آ رہا ہے:

**آیت ۲۶** ﴿وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا﴾ ”اور نوح نے کہا: اے

میرے پروردگار! اب تو اس زمین پر کافروں کا بستا ہوا ایک گھر بھی مت چھوڑ۔“

**آیت ۲۷** ﴿إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ ”اگر تو نے ان کو چھوڑ

دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسلوں میں بھی اب فاجرا اور کافروں کے سوا اور کوئی پیدا  
نہیں ہوگا۔“

ان لوگوں کی فطرتیں مسخ ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے ان کی آئندہ نسلوں سے بھی کسی خیر کی توقع نہیں ہے۔  
اس لیے ان کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے کسی بندے نے شاید ہی ایسی سخت دعا  
مانگی ہو۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک جس طرح صبر و استقامت کے ساتھ اپنی قوم کی  
زیادتیوں کو برداشت کیا اس پس منظر میں آپ کا یہ غصہ حق بجانب تھا۔

**آیت ۲۸** ﴿رَبِّ اغْنِيْ لِيْ وَلِيًّا وَلِيًّا دَعَا وَلَمْ يَكُنْ لِيْ يَنْصُرُنِيْ مُوْتًا﴾ ”پروردگار! مغفرت فرما دے میری

اور میرے والدین کی اور جو کوئی بھی میرے گھر میں داخل ہو جائے ایمان کے ساتھ اس کی بھی“  
 ﴿وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ ”اور تمام مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی (مغفرت فرمادے)“

یہ دعا اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اگلے اور پچھلے زمانوں کے تمام اہل ایمان شامل ہو گئے ہیں۔

﴿وَلَا تَرِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا﴾ ﴿۲۸﴾ ”اور ان ظالموں کے لیے تُو اب کسی چیز میں اضافہ مت کر سوائے تباہی اور بربادی کے۔“

سورۃ المعارج اور سورۃ نوح کے مطالعے کے بعد یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ اگر ”نظم قرآن“ کو مد نظر رکھتے ہوئے ان دونوں سورتوں کا مطالعہ جوڑے کی حیثیت سے کیا جائے تو نہ صرف سورۃ المعارج کی پہلی آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے، بلکہ سورۃ نوح کے نزول کا سبب اور حضرت نوح علیہ السلام کی مذکورہ دعا کا جواز بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بہر حال اس پہلو سے ان دونوں سورتوں پر غور کرنے سے یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ المعارج کی ابتدائی آیت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے اور یہ بھی کہ سورۃ المعارج کی آیت ۵ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَبِيلًا﴾ کی تلقین بھی اسی حوالے سے کی گئی، بلکہ اس کے بعد ایک پوری سورت (سورۃ نوح) نازل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و مصائب کا نقشہ بھی دکھا دیا گیا کہ آپ کی دعوتی مہم کو شروع ہوئے تو ابھی چار پانچ سال ہی ہوئے ہیں، آپ ہمارے اس بندے کی ہمت اور استقامت کو بھی مد نظر رکھیں جو ایسے مشکل حالات کا سامنا ساڑھے نو سو سال تک کرتا رہا۔



# سُورَةُ الْجِنِّ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الجن منفرد سورۃ ہے اس کا کوئی یوزائٹس۔ یہ قرآن مجید کی واحد سورۃ ہے جس میں جنات کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الرحمن اور سورۃ الاحقاف میں بھی جنات کا تذکرہ ہے۔ سورۃ الاحقاف میں ان جنات کے بارے میں بتایا گیا ہے جو حضور ﷺ سے قرآن مجید سن کر ایمان لے آئے تھے جبکہ سورۃ الرحمن میں انسانوں اور جنوں کو ﴿بِشَعْرِ الْجَبِّ وَالْإِنْسِ﴾ ایک ساتھ مسلسل مخاطب کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الرحمن کی ترجمانی آیت ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ پوری سورۃ میں اکتیس (۳۱) مرتبہ دہرائی گئی ہے۔ زیر مطالعہ سورۃ میں جنات کے ایک گروہ کے کچھ افراد کی باہمی گفتگو کا ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ وہی گروہ ہو جس کا ذکر سورۃ الاحقاف میں آیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا گروہ ہو۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۱۵

قُلْ أَوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۖ يَهْدِي إِلَى  
الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۚ وَأَنَّهُ تَعَلَّى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا  
وَلَدًا ۚ وَأَنَّهُ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ۚ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نَقُولَ الْإِنْسَ  
وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ وَأَنَّهُ كَانَ يَجَالُ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ  
فَإِذَا دُعِمَ رَهْقًا ۚ وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا ۚ وَأَنَّا لَبَسْنَا  
السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا مُلْأً مِن ذُرِّيٍّ أَوْشُهْبًا ۚ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ  
فَمَن يَسْمَعُ أَلَّنْ يَجِدَ لَهُ سَهَابًا رَّصَدًا ۚ وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِنَا فِي الْأَرْضِ أَمْ  
أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۚ وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ ۖ كُنَّا طَرِيقَ قِدْدٍ ۚ وَأَنَّا  
ظَنَنَّا أَنَّ لَّنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ هَرَبًا ۚ وَأَنَّا لَبَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ أَمَّا يَهُ ۖ  
فَمَن يُؤْمِنُ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهْقًا ۚ وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِمَّا الْقَاسِطُونَ ۖ  
فَمَن أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا وَرَشَدُوا ۚ وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۚ

**آیت ۱** ﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: میری طرف

وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے بڑے غور سے سنا۔“

جنات کی جماعت نے کیا سنا؟ اس کا جواب اگلے جملے میں ہے۔

﴿فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝﴾ ”تو انہوں نے (جا کر دوسرے جنات سے) کہا کہ ہم نے

سنا ہے ایک بہت ہی دل کو لہانے والا قرآن۔“

**آیت ۲** ﴿يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾ ”جو راہِ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان

لے آئے۔“

قرآن کے بارے میں جنات کا یہ ردِ عمل ہم انسانوں کے لیے باعثِ عبرت اور لمحہ فکریہ ہے۔ انہوں نے

ایک مرتبہ قرآن سنا اور وہ اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ قرآن کو سن کر نہ صرف اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ

داعی بن کر اس کا پیغام اپنی قوم تک پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ قرآن کو بار بار

پڑھتے ہیں بار بار سنتے ہیں لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو اس نیت

سے اور اس انداز سے پڑھتے یا سنتے ہی نہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں اُترے۔ ہم تو رمضان کے قیام اللیل کے

لیے بھی اس مسجد کا انتخاب کرتے ہیں جہاں کے قاری صاحبِ کم سے کم وقت میں ”منزل“ طے کر لیتے ہوں۔

بلکہ آج کل تو باقاعدہ اشتہارات کے ذریعے مختلف مساجد میں ایک سے بڑھ کر ایک ”پُرکشش پیکیج“ پیش کیا جاتا

ہے کہ ہمارے ہاں صرف اتنے دنوں میں قرآن ختم کرا دیا جاتا ہے..... ہماری مسجد میں نماز تراویح صرف تیس

منٹ میں پڑھادی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ — اندازہ کیجیے! جہاں قرآن مجید کم از کم وقت میں ختم کرنے کے

لیے دوڑیں گے وہاں سمجھنے سمجھانے کی فرصت کسے ہوگی؟ اب ذرا اس طرزِ عمل کے مقابلے میں مذکورہ

جنات کے رویے کا تصور کریں جو ایک ہی مرتبہ قرآن مجید کو سن کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ قرآن پر ایمان لانے

کا اعلان کرنے کے بعد انہوں نے کہا:

﴿وَلَكِنْ نُّشْرِكُ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝﴾ ”اور اب ہم کبھی بھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں

ٹھہرائیں گے۔“

**آیت ۳** ﴿وَأَنَّهُ تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۝﴾ ”اور یہ کہ ہمارے رب کی شان

بہت بلند ہے اُس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد۔“

**آیت ۴** ﴿وَأَنَّهُ كَانَ يَفْقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ۝﴾ ”اور یقیناً ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ

کے بارے میں خلافِ حقیقت باتیں کہتا رہا ہے۔“

اپنے ”بے وقوف“ سے ان کا اشارہ اپنے سب سے بڑے جن عزرائیل (الیس) کی طرف ہے۔

**آیت ۵** ﴿وَأَنَّا ظَنَنَّا أَنْ لَّنْ نَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝﴾ ”اور یہ کہ ہم تو اس گمان میں

رہے کہ جن اور انسان اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھیں گے۔“  
وہ بد بخت اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا رہا اور ہم اس خوش فہمی میں اس کی باتوں کو مانتے رہے کہ کوئی انسان یا جن اللہ کے بارے میں کبھی کوئی خلاف حق بات نہیں کر سکتا۔

**آیت ۶** ﴿وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا﴾ اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ مرد جنات میں سے کچھ مردوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انہوں نے ان (جنات) کی سرکشی میں مزید اضافہ کیا۔“

عربوں کے ہاں جنات سے پناہ طلب کرنے کا رواج عام تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر جنگل اور ہر ویرانے میں جنات کا بسیرا ہوتا ہے۔ اس لیے جب ان کا کوئی قافلہ صحرا میں کہیں پڑاؤ کرتا تو قافلے کا سردار باوازی بلند پکارتا کہ ہم اس وادی کے سردار جن کی پناہ میں آتے ہیں۔ اب ظاہر ہے جنات تو انسانوں کی ایسی حماقتوں پر ہنستے ہوں گے کہ دیکھو! آج اسی آدم کی اولاد ہمیں معبود بنائے بیٹھی ہے جسے سجدہ نہ کرنے پر ہمارے جد امجد کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ انسانوں کی ایسی حرکتوں سے جنات کے غرور اور سرکشی میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

**آیت ۷** ﴿وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَنَّ لَنَا بَيْعَتُ اللَّهِ أَخْذًا﴾ اور یہ کہ انہوں نے بھی ایسا ہی سمجھا جیسا کہ تم نے سمجھا ہوا ہے کہ اللہ کسی کو ہرگز نہیں اٹھائے گا۔“

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھائے گا، یعنی بعث بعد الموت کے عقیدے میں کوئی حقیقت نہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو بھی رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ سورۃ الاحقاف میں جنات کے تذکرے کے حوالے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات تو رات سے واقف تھے اور وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو برس کا زمانہ انسانی تاریخ میں سلسلہ رسالت کے انقطاع کا طویل ترین وقفہ ہے)۔ چنانچہ اپنی ان معلومات کی بنیاد پر جنات یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسالت کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے اور یہ کہ اب دنیا میں کوئی رسول نہیں آئے گا۔

**آیت ۸** ﴿وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ﴾ اور یہ کہ ہم نے مٹولا آسمان کو“

ہم نے غیب کی خبروں کی ٹوہ میں آسمان کی پہنائیوں میں حسب معمول بھاگ دوڑ کی۔

﴿فَوَجَدْنَهَا مِلْثَ حَرَمٍ شَدِيدًا وَشُهَبًا﴾ ”تو ہم نے دیکھا کہ وہ سخت پہروں اور

انگاریوں سے بھرا ہوا ہے۔“

ہم نے دیکھا کہ آسمان میں اب جگہ جگہ پہرے مقرر کر دیے گئے ہیں اور شہاب ثاقب کی قسم کے میزائل نصب کر کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی طور پر سخت کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے آگ اور نور کی کچھ خصوصیات مشترک ہونے کے باعث جنات اور فرشتوں کے مابین تخلیقی اعتبار سے کچھ نہ کچھ قربت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے جب عالم بالا سے احکام لے کر زمین کی طرف آتے ہیں تو

شیاطین جن ان سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور احکام سے متعلق پیشگی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی خبریں وہ اپنے ان انسان ساتھیوں تک پہنچانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں کابھوں اور جاویدگروں کے روپ میں شرک و ضلالت کی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔ عام حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے شاید ان جنات کو ایسی خبروں تک کسی نہ کسی حد تک رسائی ہو جاتی ہو مگر نزول وحی کے زمانے میں انہیں حساس محدود کے قریب بھی پہنکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ آیات زیر مطالعہ میں اسی حوالے سے جنات کی چند میگوئیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

**آیت ۹ ﴿وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ﴾** ”اور یہ کہ (اس سے پہلے) ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے کچھ سن گن لینے کے لیے۔“

﴿فَمَنْ يَسْمَعُ الْآنَ﴾ ”لیکن اب اگر کسی نے کچھ سننے کی کوشش کی“

﴿يَجِدْ لَهُ سِمْهَانًا رَّصَدًا﴾ ”تو وہ پائے گا اپنے واسطے ایک انگارہ گھات میں لگا ہوا۔“

**آیت ۱۰ ﴿وَأَنَّا لَا تَدْرِي أَشَرُّ أُرِيدُكَ لَمَنَّ فِي الْأَرْضِ﴾** ”اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے لیے کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔“

﴿أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رُدًّا﴾ ”یا ان کے لیے ان کے رب نے کسی بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔“

جنات کی اس بات سے ایسے لگتا ہے جیسے وہ تورات کے عالم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کے دو امکانی نتائج میں سے ایک نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے۔ یا تو متعلقہ قوم اپنے رب پر ایمان لا کر ہدایت کے راستے پر چل پڑتی ہے یا اس کا انکار کر کے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب بھیجنا چاہتا ہے تو اس قوم میں رسول مبعوث کر کے تمام جہت ضرور کرتا ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نُنْفِثَ رُسُلًا﴾ ”اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کسی قوم کو نہ بھیج دیں۔“ چنانچہ آسمانوں پر غیر معمولی سخت حفاظتی انتظامات دیکھ کر جنات یہ تو سمجھ گئے کہ اہل زمین کے لیے وحی و رسالت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے کا حتمی نتیجہ کیا نکلے گا۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فیصلے سے انسانوں کی بھلائی مطلوب ہے یا اس نے اہل زمین کو قوم نوح، قوم ہود اور قوم صالح کی طرح ایک مرتبہ پھر تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ان پر عذاب بھیجنے سے پہلے رسول مبعوث کر کے وہ ان لوگوں پر اتمام حجت کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالت محمدی ﷺ انسانیت کے حق میں سراسر خیر ہی خیر ہے لیکن ان جنات کو اس وقت تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

**آیت ۱۱ ﴿وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَلِكَ﴾** ”اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف قسم کے بھی ہیں۔“

یہاں نیک کے مقابل میں ان کا اٹھا تو ظاہر ہے برائش اور اسی جنات ہی کی طرف ہے لیکن انہوں

نے ان کا ذکر ایسے الفاظ کے ساتھ نہیں کیا۔ یہ دراصل حکمت تبلیغ کا اہم اصول ہے کہ برے کو بھی برا نہ کہو۔

﴿كُنَّا طَرِيقَ قَدَدَا ۝۱۱﴾ ”ہم مختلف راستوں پر پھٹے ہوئے تھے۔“

طَرِيق جمع ہے طَرِيقَۃ کی اور قَدَد جمع ہے قَدَدَۃ کی، یعنی مختلف الرائے فرتے۔ قَدَّ يَقْدُّ قَدًّا کے معنی پھاڑنے یا کانٹے کے ہیں۔ جیسے سورہ یوسف کی آیت ۲۵ میں آیا ہے: ﴿قَدَّتْ قِمِيصُہُ مِنْ دُبُرٍ﴾ ”اُس (عورت) نے پھاڑ دی آپ کی قمیص پیچھے سے۔“

آیت ۱۲ ﴿وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّن نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَكِن نُّعْجِزُہُ هَرَبًا ۝۱۲﴾ ”اور یہ کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اُسے ہراسکتے ہیں۔“

آیت ۱۳ ﴿وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا اللّٰهَی اٰمَنَّا بِہٖ ۝۱۳﴾ ”اور یہ کہ ہم نے جو نبی اس ہدایت (الہدیٰ) کو سنا ہم اس پر ایمان لے آئے۔“

﴿فَمَنْ یُّؤْمِنُ بِرَبِّہٖ فَلَا یَحَافُ بَحْثًا وَلَا رَهَقًا ۝۱۴﴾ ”تو جو کوئی بھی ایمان لائے گا اپنے رب پر اسے نہ تو کسی نقصان کا خوف ہوگا اور نہ زیادتی کا۔“

اللہ تعالیٰ ہر کسی کے نیک اعمال کا پورا پورا اجر دے گا، کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا حق تلفی کا معاملہ نہیں ہوگا۔ آیت ۱۴ ﴿وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۝۱۴﴾ ”اور یہ کہ ہم میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصافی کرنے والے بھی۔“

قَسَطَ (مثلاثی مجرد میں) عدل اور نا انصافی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور قَاسِطُ (اسم فاعل) کے معنی ”نا انصاف“ کے ہوتے ہیں لیکن اَقْسَطَ (باب افعال میں) صرف عدل و انصاف کے معنی میں مستعمل ہے۔ ﴿فَمَنْ اٰسَلَمَ فَاولٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝۱۵﴾ ”تو جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تو انہوں نے ڈھونڈ نکالی نیکی کی راہ۔“

آیت ۱۵ ﴿وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝۱۵﴾ ”اور جو بے انصاف ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔“

یہ تو تھا جنات کی اس تقریر کا اقتباس جو انہوں نے قرآن سننے کے بعد اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے تبلیغ کی غرض سے کی تھی۔ اس کے بعد خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام کیا گیا ہے۔

## آیات ۱۶ تا ۲۸

وَأَن لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَّاءً غَدَقًا ۝۱۶ لِنَقِیْتَهُمْ فِیْہٖ ۝۱۷ وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّہٖ یَسْأَلْہُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۸ وَأَن الْمَسِیْحَ اللّٰہُ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اٰحَدًا ۝۱۹ وَآئِکَہُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوہُ کَاذِبًا یَّکُونُونَ عَلَیْہِ لِبَدًا ۝۲۰ قُلْ اِنِّہَا اَدْعَاؤِیْ وَلَا اَشْرَکُ بِہٖ ۝۲۱



أَحَدًا ۖ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ صَرًّا وَلَا رِشْدًا ۖ قُلْ إِنِّي لَنْ يُخَيِّرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ۚ  
وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۚ إِلَّا بَلَاغًا مِنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً ۚ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَيَسْأَلُونَ مَنْ  
أُصْغَفَ نَاصِرًا وَاقِلًا عَذَابَ ۚ قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مِمَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي  
أَمَدًا ۚ عَلِيمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۚ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ  
يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۚ لَيَعْلَمَنَّ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ  
بِكُلِّ شَيْءٍ عَدَدًا ۚ

**آیت ۱۶** ﴿وَأَنْ لَّوِ اسْتَفْتَمُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَاءً غَدَقًا ۖ﴾ ”اور (اے نبی ﷺ! آپ  
کہیں کہ مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے) کہ اگر یہ لوگ درست طریقے پر چلتے رہتے تو ہم انہیں خوب  
سیراب کرتے۔“

یعنی اگر نسل انسانی کے لوگ انبیاء و رسل ﷺ کے راستے پر چلتے رہتے تو آخرت کی نجات کے ساتھ ساتھ  
ہم انہیں دنیا میں بھی خوب نوازتے۔ یہاں پر جس مفہوم میں لفظ ”طَّرِيقَةُ“ آیا ہے عین وہی مفہوم لفظ ”شَرِيعَةُ“  
اس آیت میں ادا کر رہا ہے ﴿لَوْ جَعَلْنَاهُ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ﴾ (الحجرات: ۱۸) ”پھر (اے نبی ﷺ!) ہم  
نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر“۔ گویا ان دونوں الفاظ کا مفہوم تو ایک  
ہی ہے لیکن ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ”شریعت“ دین کے ظاہری اور قانونی پہلو کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ  
”طریقہ“ سے دین کا باطنی پہلو مراد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز کے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟ مختلف ارکان کی  
ادائیگی کا درست طریقہ کیا ہے؟ کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ یہ شریعت کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے ایسے  
مسائل معلوم کرنے کے لیے آپ کو کسی فقیہ یا مفتی سے رجوع کرنا ہوگا۔ لیکن نماز کی اصل روح کیا ہے؟ نماز  
میں خشوع و خضوع اور حضور قلب کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اور اس کے اثرات کیا ہیں؟ اس قسم کے سوالات طریقت  
سے متعلق ہیں اور ان کے جوابات آپ کو کسی صوفی سے ملیں گے۔ اولین آدوار کے بزرگان دین تو جامع الصفات  
تھے۔ جو صوفی تھے وہ بہت بڑے عالم اور مفتی بھی ہوا کرتے تھے۔ برصغیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ ایسی ہی  
ایک جامع شخصیت تھے۔ آپ مفتی، مفسر اور محدث بھی تھے اور بہت بڑے صوفی اور مرشد بھی۔ آپ مرزا مظہر  
جانب جاناں شہید رحمہ اللہ (آپ اہل تشیع کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے) کے خلیفہ تھے۔ آپ کا تعلق شیخ احمد  
سرہندی رحمہ اللہ کے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ سے تھا۔ بہر حال ایسی شخصیات کی موجودگی میں تو شریعت اور طریقت کے  
درمیان کوئی بُعد نہیں تھا، لیکن آج بدقسمتی سے دین کے ان دونوں پہلوؤں کو چھڑ کر بالکل الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

**آیت ۱۷** ﴿لَيَسْأَلَنَّهُمْ فِيهِ﴾ ”تا کہ ہم اس (فراوانی) میں ان کی آزمائش کریں۔“

یعنی ہم لوگوں کو خوب سیراب کر کے اور انہیں مختلف النوع نعمتوں سے نواز کر ان کا امتحان لیتے ہیں۔

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی آزمائش کے انداز مختلف ہیں، وہ کسی کو تو نگری اور خوشحالی میں آزما تا ہے تو کسی کو فاقوں میں مبتلا کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ﴾ ”اور جو کوئی بھی اعراض کرے گا اپنے رب کے ذکر سے“

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾ ﴿١٧﴾ ”تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔“

یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ایسے عذاب میں ڈالے گا جس کی شدت ہر لمحہ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

**آیت ۱۸** ﴿وَإِنَّ الْمُسْلِمَ لَللَّهِ﴾ ”اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں“

یہاں ”مساجد“ سے مراد سجدہ کرنے کی جگہیں یعنی عبادت گاہیں بھی ہیں اور سجدے کے اعضاء (پیشانی، ناک، ہاتھ پاؤں، گھٹنے) بھی۔ یعنی تمام مساجد اور انسانوں کے اعضاء سجدہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔

﴿فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ ﴿١٨﴾ ”تو تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو!“

**آیت ۱۹** ﴿وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ﴾ ”اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے“

﴿كَأَدُّوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ ﴿١٩﴾ ”تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس پر جھوم کر کے آجائیں گے۔“

اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور اس میں قرآن کی تلاوت فرماتے تو مشرکین یہ کلام سننے کے لیے آپ ﷺ کے گرد بڑے تجسس سے جمع ہو جاتے تھے، لیکن ایمان لانے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کو نماز میں کھڑا دیکھتے تو ان کے عناد کی آگ بھڑکنے لگتی اور ان کا بقی چاہتا کہ آپ ﷺ پر ہلہ بول دیں اور اس شیع ہدایت کو کھل کر دیں۔

**آیت ۲۰** ﴿قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي﴾ ”(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں“

﴿وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا﴾ ﴿٢٠﴾ ”اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔“

**آیت ۲۱** ﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ صَرًا وَلَا رَشَدًا﴾ ﴿٢١﴾ ”آپ کہہ دیجیے کہ مجھے کوئی اختیار نہیں تمہارے لیے کسی نقصان کا اور نہ راہ پر لانے کا۔“

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے، میں خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ اس حوالے سے سورۃ القصص کی یہ آیت بہت واضح ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (آیت ۵۶) ”آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔“

**آیت ۲۲** ﴿قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ﴾ ”آپ کہہ دیجیے کہ مجھے اللہ (کی پکڑ) سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا“

﴿وَلَنْ أَحْدَ مِنْ دُونِهِ مُنْتَحِدًا﴾ ﴿٢٢﴾ ”اور نہ ہی میں اس کے علاوہ سرچھپانے کی کوئی جگہ پاؤں گا۔“

**آیت ۲۳** ﴿إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً﴾ ”بس (میرا فرض) اللہ کی طرف سے تبلیغ اور اس کے

پیغامات کا پہنچا دینا ہے۔“

یعنی اگر میں نے یہ فریضہ انجام دینے میں کوتاہی کی تو میری جواب دہی ہوگی۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں اپنا قانون واضح طور پر بیان فرما دیا ہے: ﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ ”پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔“

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ ”اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے گا“  
﴿فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ۝﴾ ”تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ  
میش رہے گا۔“

**آیت ۲۴** ﴿حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ﴾ ”یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے وہ چیز جس کی انہیں دھمکی  
دی جا رہی ہے“

﴿فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضَعُفُ نَاصِرًا وَاقْلًا عَدَدًا ۝﴾ ”اُس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون  
کمزور ہے مددگاروں کے اعتبار سے اور کون اقلیت میں ہے۔ تعداد کے لحاظ سے۔“  
سردارانِ قریش کے طعنوں میں سے حضور ﷺ کے لیے ایک طعن یہ بھی تھا کہ آپ کی محفل کے مقابلے میں  
ہماری محفلیں زیادہ باوقار اور پُر رونق ہوتی ہیں۔ آپ تو نچلے طبقے کے چند غریب، کمزور اور نادار افراد کو لے کر  
بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ ہماری محفلوں میں بڑے بڑے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس طعن کا  
جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے حمایتیوں کی طاقت اور تعداد کے لحاظ سے کس  
کی کیا حیثیت ہے۔ سورہ مریم میں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔

**آیت ۱۵** ﴿قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مَا تُوْعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا ۝﴾ ”آپ یہ بھی کہہ دیجیے  
کہ مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آچکی ہے یا میرا رب اس کی مدت اور  
لمبی کر دے گا۔“

مَا تُوْعَدُونَ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چیز جس کی تم لوگوں کو وعید یا دھمکی دی جا رہی ہے۔ وعدہ  
اور وعید دونوں الفاظ ایک ہی مادہ (وعد) سے مشتق ہیں۔ اس لحاظ سے وعید (دھمکی) کی حیثیت بھی گویا ایک  
وعدے کی سی ہے۔ اس آیت کا مضمون ملتے جلتے الفاظ میں سورۃ الانبیاء کی اس آیت میں بھی آچکا ہے: ﴿وَأَنْ  
أَدْرِي أَقْرَبُ أَمْ يَبْعِدُ مَا تُوْعَدُونَ ۝﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ انہیں بتا دیں کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز  
کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آچکی ہے یا ابھی دور ہے۔

**آیت ۲۶** ﴿غَلِمُ الْغَيْبِ﴾ ”وہی ہے غیب کا جاننے والا“

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝﴾ ”پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔“

**آیت ۷۲** ﴿الَّذِينَ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ﴾ ”سوائے اُس کے جس کو اُس نے پسند فرمایا ہوا اپنے رسولوں میں سے“

اس آیت میں علم غیب کے بارے میں بہت اہم اصول بتا دیا گیا ہے۔ یعنی غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے اس بارے میں مطلع فرماتا ہے۔ اس اصول کے تحت دیکھا جائے تو حضور ﷺ کی ذات سے متعلق علم غیب کا مسئلہ خواہ مخواہ متنازعہ بنادیا گیا ہے۔ اگر تو کوئی شخص علم غیب سے مراد ایسا علم لیتا ہے جو بغیر کسی کے بتائے ہوئے حاصل ہو تو ایسا کوئی علم اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہر کسی کو جو بھی علم ملا ہے کسی نہ کسی کے سکھانے سے ہی ملا ہے۔ حضور ﷺ کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ حضرت جبرائیلؑ کو بھی علم اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔ ہم جیسے عام انسان بھی اپنے والدین، اساتذہ اور بزرگوں سے ہی سیکھتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے علم غیب کی درست تعریف (definition) طے کرنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ ”غیب“ کا تعلق مخلوق سے ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز ”غیب“ ہے ہی نہیں، ہر شے ہر آن اُس کے سامنے موجود ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں یا خبریں ہم انسانوں سے پوشیدہ رکھی ہیں وہ ہمارے لیے ”عالم غیب“ ہے۔ مثلاً جنت، دوزخ، فرشتے وغیرہ۔ اس بارے میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو غیب کی خبریں بھی دی جاتی ہیں اور کسی حد تک انہیں عالم غیب کا مشاہدہ بھی کرایا جاتا ہے: ﴿وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلَيَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴﴾ (الانعام) ”اور اسی طرح ہم دکھاتے رہے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔“ حضور ﷺ کو معراج کے موقع پر جنت، دوزخ اور بہت سی دوسری کیفیات کا مشاہدہ کرایا گیا، بلکہ غیب سے متعلق ایسے مشاہدات آپ کو عام معمول کی زندگی میں بھی کرائے جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نماز استسقاء پڑھا رہے تھے تو نماز کے دوران آپ اچانک ایک دفعہ آگے بڑھے اور پھر اسی انداز میں پیچھے ہٹے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے اچانک جنت لے آئی گئی تو میں نے چاہا کہ اس کا پھل توڑ لوں۔ چنانچہ میرا ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بعد میرے سامنے دوزخ لے آئی گئی تو اس کی تپش کی وجہ سے میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ بہر حال علم کے اعتبار سے ایک عام انسان اور ایک نبی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے کہ نبی کو عالم غیب کا علم بھی دیا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں تک امور دنیا کے علم کا تعلق ہے اس بارے میں حضور ﷺ کا واضح فرمان موجود ہے۔ ایک موقع پر آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) (۱) کہ دنیا داری کے اپنے معاملات کے بارے میں تم لوگ بہتر جانتے ہو۔ چنانچہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل علیہم السلام کو جب چاہے جس قدر چاہے عالم غیب کا مشاہدہ کرا دے یا غیب کے علم میں سے جتنا علم چاہے عطا فرمادے۔ البتہ جو کوئی یہ مانے کہ نبی مکرم ﷺ کو کُل غیب کا علم تھا وہ کافر ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً، ج: ۲، ص: ۲۳۶، عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ۔

حضور ﷺ کے علم غیب کے بارے میں بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ذاتی طور پر متعدد بریلوی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ میں جتنے علماء سے ملا ان سب کو میں نے مندرجہ ذیل تین نکات پر متفق پایا:

- (۱) حضور ﷺ کا علم ذاتی نہیں، عطائی ہے، یعنی اللہ کا عطا کردہ ہے۔
- (۲) آپ کا علم قدیم نہیں حادث ہے۔ یعنی پہلے نہیں تھا، جب اللہ نے عطا کیا تو آپ کو علم ہو گیا۔
- (۳) آپ ﷺ کا علم لامحدود نہیں، محدود ہے۔

دراصل ان تین نکات کے بارے میں مسلمانوں کے کسی مکتبہ فکر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے بحث طلب ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو علم غیب عطا فرمایا، جب چاہا اور جتنا چاہا عطا فرمایا۔ اب کیا میں اور آپ اس بارے میں بحث کریں گے کہ حضور ﷺ کو کس چیز کا علم تھا اور کس چیز کا علم نہیں تھا؟ میری اور آپ کی حیثیت ہی کیا ہے کہ ہم حضور ﷺ کے علم کے بارے میں ناپ تول کریں۔ معاذ اللہ!

﴿فَإِنَّهُ يَسْأَلُكَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا﴾ ﴿۷۵﴾ ”تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا

دیتا ہے۔“

یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی حفاظت کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے۔

**آیت ۲۸** ﴿لَيَعْلَمَنَّ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَتِ رَبِّهِمْ﴾ ”تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے واقعتاً اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں“

یعنی اللہ تعالیٰ یہ بات واضح کر دے۔ اسی حوالے سے اتمامِ حجت کے لیے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر حاضرین سے پوچھا تھا: ((أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ”کیا میں نے اللہ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟“ اس پر تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا تھا: نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَأَذَيْتَ وَنَصَحْتَ (۱)

﴿وَأَخَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ ﴿۷۶﴾ ”اور وہ احاطہ کیے ہوئے ہے اس سب کچھ کا جو ان کے پاس ہے اور اُس نے ہر چیز کا حساب کتاب رکھا ہوا ہے گنتی کے ساتھ۔“



# سُورَةُ الْمَزْمَلِ

سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے بلکہ اس سے آگے سورۃ الناس تک تمام (۴۰) سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے آغاز کی آیات لفظی اور معنوی اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۱۹

يَا أَيُّهَا الْمَزْمَلُ ۖ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۖ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ  
الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۚ إِنَّا سَمِعْنَا نَقِيلًا ۚ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَاقُومُ  
قِيلًا ۚ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا ۚ وَادْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَكَبَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۚ رَبُّ  
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۚ وَأَصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا  
جَمِيلًا ۚ وَذُرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولَى النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۚ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۚ  
وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۚ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا  
مَّهِيلًا ۚ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۚ  
فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۚ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ  
الْوِلْدَانَ سِيبًا ۚ السَّمَاءَ مُنْفَطِرًا ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۚ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ  
اتَّخِذْ إِلَى رَبِّهِ سَبِيلًا

بِسْمِ

**آیت ۱** ﴿يَا أَيُّهَا الْمَزْمَلُ ۖ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۖ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۚ﴾ ”اے کبل میں پلٹ کر لیٹنے والے (مُزَمِّل)!“

فداہ آباؤ نا وامہانتا۔

**آیت ۲** ﴿قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۖ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۚ﴾ ”آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔“

**آیت ۳** ﴿نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۚ﴾ ”(یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔“  
یعنی آپ اللہ تعالیٰ کے حضور آدھی رات یا ایک تہائی رات کا قیام کریں۔

آیت ۴ ﴿أَوْ زِدْ عَلَيْهِ﴾ ”یا اس پر تھوڑا بڑھالیں“

یا پھر رات کا دو تہائی حصہ قیام میں گزاریں۔ گویا آپ ﷺ کے قیام اللیل کا دورانیہ یا نصاب ایک تہائی رات سے لے کر دو تہائی رات تک ہونا چاہیے۔ اس نصاب میں ہمارے لیے رمضان کے قیام اللیل کے حوالے سے بھی راہنمائی موجود ہے۔ رمضان کی راتوں کے قیام کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))<sup>(۱)</sup>

”جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!“

اب ظاہر ہے ”قیام اللیل“ کی اصطلاح کا اطلاق رات کے ایک بڑے حصے کے قیام پر ہی ہو سکتا ہے۔ گھنٹے بھر میں جیسے تیسے بیس رکعتیں پڑھ کر سو جانے کو تو قیام اللیل نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ بیس رکعتوں کا نصاب تو اصل میں ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے سارا دن محنت و مشقت میں گزارنا ہے۔ ایسے لوگوں کی مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے قیام اللیل کا ایک کم سے کم معیار مقرر فرمادیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کے حالات موافق ہوں انہیں رمضان المبارک میں بہر صورت زیر مطالعہ آیات کے مفہوم و مدعا کے مطابق قیام اللیل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ حضرات جو اپنی ملازمت وغیرہ سے ایک ماہ کی رخصت لے سکتے ہوں انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنی سالانہ چھٹیاں سیر سیالوں پر ضائع کرنے کے بجائے رمضان کے لیے بچا کر رکھا کریں تاکہ قیام اللیل کی برکتوں سے کما حقہ مستفید ہو سکیں۔

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝﴾ ”اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جائیے۔“

تَرْتِيل کے معنی قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کے ہیں۔ گویا قیام اللیل کا اصل لازمہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کو یہ قسم نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں دے دیا گیا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو قیام اللیل کو مختصر کر کے تہجد کی شکل دے دی گئی، لیکن اس میں بھی قرآن کی تلاوت پر زور دیا گیا: ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹) یعنی تہجد بھی قرآن کے ساتھ (بہ) ادا کریں۔ تہجد کا حق یوں ادا نہیں ہوتا کہ چند مختصر سورتوں کے ساتھ آٹھ رکعتیں ادا کیں اور پھر بیٹھ کر دوسرے اذکار میں مشغول ہو گئے۔ بہر حال جسے اللہ تعالیٰ نے تہجد کی توفیق دی ہو اس کے لیے

(۱) صحیح البخاری، کتاب صلاة التراويح، باب فضل ليلة القدر۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فی قیام رمضان وهو التراويح۔

لازم ہے کہ وہ اتنا قرآن ضرور یاد کرے جس سے تہجد کا کچھ نہ کچھ حق ادا ہو سکے۔

**آیت ۵ ﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَلَاثًا﴾** ”ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔“

اس سے مراد رسالت (انذار و تبلیغ) کی ذمہ داری ہے جس کے بارے میں پہلا حکم سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں آیا تھا۔ واضح رہے کہ سورۃ المزمل کی زیر مطالعہ آیات (غالباً ابتدائی نو آیات) تیسری وحی کی صورت میں نازل ہوئیں جبکہ اس کے بعد نازل ہونے والی چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی۔

اس آیت میں حضور ﷺ کو اس عظیم ذمہ داری کے بارے میں بتایا جا رہا ہے جس کا بوجھ عنقریب آپ کے کندھوں پر پڑنے والا تھا۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے تو حضور ﷺ پہلے ہی انسانیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے، لیکن اب رسالت کی کٹھن ذمہ داریوں کے حوالے سے آپ کو مزید ریاضت کرنے کی ہدایت کی گئی کہ اب آپ رات کا بیشتر حصہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھنے میں گزارا کریں اور اس طرح قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کریں۔

**آیت ۶ ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً﴾** ”یقیناً رات کا جاگنا بہت موثر ہے نفس کو زیر کرنے کے لیے“

**﴿وَأَفْقُومٌ قِيلًا﴾** ”اور بات کو زیادہ درست رکھنے والا ہے۔“

یہ نہایت سکون و اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بندے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

**آیت ۷ ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا﴾** ”یقیناً دن کے اوقات میں تو آپ کے لیے بڑی

مصرفیات ہیں۔“

دن کے اوقات میں تو آپ کو بہت سی دوسری مصرفیات کا سامنا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنا اور ان کی کڑوی کیسی باتیں سنا بذات خود ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ ان مصرفیات میں آپ کی توجہ بٹی رہتی ہے۔ لیکن رات کی تنہائیوں میں تو بس آپ ہیں اور آپ کا رب ہے۔ اس وقت آپ پوری توجہ اور دلجمعی سے اپنے رب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

**آیت ۸ ﴿وَإِذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتَلًا﴾** ”اور آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کریں

اور ہر طرف سے کٹ کر بس اسی کے ہو جائیں۔“

تبتل کا معروف مفہوم تو یہی ہے کہ سب سے کٹ کر کسی ایک کا ہو جانا، لیکن عملی طور پر اس حکم کے ذریعے ایک بندہ مؤمن سے ”بے ہمد و باہمہ“ کی کیفیت مطلوب ہے۔ یعنی رشتوں اور تعلقات کے ہجوم میں بظاہر سب کے ساتھ نظر آو، لیکن حقیقت میں تمہارا تعلق کسی کے ساتھ بھی نہ ہو۔ جیسے قیامت کے دن ہر انسان کو انفرادی حیثیت سے اللہ کے حضور کھڑے ہونا ہوگا۔ اس وقت ماں باپ، اولاد، بیوی شوہر کوئی بھی ساتھ نہیں ہوگا۔ بہر حال ایک بندہ مؤمن کو فریضہ دعوت و تبلیغ کی ادائیگی کے لیے بظاہر تو معاشرے میں رہنا ہے اور خود سے متعلقہ لوگوں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے، لیکن باطنی طور پر اسے تمام لوگوں سے ذہنی و قلبی رشتے، دوستیاں، امیدیں اور توقعات توڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے رشتہ استوار کرنا چاہیے۔ یہ ہے وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتَلًا کے حکم کا اصل مدعا۔



**آیت ۹ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾** ”وہ رب ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی“

**﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا﴾** ”اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بس آپ اسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔“

**آیت ۱۰ ﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ﴾** ”اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے“

**﴿وَاهْجُزْهُمْ هَاجِرًا جَمِيلًا﴾** ”اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔“

یہ لوگ آپ کے لیے شاعر، جادوگر اور مجنون جیسے نام رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کے لیے بلاشبہ نہایت تکلیف دہ ہے، لیکن آپ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورت انداز میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ سورۃ الفرقان میں اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے: ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ کہ جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے اس حکمت عملی کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے انسان کے حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ہو سکتا ہے آج جن لوگوں کو آپ کی دعوت سے چڑھے کل انہیں آپ کی یہی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اس لیے لوگوں سے دوبارہ بات کرنے کا راستہ کھلا رکھنا ضروری ہے۔ یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اگلے بارہ سال کے دوران مکہ کے حالات نے ابھی کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اہل مکہ کی اچھی حرکتوں کی وجہ سے آپ ان کو نظر انداز تو کریں، لیکن تعلقات میں اس قدر نرمی نہ آنے دیں کہ دوبارہ انہیں دعوت دینا ممکن نہ رہے۔

**آیت ۱۱ ﴿وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولَىٰ النَّعْمَةِ﴾** ”آپ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں، جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں“

ان کو مال و اولاد بڑی بڑی جائیدادیں اور طرح طرح کی دوسری نعمتیں بھی میں نے ہی عطا کی ہیں اور اب ان کی سرکشی کا مزہ بھی انہیں میں ہی چکھاؤں گا، لہذا ان کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ نوٹ کیجیے ابتدائی دور کی ان سورتوں میں ذَرْنِي اور ذَرُّهُمْ کے صیغے بار بار آرہے ہیں۔

**﴿وَمَهْلُهُمْ قَلِيلًا﴾** ”اور ابھی آپ انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔“

قبل ازیں ہم سورۃ مریم میں اس سے ملتا جلتا یہ حکم بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَذَابًا﴾ ”تو آپ ان کے خلاف (فیصلے کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔ ہم ان کی پوری پوری گنتی کر رہے ہیں۔“ سورۃ الطارق کی اس آیت میں بھی بالکل یہی مضمون بیان ہوا ہے: ﴿فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ أَهْلُهُمْ رُوْبُدًا﴾ ”تو آپ کافروں کو مہلت دیں، بس تھوڑی سی مزید مہلت۔“

**آیت ۱۲ ﴿إِنَّا لَنَدِينَاكُمُ الْغُلَاةَ وَجَعِجُمًا﴾** ”ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔“

**آیت ۱۳ ﴿وَوَطْعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾** ”اور وہ کھانا جو حلق میں اُٹک جائے گا“

اس سے مراد ”زقوم“ ہے جس کا ذکر قرآن میں متعدد بار ہوا ہے۔ (اس کی تفصیل سورۃ الواقعة آیت ۵۲ کے ضمن میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

﴿وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۳﴾ ”اور دردناک عذاب ہے۔“

یعنی یہ لوگ جہنم کا ایندھن بنے اور اس کے دردناک عذابوں کا مزہ چکھنے کے لیے کشاں کشاں اس کی طرف جا رہے ہیں، لیکن ابھی ہم کچھ دیر کے لیے انہیں مہلت دینا چاہتے ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿يَوْمَ تَذُجُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝۱۴﴾ ”جس دن کہ زمین

اور پہاڑ لرز نے لگیں گے اور پہاڑ ریت کے بکھرتے تو دے بن جائیں گے۔“

کوہ ہمالیہ جیسے بڑے بڑے پہاڑ اس دن ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں (sand dunes) کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر ان ٹیلوں کے پھسلنے اور بکھرنے کے باعث زمین کے تمام نشیب و فراز برابر ہو جائیں گے۔

اس طرح کہ: ﴿لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۝۱۵﴾ (ظہ) ”آپ نہ تو اس میں کوئی نیزہ دیکھیں گے اور نہ کوئی نیلا۔“

**آیت ۱۵** ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ﴾ ”(اے لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک

رسول بھیج دیا ہے تم پر گواہ بنا کر۔“

ہمارا یہ رسول دنیا میں تمہارے سامنے اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دے گا اور قیامت کے دن تمہارے خلاف گواہی دے گا کہ اے اللہ! میں نے تو تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا، اب اس حوالے سے یہ لوگ خود

جواب دہ ہیں۔

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝۱۶﴾ ”جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف بھی ایک رسول۔“

اسی طرح اس سے پہلے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس بھیجا تھا۔

**آیت ۱۶** ﴿فَقَعَلَىٰ فِرْعَوْنَ الرَّسُولُ﴾ ”پس فرعون نے نافرمانی کی ہمارے رسول کی“

﴿فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝۱۷﴾ ”تو ہم نے پکڑ لیا اس کو بڑے وبال والی پکڑ۔“

اب تم خود ہی سوچو کہ اللہ کے رسول کو جھٹلا کر اگر فرعون جیسا مطلق العنان بادشاہ نہیں بچ پایا تھا اور اسی جرم کی پاداش میں اگر عاد و ثمود جیسی طاقتور قوموں کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا تو تم لوگ اللہ کے رسول کو جھٹلا کر کیسے بچ رہو گے!

**آیت ۱۷** ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا﴾ ”اب اگر تم کفر کرو گے تو تم کیسے

بچ جاؤ گے اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔“

قیامت کا دن اللہ کے نافرمانوں کے لیے بہت سخت ہوگا۔

**آیت ۱۸** ﴿إِنَّ السَّمَاءَ مُنْفِطِرَةٌ بِهِ ۝۱۸﴾ ”آسمان اس سے پھٹ پڑنے والا ہے“

اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔“

قیامت اس کائنات پر کہیں باہر سے نہیں آئے گی وہ اس وقت بھی اس کے اندر موجود ہے جیسے کہ سورۃ اللہ اف میں فرمایا گیا ہے: ﴿تَقْلُتْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (آیت ۱۸۷) کہ وہ آسمان و زمین پر بہت بھاری ہے۔

چنانچہ قیامت کا ”بھاری پن“ کائنات کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا ہے اور اب اس کے ظہور سے متعلق اللہ کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

**آیت ۱۹** ﴿إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ﴾ ”یقیناً یہ ایک یاد دہانی ہے۔“

﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۱۹﴾ ”تو جو کوئی بھی چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے۔“

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو قرآن مجید کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق اور بہت عطا فرمائے۔ آمین!

## آیت ۲۰

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنُصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۖ وَاللَّهُ يُفَضِّلُ الْبَيْتَ وَالنَّهَارَ ۖ عَلِمَ أَن لَّنْ حُصُوهَ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۖ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۖ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِّن فَضْلِ اللَّهِ ۖ وَآخَرُونَ يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۖ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَءُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۖ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِن خَيْرٍ نَّحْدُوهُ ۖ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ أَوْ أَكْثَرُ ۖ فَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۲۰

یہ رکوع صرف ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اس آیت کے زمانہ نزول کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی روایت بتاتی ہے کہ یہ آیت اس سورت کے پہلے حصے کے نزول کے آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی اور اس سے قیام اللیل کا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ کچھ روایات میں یہ مدت ایک سال اور کچھ میں ۱۶ ماہ بتائی گئی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور پہلی آیات کے گیارہ سال بعد نازل ہوئی۔ اس آیت کو سمجھنے اور اس سے متعلق روایات میں پائے جانے والے غیر معمولی اختلاف کی وجہ جاننے کے لیے میں ایک عرصہ تک پریشان رہا۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے کسی تفسیر سے بھی مجھے کوئی واضح راہنمائی نہ مل سکی۔ پھر کسی زمانے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ”الاعتقان فی علوم القرآن“ کا مطالعہ کرتے ہوئے اتفاقاً مجھے اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول مل گیا کہ یہ ایک نہیں دو آیات ہیں۔ چنانچہ اس قول کی روشنی میں اس نکتے پر میرا دل مطمئن ہو گیا کہ اس کلام کا نزول تو دو حصوں میں دو الگ الگ مواقع پر ہوا، لیکن حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق اسے ایک آیت شمار کیا گیا۔

**آیت ۲۰** ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنُصْفَهُ وَثُلُثَهُ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی نصف رات اور کبھی

ایک تہائی رات“

﴿وَلَا نَفْعَ مِنَ الَّذِينَ مَعَكَ﴾ ”اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک جماعت آپ کے ساتھ (کھڑی) ہوتی ہے۔“

﴿وَاللَّهُ يَقْدَرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ ”اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے۔“

رات دن کے اوقات بھی اللہ نے بنائے ہیں اور انسانوں کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے اس لیے وہ اپنے بندوں کی استعداد سے خوب واقف ہے۔

﴿عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصُوهُ﴾ ”اللہ جانتا ہے کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے“

یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس انداز سے یہ مشقت زیادہ عرصے تک نہیں جھیلی جاسکتی۔

﴿فَقَاتَبَ عَلَىٰكُمْ﴾ ”تو اُس نے تم پر مہربانی فرمائی ہے“

﴿فَاقْرَءْ وَامَّا تَتَسَوَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ ”تو اب قرآن سے جتنا باآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔“

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مذکورہ قول کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اس آیت کا یہ حصہ پہلی آیات کے گیارہ ماہ یا ایک سال بعد نازل ہوا۔ اس حکم کے ذریعے دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔ البتہ آیت کا دوسرا (درج ذیل) حصہ جس میں قاتل کا ذکر ہے اس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہجرت سے مصداً قبل یا ہجرت کے مصداً بعد نازل ہوا۔ چنانچہ گیارہ سال کے وقفے والی روایت اس حصے سے متعلق ہے۔

﴿عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضًى﴾ ”اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں کچھ لوگ مریض ہوں گے“

﴿وَأُخَرُونَ يَصْرَبُونَ فِي الْأَرْضِ يُسْتَعْمُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ ”اور بعض دوسرے زمین میں

سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے“

﴿وَأُخَرُونَ يَفْقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”اور کچھ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہوں گے“

اب ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے رات کو طویل قیام کرنا ممکن نہیں۔

﴿فَاقْرَءْ وَامَّا تَتَسَوَّرَ مِنْهُ﴾ ”چنانچہ جس قدر تمہارے لیے آسان ہو اس میں سے پڑھ لیا کرو“

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ ”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو“

اب اس حکم میں نماز و خجگہ نہ کی تاکید ہے اور نماز و خجگہ نہ ظاہر ہے ۱۰ انبوی میں معراج کے موقع پر فرض ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے بھی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ آیت کا یہ حصہ ۱۰ انبوی کے بعد ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوا۔ اس حکم میں پانچ نمازوں کو قیام اللیل کا بدل قرار دے دیا گیا البتہ رمضان میں قیام اللیل کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رہا۔ رمضان چونکہ نزول قرآن کا مہینہ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾

(البقرہ: ۱۸۵) ”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا“ چنانچہ قرآن سے تعلق کی تجدید کے لیے اس مہینے میں قیام اللیل کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رمضان کی آمد پر حضور ﷺ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((جَعَلَ اللَّهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا))<sup>(۱)</sup> ”اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)۔“ یعنی رمضان کے روزے تو اہل ایمان پر فرض کر دیے گئے کہ اہل ثروت، نادار، مزدور، کسان وغیرہ سبھی روزہ رکھیں اور بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرنے کے عادی بن کر خود کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھیں۔ جبکہ رمضان کی راتوں کے قیام کے لیے اختیار دے دیا گیا کہ جو کوئی اس کا اہتمام کر سکتا ہو وہ ضرور اس کی برکتوں سے مستفیض ہو۔ بعد میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسے اجتماعی شکل دے دی گئی۔ چنانچہ اجتماعی قیام اللیل کا وہ سلسلہ جس کا اہتمام ہمارے ہاں باجماعت تراویح کی صورت میں ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے امت تک پہنچا ہے۔ یہ دراصل قیام اللیل کا ”عوامی“ پروگرام ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قیام اللیل کی برکتوں سے کوئی شخص بھی محروم نہ رہنے پائے۔ قرونِ اولیٰ کے مخصوص ماحول اور حالات میں اس باجماعت قیام اللیل کی افادیت بہت زیادہ تھی۔ قرآن مجید کی زبان چونکہ ان لوگوں کی اپنی زبان تھی اس لیے امام کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ”از دل خیزد بردل ریزد“ کے مصداق تمام سامعین کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا، لیکن آج ہمارے ہاں کی تراویح کے اکثر و بیشتر مقتدی تو ”زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم“ کی تصویر بنے ساراقت رکعتوں کے حساب میں مشغول رہتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ چنانچہ اس عظیم الشان فورم پر بھی اب قرآن کا سننا بس سننے کی حد تک ہی ہے اور تفہیم و تذکیر کے حوالے سے اس استماع کی افادیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔

﴿وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ”اور اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔“

﴿وَمَا تَقْضُوا لَآ أَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا﴾ ”اور جو بھلائی

بھی تم آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لیے اسے موجود پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر اور اجر میں بڑھ کر۔“ جو نیک اعمال تم نے آگے بھیجے ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ کے پاس تم بہت ہی بہتر حالت میں پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال کو نہ صرف سات سو گنا تک بڑھا کر تمہیں لوٹائے گا بلکہ اپنے فضلِ خاص سے اس کے بدلے خصوصی اجر بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿وَأَسْتَغْفِرُوا اللَّهَ﴾ ”اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا رحمت فرمانے والا ہے۔“



# سُورَةُ الْمَدَّثِر

## تمہیدی کلمات

سورة المدثر اور سورة المزمل کی باہمی مشابہت و مناسبت ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے الفاظ (يَا أَيُّهَا الْمَزْمِلُ ۝ قُمْ) اور (يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ۝ قُمْ) سے واضح ہے۔ ان دونوں آیات میں حضور ﷺ کو چادر کبل یا لحاف چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورة المزمل میں قیام اللیل کے اہتمام کی ترغیب ہے تو اس سورت میں قیام النہار (عملی محنت اور مشقت) کی تیاری کا حکم ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ پہلے سے ہی معراج انسانیت کے درجے پر فائز تھے اور اس حوالے سے آپ کو ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (ن) کی سند بھی عطا ہو چکی تھی، لیکن قیام اللیل کی ریاضت کا مقصد یہ تھا کہ رات کی تنہائیوں میں ترتیل قرآن کی مشق سے قرآن مجید آپ ﷺ کے پورے وجود میں سرایت کر جائے اور رسالت کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کے لیے آپ ﷺ کی روحانی طاقت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس مصرعے میں قرآن کی تاثیر کے اسی پہلو کا ذکر کیا ہے: ”چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود“ کہ قرآن مجید جس انسان کی روح میں سرایت کر جاتا ہے اس کی پوری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔

سورة المدثر کی پہلی سات آیات کے بارے میں اگرچہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی تھی، لیکن تمام اہل علم کی متفقہ رائے بہر حال یہی ہے کہ پہلی وحی سورة العلق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ (پہلی وحی سورة العلق کی ابتدائی پانچ آیات دوسری وحی سورة ن کی ابتدائی سات آیات اور تیسری وحی سورة المزمل کی ابتدائی دس آیات پر مشتمل تھیں۔) اس مغالطے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ فترت وحی کے بعد وحی کا دوبارہ آغاز سورة المدثر کی ابتدائی آیات سے ہوا تھا۔ دراصل تیسری وحی کے بعد کئی ماہ تک نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اس وقفے کو سیرت نگاروں نے ”فترت وحی“ کا نام دیا ہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذریعے حضور ﷺ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصی علوم کے بیش بہا خزانے آپ کو عطا فرمائے۔ نزول وحی میں مذکورہ وقفے کی وجہ سے آپ ﷺ اکثر رنجیدہ اور پریشان رہتے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دن آپ ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی ملک کی شکل میں نظر آئے۔ اس واقعے کی تفصیل جو احادیث سے ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ غار حرا سے نیچے اتر رہے تھے تو آپ کو ایک آواز سنائی دی۔ ”یا محمد“ (ﷺ)! آپ نے ادھر ادھر دیکھا تو آپ کو کہیں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ آپ چند قدم آگے گئے تو پھر آواز آئی ”یا محمد“ (ﷺ)! اس مرتبہ بھی جب پکارنے والا نظر نہ آیا تو آپ کو بجا طور پر گھبراہٹ اور تشویش ہوئی۔ اسی کیفیت میں جب آپ ﷺ مزید آگے بڑھے تو تھوڑی دیر بعد وہی

آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔ اس پر جب آپ ﷺ کی نگاہ اٹھی تو سامنے اُفق پر آپ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی ملکی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا اُفق ان کی موجودگی کی وجہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد آپ گھبرا گئے اور آپ پر کچکی طاری ہو گئی۔ بالکل اسی کیفیت کا سامنا آپ ﷺ کو پہلی وحی کے وقت بھی کرنا پڑا تھا۔ گھر پہنچنے پر آپ مکمل یاخلف اوڑھ کر لیٹ گئے تو اسی حالت میں آپ پر سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات نازل ہوئیں۔ چونکہ یہ ”فترت“ کے بعد پہلی وحی تھی اس لیے بعض روایات میں اس کا ذکر پہلی وحی کے طور پر بھی آیا ہے۔ بہر حال اس وحی کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے حضور ﷺ کی ”رسالت“ کا آغاز ہوا جبکہ سورۃ اعلق کی پہلی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ آپ کی ”نبوت“ کا ظہور ہوا تھا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ نبی پیدا کئی طور پر نبی ہوتا ہے البتہ نبی کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے نزول کے وقت ہوتا ہے۔

ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (يٰۤاَيُّهَا الْمُرْسَلُ اور يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ) کے مفہوم کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کی قبل از بعثت زندگی کے شب و روز کا مطالعہ ضروری ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے اس دور کا نقشہ ذہن میں لائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کا بچپن اور لڑکپن عمرت اور مشقت میں گزرا۔ باقاعدہ طور پر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد آپ نے دوسروں کے سرمائے سے تجارت شروع کی۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد جب آپ ﷺ کو مالی اعتبار سے فراغت ملی تو آپ نے بھرپور انداز میں تجارت کی۔ سائیکالوجی کی اصطلاح میں بات کریں تو ابتدائی زندگی کے دور میں آپ ﷺ کسی حد تک بیروں میں (extroward) شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کے مطابق لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں آپ خلوت گزینی کو پسند فرمانے لگے تھے۔ یعنی اس عمر میں آپ ﷺ کی طبیعت رفتہ رفتہ غور و فکر اور سوچ بچار یعنی دروں میں (introward) رویے کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ غار حرا میں آپ ﷺ کا آنا جانا بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ یوں سائیکالوجی کی ان دو اصطلاحات کے حوالے سے آپ کی شخصیت میں توازن کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ پوری نسل انسانی میں صرف ایک ہی شخصیت ایسی ہے جو بیروں میں نبی اور دروں میں نبی کے رجحانات میں کلیئاً متوازن ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت!

اب سوال یہ ہے کہ غار حرا میں جا کر آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں موجود ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ غار حرا میں آپ عبادت کیا کرتے تھے (حضرت عائشہؓ نے ”فتح“ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہریؒ نے ”تعبد“ سے کی ہے۔) اس حوالے سے شارحین حدیث نے آپ ﷺ کے تنہا یا تعبد کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ غار حرا کی خلوت میں بیٹھ کر آپ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ ان ہی حالات میں جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو ذمہ داری کے شدید احساس کی وجہ سے آپ ﷺ کی سوچ بچار اور تشویش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں آپ ﷺ کی چادر یا مکمل اوڑھنے کی کیفیت کا تذکرہ گویا آپ ﷺ کی زندگی کے اس مخصوص دور کا تذکرہ ہے جس دور میں آپ ہر وقت قمر و تدبر کی چادر میں لپٹے رہتے تھے۔ اس حوالے سے ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (يٰۤاَيُّهَا الْمُرْسَلُ ① فَم..... اور يٰۤاَيُّهَا

﴿قُمْ.....﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی (ﷺ) آپ کے سوچ بچار کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے اب آپ اٹھیں اور عملی جدوجہد کا آغاز کیجیے۔

مضمون کے اعتبار سے یہ سورت تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ اعلق کے ساتھ اس کی خاص مناسبت اور مشابہت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## آیات اتاے

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ قُمْ فَأَنْذِرْ ۚ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۚ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۚ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۚ وَلَا تَمْنُنْ  
تَسْتَكْبِرُ ۚ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ

**آیت ۱** ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ﴾ ”اے کبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!“

**آیت ۲** ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ ۚ﴾ ”آپ اٹھیں اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے۔“

یہ ہے وہ کٹھن ذمہ داری جس کے بارے میں سورۃ المزمل کی آیت ﴿اِنَّا سَلَفُنَا عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلاً﴾ میں حضور ﷺ کو بہت پہلے اشارہ دے دیا گیا تھا، یعنی انذارِ آخرت کی ذمہ داری جس کے لیے تمہیدی کلمات میں قیام اللیل کے مقابلے میں ”قیام النہار“ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ دراصل انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت کے حوالے سے جو اصطلاح قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے وہ ”انذار“ ہی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو بھی بار بار حکم دیا گیا کہ آپ قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو خبردار کریں: ﴿وَاَوْحِیْ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِاَنْذِرْكُمْ بِهِ﴾ (الانعام: ۱۹) اے نبی (ﷺ) آپ ان لوگوں کو بتائیں کہ قرآن مجھ پر نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو خبردار کر دوں۔ تم اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہو تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم امانت ہے جس کی ذمہ داری کے بوجھ سے زمین پہاڑ اور آسمان تک ڈر گئے تھے۔ اسی امانت کے حوالے سے تمہارا احتساب ہونا ہے۔ اس احتساب کے لیے مرنے کے بعد تمہیں پھر سے زندہ کیا جائے گا:

﴿وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَمُوْتُنَّ ۖ ثُمَّ لَتُبْعُنَّ كَمَا تَسْتَفْطَوْنَ ۚ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۚ ثُمَّ لَنُحْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالشُّؤْءِ شُؤْءًا ۚ وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا﴾ (۱)

”اللہ کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا“ اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی!“

بہر حال آیت زیر مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی دعوت کا نقطہ آغاز ”انذارِ آخرت“ ہے۔ اب



اگلی آیت میں اس دعوت کے ہدف کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کی دعوت کا ہدف نہ تو خانقاہی نظام کی تشکیل ہے اور نہ ہی صرف تعلیم و تعلم کے نظام کا قیام ہے، بلکہ اس کا ہدف یہ ہے:

**آیت ۳ ﴿وَرَبُّكَ فَكَبِّرُ﴾** ”اور اپنے رب کو بڑا کرو!“

غور کیجیے! رب کو بڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو اپنی ذات میں خود ہی سب سے بڑا ہے۔ ہم انسان اس کو بھلا کیا بڑا کریں گے؟ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی عملًا تسلیم نہیں کی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو محدود اختیار عطا فرمایا تھا اس کے بل پر اس نے اسی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم اور فساد کا بازار گرم ہو گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ۴۱)۔ ”بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے“ لوگوں کے اعمال کے سبب۔ چنانچہ اب جو کوئی بھی اللہ کو اپنا الہ اور اپنا رب مانتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پارتی (حزب اللہ) کا ممبر اور اس کی فوج کا سپاہی بن کر لوگوں سے اُس کی بڑائی کو منوانے اور اس کی کبریائی کو عملی طور پر دنیا میں نافذ کرنے کی جدوجہد میں اپنا متن اور دھن کھپا دے تاکہ اللہ کی بات سب سے اوجھی ہو: ﴿وَيَكُونَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّهِ﴾ (الانفال: ۳۹) ”اور دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے“۔ یہ ہے ”تکبیر رب“ یا رب کو بڑا کرنے کے مفہوم کا خلاصہ۔ گویا ان دو لفظوں میں حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد اور آپ کے مشن کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ”تکبیر رب“ کی اصطلاح کی حیثیت ایک ایسی گتھلی کی ہے جس میں سے اقامت دین طلبہ دین اظہار دین حق، حکومت البیہ وغیرہ اصطلاحات کی کونئیں بھونٹی ہیں۔

سورت کی ان ابتدائی تین آیات میں حضور ﷺ کی زندگی کے اس دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے جب آپ پر تفکر و تدبر بلکہ تشویش اور فکر و مندی کا غلبہ تھا۔ غار حرا کے اندر پہلی وحی کا نزول آپ کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا جس پر آپ بجا طور پر فکر مند تھے۔ پھر ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کے آئندہ حالات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے آپ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی تھے۔ پہلی وحی کے واقعہ کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خصوصی طور پر ان کے پاس لے کر گئیں۔ وہ صاحب بصیرت عیسائی راہب تھے۔ انہوں نے آپ سے غار حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد کہا کہ آپ کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور ﷺ نے ورقہ بن نوفل کی اس بات پر پریشانی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ آپ ﷺ کا مطلب تھا کہ وہ سب لوگ تو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں، مجھے صادق اور امین مانتے ہیں اور میرے قدموں میں اپنی نگا ہیں، بچھاتے ہیں، بھلا وہ مجھے کیوں شہر بدر کریں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے جواب دیا کہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی یہ ذمہ داری جس کسی کو بھی ملی اس کی قوم اس کی دشمن بن گئی، ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضور ﷺ سے اس ملاقات کے بعد جلد ہی ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا۔ یعنی اس وقت تک صرف آپ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا رسالت کی ذمہ داری ابھی آپ کو نہیں ملی تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت بھی نہیں دی اور اسی لیے ورقہ بن نوفل کا شمار صحابہ میں بھی نہیں ہوتا۔

**آیت ۴ ﴿وَيَا بَنِي إِسْرٰءِیْلَ فَطَهِّرْ كَلِمٰتِیْ ۚ لَا یَكُنْ لِلشِّرْكِ مِنْ شَیْءٍ ۚ وَیَسِّرْ لِلْكَافِرِیْنَ ۚ﴾** ”اور اپنے کپڑوں کو صاف رکھنے کا اہتمام کیجیے۔“

جس طرح آپ کی زندگی کا مقصد پاکیزہ ہے اسی طرح آپ کا لباس بھی پاک اور صاف ہونا چاہیے۔ اس آیت کی صوفیانہ انداز میں ایک تعبیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ”شیاب“ سے صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار بھی مراد ہے۔ گویا اس حکم میں ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت بھی شامل ہے۔

**آیت ۵ ﴿وَالزُّجْنَ فَاهْجُرُوْا ۚ﴾** ”اور ہر قسم کی گندگی سے دور رہیے۔“

یعنی ظاہری اور باطنی نجاستوں سے خود کو بچا کر رکھئے۔ ظاہر ہے باطنی گندگیوں میں سب سے بڑی گندگی شرک ہے۔ (اسی لیے بعض مترجمین نے الزُّجْنَ کا ترجمہ ”بتوں کی گندگی“ کیا ہے۔)

**آیت ۶ ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۚ﴾** ”اور زیادہ لینے کے لیے کسی پر احسان نہ کیجیے۔“

اس آیت کا عام اور معروف مفہوم تو یہی ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہوئے بدلے کی توقع نہ رکھو بلکہ احسان برائے احسان کرو۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس آیت کا وہ ترجمہ پسند ہے جو مولانا اصلاحی صاحب نے کیا ہے: ”اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر!“ ”مَنْ يَمْنُنْ مَتَا“ کے معانی احسان کرنا اور احسان جتلانا کے علاوہ توڑنے اور کاٹنے کے بھی ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اپنے ترجمے میں اسی معنی کو اپنایا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے فرض منصبی سے متعلق جدوجہد کو منقطع نہ کرنا، یقیناً آپ کی اس دعوت کے بڑے بڑے نتائج نکلیں گے۔ کچھ عرصے تک آپ کو انتظار تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن بالآخر آپ کی تحریک کامیاب ہوگی اور آپ کو ڈھیروں کامیابیاں ملیں گی۔

**آیت ۷ ﴿وَلِیُوْثِقَ الْاَبْصٰرُ ۚ﴾** ”اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔“

یہ اس آیت کا وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن میں قبل ازیں متعدد بار یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ صبر کے ساتھ جب ”لی“ آتا ہے تو اس کے معنی میں انتظار کا مفہوم آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے اور جو بھی حکم آئے اس پر عمل کیجیے۔ سورت کا پہلا حصہ ان ابتدائی سات آیات پر مشتمل ہے اور اس حصے میں حضور ﷺ سے خطاب تھا۔ اب اگلی آیت سے اس سورت کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ حصہ تین مختصر آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات میں قیامت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

## آیات ۸ تا ۱۰

فَاِذَا نْفَرَ فِی النَّاقُورِ ۚ فَذٰلِكَ یَوْمَیْذِ یَوْمٍ عَسِیْرٍ ۚ عَلٰی الْكَافِرِیْنَ غِیْرٌ یَّسِیْرٌ ۚ

آیت ۸ ﴿فَإِذَا نُفِرَ فِي النَّاقُورِ ۝﴾ ”جب صور میں پھونکا جائے گا۔“

آیت ۹ ﴿فَذَلِكَ يَوْمًا عَسِيرٌ﴾ ”تو وہ دن بہت سخت دن ہوگا۔“

آیت ۱۰ ﴿عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ﴾ ۱۰ ”کافروں پر وہ ہلکا نہیں ہوگا۔“

اس کے مقابل سورۃ المزمل میں قیامت کے دن کا ذکر اس طرح آیا تھا: ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝١٤ السَّمَاءُ مُنْفِطِرَةٌ ۖ بِهِ طُغْيَانٌ وَعُدَّةٌ مُفْعُولًا ۝١٥﴾ ”اب اگر تم بھی کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ آسمان اس کے ساتھ پھٹ پڑنے کو ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔“

اس کے بعد سورت کے تیسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان آیات کا لہجہ اور انداز بہت سخت ہے۔

## آیات ۱ تا ۳۱

ذُرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَجِيدًا ۖ وَجَعَلْتُ لَهُ مَا لَا مَبْدُودًا ۖ وَبَيْنَ شُهُودًا ۖ وَمَهَّدْتُ لَهُ  
تَمْهِيدًا ۖ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۖ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَيْنِدًا ۖ سَأَرْهُقُهُ صَعُودًا ۖ إِنَّهُ فَكَّرَ  
وَقَدَّرَ ۖ فَقَتِيلٌ كَيْفَ قَدَّرَ ۖ ثُمَّ قَتِيلٌ كَيْفَ قَدَّرَ ۖ ثُمَّ نَظَرَ ۖ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۖ ثُمَّ أَدْبَرَ  
وَأَسْتَكْبَرَ ۖ فَفَالَ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۖ إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۖ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۖ وَمَا  
أَدْرَاكَ مَا سَقَرُهُ ۖ لَا تُبْقَى وَلَا تَذَرُ ۖ لَوَاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۖ عَلَيْهَا سِتْعَةُ عَشْرَ ۖ وَمَا جَعَلْنَا  
أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۖ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۖ لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ  
أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ  
وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۖ كَذَلِكَ  
يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۖ وَمَا هِيَ إِلَّا  
ذِكْرَى لِّلْبَشَرِ ۖ

آیت ۱۱ ﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝﴾ ”آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا۔“

ذُرِّيْہ کا یہ انداز ہم قبل ازیں سورہ ن اور سورۃ المزمل میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ خَلَقْتُ وَحِيدًا کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں نے اسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ تنہا تھا، کوئی مال، اولاد یا جائیداد وغیرہ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان آیات کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ اس شخص کی مکہ اور طائف دونوں شہروں میں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ اللہ نے اسے بہت سے بیٹوں سے بھی نوازا رکھا تھا۔

آیت ۱۲ ﴿وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا﴾ ”اور اسے میں نے بہت سாமال دیا پھیلا ہوا۔“

ان الفاظ میں اشارہ ہے اس شخص کی ان جائیدادوں کی طرف جو زمینوں، باغوں، گھروں وغیرہ کی صورت

میں مکہ اور طائف دونوں شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

**آیت ۱۳ ﴿وَلَبِئْسَ شُھُودًا ۝۱۳﴾** ”اور نگاہوں کے سامنے رہنے والے بیٹے دیے۔“

کسی کے بیٹوں کا گھر میں حاضر و موجود رہنا بھی اس کی تو نگری اور خوشحالی کی علامت ہے۔ ورنہ فکر معاش جوان بیٹوں کو گھر میں چین سے کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ آج ”حاضر باش“ بیٹوں جیسی نعمت کی قدر پوچھنی ہو تو ان والدین سے پوچھیں جن کے نو جوان بیٹے روز کی تلاش میں امریکہ اور یورپ میں دھکے کھا رہے ہیں اور وہ محض انہیں ایک نظر دیکھنے کی امید پر جی رہے ہیں۔

**آیت ۱۴ ﴿وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ۝۱۴﴾** ”اور میں نے اس کے لیے ہر قسم کا سامان خوب اچھی طرح سے تیار کر دیا۔“

**آیت ۱۵ ﴿ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۝۱۵﴾** ”پھر وہ چاہتا ہے کہ میں اسے اور بھی دوں!“

**آیت ۱۶ ﴿كَلَّا ۝۱۶﴾** ”ہرگز نہیں!“

**﴿إِنَّهُ كَانَ لِأَيْسَارًا عَلِيمًا ۝۱۶﴾** ”وہ تو ہماری آیات کا مخالف (اور دشمن بن گیا) ہے۔“

**آیت ۱۷ ﴿سَازُوهُفَةً صَعَوْدًا ۝۱۷﴾** ”میں اسے عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔“

اس سے مراد ایسا عذاب ہے جس کی شدت ہر آن بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی نوعیت کے عذاب کا ذکر سورہ جن میں بھی آچکا ہے: ﴿يَسْلُكُهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۷﴾ ”تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔“

ولید بن مغیرہ بنیادی طور پر بہت ذہین اور سمجھ دار شخص تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، لیکن اپنے ضمیر کی اس آواز پر لبیک کہہ کر وہ اپنی چودھراہٹ اور دنیوی ٹھانڈ بٹھک کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ واقعتاً بہت مشکل میں تھا۔ اپنی اس مشکل کا حل اسے کسی درمیانی راہ میں نظر آتا تھا۔ چنانچہ قریش میں سب سے بڑھ کر اس شخص نے حضور ﷺ پر سمجھوتے (compromise) کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے اس نے حضور ﷺ کو ہمدردانہ انداز میں بھی سمجھایا، پرکشش پیشکش کا حربہ بھی آزمایا اور برادری کے معاملات کا واسطہ بھی دیا کہ قریش اگر آپس میں تقسیم ہو جائیں گے تو ان کی بنی بنائی سا کھ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ غرض اس نے ہر طرح سے کوشش کی کہ حضور ﷺ کو اپنی بات منوالیں، کچھ قریش کی مان لیں اور اس طرح فریقین کے اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔

آئندہ آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالے سے اس شخص کی ایک خاص کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ تفسیر میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک محفل میں قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ایک متفقہ موقف اپنانا چاہیے۔ جب ہم میں سے کوئی اسے شاعر سمجھتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے، کوئی کاہن قرار دیتا ہے تو اس سے خود ہمارا موقف کمزور ہو جاتا ہے کہ ہم خود کسی بات پر متفق نہیں۔ بحث مباحثہ کے بعد انہوں نے ولید بن مغیرہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ جائے اور آپ سے تفصیلی بات چیت کر کے انہیں اپنی حتمی رائے سے آگاہ کرے۔ جب وہ حضور ﷺ سے ملاقات

کر کے واپس آیا تو انہوں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ دراصل حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ لیکن یہ بات سردارانِ قریش کے سامنے تسلیم کرنا اُسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے؟ کیا ہم محمد (ﷺ) کو محض ایک شاعر سمجھیں؟ تو اس نے کہا: نہیں ان (ﷺ) کا کلام شعر نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا تو کیا پھر ہم اسے (ﷺ) کا ہن کہہ سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: نہیں! کاہنوں کے قول و کردار کو میں خوب جانتا ہوں۔ وہ ذومعنی باتیں کرتے ہیں جبکہ یہ (ﷺ) تو دونوں اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس پر سردارانِ قریش نے کہا کہ لو جی! یہ تو گویا! اس پر بھی محمد (ﷺ) کا جادو چل گیا! اب اس نے اہل محفل کے جوتیور دیکھے تو فوراً اینٹرا بدل کر بولا کہ ہاں اس کے کلام کے بارے میں آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو پچھلے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

اب ظاہر ہے ولید بن مغیرہ جیسے معتبر اور مدبر شخص کا ایک بات پر پوری طرح سے قائل ہونے کے بعد زبان سے اس کی علی الاعلان نفی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے زبان سے جھوٹ کہتے ہوئے اور اس دوران اپنی پریشانی اور خفت کو چھپاتے ہوئے جس کرب سے گزرا ہے ان آیات میں اس کی اس پوری کیفیت کی تصویر کشی دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام فصاحت و بلاغت کی معراج اور لفظی منظر کشی کی بہترین مثال ہے۔

**آیت ۱۸ ﴿إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸﴾** ”اس نے غور کیا اور کچھ اندازہ کیا۔“

اس نے سوچا کہ دل کی بات زبان پر لانے یعنی حق کو مان لینے سے کیا ہوگا اور نہ ماننے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ پھر جب اسے اپنے ذہنی مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے تو اس نے ضمیر کی آواز کو دبا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

**آیت ۱۹ ﴿فَقِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹﴾** ”پس ہلاک ہو جائے اُس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔“

اس کے اندازے کے مطابق تو حق کو مان لینے میں سراسر نقصان ہی نقصان تھا، لیکن اسے اس حقیقت کا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے حق کو حق سمجھتے ہوئے ماننے سے انکار کر کے کتنے بڑے گھانے کا سودا کیا تھا۔

**آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ قِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰﴾** ”پھر ہلاک ہو جائے اُس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔“

**آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ نَظَرُ ۝۲۱﴾** ”پھر اُس نے دیکھا۔“

یعنی کچھ دیر توقف کیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

**آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲﴾** ”پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔“

**آیت ۲۳ ﴿ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳﴾** ”پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔“

**آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ إِنَّ هَذَا إِلَهٌ مِّثْلِي مَثَلِي ۝۲۴﴾** ”پھر اُس نے کہا کہ یہ تو بس جادو ہے جو پہلے سے چلا

آ رہا ہے۔“

**آیت ۲۵ ﴿إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵﴾** ”یہ نہیں ہے مگر انسان کا کلام۔“

یعنی اس کلام میں جادو کا سا اثر تو ہے، لیکن محمد (ﷺ) کا یہ دعویٰ کہ یہ اللہ کا کلام ہے اسے میں نہیں مانتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی کلام ہی ہے۔ اب اگلی آیات کو پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے حق کو پہچانتے ہوئے جھٹلا کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے دی۔

**آیت ۲۶ ﴿سَاصِلِهِ سَقَرٌ﴾** ”میں عنقریب اسے ڈالوں گا سقر (دوزخ) میں!“

**آیت ۲۷ ﴿وَمَا أَذْرَاكَ مَا سَقَرٌ﴾** ”اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سقر کیا ہے؟“

**آیت ۲۸ ﴿لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ﴾** ”وہ نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی!“

**آیت ۲۹ ﴿لَوَاحِجَةً لِّلْبَشْرِ﴾** ”انسان کی کھال کو جھلسا ڈالنے والی۔“

نہ تو اس کا عذاب ختم ہوگا اور نہ ہی اس میں جلتے ہوئے انسان کو موت آئے گی۔

**آیت ۳۰ ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾** ”اس پر انیس (۱۹) داروغے مقرر ہیں۔“

آغازِ سورت سے یہاں تک پورا کلام ایک ہی اسلوب میں ہے، یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔ لیکن اب آگے ایک طویل آیت آرہی ہے۔ ایسی ہی ایک طویل آیت ہم سورۃ المزمل میں بھی پڑھ آئے ہیں، بلکہ سورۃ المزمل کا دوسرا کوع اسی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ جس طرح سورۃ المزمل کی مذکورہ آیت باقی سورت سے الگ بعد میں نازل ہوئی، اسی طرح اس سورت کی یہ ایک آیت بھی بعد میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں دراصل مشرکین کی ان استہزائیہ باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کے بارے میں کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کے معاملے کو انہوں نے مذاق بنالیا تھا اور وہ اپنی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے اس بارے میں طرح طرح کے فقرے کتے رہتے تھے۔ ایک محفل میں ابو جہل نے کہا تھا: بھائیو! تم نے سن لیا، اس نبی کے خدا کی فوج صرف انیس سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس آدمی مل کر بھی ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟ اس پر بنی جمح کا ایک زور آور پہلوان یوں گویا ہوا کہ ان میں سے سترہ کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا، باقی دو سے تم سب مل کر نمٹ لینا۔ غرض وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اس آیت میں ان کی ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے:

**آیت ۳۱ ﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً﴾** ”اور ہم نے انہیں مقرر کیے جہنم کے داروغے مگر فرشتے“

ان لوگوں کو فرشتوں کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ فرشتوں کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا ان کی حماقت ہے۔

**﴿وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمُ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا﴾** ”اور ہم نے انہیں ٹھہرائی ان کی یہ تعداد مگر

کافروں کی آزمائش کے لیے“

**﴿لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ﴾** ”تاکہ جنہیں کتاب دی گئی تھی انہیں یقین آ جائے“

جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق جہنم کے انیس داروغوں کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اب ظاہر

ہے اہل کتاب کے لیے تو قرآن کے حق میں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔

﴿وَيَزِدَّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا﴾ ”اور جو اہل ایمان ہیں وہ ایمان میں بڑھیں“

اہل ایمان کے لیے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر وحی ایمان میں اضافے کا باعث بنی ہے۔

﴿وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ ”اور نہ شک میں پڑیں اہل کتاب اور اہل ایمان“

﴿وَلَيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا﴾ ”اور تاکہ کہیں

وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفار بھی کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے؟“

یعنی منافقین اور کفار اپنے من پسند تبصرے کرتے رہیں کہ جہنم کے فرشتوں کی تعداد بتانے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے۔

﴿كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ ”اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو

چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔“

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ ”اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو سوائے اُس کے۔“

﴿وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ﴾ ”اور یہ آیات صرف انسانوں کی یاد دہانی کے لیے ہیں۔“

اس کے بعد سورت کے آخر تک تمام آیات کا اسلوب اور آہنگ وہی ہے جو شروع سورت سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز دردم۔

## آیات ۳۲ تا ۵۶

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۚ وَالْيَلِ إِذَا دَبَّرَ ۚ وَالضُّبْرِ إِذَا أَسْفَرَ ۚ إِنَّهَا لِإِحْدَى الْكُبَرِ ۚ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ۚ

لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۚ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۚ إِلَّا أَصْحَابَ

الْيَمِينِ ۚ فِي جَنَّتِ شَيْتَآءُ لَوْنٍ ۚ عَنِ الْجُبْرِ مَيْنٍ ۚ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ قَالُوا لَمْ نَكُ

مِنَ الْمُصَلِّينَ ۚ وَكَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمُسْكِينِ ۚ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَالِصِينَ ۚ وَكُنَّا لَكَذِبَ

يَوْمَ الدِّينِ ۚ حَتَّىٰ أَتَيْنَا الْيَقِينَ ۚ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشُّفَعِينَ ۚ فَمَا لَهُمْ عَنِ

التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۚ كَانَهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفَرَةٌ ۚ فَزَتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۚ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ

مِنْهُمْ أَنْ يُدْثِيَ صُفْصًا مُنْشَرَّةً ۚ كَلَّا ۚ بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۚ كَلَّا إِنَّهُ تَذَكُّرَةٌ ۚ فَمَنْ

شَاءَ ذَكَرْهُ ۚ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَعْرِفَةِ ۚ

آیت ۳۲ ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ۚ﴾ ”کیوں نہیں قسم ہے چاند کی۔“

آیت ۳۳ ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا اُدْبَرَ﴾ ”اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔“

یعنی جب رات رخصت ہو رہی ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا اسْفَر﴾ ”اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے۔“

یہاں چاند کی قسم اور پھر رخصت ہوتی ہوئی رات اور روشن صبح کے ذکر کے پردے میں بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ رات کی قسم میں فترت وحی کے طویل دور کی طرف اشارہ ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت محمدی کے ظہور تک چھ سو برس پر محیط وہ عرصہ جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس دوران دنیا میں بلاشبہ جہالت کی تاریکی کا راج تھا۔ سابقہ نبوتوں کی تعلیمات زیادہ تر مسخ ہو چکی تھیں اور مجموعی طور پر دنیا کے اندر ہدایت آسمانی کی روشنی بہت مدہم پڑ چکی تھی۔ چاند کی قسم اسی مدہم اور مستعار روشنی کا اشارہ دے رہی ہے، جبکہ صبح کی روشنی نبوت و رسالت محمدی کا استعارہ ہے۔ گویا علامات کے پردے میں ان تین آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا پر جہالت و ضلالت کی تاریکی رات مسلط تھی، ہدایت خداوندی کی روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، مگر اب رسالت محمدی کا خورشید طلوع ہونے سے تاریکی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ان تین قسموں کا حوالہ سورۃ الانشقاق (پارہ تیس) کی آیات ۱۶ تا ۱۹ کے مطالعہ کے دوران دوبارہ آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿اِنَّهَا لَا تَخَذِي الْكُبْرٰى﴾ ”یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔“

ظاہر ہے نوع انسانی کی تاریخ میں نبوت محمدی کے ظہور سے بڑا واقعہ اور کون سا ہوگا۔

آیت ۳۶ ﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ﴾ ”خبردار کرنے کے لیے انسانوں کو۔“

آیت ۳۷ ﴿لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ﴾ ”جو بھی تم میں سے چاہے کہ وہ آگے بڑھے یا

پچھے رہ جائے۔“

اب کامیابی کا دار و مدار ہر کسی کی ہمت اور کوشش پر ہے۔ جس کی ہمت جوان ہو وہ سب سے آگے بڑھ کر صدیقیت کا مقام اور ”السابقون الاولون“ کا درجہ حاصل کر لے۔ جو کوئی دوسروں کا انتظار کر کے ذرا دیر سے چلنے میں عافیت سمجھے وہ وَاَتَّبَعُوْهُمْ يٰۤاَحْسَنُ والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لے اور جس کسی کی ہمت اور قسمت ساتھ نہ دے وہ خود کو مستقل طور پر محروم کر لے۔

آیت ۳۸ ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِِيْنَةٌ﴾ ”ہر جان رہن ہے اُس کے عوض جو کچھ کہ اُس نے

کمایا ہے۔“

ہر انسان نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو کچھ کمایا ہے قیامت کے دن وہ سب کچھ اسے وصول کرنا ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿اِلَّا اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ﴾ ”سوائے ان لوگوں کے جو داہنے والے ہوں گے۔“

یعنی جن کا نام اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿فِيْ جَنَّتٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ﴾ ”وہ جنتوں میں ہوں گے پوچھتے ہوں گے۔“

آیت ۴۱ ﴿عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ ”گنہگاروں کے بارے میں۔“



آیت ۲۲ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ﴾ ”تم لوگوں کو کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟“

آیت ۲۳ ﴿قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ﴾ ”وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔“

آب ۲۴ ﴿وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمَسْكِينِ﴾ ”اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔“

آیت ۲۵ ﴿وَكُنَّا نَحْوُصُّ مَعَ الْخَائِضِينَ﴾ ”اور ہم کٹ جھپیاں کرنے والوں کے ساتھ مل کر کٹ جھپیاں کیا کرتے تھے۔“

ہم تو دنیا میں بس کھیل تماشوں میں ہی لگے رہے۔ حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے۔ ہم نے اپنی زندگی کے مقصد اور انجام کے بارے میں تو کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔

آیت ۲۶ ﴿وَكُنَّا نَكْذِبُ بَيَوْمِ الدِّينِ﴾ ”اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ہم جزاء و سزا کے دن کا انکار کرتے رہے۔“

آیت ۲۷ ﴿حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ﴾ ”یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔“

آیت ۲۸ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّفِيعِيْنَ﴾ ”تو اب ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوگی شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت۔“

آیت ۲۹ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ﴾ ”تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس یاد دہانی (قرآن) سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں؟“

آیت ۵۰ ﴿كَانَتْهُمْ حُمْرٌ مُّنتَفِرَةٌ﴾ ”گویا وہ بد کے ہوئے جنگلی گدھے ہیں۔“

آیت ۵۱ ﴿فَوَرَّتْ مِنْ قَسْرَةٍ﴾ ”جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔“

یہ لوگ ایک اللہ قرآن اور آخرت کے ذکر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر کی آہٹ پا کر جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ایسے مناظر اب ٹیلی ویژن پر عام دکھائے جاتے ہیں کہ افریقہ کے جنگلوں میں زبوروں کے غول کے غول شیر کی آہٹ محسوس کر کے بگٹ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنتَشَرَةً﴾ ”بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو پکڑا دیے جائیں کھلے صحیفے۔“

یہ ان کی استہزائیہ گفتگو کا ذکر ہے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت کے جواب میں اکثر ایسی باتیں کرتے تھے کہ یہ حساب کتاب کا معاملہ قیامت پر کیوں نالا جا رہا ہے؟ آپ اپنے اللہ سے کہیں کہ وہ مہربانی فرما کر ہمارے اعمال نامے ابھی ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کو اللہ کا کلام تب مانیں گے جب ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایک صحیفہ پکڑا دیا جائے گا۔

آیت ۵۳ ﴿كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ﴾ ”ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ وہ آخرت کا خوف

نہیں رکھتے۔“

جب ان کے دلوں میں آخرت کا خوف نہیں رہا تو اب وہ جیسی چاہیں باتیں بنائیں۔ فارسی کا مشہور محاورہ ہے: ”بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!“ کہ ایک دفعہ حیا کا پردہ اٹھا دو پھر جو چاہو کرو۔ چنانچہ آخرت سے بے خوف ہو کر وہ ہر طرح کی باتیں بنانے میں آزاد ہیں۔

**آیت ۵۴ ﴿كَذَٰلِكَ إِنَّهُ تَذَكُّرٌ ۝﴾** ”ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے۔“

**آیت ۵۵ ﴿فَمَنْ شَاءَ ذَكِّرْهُ ۝﴾** ”اب جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔“

**آیت ۵۶ ﴿وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۝﴾** ”اور یہ لوگ نصیحت اخذ نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ

ہی ایسا چاہے۔“

**﴿هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝﴾** ”وہی ڈرنے کے لائق ہے اور وہی مغفرت کا مجاز۔“

یہ اُسی کا حق ہے کہ اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے اُس کے احکام کی پاسداری کی جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ جس کی چاہے مغفرت فرمادے۔



# سُورَةُ الْقِيَامَةِ

## تمہیدی کلمات

سورتوں کے نظم کے اعتبار سے سورۃ القیامہ کا جوڑے کا تعلق سورۃ الدھر کے ساتھ ہے۔ سورۃ القیامہ ادبی و لسانی محاسن اور زورِ خطابت کے اعتبار سے قرآن کے عمومی اسلوب کی بھرپور نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ قرآن کا عمومی اسلوب دراصل خطابت کا اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنی جگہ پر ایک خوبصورت خطبے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ بعض سورتیں تو کئی کئی خطبات پر مشتمل ہیں۔ اس اعتبار سے ہم قرآن کو ”مجموعہ خطبات الہیہ“ (A Collection of Divine Orations) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس اسلوب کا رنگ حضور ﷺ کے خطبات میں بھی نظر آتا ہے۔ حضور ﷺ جب قرآن مجید پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے تو بھی آپ کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ خطبہ دیتے وقت آپ کی آواز بلند ہو جاتی تھی، آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور آپ کے اندازِ خطابت سے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی پہ سالار اپنے سپاہیوں کو لگا رہا ہے۔ بہر حال سورۃ القیامہ کی ایک ایک آیت میں خطابت کا بہت گہرا رنگ نظر آتا ہے۔

سورت کا آغاز اس انداز میں ہوتا ہے جیسے پس منظر میں کچھ لوگ وقوعِ قیامت کو جھٹلانے کے لیے دلیل بازی کر رہے ہوں اور یہ سورت ان کے سلسلہ بحث کو منقطع کرتے ہوئے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہو۔ لیکن چند آیات کے بعد ابتدائی انداز اور خطاب کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ صوتی آہنگ اور خطاب کے رخ کی یہ تبدیلی (تحویلِ خطاب) سورت میں تقریباً ہر چار یا چھ آیات کے بعد ہوتی نظر آتی ہے۔ اس طرح پوری سورت چھوٹے چھوٹے کئی حصوں کا مجموعہ نظر آتی ہے جس میں ہر حصے کی آیات کا ردھم اور ہم آواز الفاظ سے پیدا ہونے والا صوتی آہنگ جدا ہے۔ غرض یہ سورت زورِ خطابت، روانی، غنا، فصاحت و بلاغت اور بہت سی دوسری لسانی و ادبی خوبیوں کا مرقع ہے اور اس حیثیت سے یہ قرآن میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۳۰

لَا أُقِيمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَلَا أُقِيمُ بِالنَّفْسِ الْكَوَامَةِ ۖ اِيْحَسَبُ الْإِنْسَانُ اَنْ اَكُنْ نَّجْمَةً  
عِظَامَةً ۖ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلٰى اَنْ يُسَوِّىَ بَنَانَهُ ۚ بَلَىٰ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجَرًا مَّامَنَهُ ۚ يَسْأَلُ  
اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ۚ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۚ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۚ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ

يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَقَرُّ ۚ كَلَّا لَا وَزَرَ ۚ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۚ يَنْبَغِي  
 الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۚ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِرَهُ ۚ  
 لَا تُخَوِّدُ بِهِ لِسَانُكَ لَتَتَّعَلَّ بِهٖ ۚ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ  
 إِنَّ عَلَيْنَا لِيَاكُنَ ۚ كَلَّا بَلِ الْمُجِئُونَ الْعَاجِلَةُ ۚ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۚ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاصِرَةٌ ۚ  
 إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ ۚ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۚ تَتَّظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۚ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ  
 التَّرَاقِي ۚ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ۚ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۚ وَالْتَفَتِ السَّائِي السَّائِي ۚ إِلَىٰ رَبِّكَ  
 يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۚ

**آیت ۱** ﴿لَا أُفْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۝۱﴾ ”نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔“  
 لا یہاں پر مترجمین کے دلائل کی نفی کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ کہ تمہیں تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا  
 ناممکن نظر آ رہا ہے اور اس بنیاد پر تم لوگ وقوع قیامت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو مگر مجھے  
 اس کے وقوع کے بارے میں اس قدر یقین ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ موقف کے مؤکد اور مؤثر ہونے  
 کے اعتبار سے یہ آیت سورۃ التغابن کی اس آیت سے گہری مشابہت رکھتی ہے: ﴿قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ  
 لَتُنُوْنَنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ﴾ (آیت ۷) ”(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے  
 تم لازماً اٹھائے جاؤ گے پھر تمہیں لازماً جتادیا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں۔“ سورۃ  
 التغابن کی اس آیت کا اسلوب اور انداز بہت پر زور ہے، لیکن دیکھا جائے تو اس میں خارجی دلیل اور منطق کوئی  
 بھی نہیں۔ البتہ ایک شخص اپنے موقف کے حق میں اپنی شخصیت اور اپنے یقین کو دلیل کے طور پر پیش کر رہا  
 ہے۔ لیکن یہ شخصیت وہ ہے جس کے قول و کردار کی سچائی کو اپنے پرانے سب نے مثالی مانا ہے اور یہی اس قول  
 کے سچا ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے معاملے میں بھی وقوع قیامت کے دعوے  
 کی دلیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کی سیرت ہے۔

**آیت ۲** ﴿وَلَا أُفْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ ”اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی۔“  
 نفسِ لوامہ کے لغوی معنی ہیں ملامت کرنے والا نفس۔ اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جسے ہم عرف عام  
 میں ضمیر (conscience) کہتے ہیں۔ اس آیت میں نفسِ لوامہ یا انسانی ضمیر کو قیام قیامت کی دلیل کے طور پر  
 پیش کیا گیا ہے۔ انسانی نفسِ لوامہ یا ضمیر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مسلمان، کافر یا دہریہ انکار نہیں  
 کر سکتا۔ ”میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے“ یا ”My conscience is biting me“ جیسے جملے دنیا بھر کے  
 انسانوں کے ہاں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آپ کوئی غلط یا برا کام کریں تو اندر  
 سے کوئی چیز کیوں بار بار آپ کے دل و دماغ میں جھین پیدا کرتی ہے؟ اور بعض اوقات اس جھین کے تسلسل و  
 تکرار کی وجہ سے آپ کی نیند تک کیوں اڑ جاتی ہے؟ اگر کوئی نیکی نیکی نہیں اور کوئی برائی برائی نہیں تو برے کام پر

آپ کے اندر کی یہ جبین یا خلش آخر آپ کو کیوں تنگ کرتی ہے؟ چنانچہ نیکی اور بدی کے الگ الگ وجوہ کاسب سے بڑا اور آفاقی سطح پر مسئلہ ثبوت انسانی نفس کی ملامت یا ضمیر کی خلش ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے نیک اور برے اعمال کا حتمی اور قطعی نتیجہ نکلتا بھی ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اس حوالے سے زمینی حقائق سب کے سامنے ہیں۔ یعنی دنیا میں ایسا کوئی حتمی اور قطعی نتیجہ نہ تو نکلتا ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر انسان کو اس کے اچھے برے اعمال کی پوری پوری جزایا سزا دینے کے لیے ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کا وجود میں لایا جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قیامت، آخرت یا بعث بعد الموت کی سب سے بڑی دلیل خود انسان کے اندر موجود ہے، اور وہ ہے انسان کا نفسِ لواہ یا اس کا ضمیر۔

**آیت ۳ ﴿يَحْسَبُ الْإِنْسَانُ إِنَّهُ نَجْمَعُ عِظَامَهُ﴾** ”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟“

**آیت ۴ ﴿بَلَىٰ قَدَرِينٌ عَلَىٰ أَنْ تُسَوَّىٰ بَنَانُهُ﴾** ”کیوں نہیں! ہم تو پوری طرح قادر ہیں اس پر بھی کہ ہم اس کی ایک ایک پور درست کر دیں۔“

یہاں پر بلی کے بعد لفظ کُنَّا محذوف ہے، گویا تقدیر عبارت یوں ہے: بَلَىٰ كُنَّا قَادِرِينَ.....  
**آیت ۵ ﴿بَلْ يَرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجَرُ أَمَامَهُ﴾** ”بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ فسخ و فحور آگے بھی جاری رکھے۔“

انسانوں کے ہاں آخرت کے انکار کی سب سے بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نیکی و بدی اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر کے عیش و عشرت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حرام خوریاں چھوڑ کر راہِ راست پر آنے کے مقابلے میں انہیں آخرت کا انکار کر دینا آسان محسوس ہوتا ہے۔ آخرت کے بارے میں انسان کا یہ رویہ ایسے ہی ہے جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی اپنا فیصلہ نہیں بدلتی اسی طرح ان کے انکار کر دینے سے قیامت کے وقوع میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کے طور پر اپنے معین وقت پر آدھمکے گی۔

**آیت ۶ ﴿يَسْأَلُ آيَاتَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾** ”وہ پوچھتا ہے: کب آئے گا قیامت کا دن؟“

مشرکین مکہ حضور ﷺ سے یہ سوال طنزیہ طور پر پوچھتے تھے۔ اسی لیے اس کا جواب بھی بہت تھکے انداز میں دیا گیا ہے۔ سوال و جواب کا یہی انداز اور اسلوب سورۃ الذاریات کی ان آیات میں بھی پایا جاتا ہے: ﴿يَسْأَلُونَ آيَاتَ يَوْمِ الدِّينِ﴾ ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ﴾ ”وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن؟ جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے۔“ مذکورہ سوال کا جواب بھی بالکل اسی انداز میں دیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

**آیت ۷ ﴿فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ﴾** ”پس جب نگاہیں چندھیا جائیں گی۔“

**آیت ۸ ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸﴾** ”اور چاند بے نور ہو جائے گا۔“

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ چاند سورج کے اندر دھنس جائے گا۔

**آیت ۹ ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾** ”اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے۔“

اس وقت سورج چاند سمیت تمام اجرام فلکی کشش ثقل کے قانون کے تحت اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ جب یہ نظام ڈھیلا پڑے گا تو تمام گزے آپس میں ٹکرائیں گے۔

**آیت ۱۰ ﴿يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْرُ ۝۱۰﴾** ”اُس دن انسان کہے گا: کہاں ہے کوئی بھاگ

جانے کی جگہ؟“

**آیت ۱۱ ﴿كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱﴾** ”(کہا جائے گا:) ہرگز نہیں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

**آیت ۱۲ ﴿إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲﴾** ”اس روز تمہارے رب ہی کے حضور میں جا کر کھڑے

ہوتا ہے۔“

**آیت ۱۳ ﴿يُنَبِّئُوا الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝۱۳﴾** ”جتلا دیا جائے گا انسان کو اُس دن جو کچھ

اس نے آگے بھیجا ہوگا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہوگا۔“

تقدیم و تاخیر کے اس فلسفے کو یوں سمجھیں کہ ہمارے اچھے برے اعمال کے بدلے کا ایک حصہ تو ہماری

زندگیوں میں ہی آخرت کے لیے ہمارے اعمال نامے میں جمع (credit) ہوتا رہتا ہے جبکہ ان اعمال کا ایک

دوسرا حصہ اچھے یا برے اثرات کی صورت میں اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ یہ ”اثرات“ اس دنیا میں جب تک

موجود رہتے ہیں ان کے بدلے میں بھی ثواب یا گناہ متعلقہ شخص کے اعمال نامے میں متواتر شامل ہوتا رہتا ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ

تمہاری یہ نیکیاں یا بدیاں تو وہ ہیں جو تم نے براہ راست خود اپنے لیے آگے بھیجی تھیں اور یہ ثواب یا وبال وہ ہے جو

تمہارے اعمال کے پیچھے رہ جانے والے اثرات کی وجہ سے تمہارے حساب میں جمع ہوتا رہا۔

**آیت ۱۴ ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝۱۴﴾** ”بلکہ انسان تو اپنے نفس کے احوال پر خود ہی خوب

بصیرت رکھتا ہے۔“

قیامت کے دن تو کسی کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر انسان کو خود ہی معلوم ہوگا کہ وہ کتنے پانی میں

ہے۔ دنیا سے وہ کیا کچھ لے کر آیا ہے اور یہ کہ وہ کیسے سلوک کا مستحق ہے۔

**آیت ۱۵ ﴿وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرُهُ ۝۱۵﴾** ”اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔“

ظاہر ہے دنیا میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چرب زبان شخص خود ساختہ عذر پیش کر کے اپنی غلطیوں اور

کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے وہ وقتی طور پر متعلقہ لوگوں کو مطمئن کر لے لیکن اس کا

ضمیر اس کو مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

اب آئندہ آیات میں خطاب کا رخ حضور ﷺ کی طرف ہو گیا ہے اور ساتھ ہی کلام کا صوتی آہنگ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ ان آیات کے آخر میں 'قُرْآنُهُ'، 'بَيِّنَاتُهُ' جیسے الفاظ آ رہے ہیں۔ جیسے کہ آغاز میں ذکر ہوا تھا یہ سورت اپنے اسلوب اور صوتی آہنگ کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر حصے کی خوبصورتی اور انفرادیت آیات کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کی وجہ سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً ابتدائی آیات کا اختتام 'قِيَامُهُ'، 'لَوَاتِمُهُ'، 'عِظَامُهُ'، 'بَنَاتُهُ' جیسے الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات کے آخر میں 'الْبَصَرُ'، 'الْقَمَرُ'، 'الْمَقَرُ'، 'وَزَرَ'، 'الْمُسْتَقَرُ' جیسے الفاظ آئے۔ جبکہ گزشتہ دو آیات کے اختتامی الفاظ (بصیرۃ، معاذیرہ) آپس میں ہم آواز ہیں۔ صوتی آہنگ اور اسلوب کی یہ تبدیلی سورت کی آئندہ آیات میں بھی مسلسل نظر آئے گی۔

**آیت ۱۶ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾** ”آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔“

حضور اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جو نبی حضرت جبرائیل وحی لے کر آتے آپ نے کلام کو فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس پس منظر میں یہاں آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس ضمن میں آپ فکر مند نہ ہوں:

**آیت ۱۷ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾** ”اسے جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔“

یعنی آپ خاطر جمع رکھیں قرآن مجید میں سے کوئی آیت یا کوئی لفظ آپ بھولیں گے نہیں۔ اس پورے کلام کی حفاظت اور ترتیب ہمارے ذمہ ہے۔

**آیت ۱۸ ﴿فَإِذَا قُرْآنُهُ فَاتَبَعَ قُرْآنَهُ﴾** ”پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔“

اس میں ترتیب مصحف کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق قرآن مجید کتابی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید کے نزول کی ترتیب اور تھیں اور مصحف کی ترتیب اور ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ اہم نکتہ مد نظر رہنا چاہیے کہ ترتیب مصحف بھی تو قیفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی طے ہوئی ہے، اور یہ کہ ہر وحی کے ساتھ نئے کلام کی ترتیب کا حکم بھی آتا تھا۔ یعنی ہر وحی میں نازل ہونے والی سورت یا آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح کیا جاتا تھا کہ پہلے سے نازل شدہ قرآن کے اندر ان کی جگہ کون سی ہوگی۔

**آیت ۱۹ ﴿لَمْ يَنْ عَلَيْنَا بَيِّنَاتُهُ﴾** ”پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کو واضح کر دینا بھی۔“

قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق یہ بہت اہم وضاحت ہے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل پیغام کی تبیین و تفہیم بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ عملی طور پر اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حسب ضرورت خود ہی اپنے احکام کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں دو احکام کے بارے میں آیا ہے: يَسْتَفْهُوْكَ ..... (آیت ۲۷ اور آیت ۱۷۶) کہ اے نبی (ﷺ) یہ لوگ آپ سے فلاں مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں تو انہیں بتائیں کہ اگر انہیں اس بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ اس معاملے کی

مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی احکام کی تمہین و تشریح خود قرآن نے بھی کی ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام زبان رسالت سے بھی کرایا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴) کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے یہ ذکر آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کو واضح کر دیں لوگوں کے لیے کہ ان پر کیا کچھ نازل ہوا ہے۔ یعنی اگر قرآن کے سمجھنے میں لوگوں کو کہیں کوئی ابہام یا اشکال محسوس ہو تو آپ اس کی وضاحت کر دیا کریں اور اگر انہیں کہیں کوئی حکم اجمال کے پردے میں لپٹا نظر آئے تو آپ اس کی تفصیل بیان کر دیا کریں۔ آئندہ آیات میں خطاب کا رخ اور کلام کا آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿كَلَّمَ بَنِي نَحْبُونَ الْعَاجِلَةَ ۝﴾ ”ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔“

**آیت ۲۱** ﴿وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝﴾ ”اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔“

یہاں خطاب کا رخ کفار کی طرف ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض یہی ہے کہ تم لوگ ”حُبِّ عَاجِلَةٍ“ میں جلا ہوا دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال و اسباب سے محبت کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں آخرت کو بالکل ہی نظر انداز کیے ہوئے ہو۔

**آیت ۲۲** ﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۝﴾ ”بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے۔“

ان آیات میں اب میدان محشر میں موجود لوگوں کی کیفیت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ اس نقشے کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ ہر انسان کو اپنے اعمال کے مطابق اپنے نتیجے کا پہلے سے ہی علم ہوگا۔ جیسے سکول میں اعلان نتائج کے موقع پر کچھ بچے پہلے سے مطمئن اور کچھ پہلے سے پریشان ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر بچہ اپنے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس نے امتحان میں کیا کچھ کیا تھا۔

**آیت ۲۳** ﴿إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ ”اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔“

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔ اس لیے کہ رویت باری تعالیٰ میدان محشر میں نہیں ہوگی، بلکہ اہل جنت، جنت میں داخلے کے بعد جس سب سے بڑی نعمت سے سرشار ہوں گے وہ دیدار الہی ہوگی۔ لیکن کچھ علماء کا خیال ہے اور میری رائے بھی یہی ہے کہ اہل ایمان کو میدان محشر میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رویت باری تعالیٰ سے شرف کیا جائے گا۔ سورۃ الْمُطَفِّفِينَ میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

**آیت ۲۴** ﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ ۝﴾ ”اور بہت سے چہرے اُس روز اترے ہوئے ہوں گے۔“

**آیت ۲۵** ﴿تَنْظُرُ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝﴾ ”ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے

والا ہے۔“

اس کے بعد اب قیامت صغریٰ یعنی انسان کی موت کے وقت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ قیامت کبریٰ کا ذکر تو



قبل ازیں ان آیات میں آپکا ہے: ﴿فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝﴾..... لیکن انفرادی سطح پر تو ہر انسان کی موت ہی اس کی قیامت ہے۔ اسی لیے قیامت کبریٰ کے مقابلے میں ہر انسان کی موت کو اس کی ”قیامت صغریٰ“ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر انسان کو اپنی ”قیامت صغریٰ“ کا تصور اپنے ذہن میں متحضر رکھنا چاہیے۔

**آیت ۲۶** ﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ الثَّرَاقِي ۝﴾ ”ہرگز نہیں! جب کہ جان آ کر پھنس جاتی ہے ہنسلوں میں۔“

**آیت ۲۷** ﴿وَقِيلَ مَنْ سَدِّ رَاقٍ ۝﴾ ”اور کہا جاتا ہے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟“

یہ اس کیفیت کا نقشہ ہے جب بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے دیتے ہیں، حکماء و اطباء معذرت کر لیتے ہیں اور عزیز و اقارب کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس جی اب دعا کریں۔ اس وقت بڑے سے بڑا عقلیت پسند شخص بھی چاہتا ہے کہ کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلا لیا جائے یا کسی تعویذ گنڈے والے کو پوچھ لیا جائے۔ شاید کہ ایسی کسی ترکیب سے اس کا پیارا موت کے منہ میں جانے سے بچ جائے۔

**آیت ۲۸** ﴿وَوَظَنَ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝﴾ ”اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔“

آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اہل و عیال سے بچھڑنے اور بڑے ارمانوں سے بنائے ہوئے گھر اور مال و اسباب کو چھوڑنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

**آیت ۲۹** ﴿وَالنَّفْسُ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝﴾ ”اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔“

یہ عین جان کنی کے وقت کی اس کیفیت کا ذکر ہے جب جسم کے نچلے حصے سے انسان کی جان ٹکنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ ناقابل بیان کرب اور شدید تکلیف کی کیفیت میں ہوتا ہے۔

**آیت ۳۰** ﴿إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۝﴾ ”اُس دن تو تیرے رب ہی کی طرف دھکیلے جاتا ہے۔“

نوٹ کیجیے گزشتہ آیات کے بعد ہم آواز الفاظ سے بننے والا مخصوص صوتی آہنگ ایک مرتبہ بھر تبدیل ہو رہا ہے۔

## آیات ۳۱ تا ۴۰

فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝ وَلَكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ آهْلِهِ يَمْكُنُ ۝ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝ ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝ اِيْحَسْبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُنثَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ اَلَيْسَ ذَلِكَ بِقْدِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُخْزِيَ الْمُؤْمِنَ ۝

**آیت ۳۱** ﴿فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝﴾ ”پس اُس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔“

**آیت ۳۲** ﴿وَلَكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝﴾ ”بلکہ اس نے جھٹلادیا اور پیٹھ موڑ لی۔“

**آیت ۳۳** ﴿ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ بِتَمْطِيٍّ﴾ ”پھر چل دیا اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا۔“

ان آیات میں ایک شخص کی حق دشمنی، ڈھٹائی اور اکڑنوں کی لفظی تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ تصویر سردارانِ قریش میں سے کسی خاص شخص کی بھی ہو سکتی ہے اور مجموعی طور پر ان کے عمومی کردار کی بھی۔ سردارانِ قریش کے اس رویے کی جھلک سورہ ص کی اس آیت میں بھی دکھائی دیتی ہے: ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَكُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ﴾ ”اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور سبر کرو اپنے معبودوں پر یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔“

**آیت ۳۴** ﴿أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ﴾ ”افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے!“

**آیت ۳۵** ﴿ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ﴾ ”پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے!“

**آیت ۳۶** ﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى﴾ ”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟“

کیا یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں؟ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا اور ان کا حساب کتاب نہیں ہوگا؟ اور انہیں ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟

**آیت ۳۷** ﴿أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةٌ مِنْ مَّنِيِّ امْرَأَةٍ﴾ ”کیا وہ حقیر پانی کی ایک بوند نہیں تھا جو (رحم مادر میں) پڑائی جاتی ہے؟“

**آیت ۳۸** ﴿ثُمَّ كَانَ عِلَقَةً﴾ ”پھر وہ ایک علقہ بنا“

یعنی پانی کی اس بوند نے جو تک جیسی شکل اختیار کر لی جو رحمِ مادر کی دیوار کے ساتھ چمٹی رہی۔

﴿فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ﴾ ”پھر اللہ نے اس کو بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔“

اللہ تعالیٰ نے علقہ کو گوشت کے ٹوٹھڑے (مضغہ) میں تبدیل کیا اور پھر اس کا جسم بنایا، جس میں آنکھیں، ناک، کان اور اپنی اپنی جگہ پر دوسرے تمام اعضاء بنا دیے۔ اور یہ سب کچھ ہوتا رہا: ﴿فَفِي ظُلُمٍ ثَلَاثِ أَلْفِ نَفْسٍ﴾ (الزمر: ۶) شکمِ مادر کے تین پردوں کے اندر۔

**آیت ۳۹** ﴿فَجَعَلْ مِنْهُ زُرًّوَجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ ”پھر اسی سے اُس نے دو زوج بنائے“

نر اور مادہ۔“

کسی کو اُس نے مرد بنادیا اور کسی کو عورت۔

**آیت ۴۰** ﴿أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ﴾ ”تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟“

کیا تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گندے پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے؟ اولادِ آدم میں سے افلاطون، بقراط اور سقراط کی تخلیق بھی اسی بوند سے ہوئی اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ بھی ایسے ہی پیدا

ہوئے۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استثناء کے علاوہ نسل انسانی کے تمام افراد اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے پیدا کیے۔ ﴿اَفَعَيَّنَّا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ (ق: ۱۵) ”تو کیا پہلی مرتبہ تم لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد اب ہم عاثر آگئے ہیں؟“ تو اسے عقل کے اندھو! کیا تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو ذات پانی کی ایک بوند سے زندہ سلامت، خوبصورت، بہترین صلاحیتوں کے مالک انسان کو پیدا کر سکتی ہے، کیا وہ مردہ انسانوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوگی؟ اس آیت کا انداز چونکہ سوالیہ ہے اس لیے اسے سن کر یا پڑھ کر ہماری زبانوں پر بے ساختہ یہ الفاظ آ جانے چائیں: ”کیوں نہیں! اسے ہمارے پروردگار! تیری ذات پاک ہے۔ ہم گواہ ہیں کہ تو مردوں کو زندہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔“

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے تو اس سوال کے جواب میں کبھی بلی (کیوں نہیں!) اور کبھی سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ قَبْلٰی (پاک ہے تیری ذات! اے اللہ! کیوں نہیں!) جیسے الفاظ فرمایا کرتے تھے۔



# سُورَةُ الدَّهْرِ

سورة الدهر اور سورة القیامہ کے مابین جوڑے کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دونوں سورتیں مضمون کے تسلسل کی بنا پر باہم جڑی ہوئی ہیں۔ سورة القیامہ کا اختتام انسان کی تخلیق کے ذکر سے ہوا اور اسی مضمون سے سورة الدهر کا آغاز ہو رہا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۲۲

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ ۖ إِنَّمَا شَاكَرًا وَإِنَّمَا كَفُورًا ۝ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَلًَا وَسَعِيرًا ۝ إِنَّ الْأَوَّلَ يُشْرُونَ مِنْ كَالِيسِ كَانَ مَرْجَاهُ ۖ كَافُورًا ۖ عَيْنًا يَشْرِبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۖ يُؤْفُونَ بِالنَّدْرِ وَيَحْفُوتُونَ ۖ يُومَأُ كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۖ وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۖ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا ۖ إِنَّا خَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَتَطِيرًا ۖ قَوَّيْنَاهُمْ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّيْنَاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۖ وَجَزَّيْنَاهُمْ بِهَا صَبْرًا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۖ مُتَّكِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْكَاءِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمَهْرِيرًا ۖ وَدَائِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ۖ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ ۖ كَانَتْ قَوَارِيرًا ۖ قَوَارِيرًا مِّنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۖ وَيَسْقُونَ فِيهَا كَأْسًا ۖ كَانَ مَرْجَاهُ ۖ رَنْجَبِيلًا ۖ عَيْنًا فِيهَا تُسْقَى سَلَاسِلًا ۖ وَيُطَوَّفُ عَلَيْهِمْ وَلَدَانِ مُخَلَّدُونَ ۖ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُورًا ۖ وَإِذَا رَأَيْتَ ثُمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۖ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ خُضْرٌ وَاسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُوتٌ أَسَاوِرٌ مِّنْ فِضَّةٍ وَسَقَمَهُمْ رَنْجَبُهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۖ إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا ۝

پ

آیت ۱ ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا﴾ ① ”کیا انسان پر اس

زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا؟ ”  
 ”ذَّهْر“ سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، جبکہ ”حِجْن“ سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو — چنانچہ ”ذَّهْر“ دراصل وقت کا وہ سمندر ہے جس کے اندر سے کائنات میں رونما ہونے والے ہر قسم کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں۔ وقت کے اسی سمندر میں سے ہم انسان بھی نکلے ہیں۔ ع ”قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حجاب“ (اقبال)۔ چنانچہ اس قلزم ہستی کے اندر ہر انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جب اس کا وجود حقیر پانی کی ایک ایسی بوند کی شکل میں تھا جس کا ذکر کرنا اور نام لینا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

**آیت ۲ ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾** ”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے طے جلے نطفے سے“  
 موجودہ دور میں سائنس نے اس آیت کا مفہوم بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مرد کی طرف سے spermatozoon اور ماں کی طرف سے ovum ملتے ہیں تو zygote وجود میں آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کا ایک بدو تو لفظ ”أَمْشَاج“ کو اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق ہی سمجھا ہوگا۔ گویا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہر زمانے کے ہر قسم کے انسانوں کے لیے قابل فہم رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی و مطالب میں نئی نئی جہتیں بھی دریافت ہوتی رہتی ہیں۔

**﴿تَبَيَّنَ﴾** ”ہم اس کو اُلٹتے پلٹتے رہے“  
 یعنی رحم مادر میں ہم نے اس ”نُطْفَةٍ أَمْشَاج“ کو مختلف مراحل سے گزارا۔ نطفہ سے اسے علقہ بنایا۔ علقہ کو مغضہ کی شکل میں تبدیل کیا اور پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ”تَبَيَّنَ“ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے ”تاکہ ہم اس کو آزمائیں“۔ یعنی ہم نے انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔

**﴿فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾** ”پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا دیکھنے والا۔“  
**آیت ۳ ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ﴾** ”ہم نے اس کو راہ بھادی“

اس سے مراد ”ایمان“ سے متعلق وہ شعور یا وہ ہدایت اور راہنمائی ہے جو ہر انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یعنی انسان اندھا اور بہرہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہری اور باطنی طور پر بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جسمانی حواس بھی دیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے روح کی بصیرت بھی عطا کی ہے۔  
**﴿إِنَّمَا شَاكِرًا وَإِنَّمَا كَفُورًا﴾** ”اب چاہے تو وہ شکر گزار بن کر رہے چاہے ناشکرا ہو کر۔“  
 اب ظاہر ہے جس انداز اور طریقے سے انسان زندگی گزارے گا، اسی کے مطابق آخرت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

**آیت ۴ ﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا﴾** ”یقیناً کافروں کے لیے ہم نے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور دہکتی ہوئی آگ۔“

**آیت ۵** ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝﴾ ”یقیناً نیکوکار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی ملونی ہوگی۔“

ایک طرف کفار و مشرکین زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے جہنم کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو دوسری طرف اللہ کے فرمانبردار اور نیکوکار بندے جنت کی نعمتوں میں دادِ عیش دے رہے ہوں گے۔ جنت میں انہیں آبِ کافور کی آمیزش والی شراب طہور بھی پیش کی جائے گی۔ آگے اس چشمہ کافور کی مزید وضاحت ہے:

**آیت ۶** ﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝﴾ ”یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور جدھر چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔“

یعنی اگر وہ چاہیں گے تو اس چشمے میں سے اپنی مرضی سے نہریں نکال کر اپنے علاقے کی طرف لے جائیں گے۔

**آیت ۷** ﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝﴾ ”وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جس کا شر ہر سو پھیل جائے گا۔“

**آیت ۸** ﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝﴾ ”اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو۔“

علیٰ حُبِّہ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ مال کی محبت کے علیٰ الرغم کھانا کھلاتے ہیں۔ یعنی ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی محبت میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اگر چنانچہ دلوں میں بھی مال سے محبت کا جذبہ ہے اور ان کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مال کو سنبھال سنبھال کر رکھیں، لیکن اپنے ان جذبات کے باوجود وہ محض اللہ کی رضا کے لیے مستحقین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حُبِّ مال کا علاج ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بشارتیں دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحدید کی یہ آیت:

﴿إِنَّ الْمَصْدَقِينَ وَالْمَصْدَقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝﴾

”یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں، ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہوگا۔“

**آیت ۹** ﴿إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ﴾ ”(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو یہ کھانا کھلا رہے ہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے“

﴿لَا نُزِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝﴾ ”ہم آپ سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ۔“

**آیت ۱۰** ﴿إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبَّنَا يَوْمًا غَلُوبًا ۝﴾ ”ہم تو ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جس کی اداسی بڑی ہولناک ہوگی۔“

عَبُوسُ کا لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نہ آتی ہو، بلکہ غصہ اور وحشت برتی ہو۔ جب کہ قمبر کا معنی ہے بہت سخت، بہت کرخت، ہولناک اور طویل۔ چنانچہ یہاں اس سے مراد میدانِ محشر کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے کھرب ہا کھرب انسان شفقراً اور پریشان ہوں گے اور ان میں سے کسی ایک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار تک نظر نہیں آئیں گے۔

**آیت ۱۱** ﴿فَوَقَّهْمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ﴾ ”تو اللہ انہیں بچالے گا اُس دن کے شر سے“

﴿وَلَقَّهْمُ نَصْرَةً وَسُرُورًا﴾ ”اور بخش دے گا انہیں تروتازگی اور مسرت۔“

یعنی چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور۔

**آیت ۱۲** ﴿وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا﴾ ”اور بدلے میں دے گا انہیں ان کے صبر کے

سبب جنت اور ریشم کا لباس۔“

دنیا میں وہ لوگ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں لگے رہے۔ انہوں نے فاتوں سے رہنا گوارا کر لیا لیکن حرام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انہوں نے اپنی جائیں تک قربان کر دیں۔ ان کے اس صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں رہنے کے لیے جنت اور پہننے کے لیے ریشم کی پوشاکیں عطا کرے گا۔

**آیت ۱۳** ﴿مَتَّكِينٍ فِيهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ﴾ ”وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوئے ہوں گے اس میں تختوں کے اوپر۔“

﴿لَا يَرْوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا﴾ ”نہیں دیکھیں گے وہ اس میں دھوپ کی حدت اور

نہ سخت سردی۔“

زَمْهَرِيرُ ایسی سخت سردی کو کہتے ہیں جو انسان پر زبردست کچکی طاری کر دے۔ چنانچہ جنت میں اہل جنت کو نہ تو دھوپ کی تپش تک کرے گی اور نہ ہی انہیں ٹھہرنے والی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گویا جنت میں مسلسل معتدل موسم کا سماں ہوگا۔

**آیت ۱۴** ﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا﴾ ”اور جنت کے سائے ان کے اوپر بٹھکے ہوئے ہوں گے“

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذَلُّلًا﴾ ”اور اس کے پھلوں کے خوشے نیچے جھکے ہوئے لٹک رہے

ہوں گے۔“

**آیت ۱۵** ﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِبَابَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَأَكُوبًا كَانَتْ قَوَارِيرًا﴾ ”اور گردش میں ہوں

گے ان پر (خُذَامِ جنت) چاندی کے برتنوں اور شیشے کے پیالوں کے ساتھ۔“

**آیت ۱۶** ﴿قَوَارِيرًا مِّنْ فِضَّةٍ﴾ ”ایسا شیشہ جو چاندی کا ہوگا“

دراصل وہ آبِ خورے یا جامِ انتہائی نفیس اور شفاف (crystal clear) چاندی سے بنے ہوں گے لیکن دیکھنے میں وہ شیشے جیسے ہوں گے۔

﴿قَدَرُوا مَا تَقْدِيرُ﴾ (۱۶) ”ان کو (ساقیانِ جنت نے) بھرا ہوگا بھر پور اندازے کے مطابق۔“  
**آیت ۱۷** ﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا تَنَازَلُ مِنْ أَجْهَرِ زَنْجِبِيلًا﴾ (۱۷) ”اور ان کو پلایا جائے گا اس میں ایسا جام کہ جس میں ملوثی ہوگی سونڈھ کی۔“

**آیت ۱۸** ﴿عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا﴾ (۱۸) ”یہ ایک چشمہ ہے اس (جنت) میں جس کا نام سلسبیل ہے۔“  
**آیت ۱۹** ﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ﴾ (۱۹) ”اور ان پر گردش میں رہیں گے ایسے لڑکے (خُدامِ جنت) جو ہمیشہ اسی عمر (اور شکل) میں رہیں گے۔“

﴿إِذَا رَأَوْهُمْ حَسِبَتْهُمْ لُؤْلُؤًا مَمْشُورًا﴾ (۲۰) ”جب تم انہیں دیکھو گے تو محسوس کرو گے کہ جیسے وہ موتی ہیں بکھرے ہوئے۔“  
 یعنی وہ نوعِ خدامِ نہایت خوبصورت ہوں گے۔

**آیت ۲۰** ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ نَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا﴾ (۲۰) ”اور تم جہاں بھی دیکھو گے وہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور بہت بڑی بادشاہی دیکھو گے۔“

**آیت ۲۱** ﴿عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ﴾ (۲۱) ”ان کے اوپر لباس ہوں گے باریک بنریشم کے اور گاڑھے ریشم کے“

﴿وَوَحَلُوا آسَافًا مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۲۲) ”اور انہیں کنگن پہنائے جائیں گے چاندی کے۔“  
 ﴿وَسَقَطَهُمْ رَبُّهُمْ سَرَابًا طَهُورًا﴾ (۲۳) ”اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ مشروب۔“  
**آیت ۲۴** ﴿إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا﴾ (۲۴) ”(اور کہا جائے گا: یہ تم لوگوں کے لیے بدلہ ہے اور تمہاری جدوجہد مقبول ہو چکی ہے۔“

تم لوگ اپنی دنیوی زندگی میں غلبہ دین کے لیے جو جدوجہد کرتے رہے تھے وہ اللہ کے ہاں قبول کر لی گئی ہے اور اس کی قدر دانی کے طور پر تم لوگوں کو جنت اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ!

### آیات ۲۳ تا ۳۱

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۚ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آيَةً أَوْ كَفُورًا ۚ  
 وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۚ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۚ إِنَّ هَؤُلَاءِ  
 يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ۚ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۚ وَإِذَا  
 شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَلَهُمْ تَبْدِيلًا ۚ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۚ وَمَا  
 نَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۚ يَدْخُلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ  
 وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۚ



آیت ۲۳ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا﴾ (اے نبی ﷺ) ہم نے ہی نازل کیا ہے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے۔“

آیت ۲۴ ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ”تو آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا“  
 رابطہ مضمون کے اعتبار سے یوں سمجھئے کہ ان آیات کا تعلق سورۃ القیامہ کی ان آیات سے ہے: ﴿لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ (۱۶) ﴿إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ﴾ (۱۷) ”آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھنا دینا ہمارے ذمہ ہے۔“۔ یعنی ہم نے قرآن مجید کو بطور تہنیل (تھوڑا تھوڑا کر کے) ہی نازل کرنا ہے ہماری مشیت اسی میں ہے۔ ہمارا حکم اور ہر فیصلہ اسی وقت پر نازل ہوگا جو وقت ہم نے اس کے نزول کے لیے طے کر رکھا ہے۔ چنانچہ آپ کو نہ صرف نزول قرآن کے حوالے سے صبر کرنا ہے بلکہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بھی آپ کو اپنے رب کے احکام کا منتظر رہنا ہے۔

﴿وَلَا تُطِيعُ مِنْهُمْ إِنَّمَا أَوْفَوْنَا﴾ (۱۸) ”اور آپ ان میں سے کسی گناہگار یا ناشکرے کی باتوں پر دھیان نہ دیجیے۔“

آیت ۲۵ ﴿وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (۱۹) ”اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے صبح و شام۔“  
 آیت ۲۶ ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ﴾ ”اور رات کے ایک حصے میں اس کے لیے سجدہ کیا کیجیے“  
 ﴿وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا﴾ (۲۰) ”اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح کیا کیجیے۔“

یہ اسی حکم کا تسلسل ہے جو سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ یعنی آپ رات کا بیشتر حصہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے، اس کے حضور سر بسجود رہنے اور اس کی تسبیح کرنے میں صرف کیا کریں۔ اُس وقت تک چونکہ ابھی نمازِ پنجگانہ کا حکم نہیں آیا تھا اس لیے سارا زور رات کی عبادت پر تھا۔ بعد میں جب نمازِ پنجگانہ کی فرضیت کا حکم آگیا تو اس ”قیام اللیل“ کو مختصر کر کے تہجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی سب کے لیے نہیں صرف حضور ﷺ کے لیے: ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹)۔ نَافِلَۃ کے لفظی معنی اضافی اور زائد کے ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کے لیے نماز تہجد باقی فرض نمازوں کے علاوہ اضافی فرض کے درجے میں تھی جبکہ امت کے لیے اس کی حیثیت نفل کی ہے۔

آیت ۲۷ ﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا نَّفِيلًا﴾ (۲۱) ”یقیناً یہ لوگ فوری ملنے والی چیز (دنیا) سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن جو ان کے پیچھے آنے والا ہے اس کا دھیان چھوڑے بیٹھے ہیں۔“

یعنی قیامت کا سخت دن: ﴿يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا﴾ (المزمل) ”وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔“ اس آیت کے مضمون کا ربط سورۃ القیامہ کی ان آیات کے ساتھ ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ﴾ (۱۵) ﴿وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ﴾ (۱۶) ”ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے

ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔“

**آیت ۲۸** ﴿نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ﴾ ”ہم نے ہی ان کو تخلیق فرمایا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں۔“

﴿وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَلَهُمْ تَبْدِيلًا﴾ ”اور ہم جب چاہیں گے ان جیسے بدل کر اور لے آئیں گے۔“

عام طور پر اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ایک قوم کو ختم کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے۔ لیکن اس سے پہلے چونکہ انسانی تخلیق اور انسانی جسم کے جوڑ بند درست کرنے کا ذکر ہوا ہے اس لیے میرے نزدیک اس جملے کا درست مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں ہم ان لوگوں کو ان کے دنیوی زندگی والے جسموں جیسے اور جسم عطا کر دیں گے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون قبل ازیں سورۃ بنی اسرائیل: ۹۹ سورۃ الواقعة: ۶۱ اور سورۃ یس: ۸۱ میں بھی آچکا ہے۔

**آیت ۲۹** ﴿إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ﴾ ”یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔“

﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ ”تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے۔“  
یعنی جس کا جی چاہے اپنے رب کے قرب کا راستہ اختیار کر لے۔ اس مضمون کے حوالے سے صوفیاء کے ہاں سیر الی اللہ، تقرب الی اللہ، سلوک الی اللہ وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

**آیت ۳۰** ﴿وَمَا تَشَاءُ وَاِنْ لَا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ ”اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔“

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ ”یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔“

**آیت ۳۱** ﴿يُدْخِلْ مَنْ يَّشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ﴾ ”وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا۔“

ظاہر ہے دنیا و آخرت کا کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہم اللہ کے حکم اور اذن کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص ایک کام کرنے پر بظاہر قادر بھی ہو تو وہ اس کام کو اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اس کی مشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل نہ ہو۔ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ جس طرح ہم خود اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح ہمارے تمام اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ سورۃ الصافات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ کہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ اس مفہوم میں ہر انسان اپنی نیت اور اپنے ارادے کی بنا پر ”کاسب اعمال“ ہے، جبکہ ”خالق اعمال“ اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اسے ایسے اعمال کی توفیق دے گا جن کی بنا پر وہ اس کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا۔

اس جملے کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں اسے جو چاہے گا۔ یعنی وہ صرف اسی شخص کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے گا جو اس کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے کوشاں ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

مَشْكُورًا ﴿١٩﴾ یعنی جس شخص نے آخرت کو اپنا اصل مقصود بنا لیا اور اس کے لیے اس نے مقدور بھرمخت بھی کی اور وہ مؤمن بھی ہو تو اس کی وہ محنت اور کوشش اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و مشکور ہوگی۔

﴿وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ ”اور رہے ظالم تو ان کے لیے اُس نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

اَللّٰهُمَّ اَعِزَّنَا مِنْ ذٰلِكَ ! اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنْ ذٰلِكَ !



# سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ المرسلات انیسویں پارے کی آخری سورت ہے۔ جوڑے کے اعتبار سے اس کا تعلق تیسویں پارے کی پہلی سورت یعنی سورۃ النبا کے ساتھ ہے۔ دونوں سورتوں کے مضمون، اسلوب اور آیات کی ترتیب میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ سورۃ المرسلات پچاس آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں چالیس جبکہ دوسرے رکوع میں دس آیات ہیں۔ سورۃ النبا کی کل چالیس آیات ہیں۔ اس کے پہلے رکوع میں تیس آیات ہیں جبکہ سورۃ المرسلات کی طرح اس کا بھی دوسرا رکوع دس آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورت کے آغاز میں پے درپے قسموں کا ذکر ہے۔ اس خصوصی انداز کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی تیسری سورت ہے۔ اس سے پہلے ہم ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کر چکے ہیں جن کا آغاز اسی طرح پے درپے قسموں سے ہوتا ہے۔ یعنی تیسویں پارے کی سورۃ الصافات اور چھیسویں پارے کی سورۃ الذاریات۔ سورۃ الصافات کے آغاز کی قسموں کا مفہوم تو بالکل واضح ہے کہ ان میں فرشتوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الذاریات کی قسموں کے بارے میں بھی مفسرین کا اجماع ہے کہ ان سے ہوائیں مراد ہیں، لیکن زیر مطالعہ سورت کی قسموں کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ کچھ مفسرین ان سے ہوائیں مراد لیتے ہیں جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۱ تا ۴۰

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۖ فَالْعَصْفِ عَصْفًا ۖ وَالنَّشْرِ نَشْرًا ۖ فَالْفَرْقِ قُرْقًا ۖ  
فَالْبَلْقِ قِطْرًا ۖ عُدْرًا أَوْ نُذْرًا ۖ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعًا ۖ فَإِذَا النُّجُومُ طُيَسَتْ ۖ  
وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۖ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۖ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِتَتْ ۖ لِأَيِّ يَوْمٍ  
أُجِلَّتْ ۖ يَوْمِ الْفُصْلِ ۖ وَمَا أَذْرَبَكَ مَا يَوْمُ الْفُصْلِ ۖ وَيْلٌ يَوْمَذِي لِّلْمُكْذِبِينَ ۖ  
أَلَمْ نُهَبِكِ الْأَوَّلِينَ ۖ ثُمَّ نُنَبِّعُهُمُ الْآخِرِينَ ۖ كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۖ وَيْلٌ  
يَوْمَذِي لِّلْمُكْذِبِينَ ۖ أَلَمْ تَخْلُقْهُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۖ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۖ إِلَى  
قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۖ فَقَدَرُنَا ثُمَّ فَعَمَّمُوا الْفِدْرُونَ ۖ وَيْلٌ يَوْمَذِي لِّلْمُكْذِبِينَ ۖ

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۖ أَحْيَاءُ وَأَمْوَاتًا ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا رِوَاسِي شُهُبٍ وَاسْقَيْنُكُمْ  
مَاءً فَرَاتًا ۖ وَإِنَّ يُؤْمِنُ بِالْمُكْذِبِينَ ۖ إِنطَلِقُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۖ إِنطَلِقُوا إِلَى  
ظِلِّ ذِي تِلْكَ شَعْبٍ ۖ لَا ظَلِيلٌ وَلَا يُغْنِي مِنَ الْهَبِ ۖ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرِّ كَالْقَصْرِ ۖ  
كَأَنَّهُ جِهْلَتٌ صُفْرٌ ۖ وَإِنَّ يُؤْمِنُ بِالْمُكْذِبِينَ ۖ هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطَلِقُونَ ۖ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ  
فَيَعْتَدِرُونَ ۖ وَإِنَّ يُؤْمِنُ بِالْمُكْذِبِينَ ۖ هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۖ جَمَعْنَكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ۖ  
فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُوا ۖ وَإِنَّ يُؤْمِنُ بِالْمُكْذِبِينَ ۖ

**آیت ۱** ﴿وَالْمُرْسَلَتِ عُرْفًا ۝۱﴾ ”قسم ہے ان ہواؤں کی جو چلائی جاتی ہیں بڑی آہستگی سے۔“  
اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کو خاص مقاصد کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلاتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿فَالْعَصْفِ عَصْفًا ۝۲﴾ ”پھرتیز و تند جھنکری صورت میں چلتی ہیں۔“

**آیت ۳** ﴿وَالنَّشْرَاتِ نَشْرًا ۝۳﴾ ”اور ان ہواؤں کی قسم جو (بادلوں کو) پھیلا دیتی ہیں۔“

**آیت ۴** ﴿فَالْفُرْقَاتِ فُرْقًا ۝۴﴾ ”پھر تقسیم کرتی ہیں جدا جدا۔“

سورۃ الذاریات میں ہواؤں کی اس خصوصیت کا ذکر ﴿فَالْمُقْسِمَاتِ أَمْرًا ۝۵﴾ کے الفاظ میں ہوا  
ہے۔ یعنی ہوائیں سمندر سے بخارات کو بادلوں کی صورت میں دو دراز علاقوں تک لے جاتی ہیں پھر وہ اس پانی  
کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مختلف علاقوں میں بارش کی صورت میں تقسیم کرتی ہیں۔ اس تقسیم میں ان کا معاملہ  
ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ جدا جدا ہوتا ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے جل شعل ہو جاتا ہے اور کوئی  
علاقہ خشک رہ جاتا ہے۔

**آیت ۵** ﴿فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا ۝۵﴾ ”پھر قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو ذکر کا القاء کرتے ہیں۔“

گزشتہ چار آیات کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔ البتہ اس  
آیت کے حوالے سے زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے فرشتے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے  
کر آتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں بھی ہواؤں ہی کا تذکرہ ہے۔ اس حوالے سے  
ان مفسرین کا استدلال یہ ہے کہ کسی نبی یا کسی داعی کی آواز بھی تو ہوا ہی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچتی ہے۔  
یعنی پیغامات و معلومات کی ترسیل و تقسیم کا ذریعہ (medium) تو بہر حال ہوا ہی ہے۔

**آیت ۶** ﴿عَذْرًا أَوْ تَذَرًا ۝۶﴾ ”عذر کے طور پر یا خبردار کرنے کے لیے۔“

وحی یا ذکر (یاد دہانی) کا ابلاغ یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں پر اتمام حجت ہو اور ان کا عذر ختم ہو جائے۔  
جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ  
يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ﴾ ”تا کہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی

جنت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو دنیا میں اسی لیے بھیجا تھا کہ ان کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس اُس کے ہاں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر نہ رہ جائے۔ وحی یا یاد دہانی کا دوسرا مقصد یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگوں کو خبردار کرنے (نُذْرًا) کے لیے ہوتی ہے کہ اگر وہ جاگنا چاہیں تو جاگ جائیں اور راست پر آنا چاہیں تو آ جائیں۔

اب اگلی آیت میں ان قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر ہے کہ یہ قسمیں کس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کھائی گئی ہیں:

**آیت ۷** ﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَوَاقِعٍ ۝۷﴾ ”جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کر رہے گی۔“  
یعنی جس قیامت کے بارے میں تم لوگوں کو بار بار متنبہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور آ کر رہے گی۔ واضح رہے کہ سورہ ق سے لے کر سورۃ الناس تک کئی سورتوں کا موضوع انذار آخرت ہے۔ اس لیے سورۃ الذاریات کی قسموں کا مقسم علیہ بھی انذار آخرت ہی سے متعلق تھا: ﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَصَادِقٍ ۝۸﴾ ”جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔“ البتہ سورۃ الصافات کے آغاز میں مذکور قسموں کا انداز تو بالکل ایسا ہی ہے لیکن وہاں ان قسموں کے مقسم علیہ کا تعلق توحید سے ہے: ﴿إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۹﴾ ”یقیناً تمہارا الہ ایک ہی ہے۔“ اس لیے کہ سورۃ الصافات کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون ہی توحید ہے۔

**آیت ۸** ﴿فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ۝۸﴾ ”پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے۔“  
یعنی بے نور کر دیے جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

**آیت ۹** ﴿وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۝۹﴾ ”اور جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے۔“  
ایسی آیات ہمارے لیے آیات تشابہات کا درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جیسے جیسے سائنسی ترقی کی بدولت انسان کی معلومات بڑھیں گی ان آیات کا مفہوم بتدریج واضح ہوتا چلا جائے گا۔

**آیت ۱۰** ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ نُصِفَتْ ۝۱۰﴾ ”اور جب پہاڑ (ریت بنا کر) اُڑا دیے جائیں گے۔“  
قیامت کے زلزلے کے باعث پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ٹیلوں کی مانند ہو جائیں گے اور ان ٹیلوں کے ذرات ہوا میں اُڑتے پھریں گے۔

**آیت ۱۱** ﴿وَإِذَا الرُّسُلُ أَقْنَتْ ۝۱۱﴾ ”اور جب رسولوں (کے کھڑے ہونے) کا وقت آ پہنچے گا۔“  
جب انبیاء و رسل علیہم السلام کی عدالت میں شہادتیں دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

**آیت ۱۲** ﴿لَا يَوْمٌ أُجِّلَتْ ۝۱۲﴾ ”(یہ معاملہ) کس دن کے لیے مؤخر کیا گیا ہے؟“

**آیت ۱۳** ﴿لَيَوْمٍ الْفُضْلِ ۝۱۳﴾ ”فیصلے کے دن کے لیے۔“

یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام کی اپنی اپنی قوموں کے خلاف گواہی (کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا اب یہ لوگ خود جوابدہ ہیں) اور خود متعلقہ اقوام کے افراد سے پوچھ گچھ جیسے معاملات اسی فیصلے کے

دن کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿وَمَا أَذْرٰكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝۱۴﴾ ”اور تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟“

**آیت ۱۵** ﴿وَبَلَّٰثِمِ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝۱۵﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

لفظ ”ویل“ کے معنی تباہی اور بربادی کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے جس کی سختیوں سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔

**آیت ۱۶** ﴿اَلَمْ يَهْلِكِ الْاَوَّلِينَ ۝۱۶﴾ ”کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟“

**آیت ۱۷** ﴿اَلَمْ نَسْجِعْهُمْ الْاٰخِرِينَ ۝۱۷﴾ ”پھر ہم ان کے پیچھے لگاتے رہے بعد میں آنے والوں کو۔“  
اس سے نوع انسانی کی مختلف نسلوں کا یکے بعد دیگرے معمول کے مطابق دنیا میں آنا بھی مراد ہے اور ایک قوم کی تباہی کے بعد اس کی جگہ دوسری قوم کا اٹھایا جانا بھی۔ جیسے قوم نوح کی ہلاکت کے بعد قوم عاد اور قوم عاد کی بربادی کے بعد قوم ثمود کو پیدا کیا گیا۔

**آیت ۱۸** ﴿كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِ ۝۱۸﴾ ”اسی طرح ہم کرتے رہے ہیں مجرموں کے ساتھ۔“

**آیت ۱۹** ﴿وَبَلَّٰثِمِ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝۱۹﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

یہ اس سورت کی تہجمی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے جو اس میں دس مرتبہ آتی ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِّنْ طَّاءٍ مَّهِينٍ ۝۲۰﴾ ”کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟“

انسان کا مادہ تخلیق ایسی گھٹیا چیز ہے کہ جس کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ سورۃ الدھر میں اس حقیقت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿هَلْ اَتٰی عَلَى الْاِنْسَانِ حِجِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ۝۱﴾ ”کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا؟“

**آیت ۲۱** ﴿فَجَعَلْنٰهُ فِیْ فِرَاقٍ مُّكِیْنٍ ۝۲۱﴾ ”پھر ہم نے اس (نطفے) کو رکھ دیا ایک محفوظ مقام میں۔“

یعنی اس حقیر پانی کی بوند کو مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم مادر میں رکھا جو اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

**آیت ۲۲** ﴿اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۲۲﴾ ”ایک طے شدہ مدت تک۔“

**آیت ۲۳** ﴿فَنَقْدَرُ نَادٍ فَنِعْمَ الْقٰیْرُوْنَ ۝۲۳﴾ ”تو ہم نے اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی اچھے ہیں اندازہ

مقرر کرنے والے!“

اس آیت کا ایک مضموم یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ اپنی قدرت سے کیا اور ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں!

**آیت ۲۴** ﴿وَبَلَّٰثِمِ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝۲۴﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں

دن کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الْفُصْلِ﴾ ”اور تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟“

**آیت ۱۵** ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

لفظ ”ویل“ کے معنی تباہی اور بربادی کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے جس کی سختیوں سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔

**آیت ۱۶** ﴿أَلَمْ نُعَلِّمِ الْوَالِیْنَ﴾ ”کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟“

**آیت ۱۷** ﴿ثُمَّ نُنْفِخُهُمُ الْآخِرِیْنَ﴾ ”پھر ہم ان کے پیچھے لگاتے رہے بعد میں آنے والوں کو۔“  
اس سے نوع انسانی کی مختلف نسلوں کا یکے بعد دیگرے معمول کے مطابق دنیا میں آنا بھی مراد ہے اور ایک قوم کی تباہی کے بعد اس کی جگہ دوسری قوم کا اٹھایا جانا بھی۔ جیسے قوم نوح کی ہلاکت کے بعد قوم عاد اور قوم عاد کی بربادی کے بعد قوم ثمود کو پیدا کیا گیا۔

**آیت ۱۸** ﴿كَذَٰلِكَ تَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ﴾ ”اسی طرح ہم کرتے رہے ہیں مجرموں کے ساتھ۔“

**آیت ۱۹** ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِیْنَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

یہ اس سورت کی ترجیحی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے جو اس میں دس مرتبہ آئی ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ﴾ ”کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟“

انسان کا مادہ تخلیق ایسی گھٹیا چیز ہے کہ جس کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ سورۃ الدھر میں اس حقیقت کا ذکر اس طرح آیا ہے ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْکُورًا﴾ ”کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا؟“

**آیت ۲۱** ﴿فَجَعَلْنَاهُ فِی قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾ ”پھر ہم نے اس (نطفے) کو رکھ دیا ایک محفوظ مقام میں۔“  
یعنی اس حقیر پانی کی بوند کو مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم مادر میں رکھا جو اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔

**آیت ۲۲** ﴿إِلَی قَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ ”ایک طے شدہ مدت تک۔“

**آیت ۲۳** ﴿فَقَدَرْنَا فَنِعْمُ الْقَدِرُونَ﴾ ”تو ہم نے اندازہ مقرر کیا“ اور ہم کیا ہی اچھے ہیں اندازہ مقرر کرنے والے!“

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ اپنی قدرت سے کیا اور ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں!  
**آیت ۲۴** ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِیْنَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں



کے لیے۔“

**آیت ۲۵** ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًاۙ﴾ ”کیا ہم نے زمین کو نہیں بنا دیا سمیٹ لینے والی؟“

**آیت ۲۶** ﴿اَحْيَاءَ وَاَمْوَاتًاۙ﴾ ”زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی!“

اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ایسی بنائی ہے کہ یہ اپنے اوپر موجود ہر زندہ وجود کی تمام ضروریات پوری کر رہی ہے اور ہر قسم کے مردہ کو بھی تحلیل کر کے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں ایسی منجاش رکھی ہے کہ یہ تاقیام قیامت تمام زندوں اور تمام مردوں کے لیے کفایت کرے گی۔

**آیت ۲۷** ﴿وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوْاسِيَ شُلُحِبِثٍ وَّاَسْقَيْنُكُمْ مَّاءً فُرَاتًاۙ﴾ ”اور ہم نے اس کے اندر

بادیے خوب جے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ہم نے تمہیں پلایا (اس میں سے) تسکین بخش پانی۔“

**آیت ۲۸** ﴿وَبَلَّغْنَا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَۙ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں

کے لیے۔“

ان تمام آیات میں تذکیر بلاء اللہ کا انداز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، نعمتوں اور اس کے احسانات کے ذکر سے یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔

**آیت ۲۹** ﴿اَنظِلُّوْا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكْتَبُوْنَۙ﴾ ”چلو اب اُسی چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

یعنی جہنم کی آگ کی طرف۔ یہ وہ حکم ہے جو میدانِ محشر میں اہل جہنم کو سنایا جائے گا۔

**آیت ۳۰** ﴿اَنظِلُّوْا اِلٰی ظِلِّ ذٰی ثَلٰثِ شُعَبٍۙ﴾ ”چلو اُس تین شاخوں والے سائے کی طرف!“

میدانِ محشر کی چلچلاتی دھوپ اور شدید گرمی میں جب وہ لوگ جہنم کو دیکھیں گے تو دور سے وہ انہیں تین اطراف میں پھیلے ہوئے سائے والی کسی جگہ کی طرح نظر آئے گی۔ چنانچہ انہیں کہا جائے گا کہ اگر تمہیں وہ سایہ نظر آتا ہے تو چلو اس سائے کی طرف! لیکن اس ”سائے“ کی حقیقت یہ ہوگی کہ:

**آیت ۳۱** ﴿لَا ظِلِّیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللّٰهَبِۙ﴾ ”نہ تو وہ سایہ دار ہے اور نہ ہی آگ کی تپش سے

بچانے والا۔“

**آیت ۳۲** ﴿اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرِّ رَکَافٍۙ﴾ ”وہ آگ اتنے بڑے بڑے انگارے پھینک رہی ہوگی

جیسے کہ وہ محل ہوں۔“

**آیت ۳۳** ﴿کَاَنَّهُ جُمِلَتْۢ صُفْرًاۙ﴾ ”(یا) جیسے وہ زرد رنگ کے اونٹ ہوں۔“

**آیت ۳۴** ﴿وَبَلَّغْنَا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَۙ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

**آیت ۳۵** ﴿هٰذَا یَوْمٌ لَا یَنْطَفُوْنَۙ﴾ ”یہ ہے وہ دن جس میں یہ بول نہیں سکیں گے۔“

**آیت ۳۶** ﴿وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فِیْ حٰیٰرَتِهِمْۙ﴾ ”اور نہ ہی انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ کوئی عذر تراشیں۔“

**آیت ۳۷** ﴿وَبَلَّغْنَا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَۙ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

آیت ۳۸ ﴿هَذَا يَوْمُ الْقُضْلِ﴾ ”یہ ہے فیصلہ کا دن“

﴿جَمَعْنَكُمْ وَالْأَوَّلِينَ﴾ ”ہم نے جمع کر لیا تمہیں بھی اور پہلوں کو بھی۔“

آیت ۳۹ ﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ تَكِيدٌ فَكِيدُوا﴾ ”اب اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے

خلاف وہ چال چل دیکھو۔“

آیت ۴۰ ﴿وَيُلْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

### آیات ۴۱ تا ۵۰

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ۖ وَفَوَاكِهٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ

تَعْمَلُونَ ۚ إِنَّكَ ذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۖ وَيُلْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۖ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا

إِنَّكُمْ مُّجْرِمُونَ ۖ وَيُلْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۖ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ۖ وَيُلْ

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۖ فَيَأْتِي حَرِيثٌ بَعْدُكَ يُؤْمِنُونَ ۚ

اب دوسرے رکوع کی دس آیات میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جا رہا ہے۔ یہاں شروع میں اہل ایمان کا

احوال بیان ہوا ہے اور آخر میں انتہائی اختصار کے ساتھ کفار کا ذکر آیا ہے۔

آیت ۴۱ ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ﴾ ”(اس دن) متقین یقیناً سائے اور چشموں کے

ماحول میں ہوں گے۔“

آیت ۴۲ ﴿وَفَوَاكِهٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ﴾ ”اور ایسے پھلوں کے اندر جو انہیں پسند ہوں گے۔“

انہیں ایسے پھل دیے جائیں گے جنہیں کھانا انہیں بہت مرغوب ہوگا۔

آیت ۴۳ ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ”(اور ہم ان سے کہہ دیں گے) کھاؤ

بیوڑے سے رچا بچتا ان اعمال کے انعام کے طور پر جو تم کرتے رہے تھے۔“

آیت ۴۴ ﴿إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ ”یقیناً ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں اپنے محسن

بندوں کو۔“

آیت ۴۵ ﴿وَيُلْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

اس کے بعد اب روئے سخن پھر کفار و مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔

آیت ۴۶ ﴿كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُّجْرِمُونَ﴾ ”(اے کفار و مشرکین!) تم کھا پی لو تھوڑی

دیر کے لیے یقیناً تم لوگ مجرم ہو۔“

تم لوگ اپنی دنیوی زندگی میں عیش کر رہے ہو تو کرتے جاؤ۔ بالآخر قیامت کے دن تمہیں مجرموں کا

دثیت سے ہمارے سامنے پیش ہونا ہے۔

**آیت ۴۷** ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ ”جس دن ہلاکت اور بربادی ہوگی (تمہارے جیسے تمام)

جھٹلانے والوں کے لیے۔“

**آیت ۴۸** ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ﴾ ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے رب

کے سامنے) جھکو تو یہ جھکتے نہیں ہیں۔“

**آیت ۴۹** ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ ”(ہلاکت اور) بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

**آیت ۵۰** ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ﴾ ”تو اب اس (قرآن) کے بعد یہ اور کس کلام پر

ایمان لائیں گے؟“

قرآن جیسا کلام سن کر بھی جس انسان کی آنکھیں نہیں کھلیں، تو اس کے بعد اس کی آنکھیں بھلا کب کھلیں گی؟



## سُورَةُ النَّبَاِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۳۰ تا

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۚ الَّذِي هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُونَ ۚ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۚ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۚ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهْدًا ۚ وَالْجِبَالَ اَوْتَكَادًا ۚ وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۚ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۚ وَجَعَلْنَا النَّيْلَ لِيَاسًا ۚ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۚ وَبَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۚ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۚ وَانْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۚ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۚ وَجَعَلْنَا الْفُجَاءَ اِنَّا يَوْمَ الْفُصْلِ ۚ كَانَ مِيقَاتًا ۚ يَوْمَ يَنْفَعُ فِي الصُّورِ فِتْنَانُ ۚ اَفْوَاجًا ۚ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ ۚ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۚ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ ۚ فَكَانَتْ سَرَابًا ۚ اِنَّا جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۚ لِلطَّاغِيْنَ مَابًا ۚ لِّبَشِيْنَ فِيْهَا حَقَابًا ۚ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۚ اِلَّا حَيْمًا وَّغَسَاقًا ۚ جَزَاءً وَّفَاقًا ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۚ وَكَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۚ فَذُوْقُوْا فَلَئِنْ لَّمْ تَزِدْكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۚ

تَعْلَمُ  
بِالنَّبَاِ  
(۳۰)

**آیت ۱** ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ①﴾ ”کس چیز کے بارے میں یہ لوگ آپس میں پوچھ چگچ کر رہے ہیں؟“ یہ منظر کشی کا بہت خوبصورت انداز ہے۔ ان دو الفاظ میں گویا اس بے چینی اور پچھل کی تصویر کھینچ دی گئی ہے جو اہل مکہ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سبب پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی سوال ہو کہ محمد (ﷺ) نے یہ کیا نئی بات کر دی ہے؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی! پھر قیامت برپا ہو گی! تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کر لیا جائے گا! ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کا حساب ہو گا! وہاں کوئی کمی پُرسانِ حال اور مددگار نہیں ہو گا! بھلا یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ مرنے کے بعد سب کا پھر سے زندہ ہو جانا؟ اتنے انسانوں کا حساب کتاب؟ ایک ایک عمل کا محاسبہ؟ نہیں، نہیں عقل نہیں مانتی! گویا مکہ کے ہر گھر میں ایک چھ میگوئیاں ہو رہی ہیں ہر محفل اور ہر چوپال میں انہی سوالات پر تبصرے ہو رہے ہیں پورے شہر کی فضا میں ایک ہی موضوع گردش کر رہا ہے۔ غرض جہاں کہیں چار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کی گفتگو کی تان میں یہی پرا کر ٹوٹی ہے۔

**آیت ۲** ﴿عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ②﴾ ”اُس بڑی خبر کے بارے میں۔“

یعنی قیامت کی خبر کے بارے میں۔ جیسے سورۃ المدثر میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّمَا لِأَحَدِي الْكَبِيرِ﴾<sup>(۷)</sup> ”یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔“

**آیت ۳** ﴿الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ﴾<sup>(۸)</sup> ”جس کے بارے میں یہ اختلاف رائے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔“  
 قیامت کے بارے میں تفصیلات سن کر ان میں سے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے معبودوں کے ہوتے ہوئے ہم سے کوئی محاسبہ نہیں ہو سکتا۔ غرض جتنے مندرجاتی باتیں! ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔

**آیت ۴** ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ﴾<sup>(۹)</sup> ”نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔“  
 عنقریب اصل حقیقت ان لوگوں پر منکشف ہو جائے گی۔ وقت آنے پر یہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔ سورہ قی میں اس کیفیت کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾<sup>(۱۰)</sup> ”(اللہ فرمائے گا: اے انسان!) تو اس دن سے غفلت میں رہا تھا! تو آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے تو آج تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے۔“

**آیت ۵** ﴿لَكُمْ سَيَعْلَمُونَ﴾<sup>(۱۱)</sup> ”ہاں کوئی بات نہیں! عنقریب یہ جان لیں گے۔“  
 عالم دین اور عالم برزخ کے درمیان صرف موت کا پردہ حائل ہے۔ جو نہی کسی انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ قبر عالم برزخ کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل پر پہنچنے ہی ہر انسان اصل حقیقت کو جان جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب ان میں سے ہر شخص پر اصل حقائق عیاں ہو جائیں گے۔

**آیت ۶** ﴿لَكُمْ لَنُجْعِلَنَّ الْأَرْضَ مِثْنًا﴾<sup>(۱۲)</sup> ”کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو کچھوٹا؟“  
**آیت ۷** ﴿وَالْجِبَالِ أَوْ تَادًّا﴾<sup>(۱۳)</sup> ”اور پہاڑوں کو میخیں؟“  
 زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے پہاڑوں کو اس میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔

**آیت ۸** ﴿وَنُحَاقِّنُكُمْ أَوْ رَاجًّا﴾<sup>(۱۴)</sup> ”اور تمہیں ہم نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔“  
**آیت ۹** ﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾<sup>(۱۵)</sup> ”اور تمہاری نیند کو بنا دیا ہم نے تھکان دور کرنے والی۔“  
**آیت ۱۰** ﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا﴾<sup>(۱۶)</sup> ”اور رات کو ہم نے بنا دیا ڈھانپ لینے والی۔“

**آیت ۱۱** ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾<sup>(۱۷)</sup> ”اور دن کو ہم نے بنا دیا معاش (کی جدوجہد) کے لیے۔“  
**آیت ۱۲** ﴿وَوَبَّيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾<sup>(۱۸)</sup> ”اور تمہارے اوپر بنا دیے ہم نے سات مضبوط آسمان۔“  
**آیت ۱۳** ﴿وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا﴾<sup>(۱۹)</sup> ”اور ہم نے (سورج کو) بنا دیا ایک روشن چراغ۔“

**آیت ۱۴** ﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾<sup>(۲۰)</sup> ”اور ہم نے امار دیا نچرنے والی بدلیوں سے چھا جوں پانی۔“

یعنی ہم پانی سے لہریز بادلوں سے موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔

**آیت ۱۵** ﴿تَنْخُرُجُ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝﴾ ”تا کہ اس کے ذریعے سے ہم نکالیں اناج اور دوسرے نباتات۔“

**آیت ۱۶** ﴿وَجَنَّتِ الْفُاقَا ۝﴾ ”اور بڑے گئے باغات بھی۔“

**آیت ۱۷** ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝﴾ ”یقیناً فیصلے کا دن ایک معین وقت ہے۔“

یہ ہے وہ اصل بات جس کے لیے بطور تمہید گزشتہ آیات میں اللہ کی رنگا رنگ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے اپنی نعمتوں کا اس قدر وسیع دسترخوان بچھایا ہے تو اس نے انسانوں پر لازماً کچھ ذمہ داریاں بھی ڈالی ہوں گی۔ جب خود انسانوں کے ہاں اصول ہے کہ ذمہ داریاں (responsibilities) اور مراعات (privileges) ایک ساتھ چلتی ہیں تو یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر اپنی عطاؤں کی بارش تو کرتا رہے اور اس پر ذمہ داری کوئی بھی نہ ڈالے۔ اس لیے تم لوگ یہ مت سمجھو کہ تم من مانی زندگی گزارتے رہو گے اور تم سے کوئی جوابدہی نہیں ہوگی۔ نہیں تم سے ایک ایک ذمہ داری اور ایک ایک نعمت کا حساب ہوگا اور اس کے لیے ہم نے فیصلے کا ایک دن پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

**آیت ۱۸** ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝﴾ ”جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم سب چلے آؤ گے فوج در فوج۔“

اس کیفیت کا نقشہ سورۃ المعارج میں اس طرح دکھایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاجًا كَآلَهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِصُونَ ۝﴾ ”جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کہ نشان زدہ اہداف کی طرف بھاگے جارہے ہوں۔“

**آیت ۱۹** ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝﴾ ”اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے بنی دروازے بن جائیں گے۔“

**آیت ۲۰** ﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝﴾ ”اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ ہو جائیں گے چمکتی ہوئی ریت۔“

**آیت ۲۱** ﴿إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝﴾ ”یقیناً جہنم گھات میں ہے۔“

جہنم تو مجرم انسانوں کی سورت میں اپنے ایدھن کا انتظار کر رہی ہے۔

**آیت ۲۲** ﴿الْبَطَّائِنُ مَأْبَأًا ۝﴾ ”وہ ٹھکانہ ہے سرکش لوگوں کا۔“

**آیت ۲۳** ﴿لَبِيشَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝﴾ ”وہ رہیں گے اس میں قرن ہا قرن۔“

**آیت ۲۴** ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝﴾ ”وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی شے اور نہ کوئی مشروب۔“

**آیت ۲۵** ﴿لَا حَمِيمًا وَلَا عَسَافًا ۝﴾ ”سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔“

**آیت ۲۶** ﴿جَزَاءً وَفَاءً ۝﴾ ”بدلہ (ان کے اعمال کا) پورا پورا۔“

ان لوگوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے ویسا ہی ان لوگوں کے ساتھ وہاں سلوک کیا جائے گا۔  
**آیت ۲۷** ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْۤا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًاۙ﴾ ”یہ لوگ کسی حساب کتاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔“  
**آیت ۲۸** ﴿وَكَذَّبُوْۤا بِآيٰتِنَا كِذْبًاۙ﴾ ”اور انہوں نے جھٹلادیا تھا ہماری آیات کو دھڑلے کے ساتھ۔“  
**آیت ۲۹** ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًاۙ﴾ ”اور ہم نے تو ہر چیز کو گن گن کر لکھ رکھا ہے۔“  
**آیت ۳۰** ﴿فَذُوْقُوْۤا فَلَنْ نَّزِيْدَ كُمْ اِلَّا عَذَابًاۙ﴾ ”تو اب چکھو! ہم ہرگز اضافہ نہیں کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب ہی میں۔“  
 تمہارے اس عذاب کی شدت ہر لحظہ بڑھتی چلی جائے گی — اب اگلی آیات میں اہل جنت کا ذکر ہے:

### آیات ۳۱ تا ۴۰

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفٰزًاۙ حٰدِثًاۙ وَّاعْتَابًاۙ وَكُوَاعِبَۙ اٰتٰرًاۙ وَكَاسًاۙ دِهَاقًاۙ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا نَغْوًاۙ وَلَا كِذْبًاۙۚ جَزَاءٌۭ مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاٰۙ حِسَابًاۙ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنُ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًاۙ يَوْمَ يَقُوْمُ السُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّاۙ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنۢ اُوْدِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًاۙ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّۙ فَمَنۢ شَاءَ اٰتٰخَذْ اِلٰى رَّبِّهِۭ مَاۤ اَبَاهُۙ اِنَّا اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًاۙ قَرِيْبًاۙ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكَفْرُ لِيَلْتَنِيْۤ اَنْتَۙ كُنْتُ تُرِيًّاۙ

ج

**آیت ۳۱** ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفٰزًاۙ﴾ ”یقیناً اہل تقویٰ کے لیے کامیابی ہوگی۔“  
**آیت ۳۲** ﴿حٰدِثًاۙ وَّاعْتَابًاۙ﴾ ”(ان کے لیے) باغ اور انگور ہوں گے۔“  
**آیت ۳۳** ﴿وَكُوَاعِبَۙ اٰتٰرًاۙ﴾ ”اور نوجوان ہم عمر بیویاں۔“  
**آیت ۳۴** ﴿وَكَاسًاۙ دِهَاقًاۙ﴾ ”اور جام پھلکتے ہوئے۔“  
**آیت ۳۵** ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا نَغْوًاۙ وَلَا كِذْبًاۙ﴾ ”وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغوبات اور نہ جھوٹ۔“  
**آیت ۳۶** ﴿جَزَاءٌۭ مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاٰۙ حِسَابًاۙ﴾ ”یہ بدلہ ہوگا آپ کے رب کی طرف سے دیا ہوا حساب سے۔“

یہ سب کچھ ان لوگوں کی محنت اور قربانیوں کے بدلے کے طور پر انہیں عطا کیا جائے گا۔  
**آیت ۳۷** ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنُ﴾ ”جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے جو الرحمن ہے۔“  
 ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًاۙ﴾ ”ان (میں سے کسی) کو ہمت نہیں ہوگی اس سے بات کرنے کی۔“

**آیت ۳۸** ﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا﴾ ”جس دن کھڑے ہوں گے جبرائیل اور تمام فرشتے صفیں باندھے۔“

﴿لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ﴾ ”وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اُس کے جسے رحمن کی طرف سے اجازت مل جائے“

﴿وَقَالَ صَوَابًا﴾ ”اور وہ بات بھی درست کرے۔“

**آیت ۳۹** ﴿ذَلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ﴾ ”یہ دن حق ہے!“

یعنی قیامت کا دن ایک اٹل حقیقت ہے جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں فرمایا گیا: ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۚ لَنُصِيبَنَّهَا كَذِٰبَةٌ ۙ﴾ ”جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔ (اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“ سورۃ الحاقہ میں قیامت کے اٹل ہونے کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿الْحَاقَّةُ ۙ مَا الْخَافَةُ ۙ﴾ ”وہ حق ہو جانے والی۔ کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟“

﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا﴾ ”تو جو چاہے اپنے رب کی طرف اپنا ٹھکانہ بنالے۔“

**آیت ۴۰** ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ عَذَابًا قَرِيبًا﴾ ”دیکھو! ہم نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے اس عذاب سے جو بالکل قریب ہے۔“

تصور کیجئے یہ عذاب انسان کے کتنا قریب ہے! ادھر انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے، ادھر اسے قبر میں اتارنے کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ اور قبر کیا ہے؟ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ((إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفْرِ النَّارِ)) (۱) ”قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔“ گویا ہر زندہ انسان اس باغیچے یا گڑھے سے صرف چند گھنٹوں کے فاصلے پر بیٹھا ہے۔

﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ﴾ ”جس دن انسان دیکھ لے گا جو اُس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا“

﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ الْيَسْنَىٰ كُنْتُ تَرِيًّا﴾ ”اور کافر کہے گا: کاش کہ میں مٹی ہوتا!“

کاش مجھے شرف انسانیت ملا ہی نہ ہوتا! ”مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے!“ کاش میری ہاں نے مجھے جتا ہی نہ ہوتا! (۲)

(۱) سنن الترمذی، ابواب صفة القيامة والرفاق والوع، باب منه، ج: ۶، ۲۴۶، راوی: ابو سعید الخدریؓ

(۲) بعض روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ حیوانات کے درمیان بھی عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا، حتیٰ کہ ایک سیگ والی بکری نے بے سیگ والی پر کوئی زیادتی کی ہوگی تو اس کا بھی بدلہ دلانے گا۔ اس سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ جانوروں کو حکم دے گا کہ مٹی ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر بھی آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی حیوان ہوتے اور آج مٹی بن جاتے۔ (تفسیر ابن کثیر)



# سُورَةُ النَّازِعَاتِ

سورة الصافات، سورة الذاریات اور سورة المرسلات کے بعد سورة النازعات پے در پے قسموں سے شروع ہونے والی قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز میں مذکور قسموں کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ان میں فرشتوں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## آیات ۲۶ تا ۲۹

وَالنَّازِعَاتِ غَرْاقًا ۝ وَالنَّشِيطَاتِ نَشْطًا ۝ وَالسَّيِّحاتِ سَهَابًا ۝ فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ يَقُولُونَ أَيْنَا لَمْ نَدْرُدْهُمْ فِي الْحَافِرَةِ ۝ وَإِذَا كُنَّا عِظَامًا تَخْرُجُ ۝ قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ فَإِنَّا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۝ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ إِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ۝ فَقُلْ هَلْ لَكَ إِلَى أَنْ تَزَكَّى ۝ وَأَهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَى ۝ فَإِنَّهُ أَلَايَةُ الْكِبَرَى ۝ فَكَذَّبَ وَعَصَى ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَى ۝ فَخَشَرْنَا أَعْيُنَهُ ۝ فَقَالَ إِنَّا رَبُّكُمْ أَلَا عَلَىٰ ۝ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ۝ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَخْشَى ۝

بُغ

**آیت ۱** ﴿وَالنَّازِعَاتِ غَرْاقًا ۝﴾ ”قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔“  
نوع کے معنی سختی سے کھینچنے کے ہیں۔ یعنی ان فرشتوں کی قسم جو انسان کے وجود کی گہرائی میں اتر کر بڑی سختی اور شدت سے اس کی جان کو کھینچ نکالتے ہیں۔

**آیت ۲** ﴿وَالنَّشِيطَاتِ نَشْطًا ۝﴾ ”اور ان (فرشتوں) کی قسم جو گرہیں کھولتے ہیں آسانی سے۔“  
یہ بھی انسان کی جان قبض ہونے کی ہی ایک کیفیت کا ذکر ہے۔ حضور ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب فرشتہ بندہ مؤمن کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مشک کے بند منہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک گیا ہے اور جب وہ کسی کافر کی جان قبض کرتا ہے تو اسے ایسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے تیغ پر سے کباب کھینچا جا رہا ہے (اعاذنا اللہ من ذلک)۔ بہر حال یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں کیفیات کا تعلق

انسان کی روح سے ہے، اس کے ظاہری جسم سے نہیں۔ جسمانی طور پر تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے نیک بندوں پر بھی نزع کا وقت سخت انداز میں وارد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ظاہری تکلیف تو خود حضور ﷺ پر بھی طاری ہوئی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی تکلیف کو دیکھ کر بار بار روتی تھیں اور ان کے منہ سے بے اختیار یا ابتاہ! یا ابتاہ! (ہائے میرے ابا جان کی یہ تکلیف!) کے الفاظ نکلتے تھے۔ حضور ﷺ یہ سن کر فرماتے کہ بیٹی آج کے بعد تیرے باپ کے لیے کوئی سختی نہیں ہے۔ فداہ آباؤنا وامہاتنا!

**آیت ۳ ﴿وَالشَّيْطَانُ سُبْحًا﴾** ”اور ان (فرشتوں) کی قسم جو تیزی سے تیرے ہوئے جاتے ہیں۔“ فرشتے تیرے ہوئے ان ارواح کو لے کر کہاں جاتے ہیں اور انہیں کہاں رکھا جاتا ہے؟ اس بارے میں وضاحت آگے سورۃ المطففین میں آئے گی۔

**آیت ۴ ﴿فَالشَّيْطَانُ سُبْحًا﴾** ”پھر وہ (تقیل ارشاد میں) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

**آیت ۵ ﴿فَالْمُدْتِرِبَاتِ أَمْرًا﴾** ”پھر (حسب حکم) معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔“ یعنی ہر مرنے والے کی روح کو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سَجِّين یا عِلِّين میں لے جاتے ہیں۔ یہاں پر ان قسموں کا جواب یا مقسم علیہ چونکہ محذوف ہے اس لیے ان قسموں کا مقسم علیہ بھی وہی تصور ہوگا جو سورۃ الذاریات اور سورۃ المرسلات میں مذکور ہے۔ یعنی: ﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَصَادِقٍ﴾ ⑤ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ⑥ ﴿الذَّارِئَاتِ﴾ ”جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔ اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔“ اور ﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَوَاقِعٍ﴾ ④ ﴿المرسلات﴾ ”جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی۔“

**آیت ۶ ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾** ① ”جس دن کانپنے لگی کاٹنے والی۔“ یعنی قیامت کے دن شدید زلزلے کی وجہ سے پوری زمین لرز اٹھے گی۔ قیامت کے زلزلے اور اس دن کی ہولناک کیفیات کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الحج کی ابتدائی آیات کا یہ انداز بہت عبرت آموز ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ ۖ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ① يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهِلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ②﴾

”اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا، زلزلہٴ ساعتِ عظیم ① یوم تروُنہا تَذْهِلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ②“

”اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا، یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اس کو دیکھو گے اس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔“

**آیت ۷ ﴿تَنْبُعُهَا الرَّادِفَةُ﴾** ② ”اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا آئے گا۔“

اس سے فخرِ ثانیہ مراد ہے جس کے بعد سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔

**آیت ۸** ﴿قُلُوبٌ يَّوْمِنٌ وَاجِفَةٌ ۝۸﴾ ”کتنے ہی دل اس دن (خوف کے مارے) دھڑک رہے ہوں گے۔“

**آیت ۹** ﴿اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹﴾ ”ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔“  
 فخرِ خوف سے آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی، اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔  
**آیت ۱۰** ﴿يَقُولُونَ ؕ اِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۰﴾ ”یہ لوگ کہتے ہیں: کیا ہمیں لوٹا دیا جائے گا اُلٹے پاؤں؟“

کہ کیا مرنے کے بعد ہمیں پھر سے زندہ کر دیا جائے گا؟

**آیت ۱۱** ﴿اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱﴾ ”کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟“

**آیت ۱۲** ﴿قَالُوا تِلْكَ اِذَا كُرَّوْاْ خَاسِرَةٌ ۝۱۲﴾ ”کہتے ہیں: تب تو یہ لوٹنا بہت گھانٹے کا سودا ہوگا۔“  
 قیامت سے متعلق خبروں پر وہ لوگ طنز یہ انداز میں ایسے تبصرے کرتے تھے۔

**آیت ۱۳** ﴿فَاَنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝۱۳﴾ ”حالانکہ یہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔“

**آیت ۱۴** ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴﴾ ”تو وہ سب کے سب ایک چٹیل میدان میں ہوں گے۔“  
 فخرِ ثانیہ کے بعد سب کے سب انسان زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

**آیت ۱۵** ﴿هَلْ اَتَيْتَكَ حَدِيثُ مُوسٰى ۝۱۵﴾ ”کیا آپ تک موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟“

**آیت ۱۶** ﴿اِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶﴾ ”جب اُس کو پکارا تھا اُس کے پروردگار نے طویٰ کی مقدس وادی میں۔“

یہ واقعہ سورۃ الاعراف، سورۃ طہ اور سورۃ القصص میں بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں اس چھوٹی سورت میں اس کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے۔

**آیت ۱۷** ﴿وَاذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ۝۱۷﴾ ”کہ جاؤ فرعون کے پاس وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔“  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے تحت اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرعون کے پاس گئے تھے۔

**آیت ۱۸** ﴿قُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَرْجِعِنِى ۝۱۸﴾ ”اور اسے کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے؟“  
 آپ اس کے پاس جا کر اسے باقاعدہ دعوت دیں تاکہ اگر وہ راہِ راست پر آنا چاہے تو آجائے اور اپنے عقائد و اعمال کو درست کر لے۔

**آیت ۱۹** ﴿وَاَهْدِكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝۱۹﴾ ”اور میں تمہاری راہنمائی کروں تمہارے رب کی طرف تاکہ تمہارے اندر خشیت پیدا ہو؟“

**آیت ۲۰** ﴿فَاَرَاهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰى ۝۲۰﴾ ”تو موسیٰ نے اس کو دکھائی بہت بڑی نشانی۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنی رسالت کے بارے میں بھی بتایا، اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی اس تک پہنچایا اور عصا کے اتر دھا بن جانے والا معجزہ بھی اسے دکھا دیا۔

**آیت ۲۱ ﴿فَكَذَّبَ وَعَصَى﴾** ﴿۲۱﴾ ”لیکن اُس نے جھٹلادیا اور نافرمانی کی۔“

**آیت ۲۲** ﴿ثُمَّ أَذْبَرَ يَسْعَى﴾ ”پھر وہ پلٹا بھاگ دوڑ کرنے کے لیے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے ملک بھر سے ماہر جادو گروں کو اکٹھا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

**آیت ۲۳ ﴿فَحْشَرَ فَنَادَىٰ﴾** ”پھر اس نے (اپنی رعیت کو) جمع کیا اور اعلان کیا۔“

آیت ۲۲ ﴿فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ ”پس کہا کہ میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب!“

ظاہر ہے فرعون نے خود کو ”رب“ اس معنی میں نہیں کہا تھا کہ وہ اس کائنات کا یا اپنے ملک کے لوگوں کا خالق ہے، بلکہ وہ تو خود باطل معبودوں کو پوجتا تھا (سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں نے پوجا پاٹ کے لیے اپنے کچھ معبود بھی بنا رکھے تھے)۔ پھر اس کی رعیت میں بہت سے بڑے بوزھے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے سامنے وہ پیدا ہوا ہوگا اور جنہوں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہوگا۔ گویا اسے خود بھی معلوم تھا اور اس کی رعیت کے تمام لوگ بھی جانتے تھے کہ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہے اور بحیثیت انسان وہ دوسرے عام انسانوں جیسا ہی ہے۔ چنانچہ اس کا مذکورہ دعویٰ دراصل حکومت اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے اس دعوے کی مزید وضاحت اس نے ان الفاظ میں کی تھی: ﴿لَقَوْمٍ آكَلَسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْفُسُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ﴾ (الزخرف: ۵۱) ”اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟“ کہہ دیکھو اس پورے ملک پر میرا حکم چلتا ہے، پورے ملک کا نہریں نظام بھی میرے تابع ہے، میں جسے جو چاہوں عطا کروں اور جسے چاہوں محروم رکھوں، میں مطلق اختیار اور اقتدار کا مالک ہوں۔ یہ تھا اس کا اصل دعویٰ اور یہی دعویٰ اپنے زمانے میں عمرو کا بھی تھا۔

یہ دعویٰ دراصل اللہ تعالیٰ کے اقتدار و اختیار کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اور اس لحاظ سے بہت بڑا شرک ہے۔ آج بد قسمتی سے یہ سیاسی شرک ”عوام کی حکومت“ کے لیبل کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ نرودی اور فرعونؑ دو دور میں تو شرک کی گندگی کا یہ نوکر کوئی ایک شخص اٹھائے پھرتا تھا، یعنی ”حاکمیت“ کا دعوے دار کوئی ایک شخص ہوا کرتا تھا، جبکہ آج اس گندگی کو تو لوں اور ماشوں میں بانٹ کر ملک کے ہر شہری کو اس میں حصہ دار بنا دیا گیا ہے۔ ”جدید دور“ میں اس سیاسی شرک کو نئے ہمیں میں متعارف کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی تعبیر علامہ اقبال نے اپنی نظم ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کی ہے :-

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

**آیت ۲۵** ﴿فَآخِذْهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ ”تو پکڑ لیا اس کو اللہ نے آخرت اور دنیا کی

سزا میں۔“

دنیا کی سزا کے طور پر تو اسے اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا گیا۔ جہاں تک اس کی آخرت کی سزا کا تعلق ہے اس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہوا ہے کہ وہ بہت بھیانک ہوگی۔

**آیت ۲۶** ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَى﴾ ”یقیناً اس میں عبرت ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے۔“ اشتقاقی اعتبار سے لفظ ”عبرت“ کا تعلق ”عبور“ سے ہے اور عبور کے معنی ہیں دریا وغیرہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا۔ اس حوالے سے لفظ عبرت کے معنی ایک چیز کو دیکھ کر اس سے ملتی جلتی کسی دوسری چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور اس خاص معاملے میں سبق حاصل کرنے کے ہیں۔

## آیات ۲۷ تا ۲۶

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمَ السَّمَاۗءُ بَنَاهَاۙ رَفَعَ سَبۡكَهَا فَسَوَّيَهَاۙ وَاَغۡطَسَ لِبۡلَهَاۙ وَاَخۡرَجَ صُحۡفَهَاۙ وَاَلۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَاۙ اَخۡرَجَ مِنْهَا مَآءَهَاۙ وَمَرۡعَهَاۙ وَالۡجِبَالَ اَرۡسَبَهَاۙ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَاِلۡاِنۡعَامِكُمۡۚ فَاِذَا جَاۤءَتِ الطَّاۡفَةُ الۡكٰذِبٰىۙ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنۡسَانُ مَا سَعٰىۙ وَبُزۡزَتِ الْجَحِيۡمُ لِمَنۡ يَّرٰىۙ فَاَمَّا مَنۡ طَغٰىۙ وَاٰثَرُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَاۙ فَاِنَّ الْجَحِيۡمَ هِيَ الْاٰوٰىۙ وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْاٰوٰىۙ يَسۡتَكۡوِنُكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّٰنَ مُّرۡسَبَهَاۙ فَيَمۡرُ اَنۡتَ مِنۡ ذِكۡرِهَاۙ اِلَىٰ رَبِّكَ مُتَنۡهَهَاۙ اِنَّمَا اَنتَ مُنۡذِرٌ مِّنۡ يَّخۡشَاهَاۙ كَانَهُمۡ يَوْمَ يَدۡوٰىهَا كُمۡ يَلۡبُثُوۡا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ صُحۡفًاۙ

اب اگلی آیات میں بعث بعد الموت کے حوالے سے مشرکین کے طنزیہ تبصروں کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے:

**آیت ۲۷** ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمَ السَّمَاۗءُ بَنَاهَاۙ﴾ ”(اے لوگو! ذرا سوچو!) کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ اس نے اسے تخلیق کیا۔“

**آیت ۲۸** ﴿رَفَعَ سَبۡكَهَا فَسَوَّيَهَاۙ﴾ ”اس کے ٹنڈ کو بلند کیا پھر اسے ہر طرح سے درست کیا۔“

**آیت ۲۹** ﴿وَاَغۡطَسَ لِبۡلَهَاۙ وَاَخۡرَجَ صُحۡفَهَاۙ﴾ ”اور اس کی رات کو اندھیرا کر دیا اور اس کے دن کو ظاہر کر دیا۔“

**آیت ۳۰** ﴿وَاَلۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَاۙ﴾ ”اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔“

**آیت ۳۱** ﴿اَخۡرَجَ مِنْهَا مَآءَهَاۙ وَمَرۡعَهَاۙ﴾ ”اس میں سے نکالا اس کا پانی اور اس کا چارہ۔“ یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر افاق توجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنا پانی موجود ہے اس کا منبع خود زمین ہے۔

آج سائنسی معلومات کی روشنی میں ہم اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین آگ کا ایک گولہ تھی۔ جوں جوں یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس کے بخارات نکل کر فضا میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح زمین کے ارد گرد مختلف گیسوں پر مشتمل ایک غلاف سا بن گیا جسے آج ہم فضا (atmosphere) کہتے ہیں۔ پھر کسی مرحلے پر فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا۔ یہ پانی فضا سے بارش کی شکل میں سا لہا سال تک زمین پر برستا رہا۔ اس کے بعد سورج کی تپش سے بخارات اٹھنے بادل بننے اور بارش برسنے کے معمول پر مشتمل پانی کا وہ مربوط نظام بنا جسے آج کی سائنس نے واٹر سائیکل (water cycle) کا نام دیا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقدار کے مطابق دنیا میں پانی پیدا فرما کر زمین پر موجود ”زندگی“ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کی رسد اور ترسیل کا ایک خوبصورت نظام (cycle) تفصیل دے دیا ہے۔ اس نظام کے تحت سمندروں کے بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ ان بادلوں سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت مختلف علاقوں میں بارش برستی ہے اور برفباری ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں پر برف کے وسیع ذخائر سے نالوں اور دریاؤں کے ذریعے نشیبی علاقوں کو سارا سال پانی کی سپلائی جاری رہتی ہے۔ گویا بارشوں اور پہاڑی گلیشیرز کے overhead tanks سے حاصل ہونے والے پانی سے پوری دنیا میں زیر زمین پانی کے ذخیرے کو رسد بھی مہیا ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی ”زندگی“ کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو پانی بچ رہتا ہے وہ واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔

**آیت ۳۲ ﴿وَالْجِبَالُ أَرْسُلَهَا﴾** ”اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ دیا۔“

**آیت ۳۳ ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَآئِعًا مِّمَّكُمْ﴾** ”سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔“

**آیت ۳۴ ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَةُ الْكُبْرَى﴾** ”پھر جب برپا ہو گا وہ بڑا ہنگامہ۔“

**آیت ۳۵ ﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَى﴾** ”اس دن انسان یاد کرے گا جو کچھ اُس نے بھاگ دوڑ کی تھی۔“

اُس دن انسان کی آنکھیں کھلیں گی اور جس شخص نے اپنی ساری زندگی دنیا کے مال و متاع کے پیچھے بھاگتے بھاگتے برباد کر دی تھی اسے معلوم ہو جائے گا کہ اب آخرت کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سورۃ الکہف کی اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے: ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا﴾ ﴿١﴾ ﴿الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يُحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ ﴿٢﴾ ”آپ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی سعی و جہد دنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔“

**آیت ۳۶ ﴿وَبُورِّدَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَّوَى﴾** ”اور کھول کر رکھ دی جائے گی جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے۔“

**آیت ۳۷** ﴿فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ﴾ ”پس جس نے سرکشی کی تھی۔“

**آیت ۳۸** ﴿وَأَنزَلَ الْخُلُوفَ اللَّذْنِيًّا﴾ ”اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔“

**آیت ۳۹** ﴿فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ ”تو یقیناً اس کا ٹھکانہ اب جہنم ہی ہے۔“

ایک بندہ مؤمن کو چاہیے کہ یہ تین آیات ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لے اور اپنی عملی زندگی میں ان کے مفہوم اور پیغام کو اپنے دل و دماغ میں ہر وقت متحضر رکھے۔ طغی کے معنی ہیں کسی کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا۔ اسی معنی میں ہمارے ہاں طغیانی کا لفظ معروف ہے اور اسی مفہوم میں اس مادہ سے لفظ ”طاغوت“ مشتق ہے۔ چنانچہ ان آیات کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذہریت) یعنی جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کے ”بندے“ بن کر رہیں۔ اب جب کوئی انسان ”بندگی“ کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے قانون، اپنے اختیار اور اپنی مرضی کی بات کرے گا تو وہ ”بندے“ کے بجائے ”طاغوت“ بن جائے گا۔ چنانچہ جو ”بندہ“ بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے طاغوت بن گیا اور پھر اس نے اپنی سوچ، اپنی مرضی، اپنی منصوبہ بندی اور اپنے فیصلوں میں آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینے کی روش اپنالی تو آخرت میں اس کے لیے جہنم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

**آیت ۴۰** ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ﴾ ”اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے“

سورۃ الخاتہ میں اس پیشی کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ ”جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی مخفی سے مخفی شے بھی چھپی نہیں رہے گی۔“

﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ ”اور اُس نے رو کے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے۔“

اس نے اپنی زندگی میں اپنے نفس کی باگیں ہمیشہ کھینچ کر رکھیں اور غلط خواہشات کے معاملے میں اسے منہ زوری نہ کرنے دی۔

**آیت ۴۱** ﴿فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ ”تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔“

اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ، اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔ آمین!

**آیت ۴۲** ﴿يَسْتَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا﴾ ”(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے

ہیں قیامت کے بارے میں کہ وہ کب آکر ٹھہرے گی؟“

**آیت ۴۳** ﴿فِيمَ أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا﴾ ”آپ کا کیا تعلق ہے اس کے بیان کرنے سے؟“

آپ کو اس لیے تو نہیں بھیجا گیا کہ آپ قیامت کے دن اور تاریخ کا تعین کر کے انہیں بتائیں، بلکہ آپ تو بشر و نذر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

**آیت ۳۴** ﴿إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهٰهَا ۚ﴾ ”اس کا انجام تو آپ کے رب ہی کی طرف ہے۔“

یہ معاملہ تو آپ کے رب ہی کے حوالے ہے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔

**آیت ۳۵** ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ مَّنْ يَعْحٰشٰهَا ۚ﴾ ”آپ تو بس خبردار کرنے والے ہیں ہر اُس شخص کو جو

اس سے ڈرتا ہو۔“

جو لوگ قیامت کے تصور سے ڈرتے ہوں یا جو اس کے ذکر سے ڈر جائیں آپ انہیں خبردار کرتے رہیں آپ کے خبردار کرنے سے ایسے لوگوں کا خوف اور تقویٰ مزید بڑھے گا۔ ظاہر ہے جس شخص کی روح میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہے اس کے دل میں قیامت کے ذکر سے ضرور خشیت پیدا ہوگی۔

**آیت ۳۶** ﴿كَانَتْهُمْ يَوْمَ يُرَوُّنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا ۚ﴾ ”جس دن وہ اسے دیکھیں

گے (انہیں یوں لگے گا) گویا وہ نہیں رہے (دنیا میں) مگر ایک شام یا اس کی ایک صبح۔“

قیامت کے دن انسان جب اپنی دنیوی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے اپنی پوری زندگی ایسے نظر آئے گی جیسے وہ ایک دن کی بھی صرف چند گھڑیاں دنیا میں رہا تھا۔





# سُورَةُ عَبَسَ

## تمہیدی کلمات

سورہ عبس کی ابتدائی آیات میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ ایک موقع پر حضور ﷺ کے پاس قریش کے چند بڑے سردار (عتبہ، شیبہ، ابو جہل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ اور عباس بن عبد المطلب وغیرہ) بیٹھے تھے اور آپ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ عین اُس وقت جب آپ ان سے مگو گفتگو تھے ایک نابینا صحابی عبد اللہ بن اُمّ مکتومؓ وہاں آئے اور آداب مجلس کی رعایت کیے بغیر آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرض کر رہے تھے: یَا رَسُولَ اللَّهِ اَوْشِدْنِي "یا رسول اللہ! مجھے سیدھا راستہ بتائیے"۔ یَا رَسُولَ اللَّهِ عَلَّمَنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللَّهُ "یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو علم آپ کو سکھایا ہے اس میں سے مجھے بھی سکھائیے"۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ صورت حال کو سمجھتے اور آپ کی گفتگو ختم ہونے کا انتظار کرتے۔ ظاہر ہے وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن سن تو سکتے تھے کہ حضور ﷺ گفتگو میں مصروف ہیں۔ بہر حال ان کی بار بار خلل اندازی کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرہ انور پر کچھ ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ بعض لوگوں نے محض یہ سمجھتے ہوئے ان آیات کی تاویلات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ کے مقام رفیع کی مناسبت سے ایسا ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح سے پیش آیا تھا جس طرح یہاں ان آیات میں مذکور ہے۔

اس معاملے کی اصل حقیقت اور منطق کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر یہ نکتہ مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ حضور ﷺ اپنے فرائض رسالت کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہر وہ طریقہ اور راستہ اختیار فرمانے کی کوشش میں رہتے تھے جو انسانی دائرہ اختیار کی حد تک بہتر سے بہتر ہوتا۔ اب ظاہر ہے عرب کے قبائلی معاشرے میں دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھانے کا مؤثر ترین طریقہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہم قبائل کی سرکردہ شخصیات کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حضور ﷺ مسلسل کوشش بھی کرتے، سرداران قریش کو مختلف انداز سے بار بار دعوت بھی دیتے اور دعا بھی فرماتے۔ آپ کے نزدیک یہ معاملہ اس حد تک اہم تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے جھولی پھیلا کر بہت ہی غیر معمولی انداز میں دعا کی تھی کہ اے اللہ عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابو جہل) میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کو تقویت عطا فرما! ظاہر ہے معاشرے کے سرکردہ لوگوں میں سے اگر کوئی شخص ایمان لے آتا تو وہ اکیلا عوام الناس کے سینکڑوں افراد سے زیادہ اہم ہوتا۔ ایسی کسی شخصیت کی وجہ سے مجموعی طور پر اسلامی تحریک کو بھی تقویت ملتی اور مکہ کے ان نادار اور بے سہارا اہل ایمان کے مصائب میں بھی ضرور کچھ کمی واقع ہوتی جنہیں اس دور میں دن رات تشدد کا نشانہ بنایا جا

رہا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضور ﷺ مکہ کے صاحبِ حیثیت لوگوں سے اپنی دعوتی ملاقاتوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور مذکورہ واقعہ کے وقت بھی آپ نے اسی وجہ سے سردارانِ قریش کے ساتھ اپنی گفتگو کو اہم خیال فرمایا۔ اس کے علاوہ اس معاملے کا ایک منطقی اور فطری پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے مواقع پر بعض اوقات اپنوں کے مقابلے میں باہر کے لوگوں کو اس لیے بھی ترجیح دے دی جاتی ہے کہ وہ تو اپنے ہیں، وہ ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے پر برا نہیں منائیں گے۔

بہر حال نبی بھی آخر انسان ہوتا ہے اور اگر انسانی نفسیات و جذبات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ واقعہ پر حضور ﷺ کا ردِ عمل بالکل فطری تھا اور یہ بھی کہ آپ کا یہ ردِ عمل اعلیٰ تر مقصد کے لیے تھا۔ پھر اس معاملے کو حَسَنَاتِ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتِ الْمُفْسِدِينَ کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جتنا بلند کسی کا مقام ہوتا ہے اس کے لیے کردار و عمل کا معیار بھی اسی نسبت سے اعلیٰ رکھا جاتا ہے۔

ان آیات کے بارے میں حضور ﷺ نے خود بھی ”عتاب“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد جب بھی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آئے آپ کے پاس حاضر ہوتے تو آپ انہیں مخاطب کر کے فرماتے: ((مَوْحِبًا بِمَنْ عَاتَيْتَنِي فِيهِ رَيْبٌ))<sup>(۱)</sup> ”محب اس شخص کے لیے جس کے معاملے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب فرمایا“۔ بہر حال اس واقعہ سے متعلق اگر مذکورہ تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جائے تو سارا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور متعلقہ آیات کی تاویل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

### بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ یُرٰی ۚ اَوْ یَذْكُرُ فَنَنْفَعَهُ  
الَّذِیْ ۚ اَمَّا مِنْ اَسْتَعٰی ۚ فَانْتَ لَهُ تَصَدٰی ۚ وَمَا عَلٰیكَ اَلَّا یُرٰی ۚ وَاَمَّا مَنْ  
جَاءَكَ یَسْعٰی ۚ وَهُوَ یَخْشٰی ۚ فَانْتَ عَنْهُ تَلْغٰی ۚ کَلَّا اِنَّمَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۚ  
فِیْ صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ ۚ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۚ بِاٰیْدِیْ سَفَرَةٍ ۚ کِرَامٍ بَرَرَةٍ ۚ قُتِلَ الْاِنْسَانُ  
مَا اَلْفَرُّهُ ۚ مِنْ اٰیِّ شَیْءٍ خَلَقَهُ ۚ مِنْ نُّطْفَةٍ ۚ خَلَقَهُ فَقَدَّرْهُ ۚ ثُمَّ السَّبِيلَ یَسِّرْهُ ۚ  
ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاقْبَرْهُ ۚ ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشَرْهُ ۚ کَلَّا لَہٗمَا یَقْضِیْ مَا اَمَرْهُ ۚ فَلِیَسْطَرَّ الْاِنْسَانُ  
اِلٰی طَعَامٍ ۚ اِنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۚ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۚ فَاقْبَتْنَا فِیْہَا حَبًّا ۚ  
وَعِنبًا ۚ وَقَضْبًا ۚ وَزَيْتُونًا ۚ وَنَخْلًا ۚ وَحَدَاقٍ غُلْبًا ۚ وَفَاکِیہًا ۚ وَابًّا ۚ مَّتَاعًا لَّکُمْ  
وَلَا نَعَامِ لَکُمْ ۚ فَاِذَا جَاءَتِ الصَّآحَةُ ۚ یَوْمَ یُفَزُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ ۚ وَاُمِّہِ ۚ وَاَبِیْہِ ۚ  
وَصَاحِبَتِہِ ۚ وَبَیْنِہِ ۚ لِکُلِّ اَمْرِئٍ مِّنْہُمْ یَوْمَیْذٍ شَأْنٌ یُّغْنِیْہُ ۚ وَجُودٌ ۚ یَوْمَیْذٍ

مُسْفِرَةً ۖ صَاحِكَةً مُتَبَشِّرَةً ۖ وَوُجُوهُ يُؤْمِنِينَ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۖ لَا تَرَاهُهَا قَتَرَةٌ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۖ

بج

**آیت ۱** ﴿عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝۱﴾ ”تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔“

یعنی حضرت عبداللہ کی بار بار خلل اندازی پر حضور ﷺ کے چہرہ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے اور آپ نے چہرہ مبارک دوسری طرف کر لیا۔

**آیت ۲** ﴿أَنۡ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝۲﴾ ”اس بات پر کہ آیا اُس کے پاس نابینا۔“

**آیت ۳** ﴿وَمَا يَذَرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكُمِي ۝۳﴾ ”اور (اے نبی ﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا۔“

ممکن ہے آپ کی گفتگو سے استغناء کر کے وہ بلند درجات تک پہنچ جاتا۔

**آیت ۴** ﴿أَوَلَيْدَكَ فَتَتَّقَهُ الذِّكْرَىٰ ۝۴﴾ ”یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے منہیر ہوتی۔“

**آیت ۵** ﴿أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝۵﴾ ”لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے۔“

ایک ایسا شخص جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔

**آیت ۶** ﴿فَأَنۡتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝۶﴾ ”آپ اُس کی تو فکر میں رہتے ہیں۔“

**آیت ۷** ﴿وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزْكُمِي ۝۷﴾ ”اور اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔“

**آیت ۸** ﴿وَأَمَّا مَنْ جَاءَهُ يَسْأَلُ ۝۸﴾ ”اور وہ جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ہے۔“

**آیت ۹** ﴿وَهُوَ يَخْشَىٰ ۝۹﴾ ”اور اس کے دل میں خشیت نہیں ہے۔“

**آیت ۱۰** ﴿فَأَنۡتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۝۱۰﴾ ”تو اس سے آپ استغناء برت رہے ہیں۔“

**آیت ۱۱** ﴿كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱﴾ ”ایسا ہرگز نہ سمجھیے تو ایک یاد دہانی ہے۔“

**آیت ۱۲** ﴿إِقْصِمۡ شَأۡءَ ذِكْرِهِ ۝۱۲﴾ ”تو جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔“

آپ ان لوگوں کے پیچھے خود کو بچان نہ کریں اگر انہیں جہل اور ابولہب اس ہدایت سے مستفید نہیں ہونا

چاہتے تو نہ ہوں آپ بھی ان کی پروا نہ کریں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ

الکہف میں فرمایا گیا:

﴿وَأُصِيبُوا نَفْسًا مَّعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْعُدُوِّ وَالْغَيْبِ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ

تُرِيدُونَ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطِيعُ مَنْ أَعْفَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۝﴾

”اور اپنے آپ کو روکے رکھیے ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں سج و شام وہ اللہ کی رضا کے

طالب ہیں اور آپ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپ

دنئوی زندگی کی آرائش و زیبائش چاہتے ہیں! اور مت کہنا مایہ ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے

غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے تجاوز ہو چکا ہے۔“  
ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سردارانِ قریش کی طرف التفات (معاذ اللہ! نعم معاذ اللہ!) کسی ذاتی غرض کی وجہ سے تو نہیں تھا بلکہ آپ اسلام کی تقویت کے لیے ان کے قبولِ اسلام کے آرزو مند تھے۔ لیکن ان کی موجودگی میں اپنے کسی ساتھی سے بے اعتنائی لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی کہ آپ ان لوگوں کی دولت و ثروت کی وجہ سے ان کی طرف ملوث ہیں اور اپنے نادار ساتھیوں سے مغفرت برت رہے ہیں۔

اگلی آیاتِ عظمتِ قرآن کے ذکر کے حوالے سے پورے قرآن میں منفرد اور ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان آیات کے بین السطور میں یہ پیغام بھی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے ان ”بڑے لوگوں“ کے پیچھے اپنے آپ کو جس انداز میں ہلکان کر رہے ہیں اور یہ لوگ جس ”بے نیازی“ سے قرآن کو نظر انداز کر رہے ہیں اس سے قرآن کے استخفاف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ لہذا آپ ان لوگوں کے پیچھے پڑ کر انہیں دعوت مت دیں۔ ظاہر ہے یہ پیغام قیامت تک کے داعیانِ حق کے لیے بھی ہے۔ اس ضمن میں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ گو معاشرے کے صاحبِ حیثیت لوگوں کا کسی جماعت میں شامل ہونا اس جماعت کے مشن کی ترویج و ترقی کے لیے بہت مفید ہے، لیکن ایسے لوگوں کو خصوصی اہتمام سے دعوت دینے اور پھر خصوصی اہتمام سے اپنی جماعت میں خوش آمدید کہنے کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے اپنے ”نظریے“ کی بے توقیری کا تاثر ملے یا پرانے کارکنوں کے دلوں میں مغفرت کا احساس پیدا ہو۔ لہذا کسی بھی جماعت کے امیر کے لیے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر صاحبِ حیثیت لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف راغب کرنے کی کوشش دراصل اس نپل صراط پر چلنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خو، داری اور تکبر کے درمیان یا خوش اخلاقی اور خوشامد کے مابین بہت باریک سا فرق ہے، لیکن اگر کوئی انسان اس باریک سے فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کی ایک بہت اعلیٰ صفت کو لوگ اس کی بہت بڑی خامی پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ لہذا حکمتِ تبلیغ کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے حساس فرض کی ادائیگی دو انتخابوں کے درمیان رہتے ہوئے بہت محتاط انداز میں سرانجام دی جائے۔

**آیت ۱۳ ﴿فَإِنِّي صُحُفٌ مُّكَرَّمَةٌ﴾** (یہ قرآن) ایسے مجسموں میں (درج ہے) جو باعزت ہیں۔“

یہ مضمون مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الزخرف میں فرمایا گیا: ﴿وَاللَّهُ فِيهِ أُمُّ الْكِتَابِ لَدُنَّا لَعَلِّي حَسِبْنَاهُ﴾ اور یہ اُمُّ الْكِتَاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا بہت حکمت والی، سورۃ الواقعة میں ارشاد ہوا کہ یہ قرآن ایک مخفی کتاب (کتابِ مکنون) میں درج ہے: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ ﴿فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ﴾ ﴿إِنَّا لَقَيْنَاهُ بِهِتْ عِزِّتِ وَالْاَقْرَانِ﴾ ہے۔ ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔“ پھر سورۃ البروج میں فرمایا گیا: ﴿إِنَّ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ ﴿فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ ﴿﴾ بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا لوح محفوظ میں۔“ بہ حال اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص مقام پر محفوظ ہے۔ صحفِ کرم اُمُّ الْكِتَاب کتاب کتاب، ان اور لوح محفوظ اسی مقام خاص کے مختلف

نام ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ ﴿۳۷﴾ ”بلند و بالا نہایت پاک۔“

**آیت ۱۵** ﴿بِأَيْدِي سَفَرَةٍ﴾ ﴿۳۸﴾ ”ان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔“

**آیت ۱۶** ﴿رُكُومٍ مُّوردَةٍ﴾ ﴿۳۹﴾ ”جو بڑے معزز اور نیک ہیں۔“

اس سے ملتی جلتی بات ہم سورۃ الواقعة کی اس آیت میں بھی پڑھ آئے ہیں: ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾ ﴿۴۰﴾ ”اسے چھونیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔“ مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقام بہت بلند ہے۔ تو اے نبی (ﷺ) آپ قرآن مجید کے مقام اور مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان لوگوں سے معاملہ کیجیے اور جو شخص قرآن مجید سے اعراض کرتا ہے آپ بھی اس کو منہ لگائیے۔ ان کے مقابلے میں آپ زیادہ توجہ ان لوگوں پر دینیے جو ہدایت کی تلاش میں آپ کے پاس چل کر خود آتے ہیں۔

**آیت ۱۷** ﴿قِيلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ﴾ ﴿۴۱﴾ ”بلاک ہو جائے انسان یہ کس قدر ناشکر ہے!“

**آیت ۱۸** ﴿مِنْ أَيْ شَيْءٍ خَلَقَهُ﴾ ﴿۴۲﴾ ”(ذرا سوچے کہ) کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟“

**آیت ۱۹** ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ﴿۴۳﴾ ”ایک بوند سے۔“

﴿خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ﴾ ﴿۴۴﴾ ”اُس نے اسے پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔“

”اندازے“ سے مراد یہاں ہر انسان کا ”شاکلہ“ ہے جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں آیا ہے۔ انسان کا شاکلہ دراصل اس کی فطری یا جبلی خصوصیات اور اس کے ماحول کے اس کی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات کے مجموعے سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی ہر انسان کی وہ شخصیت جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں اپنے والدین کی طرف سے ملتی ہے عملی زندگی میں آکر اپنے ماحول کے مخصوص اثرات کی وجہ سے ایک خاص ”قالب“ میں ڈھل جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کے اسی قالب کو اس انسان کا شاکلہ کہا جائے گا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تشریح آیت ۸۴ سورۃ بنی اسرائیل)

**آیت ۲۰** ﴿ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ﴾ ﴿۴۵﴾ ”پھر آسان کر دیا اس پر راستہ۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں ایسا ماحول فراہم کیا ہے اور اسے ایسی سہولیات سے نوازا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں زندگی بسر کرنا اس کے لیے بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ سے انسان کے دنیا میں آنے کا راستہ اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے۔ یعنی وضع حمل کا بظاہر انتہائی پیچیدہ اور مشکل مرحلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آسان ہو گیا ہے۔

**آیت ۲۱** ﴿ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ﴾ ﴿۴۶﴾ ”پھر اس پر موت وارد کی اور اسے قبر میں داخل کر دیا۔“

**آیت ۲۲** ﴿ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ﴾ ﴿۴۷﴾ ”پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔“

دراصل یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ جس ہستی نے انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی سے متعلق یہ سب کچھ کیا ہے اس کے لیے انسان کو دوبارہ اٹھانا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ اگر انسان خود اپنی تخلیق کے پورے عمل پر غور کر لے

تو اس کے پاس بعث بعد الموت سے انکار کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

**آیت ۲۳** ﴿كَلَّمَآ يَتَقَضِّ مَا أَمْرُهُ ۝﴾ ”نہیں! اس نے تاحال وہ بات پوری نہیں کی جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔“

**آیت ۲۴** ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝﴾ ”تو انسان ذرا اپنے کھانے ہی کو دیکھ لے۔“  
اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں اگر پھر بھی کسی کو شک ہو تو وہ اپنی غذا پر ہی غور کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کرنے کے بعد کس کس انداز میں اس کی غذا کا انتظام کیا ہے۔

**آیت ۲۵** ﴿أَنَّا صَبَّيْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝﴾ ”کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جیسے کہ برسایا جاتا ہے۔“  
**آیت ۲۶** ﴿ثُمَّ شَفَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝﴾ ”پھر ہم نے زمین کو پھاڑا جیسے کہ وہ پھٹتی ہے۔“  
زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کوئلیں برآمد ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ پورے پودے بلکہ تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

**آیت ۲۷** ﴿فَلْيَنْظُرِ فِيهَا صَبًّا ۝﴾ ”پھر ہم نے اُگادے اس میں اناج۔“  
**آیت ۲۸** ﴿وَعَبْنَا وَقَضَّبْنَا ۝﴾ ”اور انگوڑا اور مختلف ترکاریاں۔“  
**آیت ۲۹** ﴿وَزَيَّنَّوْنَا وَلَٰخُلًا ۝﴾ ”اور زیتون اور کھجوریں۔“  
**آیت ۳۰** ﴿وَحَدَّآثِقَ غُلْبًا ۝﴾ ”اور بڑے گھنے باغات۔“  
**آیت ۳۱** ﴿وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝﴾ ”اور میوے اور چارہ۔“  
**آیت ۳۲** ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَٰعْمًا لِّكُمْ ۝﴾ ”ضرورت کا سامان تمہارے لیے بھی اور تمہارے مومنینوں کے لیے بھی۔“

یہ آیت جو بہ سورۃ النازعات میں (آیت ۳۲ کے طور پر) بھی آچکی ہے۔ جوڑا ہونے کے اعتبار سے ان دونوں سورتوں کے مضمون اور اسلوب میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔

**آیت ۳۳** ﴿فَإِذَا جَاءَ بِالصَّاحَّةِ ۝﴾ ”تو جب وہ آجائے گی کان پھوڑنے والی (آواز)۔“  
یعنی جب قیامت برپا کرنے کے لیے صور میں پھونکا جائے گا تو اس کی آواز سے کان پھٹ جائیں گے۔  
اس آیت کی مشابہت سورۃ النازعات کی اس آیت سے ہے: ﴿فَإِذَا جَاءَ بِطَافَتِ الْكُفْرَىٰ ۝﴾ ”پھر جب وہ آجائے گا بڑا ہنگامہ۔“

**آیت ۳۴** ﴿يَوْمَ يَقْرَأُ الْمُرءُ مِنْ آخِيهِ ۝﴾ ”اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے۔“

**آیت ۳۵** ﴿وَأُمِّهِ وَأَبْنَيْهِ ۝﴾ ”اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔“

**آیت ۳۶** ﴿وَصَاحِبِهِ وَنَيْبِهِ ۝﴾ ”اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔“

**آیت ۳۷** ﴿لِكُلِّ أُمِرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝﴾ ”اُس دن ان میں سے ہر شخص کو ایسی فکر لاحق

ہوگی جو اسے (ہر ایک سے) بے پروا کر دے گی۔“

اس دن ہر انسان نفسا نفسی کی کیفیت میں ہوگا۔ ہر انسان کو اپنی پریشانی کی وجہ سے اپنے عزیز ترین رشتوں سمیت کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔

**آیت ۳۸ ﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفَرَةٌ﴾** ”کچھ چہرے اُس دن روشن ہوں گے۔“

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ کی ان آیات میں بھی آچکا ہے۔ ﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ﴾ (۳۶) اِلٰی رَبِّهَا نَاطِرَةٌ ﴿۳۷﴾ وَوَجُودٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۳۸﴾ تَنْظُرُ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۳۹﴾ ”بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے وہ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اس روز اترے ہوئے ہوں گے۔ ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سُنُک ہوگا۔“

**آیت ۳۹ ﴿صَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾** ”مسکراتے ہوئے خوش و خرم۔“

**آیت ۴۰ ﴿وَوَجُودٌ يَوْمَئِذٍ غَیْبَةٌ﴾** ”اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔“

**آیت ۴۱ ﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾** ”ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔“

**آیت ۴۲ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾** ”یہی ہوں گے وہ کافر اور فاجر لوگ۔“

یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں اپنے نفس کے نقائص پرے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔



# سُورَةُ التَّكْوِيْرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ التکویر اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے بعد والی تینوں سورتوں سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ چاروں سورتیں (سورۃ التکویر، سورۃ الانفطار، سورۃ المطففین اور سورۃ الانشقاق) ایک ضمنی گروپ کی حیثیت سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ البتہ جوڑوں کے نظم کے حوالے سے سورۃ التکویر کا تعلق سورۃ الانفطار سے ہے جبکہ سورۃ المطففین اپنے بعد والی سورت یعنی سورۃ الانشقاق کے ساتھ مل کر جوڑا بناتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ اُنْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوْجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءِدَةُ سُيْلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ وَاِذَا الصُّعْفُ يُنْشَرَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِرَتْ ۝ وَاِذَا الْهَيۡئَةُ اُزْلِفَتْ ۝ عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا اَخۡضَرْتَ ۝ فَلَا اَقِيۡمُ بِالۡخَيْسِ ۝ اِنۡجَوَارِ الْكُنۡسِ ۝ وَالۡلَّيْلِ اِذَا اَعۡسَسَ ۝ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ ۝ كَرِيۡمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِي الْعُرۡشِ مَكِيۡنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اٰمِيۡنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِخٰنُوۡنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الْمُبِيۡنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلٰى الْغُيۡبِ بِضٰنِيۡنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۝ فَاَنۡ تَذٰهَبُوۡنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ لِيۡنۡ شَآءَ مِنْكُمۡ اَنْ يَّسْتَقِيۡمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوۡنَ ۝ اِلَّا اَنْ يَّسَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيۡنَ ۝

آیت ۱ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝﴾ ”جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔“

آیت ۲ ﴿وَاِذَا النُّجُوْمُ اُنْكَدَرَتْ ۝﴾ ”اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔“

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝﴾ ”اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۔“

آیت ۴ ﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝﴾ ”اور جب گاجھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔“

العِشَار سے دس مہینوں کے حمل والی اونٹنیاں مراد ہیں، یعنی ایسی اونٹنیاں جن کے وضع حمل کا وقت بہت



قریب ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی افنی بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ لوگ اس کی خصوصی حفاظت اور خدمت کرتے تھے۔ آیت میں اس حوالے سے قیامت کی ہولناک کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو بہت قیمتی اونٹنیاں بھی لاوارث ہو جائیں گی، انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اُس وقت جبکہ خود عورتوں کو اپنے حمل کی کوئی فکر نہیں ہوگی تو اونٹنیوں کی کسے ہوش ہوگی۔

**آیت ۵ ﴿وَإِذَا الْمَوْحُشُ حُشِرَتْ ۝۵﴾** ”اور جب وحشی جانور جمع کر دیے جائیں گے۔“

عام طور پر جنگلی جانور ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں، لیکن اس دن خوف کے مارے ان کی وحشت بھی جاتی ہے گی اور مختلف اقسام کے جانور بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔

**آیت ۶ ﴿وَإِذَا الْبُحُورُ مُدْجِرَتْ ۝۶﴾** ”اور جب سمندر رہکا دیے جائیں گے۔“

اگلی رات یعنی سورۃ الانفطار میں ”مَدْرَدَسَ پھاڑے“ ہانے ﴿وَإِذَا الْبُحَارُ فَجُورَتْ ۝۷﴾ کا ذکر ہے۔ ان دونوں آیات پر غور کریں تو یہ لگتا ہے کہ جب زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا ﴿وَإِذَا الْأَرْضُ مُدْجِرَتْ ۝۸﴾ اور ”مَدْرَدَسَ“ کی امدادنی تیش اوپنی سطح پر آ جائے گی۔ چنانچہ دیکھتے ہوئے لاوے کے عین وہ سمندر اُٹھ رہے ہوں گے اور اس طرح سمندروں کا پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم!

**آیت ۷ ﴿وَإِذَا الْكُفُورُ سُودَتْ ۝۷﴾** ”اور جب کافروں کے جوڑ ملائے جائیں گے۔“

یعنی پوری نسل انسانی کے مختلف افراد کی گروہ بندی کر دی جائے گی۔ یہ گروہ بندی لوگوں کے اعمال اور ان کے حوالے سے ہوگی جیسے سورۃ النمل آیت ۸۳ اور سورۃ الحجۃ آیت ۱۹ میں اہل جہنم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیے گئے۔ یاد رکھ کر آئیے۔ اس آیت کا مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ جب جانیں جسون کے ساتھ بوزدی جائیں گی۔

**آیت ۸ ﴿وَإِذَا الْمَوْءُ دُفِّسَتْ ۝۸﴾** ”اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔“

**آیت ۹ ﴿إِنِّي بَئِيْتُ دُنْبٌ قُفِّلْتُ ۝۹﴾** ”کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟“

یہ تذکیر و انداز کا بہت لطیف انداز ہے۔

**آیت ۱۰ ﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰﴾** ”اور جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے۔“

**آیت ۱۱ ﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝۱۱﴾** ”اور جب آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی۔“

یعنی آسمان پر سے پردہ اُٹھا دیا جائے گا اور اس کے وہ سب رموز اور مناظر جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ آسمان اس دن کھال اُترے ہوئے کسی جانور کے جسم کی طرح سرخ نظر آئے گا، بعینہ کہ سورۃ الرحمن کی اس آیت میں بھی بتایا گیا ہے ﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝۳۰﴾ ”پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی تیل کی تلچھٹ جیسا۔“

**آیت ۱۲ ﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سُفِرَتْ ۝۱۲﴾** ”اور جب جہنم دھکائی جائے گی۔“

**آیت ۱۳ ﴿وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝۱۳﴾** ”اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی۔“

ان تیرہ آیات میں قیامت کے دن کی مختلف کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد جو آدم اور اصل بات بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے:

**آیت ۱۴** ﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرْتُ﴾ ﴿۱۴﴾ ”(اُس دن) ہر جان جان لے گی کہ اس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے۔“

یعنی ہر انسان کے تمام اعمال کی پوری تفصیل اس کے سامنے آ جائے گی۔

**آیت ۱۶۱۵** ﴿فَلَا أَقْسِمُ بِالْخُنُوسِ﴾ ﴿۱۵﴾ ﴿الْجَوَارِ الْكُنُوسِ﴾ ﴿۱۶﴾ ”تو نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے چلتے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔“

یعنی ایسے ستارے جو سیدھا چلتے چلتے پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

”کئی سیاروں (مثلاً زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد) کی چال اس ڈھب سے ہے کہ کبھی مغرب سے مشرق وچلیں، یہ سیدھی راہ ہوئی، کبھی ٹھنک کر اٹنے پھریں اور کبھی سورج کے پاس آ کر کتے دونوں تک غائب رہیں۔“

بہر حال یہ آیات آج کے ماہرین فلکیات کو دعوتِ تحقیق دے رہی ہیں کہ وہ جدید معلومات کی روشنی میں ان الفاظ (الْخُنُوسِ اور الْجَوَارِ الْكُنُوسِ) کے لغوی معانی کے ساتھ ستاروں کی دنیا کے رموز و حقائق کی مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

**آیت ۱۷** ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾ ﴿۱۷﴾ ”قسم ہے رات کی جب وہ روانہ ہونے لگے۔“

یہ آیت اور سورۃ المدثر کی یہ آیت باہم مشابہ اور ہم معنی ہیں ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا اَذْبَرَ﴾ ﴿۱۸﴾ ”اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔“

**آیت ۱۸** ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ﴾ ﴿۱۸﴾ ”اور صبح کی جب وہ سانس لے۔“

یعنی صبح صادق کا وہ وقت جب رات کے سانس لے میں سے زندگی اگڑائی لیتی ہوئی آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہے۔

**آیت ۱۹** ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ﴿۱۹﴾ ”یقیناً یہ (قرآن) ایک بہت باعزت پیغامبر کا قول ہے۔“

یہاں ”رَسُولٍ كَرِيمٍ“ سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یہ آیت قبل ازیں سورۃ الفاتحہ میں بھی (بطور

آیت ۳۰) آجھی ہے اور وہاں ”رَسُولٍ كَرِيمٍ“ سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سورۃ الحج (آیت ۷۵) میں

فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّهُ يَنْضَضُفِي مِنَ الْمَلَكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾۔ اللہ جنہں لیتا ہے اپنے پیغامبر فرشتوں میں

سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔ چنانچہ فرشتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو چنا اور

انسانوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور یوں ان دو قسمیوں کے ذریعے سے ”رسالت“ کا سلسلہ تکمیل پذیر ہوا۔

زیر مطالعہ آیات میں رسول کریم بشر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور رسول کریم ملک (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کی

ملاقات کا ذکر بھی آ رہا ہے کہ رسالت کی ان دو کڑیوں کے ملنے کا ثبوت فرام ہو جائے۔ یہ مضامین اس سے پہلے

سورۃ النجم میں بھی آچکا ہے۔

**آیت ۲۰** ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾ ”جو (جبرائیل) بہت قوت والا ہے صاحب عرش کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔“

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقررین میں سے ہیں۔

**آیت ۲۱** ﴿مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ ”جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امانت دار بھی ہے۔“

حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے آپ تمام فرشتوں کے مطاع ہیں یعنی تمام فرشتے آپ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور آپ امانت دار ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام جوں کا توں انبیاء و رسل علیہم السلام تک پہنچاتے رہتے ہیں۔

**آیت ۲۲** ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾ ”اور تمہارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی مجنون نہیں ہیں۔“

زیر مطالعہ آیات سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کے ساتھ خصوصاً ماسیت اور مشابہت رکھتی ہیں۔ وہاں بھی اس مضمون کا آغاز ستارے کی قسم (وَالنَّجْمِ) سے ہوا ہے اور یہاں بھی اس موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے آیات ۱۵ اور ۱۶ میں ستاروں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ وہاں صَاحِبُكُمْ سے بات شروع ہو کر حضرت جبرائیل کے ذکر تک آئی ہے جبکہ یہاں حضرت جبرائیل کا ذکر پہلے اور صَاحِبُكُمْ کا بیان بعد میں آیا ہے۔ وہاں حضرت جبرائیل کا ذکر شَدِيدُ الْقُوَى کے لقب سے ہوا ہے جبکہ یہاں ان کی شان میں ذِي قُوَّةٍ کے الفاظ آئے ہیں۔

**آیت ۲۳** ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ﴾ ”اور انہوں نے دیکھا ہے اس کو کھلے افق پر۔“

یعنی ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جبریل کو کھلے اور روشن افق پر دیکھا ہے اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ کے لیے سورۃ النجم میں بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى (آیت ۷) کی ترکیب آئی ہے۔

**آیت ۲۴** ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْعَرْشِ بِصَیْبِنٍ﴾ ”اور وہ غیب کے معاملے میں حریص یا بخیل نہیں ہیں۔“

’صَیْبِنٍ‘ کا ترجمہ حریص بھی کیا گیا ہے اور بخیل بھی۔ دراصل بخل اور حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی مفہوم کے دو پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ حریص کے معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری زندگی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ کیا انہوں نے کاتبوں اور نجومیوں کے ساتھ کبھی دوستی رکھی ہے؟ یا غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے کیا انہوں نے کبھی ریاضتیں وغیرہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ ظاہر ہے ان کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ جتنا خجہ تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ غیب کی خبروں کے معاملے میں شروع ہی سے ’حریص‘ تھے۔ اسی طرح وہ اس بارے میں بخیل بھی نہیں ہیں اور اس حقیقت کے بھی تم خود گواہ ہو۔ انہیں غیب کی جو خبریں معلوم ہوتی ہیں وہ تم لوگوں کو بتاتے ہیں۔ کیا کاتبین اور نجومی بھی غیب کی خبریں اسی طرح کھلے عام لوگوں کو بتاتے ہیں؟ کسی کاتبین کے پاس تو غیب کا علم ہوتا ہی نہیں اور جو کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین کی بنا پر وہ کچھ جانتا ہے اس پر وہ اپنا کاروبار چمکاتا ہے۔ گویا ’بلدی کی گانٹھ‘ مل جانے پر وہ پسناری بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ایک ایک بات کے عوض منہ مانتے نذرانے وصول کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اگر

فرشتے اور دیکھا یہ تو انہوں نے سرمام تم لوگوں کو بنا دیا ہے۔ (اور انہوں کی طرف سے انہیں غیب کا جو علم دیا جا رہا ہے وہ من و عن تم لوگوں کو بتاتے ہیں اور اس معاملے میں غیروں کو کچھ نہیں دیتے۔) (۱)

**آیت ۲۵ ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾** "اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔"

شیاطین جن چونکہ غیب کے نام پر جھوٹی کچی خبریں کا ہنوں تک پہنچاتے رہتے تھے اس لیے یہاں ان امکان کی بھی تردید کر دی گئی ہے۔ یعنی تم لوگ یہ مت سمجھو کہ جنوں میں سے کسی شیطان نے انہیں کوئی پتی پڑھادی ہے (معاذ اللہ)۔ یہی مضمون سورۃ الحاقہ میں زیادہ وضاحت اور زیادہ پر زور انداز میں یوں بیان ہوا ہے ﴿فَلَا أَفْهَمُ مِمَّا تَتَّبِعُونَ﴾ (۳) ﴿وَمَا لَا تُبْصِرُونَ﴾ (۴) "میں قسم کہ تم لوگوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔ (یہاں پر مَا تَبْصِرُونَ سے شاعر کا وہ غیر مراد ہے اس لیے کہ شاعر لوگ اپنی اور فکر سے شمر کہتے ہیں جبکہ مَا لَا تُبْصِرُونَ کے الفاظ میں شیاطین جن کی خبروں کی طرف اشارہ ہے جو کانہوں تک پہنچاتے تھے)۔ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ (۵) ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلٍ مَّا تُولَیُّونَ﴾ (۶) ﴿بِقَوْلٍ كَافٍ﴾ (۷) ﴿قَلِيلٌ مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ (۸) "یہ قول ہے رسول کریم کا اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے کہ تم ہی جو تم یقین کرتے ہو۔ اور نہ ہی یہ کسی کان کا کلام ہے۔ تم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔"

**آیت ۲۶ ﴿فَاقِنْ تَذَهَّبُونَ﴾** "تو تم کدھ چلے جا رہے ہو؟"

تمہاری بھلائی اور کامیابی تو ان میں تھی کہ تم لوگ ہمارے رسول (ﷺ) پر ایمان لاتے اور ان کی طرف سے جو وحی آ رہی ہے اس کے نور سے اپنے دلوں کو نور کرتے لیکن تم لوگوں نے اس کے بجائے ان کی تکذیب اور مخالفت کی روش اپنا رکھی ہے۔ تم لوگ کبھی بخیرگی سے غور تو کرو کہ اللہ کے کلام سے سزاوارتہ تم لوگ کس طرف جا رہے ہو۔

**آیت ۲۷ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾** "نہیں ہے یہ کلام جہاں والوں کے لیے ایک یاد دہانی۔"

قرآن مجید اس مضمون میں ذکر یعنی یاد دہانی ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود حقائق کی یاد دہانی کرتا ہے۔ دراصل انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید کے تصور سے آشنائے مگر دنیا میں رہ کر ہوئے اگر انسان کی فطرت پر غفلت کے پردے پڑ جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اس حوالے سے ہم اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پڑھ چکے ہیں ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾ کہ اے اہل ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہر حال غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان باللہ سے متعلق وہ حقائق جو ہر انسان کی فطرت

(۱) اس آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو

"یعنی یہ نتیجہ ہر قسم کے غیروں کی خبر دینا ہے ماضی سے متعلق اور یہ مستقبل سے یا اللہ کے اسرار و صفات سے یا احکام شریعہ سے یا خدا کی حقیقت و بظان سے یا سنت و درویشی سے یا رسول سے یا واقعات بعد الموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اجرت مانگتا ہے۔"

میں مضمحل ہیں پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات انسانی فطرت میں موجود ان تمام حقائق کو خفتہ (dormant) حالت سے نکال کر پھر سے فعال (active) کرنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

**آیت ۲۸** ﴿لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْقِيَهُ﴾ ”ہر اس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے۔“

یعنی قرآن ہر اس شخص کے لیے یاد دہانی ہے جو ہدایت کا طالب ہو اور پورے خلوص سے چاہتا ہو کہ وہ گمراہی سے نکل کر ہدایت کے راستے پر آجائے۔

**آیت ۲۹** ﴿وَمَا تَشَاءُ وَاَلَا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ ”اور تمہارے چاہے بھی کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔“

یہ مضمون قرآن میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے، یعنی کسی انسان کو ہدایت تبھی ملے گی جب وہ خود بھی اس کے لیے ارادہ کرے اور پھر اللہ بھی اسے ہدایت دینا چاہے۔ ظاہر ہے ہر کام اللہ ہی کے اذن اور اسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ لیکن ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ انسان کی اپنی خواہش اور طلب کا شامل ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردستی کسی پر ہدایت مسلط نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر سزا اور جزا کا سارا فلسفہ ہی غلط ہو جاتا ہے۔



# سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الانفطار اور سورۃ التکویر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے اور یہ تعلق اس حد تک گہرا ہے کہ ان دونوں کا مضمون بھی ایک ہے بلکہ متعلقہ مضمون دونوں سورتوں کے ملنے سے مکمل ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں قیامت کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ سورۃ التکویر میں ان حالات کی تفصیل تیرہ آیات میں بیان ہوئی ہے جبکہ سورۃ الانفطار میں وہی مضمون صرف چار آیات میں سمٹ گیا ہے۔ اس مضمون کے بعد سورۃ التکویر میں جو اہم خبر دی گئی ہے وہ یہ ہے: ﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أُخِذْتُ ۖ وَمَا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ ۝۴۳﴾ جبکہ سورۃ الانفطار میں اس کے مقابلے یہ آیت آئی ہے: ﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ ۝۴۴﴾ یہاں تک تو دونوں سورتوں کا مضمون ایک جیسا ہے۔ اس کے بعد سورۃ التکویر میں قرآن کی صداقت کا حوالہ دے کر مخاطبین سے یہ چبھتا ہوا سوال کیا گیا ہے: ﴿فَاقْنِ تَذَهَّبُونَ ۝۴۵﴾ کہ تم لوگ نہ اللہ کے رسول کی سیرت کو دیکھتے ہو نہ حق کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرتے ہو۔ آخر تم لوگ جا کدھر رہے ہو؟ لیکن وہاں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ جب قیامت برپا ہو جائے گی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ چنانچہ اس موضوع پر روشنی یہاں سورۃ الانفطار میں ڈالی گئی ہے کہ اگر یہ راستہ اختیار کرو گے تو اس منزل پر پہنچو گے اور اگر دوسرا طریقہ عمل اپناؤ گے تو اس انجام سے دوچار ہو گے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۖ وَاِذَا النُّجُومُ انْتَثَرَتْ ۖ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۖ وَاِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۖ عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ ۖ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۖ الَّذِي خَلَقَكَ فَسُوِّكَ فَعَدَلَكَ ۚ فِيْ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاءَ رَبُّكَ ۚ كَلَّا بَلْ تَكْذِبُوْنَ ۚ بِالْاٰتِيْنَ ۚ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ ۚ كِرٰمًا كَاتِبِيْنَ ۖ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۚ اِنَّ الْاَنْۢكَرَ لَعِیْ نَعِیْبٍ ۚ وَاِنَّ الْفَجَارَ لَفِیْ حَجِیْمٍ ۖ یَّصْلُوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۚ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآیِبِیْنَ ۚ وَمَا اَدْرٰکُ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۚ ثُمَّ مَا اَدْرٰکُ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۚ یَوْمَ لَا تَمَلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْۢءًا ۚ وَالْاَمْرُ یَوْمَیْذٍ لِلّٰهِ ۚ

**آیت ۱** اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ① ﴿﴾ ”جب آسمان پھٹ جائے گا۔“

**آیت ۲** وَاِذَا النُّجُومُ انْتَثَرَتْ ② ﴿﴾ ”اور جب تارے بکھر جائیں گے۔“

**آیت ۳ ﴿وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝﴾** ”اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔“

**آیت ۴ ﴿وَإِذَا الْقُورُ بُعِثَتْ ۝﴾** ”اور جب قبریں تپت کر دی جائیں گی۔“

**آیت ۵ ﴿وَعِلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمْتُ وَأَخَّرْتُ ۝﴾** ”(اُس وقت) ہر جان جان لے گی کہ اُس نے

کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔“

اس دن ہر شخص کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا کیا اچھے یا برے اعمال آگے بھیجے تھے اور ان کے آثار و نتائج کی شکل میں کیا کچھ وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا۔ اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ القیامہ کی آیت ۱۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کس شے کو آگے کیا تھا اور کس شے کو پیچھے رکھا تھا۔ یعنی دنیا اور آخرت میں سے اس نے کس کو مقدم رکھا تھا اور کس کو مؤخر کیا تھا۔ آیت کے اس مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار کُلّی طور پر اس ”طرزِ عمل“ پر ہے جو وہ اپنی زندگی میں دنیا اور آخرت کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ یعنی انسان کا ایک طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ میرا اصل مطلوب و مقصود تو آخرت ہے، دنیا کا کیا ہے جو مل گیا وہی غنیمت ہے اور اگر کبھی نہ بھی ملے تب بھی کوئی بات نہیں۔ دوسرا ممکنہ رویہ یہ ہے کہ میرا اصل مقصود تو دنیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر آخرت بھی مل جائے تو اچھا ہے، چاہے وہ کسی کی سفارش سے مل جائے یا کسی اور حیلے سے۔ لیکن میری پہلی ترجیح (1st priority) بہر حال دنیا اور اس کا مال و متاع ہے، اور زندگی میں میری ساری تنگ و دواسی کے لیے ہے۔

**آیت ۶ ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝﴾** ”اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اپنے رب کریم کے بارے میں۔“

ظاہر ہے یہ کام شیطان لعین ہی کرتا ہے۔ وہی انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں ڈالتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں بنی نوع انسان کو بار بار خبردار کیا گیا ہے، مثلاً سورۃ لقمان میں فرمایا: ﴿وَلَا يَغْوُكُمْ بِاللَّهِ الْغَوُورُ ۝﴾ کہ وہ بڑا دھوکے باز تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں کہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام تر تنبیہات کے باوجود اکثر انسان شیطان کے اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے شیطان مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف چالیں اور حربے آزما رہا ہے۔ مثلاً ایک دیندار شخص کو اہم فرائض سے ہٹانے کے لیے وہ نوافل اور ذکرواد کا پرکشش منجک پیش کر سکتا ہے کہ تم اقامت دین اور دوسرے فرائض دینی کا خیال چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے راتوں کو جاگنے اور تہجد کی پابندی پر توجہ دو۔ عام مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ہی تیر بہدف چال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ کوئی خوردہ گیر نہیں کہ اپنے مؤمن بندوں کو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر پکڑے۔ وہ تو بہت بڑے بڑے گناہگاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے عملی کی سب سے بڑی وجہ شیطان کی یہی چال ہے، بلکہ اس دلیل کے سہارے اکثر لوگ گناہوں کے بارے میں حیران کن حد تک جری اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت زیرِ مطالعہ ہم

میں سے ہر ایک کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! تمہاری بے عملی کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ شیطان نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے نام پر دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے؟

**آیت ۷** ﴿الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ﴾ ﴿۷﴾ ”جس نے تمہیں تخلیق کیا، پھر تمہارے نوک پلک سنوارے، پھر تمہارے اندر اعتدال پیدا کیا۔“

اللہ تعالیٰ نے تمہارے قوائے جسمانی اور قوائے نفسیاتی میں ہر طرح سے اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے۔ گویا تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کی مظہر ہے۔ تمہاری تخلیق کے اندر توازن اور خوبصورتی کا یہ پہلو گویا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے اور یہ کہ وہ تم انسانوں کے ساتھ آخرت میں بھی عدل و انصاف کا معاملہ فرمائے گا، تاکہ گناہگاروں کو قرار واقعی سزا مل سکے اور نیکوکار اپنی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ پائیں۔ تمہاری مبنی براعتدال تخلیق و ترکیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہارے خیالات و اعمال بھی اعتدال اور توازن کا مظہر ہوتے، مگر تم لوگ ہو کہ اپنے خالق کے بارے میں ہی دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم اس کی شانِ غفاری کو تو بہت اہتمام سے یاد رکھتے ہو جبکہ اس کی صفتِ عدل سمیت بہت سی دوسری صفات کو بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہاری یہ بے اعتدالی تمہارے اس خالق کو بالکل پسند نہیں ہے جس نے تمہاری تخلیق کا خیر ہی اعتدال سے اٹھایا ہے۔

**آیت ۸** ﴿فَبِئْسَ أَتَى صُورَةً مَّا شَاءَ رَبُّكَ﴾ ﴿۸﴾ ”پھر جس شکل میں اُس نے چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔“ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شکل اور اس کے مختلف اعضاء اپنی مرضی و مشیت کے مطابق بناتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اس موضوع کی مناسبت سے مجھے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نعتیہ اشعار یاد آ گئے ہیں۔ آپ حضور ﷺ کی شان میں فرماتے ہیں:

وَأَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ  
خُلِفْتَ مُبْرَأً مِنْ مَخْلَقِ عَيْبٍ كَأَنَّكَ قَدْ خُلِفْتَ كَمَا نَشَاءُ

”آپ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے بڑھ کر جمیل عورتوں نے جنم ہی نہیں۔ آپ ہر عیب اور نقص سے مبرا پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپ اس طرح پیدا ہوئے ہیں جس طرح آپ نے خود چاہا۔“

**آیت ۹** ﴿كَأَنَّا بَلَّ تَكْدِبُونَ بِالْأَدْنَى﴾ ﴿۹﴾ ”ہر گز نہیں! بلکہ اصل میں تم جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو۔“ تم لوگ یہ جو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے قصیدے پڑھ رہے ہو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ تم اس کی رحمت اور بخشش پر واقعتاً بہت پختہ یقین بھی رکھتے ہو بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اپنے اس فلسفے کی آڑ میں تم جزا و سزا کا انکار کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح کے ایک ”قصیدے“ کی یہ جھلک ملاحظہ کیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کا اقرار ہے یا اس کے فلسفہ جزا و سزا کا مذاق۔

عصیاں سے کبھی ہم نے سنرا نہ کیا پر تو نے دل آزرده ہمارا نہ کیا  
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا!

اگر کوئی شخص واقعی پوری دیدہ دلیری سے جہنم کی تدبیر اور کوشش کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا تو یہی ہے



کہ اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے اسے جہنم میں جھونک دیا جائے۔ چنانچہ ایسے خیالات و نظریات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کی بنیاد پر تشکیک کر کے نہ صرف اپنے آپ کو سزا دے رہے ہیں بلکہ عملی طور پر جزا و سزا کے فلسفہ کا ہی انکار کر رہے ہیں۔

**آیت ۱۰ ﴿وَإِنَّا عَلَيْكُمْ لَحَافِظُونَ ۝﴾** ”حالانکہ تم پر نگہبان (فرشتے) قرار ہیں۔“

**آیت ۱۱ ﴿يَكْرَاهُوا كِتَابِيْنَ ۝﴾** ”جو بڑے باعزت لکھنے والے ہیں۔“

**آیت ۱۲ ﴿يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝﴾** ”وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے بطور نگہبان قرار کر رکھے ہیں جو اس کا ایک ایک عمل لکھ رہے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کا محاسبہ کرنا منظور نہیں ہے تو گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کا فرشتوں کو بطور نگہبان قرار کرنا اور ان فرشتوں کا ایک ایک انسان کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ مرتب کرنا سب کا رعبث ہے۔ ایسے خیالات کے حامل لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ”کارعبث“ اللہ کے شایانِ شان نہیں، وہ احتساب ضرور کرے گا اور اس احتساب کے نتائج بھی ضرور نکلیں گے، جن کا ذکر اگلی آیات میں ہے:

**آیت ۱۳ ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝﴾** ”یقیناً نیکو کار بندے نعمتوں میں ہوں گے۔“

**آیت ۱۴ ﴿وَإِنَّ الْفَاجِرَ لَفِي جَحِيمٍ ۝﴾** ”اور یقیناً فاسق و فاجر جہنم میں ہوں گے۔“

**آیت ۱۵ ﴿تَصَلُّوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾** ”داخل ہوں گے اس میں جزا و سزا کے فیصلے کے دن۔“

**آیت ۱۶ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝﴾** ”اور وہ اس سے کہیں غائب نہیں ہو سکیں گے۔“

ظاہر ہے جہنم سے بھاگ نکلنے کا نہ کوئی راستہ ہوگا اور نہ ہی کسی میں بھاگ جانے کی طاقت ہوگی۔

**آیت ۱۷ ﴿وَمَا أَزِلُّكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾** ”اور کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ روز جزا کیا ہے؟“

**آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ مَا أَزِلُّكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾** ”پھر کیا تمہیں کچھ اندازہ ہوا ہے کہ روز جزا کیا ہے؟“

**آیت ۱۹ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝﴾** ”جس روز کسی جان کو کسی

دوسری جان کے لیے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور امر کل کا کل اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔“

اس دن سر محشر پکارا جائے گا: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِمَا كُنْتُمْ تَفْعَلُوْنَ ۖ بَلِ الْبِرُّ بِمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۖ فَمَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلنَّبِيِّ فَيُوْثِقْ يَدَہٗ إِلَى الْعَرْشِ حَافِیًا ۚ سَوْفَ نُقَبِّضُہٗ ۚ فَمَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلنَّبِيِّ فَيُوْثِقْ يَدَہٗ إِلَى الْعَرْشِ حَافِیًا ۚ سَوْفَ نُقَبِّضُہٗ ۚ فَمَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلنَّبِيِّ فَيُوْثِقْ يَدَہٗ إِلَى الْعَرْشِ حَافِیًا ۚ سَوْفَ نُقَبِّضُہٗ ۚ

آج حکومت اختیار اور اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس سوال کا جواب بھی پھر خود ہی دیا جائے گا: ﴿لِلَّهِ

الْوَحْدِ الْقُدْرَةُ﴾ (المؤمن: ۱۶) یعنی آج کے دن اختیار کل کا کل اللہ ہی کے پاس ہے جو اکیلا ہے اور سب پر

عالم ہے۔ اس دن انسانوں کی اکثریت کو بے بسی اور نفساً نفسی کی جس کیفیت کا سامنا ہوگا سورۃ البقرۃ میں اس کا

تشریح کیا گیا ہے: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ

مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝﴾ ”اور وہ دن ہے کہ جس دن کام نہ آئے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی۔ غارش قبول الیٰی نہ ہوگی اور نہ کسی سے کوئی نہ ہوگا اور نہ انہیں کوئی مدد

# سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۚ الَّذِينَ إِذَا أَتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۚ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۚ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۚ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۚ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفِتْنَةِ لِنَفْسٍ سَجِينٍ ۚ وَمَا أَذْرَكَ مَا يَسْحَبْنَ ۚ كِتَابَ مَرْقُومٍ ۚ وَيَلَّيْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۚ الَّذِينَ يَكْذِبُونَ يَوْمَ الدِّينِ ۚ وَمَا يَكْذِبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۚ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۚ كَلَّا أَنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّجَبُونَ ۚ ثُمَّ أَنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۚ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَكْذِبُونَ ۚ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لِنَفْسٍ عَلِيمٍ ۚ وَمَا أَذْرَكَ مَا عَلَيْكُمْ ۚ كِتَابَ مَرْقُومٍ ۚ يَتَّبِعُهُ الْمُفَرِّقُونَ ۚ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَنُفِيعِينَ ۚ عَلَى الْأَرَابِكِ يَنْظُرُونَ ۚ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۚ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّحْمُومٍ ۚ خَمَّةٌ مِّسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلَيْتَاتٌ تَقِيسُ الْمُنْتَافِسُونَ ۚ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۚ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۚ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۚ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۚ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۚ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۚ عَلَى الْأَرَابِكِ يَنْظُرُونَ ۚ هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ

﴿آیت ۱﴾ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿۱﴾ ”ہلاکت ہے کی کرنے والوں کے لیے۔“

وَيْل کے معنی تباہی، بربادی اور ہلاکت کے بھی ہیں اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے۔ ”طف“ لغوی اعتبار سے حقیر سی چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ کم تولنے یا کم ماپنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مُطَفِّف وہ ہے جو حق دار کو اس کا پورا حق نہیں دیتا بلکہ اس میں کمی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص ماپ تول میں کمی کرتا ہے وہ اپنے اس عمل کے ذریعے متعلقہ چیز کی بہت تھوڑی سی مقدار ہی ناحق بچا پاتا ہے۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اتنی حقیر سی چیز کے لیے اپنا ایمان فروخت کر رہا ہے۔ بہر حال اس آیت میں کم

تولنے یا کم ماپنے والوں کو آخرت میں بربادی اور جہنم کی نوید سنائی گئی ہے۔

**آیت ۲** ﴿الَّذِينَ إِذَا اُتُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ﴾ ﴿۲﴾ ”وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔“

**آیت ۳** ﴿وَإِذَا كَالُوا لَهُمْ اَوْ وَزَنُوا لَهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ ﴿۳﴾ ”اور جب خود انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔“

**آیت ۴** ﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَبْعُوْنَ﴾ ﴿۴﴾ ”کیا ان کو یہ گمان نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں۔“

**آیت ۵** ﴿لَيَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ ﴿۵﴾ ”ایک بڑے دن کے لیے۔“

**آیت ۶** ﴿لَيَوْمٍ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿۶﴾ ”جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے رب کے سامنے۔“

ناپ تول میں کمی کرتے ہوئے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دینا بھاسر تو ایک معمولی سائل ہے لیکن ”تل کی اوٹ میں پہاڑ“ کے مصداق ایسا کرنے والے کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تو اس کا باعث بعد الموت پر یقین نہیں یا پھر اسے اس کی پروا نہیں کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

**آیت ۷** ﴿تَكَلَّأَ اِنَّ يَكْتَلِبَ الْفُجَّارُ لَفَنِي سَبِّحِينَ﴾ ﴿۷﴾ ”برگزن نہیں! یقیناً گناہگاروں کے اعمال نامے تحکیم میں ہوں گے۔“

عام طور پر کتاب سے یہاں اعمال نامہ بنی مراد لیا گیا ہے کہ کافر و فاجر لوگوں کے اعمال نامے ”سَبِّحِينَ“ میں جبکہ نیک لوگوں کے اعمال نامے ”عِلَّیِّیْنَ“ (بحوالہ آیت ۱۸) میں ہوں گے۔ تاہم بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ ”تحکیم“ ایک مقام ہے جہاں اہل دوزخ کی روحیں محبوس ہوں گی جبکہ اہل جنت کی ارواح ”طنینین“ میں ہوں گی۔ چنانچہ تحکیم اور طنین کا یہ فرق صرف اعمال ناموں کو رکھنے کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا۔ اس حوالے سے میرے غور و فکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے خاکی جسم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو روح پھونکی گئی ہے وہ ایک نورانی چیز ہے۔ انسان اچھے برے جو بھی اعمال کرتا ہے اس کے اثرات اس کی روح پر مرتب ہوتے رہتے ہیں جیسے آواز کی ریکارڈنگ کرتے ہوئے میپ کے نیچے سی ڈی یا منیکر و کارڈ وغیرہ پر اس آواز کے اثرات نقش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کی ارواح جب اس دنیا سے جاتی ہیں تو اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ ان ”اثرات“ کی وجہ سے ہر روح دوسری روح سے مختلف ہو جاتی ہے اور یوں نیک اور برے انسانوں کی ارواح میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری رائے میں انسانی ارواح پر ثبت شدہ اثرات اعمال کو یہاں لفظ ”کتاب“ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی انسانی ارواح اعمال کے اثرات لیے ہوئے جب اس دنیا سے جائیں گی تو برے اعمال کے اثرات والی ارواح کو تحکیم میں رکھا جائے گا۔ ”جہنم کے معنی“ ”جیل خانہ“

کے ہیں۔ گویا برے لوگوں کی ارواح کو وہاں کسی جیل نما جگہ میں بند کر دیا جائے گا جیسے ضلعی انتظامیہ کے ”محافظ خانے“ میں پرانی فائلوں کے انبار لگے ہوتے ہیں۔

**آیت ۸** ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَيَجِئُ ۝۸﴾ ”اور تم نے کیا سمجھا کہ تجھ کو کیا ہے؟“

**آیت ۹** ﴿كِتَابٌ مَرْقُومٌ ۝۹﴾ ”لکھا ہوا دفتر۔“

اس ”کتاب“ سے مراد ایک انسان کی جان اور روح کا وہ ملفوظ ہے جس میں اس کے اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوتے ہیں۔ کسی برے انسان کے مرنے پر متعلقہ فرشتہ وہ ملفوظ لاکر جہنم میں ”جمع“ کرادیتا ہے۔

**آیت ۱۰** ﴿وَيَلَّيْلٌ يَوْمُنِدِّ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۱۰﴾ ”تباہی اور ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔“

**آیت ۱۱** ﴿الَّذِينَ يَكْذِبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝۱۱﴾ ”جو جھٹلا رہے ہیں جزا و سزا کے دن کو۔“

**آیت ۱۲** ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝۱۲﴾ ”اور نہیں جھٹلاتا اس دن کو مگر وہی کہ جو حد سے

بڑھنے والا گناہگار ہے۔“

ایسا شخص سزا و جزا کے دن کو دراصل اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں اور حرام خوریوں کی وجہ سے اس دن کے احتساب کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ جس طرح لمبی سے بچنے کے لیے کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اسی طرح یوم حساب کی جواب دہی سے بچنے کے لیے ایسے لوگ اس دن کے وقوع کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔

**آیت ۱۳** ﴿إِذَا تَنَالَىٰ عَلَيْهِ إِشْنَا قَالَ أَصَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۳﴾ ”جب اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری

آیات تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔“

یعنی یہ تو وہی باتیں ہیں جو پچھلے زمانے کے لوگوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۱۴﴾ ”نہیں! بلکہ (اصل صورت حال

یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر رنگ آ گیا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔“

اس ”رنگ“ کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمائی ہے کہ ”بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے اس گناہ سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو اس کے دل کا یہ داغ صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو وہ داغ بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔“ (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

گناہگار اہل ایمان کے دلوں کے اندر ان کی روجوں کا ”نور“ تو موجود ہوتا ہے لیکن دلوں کے ”شیشے“ رنگ آلود ہو جانے کی وجہ سے یہ نور خارج میں اپنے اثرات نہیں دکھا سکتا۔ جیسے کسی ذی نوس یا لالین کا شیشہ اگر دھوئیں سے سیاہ ہو جائے تو اس کے اندر چلنے والے شعلے کی روشنی باہر نہیں آ سکتی اور باہر کی روشنی اندر نہیں جاسکتی۔ انسانی دل کی اس کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے حضور ﷺ نے اس کا علاج بھی تجویز فرما دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ تَصْغُرُ كَمَا يَصْغُرُ الْحَدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا جَلَاءُهَا؟

قَالَ: ((كُنْزُهُ ذِكْرُ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (۱)

”ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔“ دریافت کیا گیا:

یارسول اللہ! اس زنگ کو دور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا: ”موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!“

**آیت ۱۵** ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾ (۱۵) ”نہیں! یقیناً یہ لوگ اُس دن اپنے رب سے اُوث میں رکھے جائیں گے۔“

قیامت کے دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس نیکو کار لوگوں کے لیے سورۃ القیامہ میں یہ خوشخبری سنائی گئی ہے: ﴿وَجُوهٌ يُّوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۖ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۳۷﴾ کہ اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کے دیدار یا اس کی کسی خاص شان کے مشاہدے سے سرفراز فرمایا جائے گا جس کے باعث اس دن کے سخت مراحل ان کے لیے آسان ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ہمارے عام مفسرین کی رائے بھی یہی ہے کہ میدانِ حشر میں بھی مؤمنین صادقین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار کرایا جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس وقت میدانِ حشر میں کفار و مشرکین بھی کھڑے ہوں گے لیکن انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ میدانِ حشر کے ایسے ہی ایک منظر کی جھلک سورۃ ن کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ اِلٰی السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ۝۳۸﴾ ”جس دن پنڈلی کھولی جائے گی“ اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے لیکن وہ کر نہیں سکیں گے۔ یعنی اہل ایمان جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے کرتے تھے وہ تو اس حکم کو سنتے ہی سجدے میں گر جائیں گے لیکن دوسرے لوگوں کی کمریں تختہ ہو کر رہ جائیں گی وہ تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

**آیت ۱۶** ﴿ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ﴾ (۱۶) ”پھر انہیں جھونک دیا جائے گا جہنم میں۔“

اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ مرحلہ دوزخ میں داخلے سے پہلے کا ہے، یعنی دیدارِ الہی سے محروم رکھے جانے کا واقعہ میدانِ حشر میں ہی رونما ہوگا۔

**آیت ۱۷** ﴿ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تَكْتَبُونَ﴾ (۱۷) ”پھر ان سے کہا جائے گا: یہ ہے وہ چیز جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے!“

دنیا میں تو لوگ جنت، دوزخ اور جزا و سزا کو بڑے شہد و مد سے جھٹلایا کرتے تھے۔ اب دیکھ لو! دوزخ اور اس کی سزائیں حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی ہیں۔

**آیت ۱۸** ﴿كَلَّا اِنَّ كِتَابَ الْاٰبَرَارِ لَفِيْ عَلَيْنِ ۝۱۸﴾ (۱۸) ”نہیں! یقیناً نیکو کاروں کے کتاب یا اعمال نامے علیین میں ہوں گے۔“

**آیت ۱۹** ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا عَلَيْنُ ۝۱۹﴾ (۱۹) ”اور تمہیں کچھ اندازہ ہے وہ علیون کیا ہے؟“

**آیت ۲۰ ﴿كُتِبَ مَرْقُومٌ﴾** ﴿۲۰﴾ ”لکھا ہوا دفتر۔“

یعنی ان لوگوں کی ارواح کا مقام جن پر ان کے نیک اعمال کے اثرات بھی ثبت ہوں گے۔

**آیت ۲۱ ﴿يُشْهَدُ الْمُقَرَّبُونَ﴾** ﴿۲۱﴾ ”وہاں موجود ہوں گے ملائکہ مقربین۔“

ان لوگوں کی ارواح کو ملائکہ مقربین کی صحبت میسر ہوگی۔ اس بلند مقام پر انہیں قیام قیامت تک رکھا جائے گا۔

**آیت ۲۲ ﴿إِنَّ الْأُبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾** ﴿۲۲﴾ ”یقیناً نیکو کار نعمتوں میں ہوں گے۔“

**آیت ۲۳ ﴿عَلَى الْأَرْآلِكَ يَنْظُرُونَ﴾** ﴿۲۳﴾ ”وہ تختوں پر بیٹھے (مناظر جنت) دیکھ رہے ہوں گے۔“

**آیت ۲۴ ﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾** ﴿۲۴﴾ ”تم دیکھو گے ان کے چہروں پر تروتازگی کی

علامات۔“

جیسے دنیا میں انسان کی خوشحالی اور آسودگی کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح

قیامت کے دن اہل جنت اپنے تروتازہ چہروں سے صاف پہچانے جائیں گے۔

**آیت ۲۵ ﴿يَسْقُونَ مِنْ رَحِيٍّ مَخْشُومٍ﴾** ﴿۲۵﴾ ”انہیں پلائی جائے گی خالص شراب جس پر مہر لگی ہوگی۔“

ہندوستان کے معروف اہل حدیث عالم دین مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے احادیث کے حوالے سے

سیرت پر ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام انہوں نے اس آیت سے اخذ کیا ہے۔ انہیں اس

کتاب پر شاہ فیصل ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ الرحیق المخبوم کے نام سے یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کا

انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

**آیت ۲۶ ﴿حِمْيَمٌ مِّسْكٌ﴾** ﴿۲۶﴾ ”اس کی مہر ہوگی مشک کی۔“

**﴿وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾** ﴿۲۷﴾ ”اس چیز کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کریں

سبقت لے جانے والے۔“

اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ دنیا کی حقیر چیزوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے ان دوائی نعمتوں کو حاصل کرنے

کے لیے محنت اور مسابقت کریں۔

**آیت ۲۷ ﴿وَمَزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾** ﴿۲۷﴾ ”اور اس کی ملوثی ہوگی تسنیم سے۔“

اس شراب یعنی رحیق مخنوم میں تسنیم کا مشروب بھی ملا یا گیا ہوگا۔ اور یہ تسنیم کیا ہے؟

**آیت ۲۸ ﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾** ﴿۲۸﴾ ”یا ایک چشمہ ہے جس پر جام نوشی کریں گے مقربین بارگاہ۔“

**آیت ۲۹ ﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ﴾** ﴿۲۹﴾ ”یقیناً جو مجرم تھے وہ اہل

ایمان پر ہنس کرتے تھے۔“

وہ اہل ایمان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ دیکھو ان بے وقوفوں کو جنہوں نے آخرت کے مہوہوم وعدوں پر

اپنی زندگی کی خوشیاں اور آسائشیں قربان کر دی ہیں۔

**آیت ۳۲** ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَرُونَ ۝﴾ ”اور جب یہ ان کے قریب سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔“

کہ دیکھو! یہ ہیں وہ احق جو جنت کی حوروں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

**آیت ۳۳** ﴿وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝﴾ ”اور جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو باتیں بناتے ہوئے نوٹتے تھے۔“

**آیت ۳۴** ﴿وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَصَالُونَ ۝﴾ ”اور جب وہ ان (اہل ایمان) کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ یقیناً یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔“

مخالفین کے ایسے بھرے طنزیہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں ہمدردی کا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے آج کل بھی ہمیں ایسے فقرے اکثر سننے کو مل جاتے ہیں کہ دیکھیں! یہ اچھا بھلا ذہین نوجوان تھا۔ بورڈ ناپ کیا، یونیورسٹی میں گولڈ میڈل لیا، ملازمت بھی بہت اچھی ملی، لیکن پھر اچانک خدا جانے اسے کیا ہوا کہ اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا، اس کے بعد تو اس کی ترجیحات ہی بدل گئی ہیں! اب اسے نہ اپنا خیال ہے اور نہ ملازمت کی فکر! بس رات دن اس کے سر پر تبلیغ کی دھن سوار ہے۔ بے چارہ! اچھا خاصا کیریئر تباہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔

**آیت ۳۵** ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۝﴾ ”جب کہ انہیں نہیں بھیجا گیا تھا ان پر نگران بنا کر۔“

**آیت ۳۶** ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝﴾ ”تو آج (قیامت) کے دن اہل ایمان ان کفار پر ہنس رہے ہیں۔“

**آیت ۳۷** ﴿رَ عَلَىٰ الْأَرْآئِكَ يَنْظُرُونَ ۝﴾ ”وہ تختوں پر بیٹھے (ان کا حشر) دیکھ رہے ہیں۔“

کہ ابو جہل پر کیا بیت رہی ہے اور ابولہب کو کیسے عذاب کا سامنا ہے۔

**آیت ۳۸** ﴿هَلْ نُؤْتِ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝﴾ ”بدلہ مل گیا نا کافروں کو اس کا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے!“



# سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًا فَمَلْفِيءٌ ۚ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ يَمِينًا ۖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۖ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۚ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۖ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۖ وَيَصْلىٰ سَعِيرًا ۚ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۚ إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّنْ يَحْضُرَهُ ۚ بَلَىٰ ۖ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۚ فَلَا أُفِيضُ بِالشَّفَقِ ۖ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۖ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۖ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۖ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۚ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْذِبُونَ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ۖ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۚ

**آیت ۱** ﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ﴾ ”جب آسمان پھٹ جائے گا۔“

نوٹ کیجیے! ان تمام سورتوں کا بنیادی موضوع ”تذکیر آخرت“ ہے۔

**آیت ۲** ﴿وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ﴾ ”اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔“

اِذِنَتْ لِرَبِّهَا کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ وہ اپنے رب کے حکم پر کان لگائے ہوئے ہے اور جو بات کان لگا کر سنی جائے اس کے مطابق عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اِذِنَتْ کا معنی اِسْمَعْتَ وَانْقَادْتَ کیا گیا ہے۔ یعنی اُس نے غور سے سنا اور تعمیل کی۔ حُقَّتْ یہاں مجبول ہے حَقٌّ يَحِقُّ سے۔ یعنی وہ اسی لائق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اپنے خالق کے حکم پر سر تسلیم خم کرے۔

**آیت ۳** ﴿وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ﴾ ”اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔“

**آیت ۴** ﴿وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ﴾ ”اور وہ نکال باہر کرے گی جو کچھ اس کے اندر تھا اور خالی

ہو جائے گی۔“

سورۃ الزلزال میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: ﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۖ﴾ ”اور جب زمین

اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی۔“ قیامت کے دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کے اجسام



اور ان کے تمام اجزاء کو نکال کر باہر کرے گی۔ اس کے علاوہ بھی زمین میں جو کچھ معدنیات اور خزانے مخفی ہیں وہ قیامت کے دن نکال کر باہر پھینک دے گی۔

**آیت ۵** ﴿وَإِذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ ۝﴾ ”اور وہ بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اسے یہی زریعہ دیتا ہے۔“

جس طرح اطاعت و انقیاد کا مظاہرہ آسمان کرے گا، اسی طرح زمین بھی حکم الہی بجالائے گی۔

**آیت ۶** ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝﴾ ”اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف‘ پھر تو اس سے ملنے والا ہے۔“

یہ دنیا انسان کے لیے دارالمحس یعنی مشقتوں کا گھر ہے۔ انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سورۃ البلد میں یوں بیان فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝﴾ کہ انسان تو پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ گویا مشقتیں برداشت کرنا دکھ اٹھانا اور سختیاں جھیلنا انسان کا مقدر ہے۔ اس سے کسی انسان کو رستگاری نہیں۔ مزدور ہے تو وہ صبح سے شام تک جسمانی سختیاں سہہ رہا ہے۔ کارخانہ دار ہے تو انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں جگر خون گر رہا ہے۔ اگر کوئی کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو ذہنی مشقت کی چٹکی میں پس رہا ہے۔ پھر اپنی اور اہل و عیال کی بیماریاں، معاشی مشکلات، معاشرتی الجھنیں، مال و جان کی حفاظت کی فکر وغیرہ کی صورت میں ذہنی و نفسیاتی پریشانیاں الگ ہیں جو ہر انسان کے گلے کا بار بنی ہوئی ہیں۔ دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کا غم اس کے علاوہ ہے جو ہر انسان نے اپنے دل و دماغ میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور پال رکھا ہے۔ پیدل چلنے والا سائیکل سوار کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے، سائیکل سوار کا روالے کے حسد میں مبتلا ہے۔ چھوٹی کار والا بڑی کار والے سے جلن کا شکار ہے۔ غرض مشقت، تکلیف یا غم کی نوعیت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی دکھ پریشانی یا مشقت میں مبتلا نہ ہو۔ ان مشقتوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا انسان کو روزِ اول سے ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ جیتے جی کوئی انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ مرزا غالب نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے:-

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!  
ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ، لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر اور پریشان کن ہے۔ اور وہ مسئلہ ہے کہ:-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

(ابراہیم ذوق)

انسان کے اخروی احتساب کا تصور ذہن میں لائیں اور پھر موازنہ کریں کہ باقی جانداروں کے مقابلے میں ”انسان“ کس قدر مشکل میں ہے۔ ایک بار بردار جانور کی زندگی کا معمول چاہے جتنا بھی مشکل ہو لیکن اس کی مشقت اور تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایک تیل جب ہل یا ر ہٹ چلا تے چلاتے

مر جاتا ہے تو اس مشقت سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک انسان بے جو کوفت پر کوفت برداشت کرتا، اور تکلیف پر تکلیف نسیلتا جب اس دنیا سے جائے گا تو اسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دنیوی زندگی کے ایک ایک پل کا حساب دینا ہوگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُولُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ حَمِيٍّ: عَنْ عَمُوٍّ فِيمَا أَفَاءَ، وَعَنْ شُبَّانِهِ فِيمَا أَبْلَاهُ، وَمَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَا أَنْفَقَهُ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ)) (۱)

”ابن آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں، صلاحیتوں اور اُمّتوں) کے دور کے بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللوں تللوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تو اس پر کتنا عمل کیا؟“

یعنی دنیا میں بار برداری بھی کرو، جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں بھی برداشت کرو۔ مال و جان اور اولاد سے متعلق رنگا رنگ صدے جھیلے جھیلے زندگی بھر کا نمونہ پر بھی اونٹے رہو اور بھر مرنے کے بعد ایک ایسی ہستی کے سامنے کھڑے ہو کر پل پل کا حساب بھی دو جس سے تمہارے قلوب و اذہان کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذبات و خیالات بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ ہے ”انسان“ کی اصل ٹریجڈی!

یہ مرحلہ ایک انسان کے لیے ایسا مشکل ہے کہ اسے یاد کر کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا!

دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے درج بالا فرمان میں مذکور سوالات میں سے آخری سوال سب سے مشکل ہے۔ جس کسی نے دین اور قرآن کا علم جس قدر زیادہ سیکھا اس کے لیے اس کا حساب دینا اسی قدر مشکل ہوگا۔ اگر کسی انسان تک قرآن کی یہ دعوت پہنچ ہی نہیں پائی تو ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ (ایسی صورت میں اس کو تا ہی کا کچھ نہ کچھ بوجھ ان لوگوں پر بھی ضرور پڑے گا جنہوں نے اسے دعوت پہنچانے میں تساہل برتا) لیکن جن لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق قرآن کے پیغام کو سمجھ بھی لیا تو ظاہر ہے ان کے لیے اس آخری سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

**آیت ۷** ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابًا بِبَيِّنَاتٍ﴾ ”تو جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ دہانے ہاتھ میں۔“

**آیت ۸** ﴿فَسَوْفَ يَحْسَابُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾ ”تو اس سے لیا جائے گا بہت ہی آسان حساب۔“

اس حساب کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں آئی ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ حُوسِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذِيبٌ)) ”قیامت کے روز جس کا حساب لیا جائے گا اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔“ اس پر میں نے عرض

(۱) سنن الترمذی: أبواب صفة القيامة والرقائق والورع باب ما جاء في شأن الحساب والقصاص۔

ج: ۲۴۱۶۔ داوی: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿اَفَسَوْفَ يُعْاَسَبُ جَسَابًا يَّسِيْرًا﴾ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَيْسَ ذَاكَ الْحِسَابُ، اِنَّ ذَاكَ الْقَوْضُ، مَنْ نُوْفِقَ الْحِسَابَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَبَ)) (۱) ”یہ حساب نہیں ہوگا یہ تو محض (اعمال نامہ) پیش کیا جانا ہوگا روز قیامت جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔“

یعنی جس خوش قسمت انسان کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے نہ تو کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی اس کے مواخذہ اور مناقشے کی قوت آئے گی۔ بس اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص سے نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔

**آیت ۹** ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰى اٰهْلِهِ مَسْرُوْرًا﴾ (۹) ”اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں۔“ عدالت کے کمرے سے وہ شخص جب اپنے ان اہل و عیال رشتہ دار اور ساتھیوں کی طرف واپس لوٹے گا جو اسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے تو بہت خوش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میری بھی خلاصی ہوگئی۔

**آیت ۱۰** ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبًا وَّرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ (۱۰) ”اور جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے۔“

قرآن کریم کی اکثر آیات میں ایسے لوگوں کو بانیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سیاق و سباق میں یہاں وَّرَآءَ ظَهْرِهٖ کے الفاظ سے یہ لگتا ہے کہ فرشتہ ایک مجرم شخص کو جب اس کا اعمال نامہ پکڑانے لگے گا تو وہ اس سے بچنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے چھپالے گا۔ چنانچہ اسی حالت میں اعمال نامہ پیچھے سے اس کے بانیں ہاتھ میں تمنا دیا جائے گا۔

**آیت ۱۱** ﴿اَفَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾ (۱۱) ”تو اب وہ موت کی طلب کرے گا۔“

اس وقت اس کی ایک ہی خواہش ہوگی کہ مجھے موت آ جائے اور میں مرکز فحتم ہو جاؤں۔

**آیت ۱۲** ﴿وَيُصْلٰى سَعِيْرًا﴾ (۱۲) ”لیکن وہ داخل ہوگا جہنم میں۔“

**آیت ۱۳** ﴿اِنَّكَ كَاٰنَ فِیْ اٰهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ (۱۳) ”یقیناً (دنیا میں) وہ اپنے اہل و عیال میں بہت خوش و خرم تھا۔“

دنیا میں وہ حرام کی کمائی سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش کرتا رہا اور آخرت کے مجاہد کا کبھی تصور بھی ذہن میں نہ لایا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص اپنی روزی تو سو فیصد حلال ذرائع سے کما رہا ہے لیکن وہ اللہ کے دین کا حق ادا نہیں کر رہا تو ایسے شخص کی حلال ذرائع سے کمائی ہوئی وہ روزی بھی حلال نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اپنی روزی کمائی کی اس تنگ و دو میں جو وقت صلاحیتیں اور وسائل صرف کیے ہیں ان میں دین کے حقوق کا حصہ بھی شامل تھا۔ گویا اپنے وقت و وسائل اور اپنی صلاحیتوں کا وہ حصہ جو اسے اللہ کے دین کے

(۱) صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من سب سبیلاً فلم يفهمه ... ح: ۱۰۳۔ وصحیح مسلم: کتاب الحنة

وصفة نعيمها واهليها، باب اثبات الحساب، ح: ۲۸۷۶، واللفظ له۔

لیے خرچ کرتا چاہیے تھا اس جسے کو غصب کر کے وہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آیا ہے۔ تو دین کے حقوق کو غصب کر کے کھائی ہوئی ایسی روزی حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ دراصل حلال و حرام کے معاملے کو بہت دقت نظری سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے کو عام طور پر بہت سطحی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام مسلمان سوار کا گوشت کھانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اس بکری کا گوشت بہت مزے اور رغبت سے کھا لیتا ہے جو اس نے کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر خریدی ہوئی ہے۔ اب ایسی بکری کے بارے میں کون کہے گا کہ وہ حلال ہے اور حرام نہیں ہے!

اس موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باطل کے غلبے کے تحت اطمینان و سکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کر رہا تو وہ بزرگم خویش بے شک ناپ تول کر حلال ہی کیوں نہ کھا رہا ہو اس کا کھانا پینا حتیٰ کہ اس ماحول میں سانس لینا سب حرام ہے۔ ایسے شخص کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کس نظام کی چاکری کر رہا ہے؟ کس کے اقتدار کو کندھا دے رہا ہے؟ تنخواہ کہاں سے لے رہا ہے؟ اور اپنا کاروبار کس کی مدد سے آگے بڑھا رہا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ سب کچھ باطل نظام کے لیے کر رہا ہے اور طاغوت کی فراہم کردہ چھتری کے سائے میں کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کا کسی باطل نظام کے تحت ہنسی خوشی زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ لہٰذا یہ کہ ایسی صورت حال میں وہ کراہت اور بے چینی میں زندگی بسر کرے اپنی ضروریات کو کم سے کم سطح پر رکھے اور باطل نظام کو بدلنے کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دینے پر ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ اس کی یہ سوچ اور جدوجہد باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

آیات زیر مطالعہ میں دو انسانی کرداروں کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں ایک کردار تو اللہ کے اُس بندے کا ہے جو دنیوی زندگی کے دوران آخرت کی جواب دہی کے احساس سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب پر آخرت کے احتساب کا خوف اس حد تک مسلط ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کیفیت کو جنت میں پہنچ کر بھی یاد کریں گے: ﴿وَقَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اٰهْلِٓنَا مُتَشَفِّقِيْنَ ۝۱۴﴾ (الطور) ”وہ کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے اہل و عیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے“۔ ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں یہاں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عدالت سے اپنی کامیابی کی نوید سننے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں لوٹے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کردار وہ ہے جو آخرت اور آخرت کے محاسب سے بے خبر اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت میں مست رہا۔ ایسے شخص نے دنیا میں بلاشبہ ایک خوشحال اور خوشیوں بھری زندگی گزاری، لیکن آخرت میں اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

**آیت ۱۴** ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحْزَرَ ۝۱۴﴾ ”اسے گمان ہو گیا تھا کہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا ہے۔“

**آیت ۱۵** ﴿بَلٰی ۙ اِنَّ رَٔیَہٗ كَانَ بِہٖ بَصِيْرًا ۝۱۵﴾ ”کیوں نہیں! یقیناً اس کا رب تو اسے خوب دیکھ رہا تھا۔“

اگلی تین آیات میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ المدثر

کی ان آیات کے ساتھ خاص مناسبت اور بہت گہری مشابہت رکھتی ہیں: ﴿كَذَٰلِكَ وَالْقَمَرَ ۝ وَاللَّيْلَ إِذَا أَذْبَرَ ۝ وَالصُّبْحَ إِذَا أَسْفَرَ ۝﴾ ”کیوں نہیں“ قسم ہے چاند کی۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔ اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے۔ ان دونوں مقامات کے مابین ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قسموں پر مشتمل مذکورہ آیات سے بالکل نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر میں بھی ﴿كَذَٰلِكَ وَالْقَمَرَ ۝﴾ سے ایک نئے مضمون کا آغاز ہو رہا ہے اور بالکل ایسی ہی صورت حال زیر مطالعہ سورت کے اس مقام پر بھی نظر آتی ہے۔

**آیت ۱۶** ﴿فَلَا أَفْسَحُ بِالْشَّفَقِ ۝﴾ ”تو نہیں مجھے قسم ہے شام کی سرخی کی۔“

**آیت ۱۷** ﴿وَاللَّيْلَ وَمَا وَسَقَ ۝﴾ ”اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے۔“

**آیت ۱۸** ﴿وَالْقَمَرَ إِذَا اتَّسَقَ ۝﴾ ”اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔“

میری خالص ذاتی رائے کے مطابق (واللہ اعلم!) سورۃ المدثر کی مذکورہ آیات (۳۲، ۳۳، ۳۴) میں بعثت محمدیؐ کی خبر دی گئی ہے جبکہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ المدثر کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ رات ﴿وَاللَّيْلَ إِذَا أَذْبَرَ ۝﴾ سے مراد چھ سو سال (حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور تک) کا وہ طویل عرصہ ہے جس کے دوران وحی و نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور دنیا پر مجموعی طور پر کفر و شرک اور ضلالت و جہالت کے اندھیرے چھائے رہے۔ چاند کی قسم ﴿كَذَٰلِكَ وَالْقَمَرَ ۝﴾ میں علم و ہدایت کی اس مدہم روشنی کا استعارہ ہے جو جن و انس کے نیک افراد کی صورت میں اس دوران کہیں کہیں موجود رہی، جبکہ صبح کی قسم ﴿وَالصُّبْحَ إِذَا أَسْفَرَ ۝﴾ کے پردے میں نبوت محمدیؐ کے خورشید کے طلوع ہونے کی خبر دی گئی ہے اور اس کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے: ﴿إِنَّمَا لِأَحْذَى الْكُتُبِ ۝﴾ کہ یہ بلاشبہ ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔ ظاہر ہے نور انسانی کی تاریخ میں نبوت محمدیؐ کے ظہور سے بڑا کوئی اور واقعہ کیا ہوگا۔

بہر حال نبوت و رسالت محمدیؐ کے خورشید جہاں تاب کی تابانیوں سے چھ سو سال کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ حضور ﷺ کی وساطت سے آبنائے آدم کو ”اَتَّكَمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ“ کی خصوصی سند بھی عطا ہوئی، جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب بھی رونما ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب کی فتوحات و برکات تین براعظموں تک پھیل گئیں۔ لیکن چند ہی دہائیوں کے بعد مشیت خداوندی سے نہ صرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ پسپائی کا یہ عمل جب شروع ہوا تو صرف جنگی محاذوں سے پیچھے ہٹنے تک ہی محدود رہا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان سے دست بردار ہو کر کشت وادبار کی پستیوں میں لڑھکتے چلے گئے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ابھی اس کے رکنے کے بظاہر کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گھمبیر صورت حال اپنی جگہ پر ایک زمینی حقیقت ہے، لیکن دوسری طرف ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے اسلام پوری دنیا پر غالب آئے گا۔ اس بارے میں حضور ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں (اس مضمون کی احادیث ”نویہ خلافت“ کے عنوان سے ایک کتابچے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تفصیل جاننے

کے لیے اس کتابچے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔) میں سمجھتا ہوں کہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کے اسی غلبے کی بشارت دی گئی ہے جس کی تفصیل حضور ﷺ کے فرمودات میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک یہاں پہلی قسم ﴿فَلَا أَفْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۵﴾ میں اسلام کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے کی صورت حال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی سورج غروب ہو چکا ہے اور اب افق پر صرف شفق کی سرخی نظر آرہی ہے۔ دوسری قسم ﴿وَاللَّيْلُ وَمَا وَسَقَ ۝۱۶﴾ میں حالات کے مزید گھمبیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ دین پر عمل کے اعتبار سے دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا جائے گی، صرف مدہمی روشنی باقی رہے گی جو وقت آنے پر آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔ درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے چاند کی قسم: ﴿وَالْقَمَرُ إِذَا اتَّسَقَ ۝۱۷﴾ اسی مدہم اور تدریجاً بڑھتی ہوئی روشنی کا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کی چاندنی ایک حد تک رات کو روشن کر دیتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

**آیت ۱۹ ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹﴾** (اسی طرح) ”تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔“

یعنی جس طرح چاند درجہ بدرجہ بڑا ہو کر مرحلہ وار رات کو روشن کرتا ہے بالکل اسی طرح تم مرحلہ وار کوششوں سے غلبہ دین کی منزل تک پہنچو گے۔ واضح رہے کہ لَتَرْكَبُنَّ کے صیغے میں زور اور تاکید نہیں ہے کہ تم لوگ اس منزل تک ضرور پہنچو گے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ خبر محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے وَهُوَ الصَّادِقُ وَالْمُصَدِّقُ! آپ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ لہذا دنیا پر اسلام کا مکمل غلبہ ہو کر رہے گا۔ البتہ اسلام کے پہلے غلبے کی شان اور ترقی اور دوسرے غلبے کا انداز اور ہوگا۔ یہ فرق سورۃ المدثر کی آیت ۳۲ اور زیر مطالعہ سورت کی آیت ۱۸ پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صبح کے اُجالے کی طرح ہوا تھا: ﴿وَالصُّبْحُ إِذَا اسْفَرَّ ۝۱۸﴾ (المدثر)۔ اس اُجالے کی شان یہ تھی کہ ادھر آفتاب نبوت طلوع ہوا اور ادھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہو گیا۔ یعنی حضور ﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف تئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پوری طرح غالب آ گیا۔ ظاہر ہے سورج کے طلوع ہونے کے بعد روشنی ہونے میں زیادہ دیر تو نہیں لگتی۔

البتہ اسلام کے دوسرے غلبے کی روشنی چاند کی چاندنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔ یعنی اب اقامت دین اور خلافت علی منہاج النہدہ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی کوششوں اور کسی ایک نسل کے زمانے میں نہیں بلکہ نسل و نسل جدوجہد سے قائم ہوگا۔ جیسے عظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ ”جد اہودیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی“، یعنی مسلمان اس ضابطہ حیات کو ایک ”وحدت“ کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ”حزب اللہ“ اور مولانا مودودی نے ”جماعت اسلامی“ کے پلیٹ فارم سے اقامت دین کے لیے جدوجہد کی۔ اسی طرح آئندہ ادوار میں بھی اللہ کی توفیق سے اس کے بندے اس جدوجہد کا علم سنبھالے رہیں گے۔ مختلف تحریکیں اس مشن کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف انداز میں

کردار ادا کرتی رہیں گی اور بالآخر ان اجتماعی اور مرحلہ دار کوششوں کے نتیجے میں جب اللہ کو منظور ہوگا اسلام بطور دین پوری دنیا میں غالب ہو جائے گا۔

**آیت ۲۰ ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾** ”تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟“

**آیت ۲۱ ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْمَعُونَ﴾** ”اور جب انہیں قرآن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو یہ سجدہ نہیں کرتے؟“

**آیت ۲۲ ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيْسَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ﴾** ”بلکہ یہ کافر تو جھٹلارہے ہیں۔“

اس آیت کے الفاظ سے یہ اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کفر اور تکذیب باہم مترادفات نہیں بلکہ الگ الگ معنی کے حامل دو الفاظ ہیں۔ کفر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں۔ اس مفہوم میں کسی انسان کا ”کفر“ یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت سے متعلق جو گواہیاں رکھی ہیں، وہ جانتے بوجھتے ان گواہیوں کو چھپا دے اور لوگوں کے سامنے ان کا اقرار و اظہار نہ کرے۔ جبکہ تکذیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان آیات کو جھٹلانا ہے جو انسانی فطرت میں موجود گواہیوں کو اجاگر (activate) کرنے کے لیے اس کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لحاظ سے کفر اور تکذیب دو الگ الگ جرائم ہیں۔ بلکہ اس وضاحت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کفر کے مقابلے میں تکذیب بڑا جرم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جو چار شرطیں عطا کیا گیا تھا اس میں بھی ان دونوں جرائم کا ذکر الگ الگ ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو اس چاروں کی عبارت:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَن تَبَعَ هَذَا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَعْرَضُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝﴾

”ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ۔ تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی

ہدایت تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزان سے

دوچار ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے

اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“

ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم یعنی کفر کے بارے میں تو شاید کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ مثلاً یہ عذر کہ ماحول کے منفی اثرات کی وجہ سے کسی انسان کی روح یا فطرت پر غفلت یا جہالت کے پردے پڑ گئے تھے اور اس وجہ سے اس کی فطرت کے آئینے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پوری طرح سے منعکس نہ ہو سکی۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی صورت میں انسان کے سامنے باقاعدہ روشنی آگئی اور اس روشنی سے بھی اس کو وہی پیغام ملا جو ہمیں اس کی اپنی فطرت کی پکار تھی تو اس کا جانتے بوجھتے ان آیات کو جھٹلانا دینا یقیناً بہت بڑی دھنڈالی اور بہت بڑا جرم ہے جس نے خلاف کوئی عذر تو بل قبول نہیں ہو سکتا۔

**آیت ۲۳ ﴿وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ﴾** ”اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ (اپنے اندر) کیا

نہج رہے ہوئے ہیں۔“

عام طور پر اس آیت کے بارے میں یہی سمجھا گیا ہے کہ اس میں انسان کے مال و دولت جمع کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دراصل اس سے دلوں اور سینوں کی گندگی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان لوگوں کے سینے کفر، عداوت، بغض، حسد، تکبر وغیرہ کی غلاظتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ اللہ کی آیات کو پہچان لینے کے بعد بھی ان کی تکذیب کر رہے ہیں۔

**آیت ۲۴** ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ ”تو (اے نبی ﷺ) ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔“

**آیت ۲۵** ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ ”البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔“

مَنْ يَمُنْ مِّنَّا کے لغوی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کو کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی انتہا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ سے مراد ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔





# سُورَةُ الْبُرُوجِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ البروج اور اس کے بعد والی سورۃ الطارق کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو یمن میں ۵۲۳ عیسوی کے لگ بھگ حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً پچاس سال قبل پیش آیا۔ قدیم یمن میں بہت عرصہ تک عیسائی بادشاہ برسر اقتدار رہے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے آغاز کے زمانے میں وہاں 'ذونواس' نامی یہودی بادشاہ کی حکومت قائم ہو گئی جو عیسائیوں کا شدید مخالف تھا۔ یہودی اور عیسائی دراصل شروع ہی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ اصولی طور پر ان کے درمیان کبھی بھی صلح نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتی ہے جبکہ یہودی آپ کو مرتد جادوگر اور ولد الزنا قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں ان لوگوں کے باہمی اختلافات کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔

البتہ آج کل اس حوالے سے بہت غیر معمولی صورت حال دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آج پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی منہی میں ہے اور عیسائیوں کی مدد سے انہوں نے یہودی ریاست بھی قائم کر لی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ عیسائیوں کی معاشی اور جنگی طاقت کو جہاں اور جیسے چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ دراصل یہودی ذہانت اور محنت کا جادو ہے جو آج پوری دنیا کے سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ اس غیر معمولی صورت حال کی وجوہات اور ممکنہ نتائج کے بارے میں میری تقاریر کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید معلومات کے لیے ان تقاریر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے عیسائی دشمنی کے جنون میں یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر ان میں ایندھن بھرا اور پھر وسیع پیمانے پر آگ جلا کر یمن ہزار کے لگ بھگ بے گناہ عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔ اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

یہ سورۃ مبارکہ مکہ معظمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب کفار مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اس میں کفار کو ان کے ظلم و ستم کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے اور اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ ضرور لے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۚ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۚ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۖ قِيلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ۚ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۚ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۚ وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۚ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۚ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۚ إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۚ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۚ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۚ إِنَّكَ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۚ ذُو الْعَرْشِ الْعَظِيمُ ۚ فَقَالَ لِمَا يَرِيدُ ۚ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۚ فِرْعَوْنُ وَكُنُودٌ ۚ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۚ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۚ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۚ فِي نُوْحٍ مُتْقِنُوظٌ ۚ

**آیت ۱** ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۙ﴾ ”قسم ہے آسمان کی برجوں والا ہے۔“

برجوں سے مراد آسمان کے عظیم اشیان ستارے اور سیارے لیے گئے ہیں۔

**آیت ۲** ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۙ﴾ ”اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔“

یعنی قیامت کا دن جو آکر رہے گا۔

**آیت ۳** ﴿وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۖ﴾ ”اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور اس کی جس کے پاس حاضر

ہو جائے۔“

اس آیت کی بہت سی تعبیرات کی گئی ہیں جن میں سے ایک تعبیر یہ ہے کہ شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے جو شہر بہشتی بہشتی لوگوں کے پاس حاضر ہوتا ہے جبکہ مشہود عرفہ (۱۰ ذی الحجہ) کا دن ہے جس کے پاس لوگوں کو خود میدانِ عرفات میں جا کر حاضر ہونا پڑتا ہے۔

**آیت ۴** ﴿قِيلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ۙ﴾ ”ہلاک ہو گئے وہ کھانیوں والے۔“

”اصحاب الاخدود“ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدقین کھودیں اور اہل ایمان کو ان خندقوں میں ڈال کر جلایا۔ بظاہر تو وہاں اہل ایمان ہلاک ہوئے تھے لیکن وہ تو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے آخرت کی نعمتوں اور کامیابیوں کے مستحق ٹھہرے اور واقعی ہلاکت اور بربادی ان لوگوں کے حصے میں آئی جنہوں نے خدقین کھود کر اہل ایمان کو ان میں ڈال کر جلایا۔

**آیت ۵** ﴿النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۙ﴾ ”وہ آگ جو بڑی اندھن والی تھی۔“

یعنی وہ خوفناک آگ جسے بہت زیادہ ایندھن جمع کر کے بھڑکایا گیا تھا۔

**آیت ۶** ﴿إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۖ﴾ ”جبکہ وہ اس (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے۔“

**آیت ۷** ﴿وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۚ﴾ ”اور مؤمنین کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہے تھے خود اس کا نظارہ بھی کر رہے تھے۔“

ان صاحب اقتدار و اختیار لوگوں نے اہل ایمان کو زندہ جلانے کے احکام جاری کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان خندقوں کے کناروں پر انہوں نے باقاعدہ براجمان ہو کر اس دلدوز منظر کا نظارہ کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ اسی طرح پچھلی صدی میں ہٹلر نے بھی بہت ”پر تکلف“ منصوبہ بندی کے ساتھ یہودیوں کے قتل عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بڑے بڑے گیس چیمبرز نصب کیے اور انسانی لاشوں کو سائنٹیفک انداز میں ٹھکانے لگانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔

**آیت ۸** ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝﴾ ”اور وہ نہیں انتقام لے رہے تھے ان سے مگر اس لیے کہ وہ ایمان لے آئے تھے اللہ پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں خود دستودہ صفات ہے۔“

**آیت ۹** ﴿الَّذِي لَكَ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ﴾ ”جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔“  
﴿وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝﴾ ”اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔“

**آیت ۱۰** ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے ظلم و ستم توڑا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر پھر انہوں نے توبہ بھی نہیں کی“

اگر ان میں سے کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا تو اس کا یہ جرم معاف ہو سکتا ہے۔  
﴿فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝﴾ ”تو ان کے لیے ہوگا جہنم کا عذاب اور جلا ڈالنے والا عذاب۔“

**آیت ۱۱** ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ﴾ ”یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے،“

﴿لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ﴾ ”ان کے لیے وہ باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔“

﴿ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝﴾ ”یہ ہے اصل بڑی کامیابی۔“

**آیت ۱۲** ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝﴾ ”یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔“

اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے، وہ انسان کو ڈھیل بھی دیتا ہے اور اس کی رشتی دراز بھی کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر اگلی سورت میں آئے گا) لیکن جب وہ کسی فرد یا قوم کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت

ہوتی ہے۔

**آیت ۱۳** ﴿إِنَّهُ هُوَ يَبْدِئُ وَيُعِيدُ﴾ ”وہی ہے جو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی اعادہ بھی کرے گا۔“

جب اس نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے تو دوسری مرتبہ وہ اسے پیدا کرنے پر بھلا کیونکر قادر نہیں ہوگا؟

**آیت ۱۴** ﴿وَهُوَ الْعَفْوَُّرُ الْوَدُودُ﴾ ”اور وہ بخشنے والا بھی ہے، محبت کرنے والا بھی ہے۔“

**آیت ۱۵** ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ ”عرش کا مالک ہے بڑی شان والا ہے۔“

**آیت ۱۶** ﴿فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ ”وہ جو ارادہ کر لے کر گزرنے والا ہے۔“

ظاہر ہے اس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

**آیت ۱۷** ﴿هَلْ أَمِّلُكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ﴾ ”کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟“

**آیت ۱۸** ﴿فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ﴾ ”فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟“

**آیت ۱۹** ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ﴾ ”لیکن یہ کافر جو ہیں یہ جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔“

**آیت ۲۰** ﴿وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ﴾ ”جبکہ اللہ ان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔“

**آیت ۲۱** ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ ”بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا۔“

**آیت ۲۲** ﴿فِي لُوحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ ”لوح محفوظ میں (نقش ہے)۔“

یعنی اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے پاس لوح محفوظ میں ہے۔ جس مقام کا ذکر یہاں لوح محفوظ کے نام سے ہوا ہے، سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اسے اُمُّ الْكِتَابِ، سورۃ الواقعة کی آیت ۸ میں کِتَابٌ مَّكُونٌ اور سورہ عمس کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں اسے صُحُفٌ مُّكَرَّمَةٌ مَّرْفُوعَةٌ مُّطَهَّرَةٌ کہا گیا ہے۔



# سُورَةُ الطَّارِقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ إِنَّ كُلُّ نَفْسٍ لَّنَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝ فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ أَهْلُهُمْ رُويَّدًا ۝

ع

**آیت ۱** ﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝﴾ ”قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔“

**آیت ۲** ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝﴾ ”اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟“

**آیت ۳** ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝﴾ ”وہ ستارہ ہے چمکدار۔“

**آیت ۴** ﴿إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّنَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝﴾ ”کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔“

سورۃ الانفطار کی ان آیات میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَإِنَّا عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝

يَكْرُمُ أَكْتَابِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝﴾ ”جبکہ ہم نے تمہارے اوپر محافظ (فرشتے) مقرر کر رکھے ہیں۔ بڑے با عزت لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔“ انسان کے محافظ فرشتوں کا ذکر سورۃ الانعام کی اس آیت میں بھی ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۝﴾ (آیت ۶۱) ”اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے۔“ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ متعدد فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ اس کے اعمال کا ریکارڈ مرتب کرنے میں مصروف ہیں جبکہ کچھ کو اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

**آیت ۵** ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝﴾ ”تو انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔“

**آیت ۶** ﴿خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝﴾ ”وہ پیدا کیا گیا ہے اچھلتے ہوئے پانی سے۔“

**آیت ۷** ﴿يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝﴾ ”جو نکلتا ہے پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے۔“

مرد کے مادہ منویہ کا اصل منبع ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے۔ یہاں سے پیدا ہو کر یہ مادہ ان

خود دوں تک پہنچتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں۔

**آیت ۸** ﴿إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ﴾ ﴿۸﴾ ”یقیناً وہ اسے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔“

جس اللہ نے پانی کی ایک بوند سے انسان کی تخلیق کی ہے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اسے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اور یقیناً وہ اس کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

**آیت ۹** ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾ ﴿۹﴾ ”جس دن تمام چھپے ہوئے رازوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔“

**آیت ۱۰** ﴿فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ﴾ ﴿۱۰﴾ ”تو نہیں ہوگی کسی انسان کے لیے کوئی طاقت اور نہ ہوگا

اس کا کوئی مددگار۔“

**آیت ۱۱** ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ ﴿۱۱﴾ ”قسم ہے اس آسمان کی جو بارش برساتا ہے وقفے وقفے سے۔“

**آیت ۱۲** ﴿وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾ ﴿۱۲﴾ ”اور قسم ہے اس زمین کی جو پھوٹ پڑتی ہے۔“

آسمان سے بارش ہوتی ہے اور بارش کی وجہ سے نباتات زمین کو پھاڑتے ہوئے اُگ آتے ہیں۔ یعنی آسمان اور زمین اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

**آیت ۱۳** ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ﴾ ﴿۱۳﴾ ”یہ (قرآن) قولِ فصل ہے۔“

**آیت ۱۴** ﴿وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ ﴿۱۴﴾ ”اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔“

جیسے سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلَهُ﴾ (آیت ۱۰۵) ”اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔“

**آیت ۱۵** ﴿إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا﴾ ﴿۱۵﴾ وَآكِيدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ ”(اے نبی ﷺ) یہ لوگ اپنی سی چالیں

چل رہے ہیں اور میں بھی اپنی چال چل رہا ہوں۔“

**آیت ۱۷** ﴿فَمَهْلِ الْكَافِرِينَ أَهْمُ لَهُمْ دُونُكَ﴾ ﴿۱۷﴾ ”تو آپ ان کافروں کو ذرا مہلت دے دیجیے“

تھوڑی دیر انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے!“

ابتدائی کئی دور کی سورتوں میں حضور ﷺ کے لیے یہ ہدایت بہت بکرار کے ساتھ آئی ہے کہ آپ ان لوگوں

کے لیے جلدی نہ کریں ان کے بارے میں تھوڑی دیر انتظار کریں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعُرْمِ مِنَ الرُّسُلِ

وَلَا تَسْتَغِيحِلْ لَهُمْ﴾ (الاحقاف: ۳۵) ”تو (اے محمد ﷺ) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسول صبر کرتے

رہے ہیں اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!“ اس دور میں چونکہ مشرکین مکہ نے اہل ایمان پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا

تھا اس لیے ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کی وساطت سے اہل ایمان کو بھی بار بار تسلی دی جاتی تھی اور سمجھایا

جاتا تھا کہ ابھی ہم ان لوگوں کو کچھ مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ لوگ ان کی طرف سے پہنچنے والی

تکالیف پر صبر کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کا انتظار کریں۔



# سُورَةُ الْأَعْلَىٰ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ مل کر جوڑا بناتی ہیں۔ حضور ﷺ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی پہلی رکعت میں اکثر سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اس انتخاب کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں تذکیر کا خصوصی حکم ہے (سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۹ اور سورۃ الغاشیہ آیت ۲۱) جبکہ ان دونوں نمازوں میں بھی تذکیر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں مواقع پر خطبات کا اہتمام خصوصی طور پر تذکیر کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۚ الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ ۚ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۚ وَالَّذِي أَوْحَرَ  
الْعُرْىَ ۚ فَجَعَلَهُ عَظَاءً آخُوًى ۖ سَتَقْبِرَنَّكَ لَا تَكْسَىٰ ۚ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ  
وَمَا يَخْفَىٰ ۖ وَنُذِيرَ الْبَاسِ ۚ فَذَكِّرْ ۚ إِن تَفْعَلِ الدِّكْرَىٰ ۖ سَيَذَكِّرْكَ مَنْ يُخْفَىٰ ۖ  
وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۚ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۖ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۖ قَدْ أَفْلَحَ  
مَنْ تَزَكَّىٰ ۖ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۖ بَلْ تُؤْوِيُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأُنْفَىٰ ۖ  
إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۖ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۖ

پ

**آیت ۱** ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ﴾ ”پاکی بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت بلند و بالا ہے۔“  
یہ علم یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ”اپنے رب کی پاکی بیان کرو“ لیکن یہاں خصوصی طور پر اسم (نام) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور سے وراء الوراء، ثم وراء الوراء ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی تعلق صرف اور صرف اس کے ناموں کے حوالے سے ہے۔ اسی لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ”اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے۔“ چنانچہ ہم انسان اگر اللہ کا ذکر کرنا چاہیں یا اس کی تسبیح و تحمید کرنا چاہیں تو ظاہر ہے اس کے اسماء کے حوالے سے ہی کر سکتے ہیں۔

**آیت ۲** ﴿الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ ۖ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ﴾ ”جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا“ پھر

تناسب قائم کیا۔ اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا، پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔“  
 ان چار الفاظ (خَلَقَ، فَسَّوَى، قَدَّرَ، فَهَدَى) میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان بھی ہے اور تخلیقی عمل کے مختلف مراحل کا ذکر بھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کے حوالے سے تین اسمائے حسنی (الْمَخْلِقُ، الْبَارِئُ، الْمُصَوِّرُ) کا ایک ساتھ ذکر قبل ازیں سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی آچکا ہے۔ سورۃ الحشر کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفات ایک خاص منطقی ترتیب سے بیان ہوئی ہیں۔ یہ ترتیب دراصل تخلیقی عمل کے مرحلہ وار ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے کسی چیز کا نقشہ یا نمونہ بناتا ہے اس لحاظ سے وہ الْخَالِقُ ہے۔ پھر وہ مطلوبہ چیز کو طے شدہ نمونے کے مطابق عدم سے عالم وجود میں ظاہر فرماتا ہے اس اعتبار سے وہ الْبَارِئُ ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ اس تخلیق کو ظاہری صورت یا شکل عطا فرماتا ہے اس مفہوم میں وہ الْمُصَوِّرُ ہے۔  
 سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت میں تخلیقی عمل کے جن تین مراحل کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق چیزوں کے ظاہری یا مادی وجود سے ہے، جبکہ زیر مطالعہ آیات میں مادی وجود کی تخلیق کے ساتھ ساتھ چیزوں کے باطنی خصائص کی تخلیق کا ذکر بھی ہے۔ (خَلَقَ، فَسَّوَى کے الفاظ میں چیزوں کے مادی وجود کی تخلیق کے مراحل کا بیان ہے جبکہ قَدَّرَ، فَهَدَى کے الفاظ کسی تخلیق کے باطنی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔)

اب ہم ان الفاظ کے معانی و مفہوم کو انسانی ماحول کی مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مراحل (تخلیق اور تسویہ) کو ایک عمارت کی مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کر دینا اس کی ”تخلیق“ ہے، جبکہ اس کو سجانا، سنوارنا (finishing) وغیرہ اس کا ”تسویہ“ ہے۔ تخلیق کا تیسرا مرحلہ جس کا یہاں ذکر ہوا ہے وہ ”قدر“ ہے۔ قدر کے لغوی معنی اندازہ مقرر کرنے کے ہیں جسے عرف عام میں ہمارے ہاں تقدیر کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں کسی تخلیق کے معیار اس کی صلاحیت، استعداد اور حدود (limitations) سمیت جملہ خصوصیات کو اس کی قدر یا تقدیر کہا جائے گا۔ مثلاً انسان اشرف المخلوقات تو ہے لیکن وہ ہوا میں اڑنے سے معذور ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی چیز یا آسانی سے ہوا میں اڑتی پھرتی ہے۔ تو گویا ہوا میں اڑنے کی یہ صلاحیت رکھنا چیز یا تقدیر کا خاصہ ہے اور اس اعتبار سے معذور ہونا انسان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے اگلے مرحلے کے طور پر یہاں ”ہدایت“ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد وہ فطری اور جبلی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدا کنشی طور پر عطا کر رکھی ہے۔ اسی ”ہدایت“ کی روشنی میں بکری کو معلوم ہوا ہے کہ اسے گھاس کھانا ہے اور شیر جانتا ہے کہ اس کی غذا گوشت ہے۔ غرض ہر جاندار اپنی زندگی اسی طریقے اور اسی لائحہ عمل کے مطابق گزار رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

تخلیق کے ان چار مراحل کے حوالے سے اگر ہم انسانی زندگی کا جائزہ لیں تو پہلے دو مراحل یعنی تخلیق اور تسویہ کے اعتبار سے تو انسان میں اور اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگلے دو مراحل (تقدیر اور ہدایت) کے حوالے سے انسان کا معاملہ دوسری مخلوقات سے الگ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کی قدر صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ کے ہاں دو طرح سے طے پاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یا ایک حصہ تو وہ ہے جو اسے پیدا کنشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں عطا ہوا (given) ہے اور دوسرا پہلو یا دوسرا حصہ اس کے ماحول کا





کے حکم اور اذن کے بغیر کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے حافظہ سے کوئی چیز محو کرنا چاہے تو وہ لاکھ اسے یاد کرتا رہے یا نہیں رکھ سکے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن مجید کی کوئی آیت حضور ﷺ بھول بھی گئے تھے۔ اس لحاظ سے اس جملے کی مثال سورۃ الزخرف کی اس آیت جیسی ہے: ﴿قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَبْدِينَ ۝۸﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ اگر رحمن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوتا۔“ ظاہر ہے یہ کلام پر زور دینے کا ایک انداز ہے اور اس کا مقصد انتہائی پُر زور انداز میں یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز ہرگز کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔

﴿إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ۝۹﴾ ”یقیناً وہ جانتا ہے اونچی آواز میں کبھی گئی بات کو بھی اور جو مخفی رکھی جائے اسے بھی۔“

**آیت ۸** ﴿وَكَيْتَرُكَ لِلْيُسْرَى ۝۸﴾ ”اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسانی تک۔“  
تیسرے یسر سے باب تفعیل ہے۔ اس باب میں تدریج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! ہم مشکلات میں سے رفتہ رفتہ آپ کے لیے راستہ بناتے چلے جائیں گے اور اس آسان راستے پر آپ کو تدریجاً ایک بڑی آسانی کی طرف لے جائیں گے۔ اس سے مراد اس دنیا میں غلبہ دین کی جدوجہد کی کامیابی اور آخرت میں جنت اور اس کی آسائش ہیں۔ ہم چاہیں تو آن واحد میں آپ کے تمام دشمنوں کو آپ کے سامنے سرنگوں کر دیں اور تمام جن و انس کو ایمان کی توفیق بخش دیں، لیکن ہماری حکمت اور مشیت میں اس معاملے کی ایک تدریج ہے۔ چنانچہ ہم آپ کی جدوجہد کو مرحلہ وار اور رفتہ رفتہ کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔ اس فلسفے کی مزید وضاحت آگے چل کر سورۃ الشمس میں آئے گی۔

**آیت ۹** ﴿فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَى ۝۹﴾ ”تو آپ یاد دہانی کراتے رہیے، اگر یاد دہانی فائدہ دے۔“  
اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ انداز تدریک کا فریضہ بھی سرانجام دیں جب مخاطب کو اس سے کچھ فائدہ ہو رہا ہو یعنی وہ اس تذکیر کا اثر قبول کر رہا ہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس حوالے سے وضاحت کر دی گئی ہے۔

**آیت ۱۰** ﴿سَيَذَكِّرْهُ مَنْ يَخْشَى ۝۱۰﴾ ”وہ نصیحت حاصل کر لے گا جو ڈرتا ہے۔“  
آپ لوگوں کو تدریک و نصیحت کرتے جائیے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو گا وہ اس کا اثر ضرور قبول کرے گا اور اسے فائدہ بھی ہو گا۔ چنانچہ اے نبی ﷺ! جب بھی آپ پر کوئی نئی وحی آئے تو آپ وہ نیا کلام پڑھ کر لوگوں کو ضرور سنائیں۔ آپ کے اہل ایمان ساتھیوں کے علم اور ایمان میں اس سے ضرور اضافہ ہو گا۔

**آیت ۱۱** ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْأُشْقَى ۝۱۱﴾ ”البتہ جو شقی (بد بخت) ہے وہ اس سے پہلو تہی کرے گا۔“

**آیت ۱۲** ﴿الَّذِي يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۝۱۲﴾ ”جو (آخر کار) داخل ہو گا بڑی آگ میں۔“

**آیت ۱۳** ﴿ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۝۱۳﴾ ”پھر نہ اس میں وہ مرے گا نہ زندہ رہے گا۔“

جہنم کی یہی خصوصیت سورۃ المدثر میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿لَا تَبْقَىٰ وَلَا تَذَرُ ۝۸﴾ ”وہ انسان کو نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ ہی اسے چھوڑے گی۔“

**آیت ۱۴** ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ (۱۴) ”یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا۔“

ان آیات میں بہت اہم اور بنیادی نوعیت کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ اگلی سورتوں میں مختلف مقامات پر ان مضامین کی مزید وضاحت آئے گی۔ تَزَكَّى سے مراد یہاں روح کی پاکیزگی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی روح بہت بلند اور اعلیٰ چیز ہے۔ سورۃ التین کی اس آیت میں دراصل انسان کی روح کی تخلیق ہی کا ذکر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (۱) کہ ہم نے انسان کو بہت عمدہ تخلیق پر بنایا ہے۔ لیکن جب اس روح کو جسد حیوانی میں تید کر کے دنیا میں بھیجا گیا تو وقتی طور پر روح اپنے اعلیٰ مقام سے گر کر پستی میں چلی گئی، جس کا ذکر سورۃ التین کی اگلی آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ (۲) کہ پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ چنانچہ انسان کی دنیوی زندگی کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود کو پستی سے نکال کر دوبارہ بلندی کی طرف لے جائے۔ اگر تو اس نے یہ ہدف حاصل کر لیا تو وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ اس کامیابی کے لیے اسے ایک طرف جسد حیوانی کے داعیات یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو دبانا ہوگا اور دوسری طرف اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا فراہم کرنے کا سامان کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے حیوانی داعیات کمزور ہوں گے تو تبھی روح کو تقویت ملے گی۔ ماہ رمضان کے چوبیس گھنٹے کے معمولات کے ذریعے سے اہل ایمان کو دراصل اسی ”دو طرفہ“ پروگرام کی مشق کرائی جاتی ہے کہ دن کو روزہ رکھ کر حیوانی جسم اور اس کے داعیات کو کمزور کر دو اور رات کو قیام اللیل کے دوران انوارِ قرآن کی بارش سے اپنی روح کو سیراب کرو تا کہ تمہاری روح کو ترفع اور اللہ کا قرب حاصل ہو سکے۔ یہ ہے تَزَكَّى کا اصل مفہوم اور اس کا بنیادی فلسفہ۔

**آیت ۱۵** ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ (۱۵) ”اور اُس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔“

اس آیت کے الفاظ کی عملی تصویر جمعہ کا اجتماع ہے۔ اجتماع جمعہ میں بھی پہلے خطبہ کی صورت میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے پھر نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں اجتماع جمعہ کے حوالے سے حضور ﷺ کا یہ معمول نقل ہوا ہے:

((كَانَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ حُطْبَتَانِ كَانَ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَذْكُرُ النَّاسَ)) (۱)

”اللہ کے رسول ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے ان کے دوران آپ بیٹھا کرتے تھے۔ آپ قرآن مجید پڑھ کر سناٹے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے۔“

حضور ﷺ کے دونوں خطبات بہت مختصر ہوتے تھے۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ ان کے درمیان حضور ﷺ کا تھکان کی وجہ سے تو نہیں بیٹھتے تھے۔ میری رائے اس حوالے سے یہ ہے کہ یہ دو خطبات نماز ظہر کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہیں۔ (نماز ظہر میں فرضوں کی چار رکعتیں ہیں جبکہ نماز جمعہ میں دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں) چنانچہ اس دوران حضور ﷺ کا بیٹھنا دراصل اپنے خطاب کو باقاعدہ دو خطبوں کی شکل دینے کے لیے ہوتا تھا۔ ان

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الحسنة، و سنن ابی داؤد:

کتاب الصلاة، باب الخطبة قائماً، ج: ۱۰، ۹۴۔ راوی: حابر بن سمرہ رحمہ اللہ۔

خطبات میں جیسا کہ حدیث میں ذکر ہوا ہے، حضور ﷺ آیات قرآنی کے ذریعے تذکیر فرماتے تھے۔ آپ کے تمام سامعین چونکہ قرآن کی زبان کو بخوبی سمجھتے تھے اس لیے ’از دل خیزد بردل ریزد‘ کے مصداق قرآن مجید کا مفہوم بغیر کسی وضاحت اور تشریح کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں چونکہ عام سامعین عربی خطبہ کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے ان کی تذکیر کے لیے خطبہ سے پہلے ’’خطاب‘‘ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اجتماع جمعہ کے موقع پر ذکر و تذکیر کی اسلام میں کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے ہوتا ہے۔ اجتماع جمعہ میں بروقت حاضری کو یقینی بنانے کی ترغیب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ كَانَ عَلَى كُلِّ بَابٍ مِنَ أَبْوَابِ الْمَسْجِدِ الْمَلَائِكَةُ، يَكْتُبُونَ الْأَوَّلَ فَأَلَّوْلَ، فَإِذَا جَلَسَ الْإِمَامُ طَرَوْا الصُّحُفَ، وَجَاوَرُوا يَسْتَمِعُونَ الذِّكْرَ))<sup>(۱)</sup>

’’جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے دروازوں میں سے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ پہلے آنے والوں کو پہلے لکھتے ہیں۔ پھر جب امام (منبر پر) بیٹھ جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر سمیٹ لیتے ہیں اور ذکر سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔‘‘

حضور ﷺ کے دوسرے فرمان میں جمعہ کے لیے جلدی مسجد آنے والوں کے لیے درجہ بدرجہ فضیلت کی وضاحت بھی ملتی ہے:

((مَنْ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَانَ نَافِلًا قَرَبَ بَدَنَةٍ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَانَ قَرَبَ بَقَرَةٍ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَانَ قَرَبَ كَبْشٍ أَوْ قَرْنٍ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَانَ قَرَبَ دَجَاجَةٍ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَانَ قَرَبَ بَيْضَةٍ فَإِذَا حَرَجَ الْإِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلَائِكَةُ يَسْتَمِعُونَ الذِّكْرَ))<sup>(۲)</sup>

’’جو آدمی جمعہ کے دن غسل جنابت (کی طرح) اہتمام کے ساتھ غسل کرے پھر وہ صبح مسجد میں جائے تو وہ اس طرح ہے گویا اس نے ایک اونٹ قربان کیا اور جو آدمی دوسری ساعت میں جائے تو گویا اس نے ایک گائے قربان کی اور جو آدمی تیسری ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک سینکڑوں والا مینڈھا قربان کیا اور جو چوتھی ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک مرغی قربان کی اور جو پانچویں ساعت میں گیا تو گویا اس نے ایک اندا قربان کر کے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ پھر جب امام (خطبہ کے لیے) نکلے تو فرشتے بھی (اندراج کا سلسلہ ختم کر کے) ذکر سننے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔‘‘

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لفظ ’’ساعت‘‘ کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی رائے اس ضمن میں یہ ہے (ذاتی طور پر مجھے اس رائے سے اختلاف ہے) کہ اس لفظ کا تعلق وقت کی ظاہری تقسیم سے نہیں بلکہ ان ’’ساعتوں‘‘ سے مخفی ساعتیں مراد ہیں۔ البتہ اس حدیث میں جس خطبہ کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد

(۱) صحیح لبخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة، ج: ۳، ۲۱۱۔ وصحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب

فضل النهي يوم الجمعة، ج: ۵، ۸۵۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب الغلب والسواك يوم الجمعة، وسنن ابی داؤد، کتاب الطهارة، باب

في الغسل يوم الجمعة۔

مسنون خطبہ ہے۔ اس حکم کا اطلاق ہمارے ائمہ اور خطباء کی مقامی زبانوں میں کی جانے والی تقاریر پر نہیں ہوتا۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد حاضری کا اندراج نہ ہونے کے حوالے سے شاہ ولی اللہؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والے جمعہ کی فضیلت سے محروم رہیں گے البتہ ان کے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص خطبہ کے دوران بھی شامل ہوگا تو فرض کی ادائیگی کی حد تک اس کی حاضری بھی قبول کبھی جائے گی۔

**آیت ۱۶ ﴿بَلْ تَقُولُوا لِنَبِيِّنَا﴾** ﴿۱۶﴾ ”بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔“

دراصل انسان کی آخری کامیابی یا ناکامی کا تمام تراخضار اس کی ترجیحات پر ہے۔ اگر تو وہ اپنے معاملات کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھتا ہے اور دنیوی مفادات کے حوالے سے قناعت پسندی کی حکمت عملی پر کاربند رہتا ہے تو وہ کامیاب ہے اور اگر اس کا معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا راستہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ اس آیت میں اس حوالے سے ہم جیسے دنیا دار مسلمانوں کے اصل مرض کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ ہم دنیوی زندگی کے مفادات کو آخرت کے معاملات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا نفع اور نقصان ہمیں نقد نظر آتا ہے جبکہ آخرت کی راحت اور تکلیف ہمیں سامنے نظر نہیں آتی۔ اس لیے دنیا کا معمولی سا مفاد ہم آخرت کے بہت بڑے عذاب کے بدلے میں بھی حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ جو لوگ ظلم و زیادتی سے یتیموں کا مال ہزپ کر جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھڑ رہے ہیں۔ لیکن آج دنیا میں جو کوئی ایسا مال کھاتا ہے اسے ایسا کرتے ہوئے تو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ آگ کے انگارے پیٹ میں بھڑ رہا ہے اس لیے جب وہ ایسے مال کو اپنی پہنچ میں دیکھتا ہے تو اسے غصہ کرنے سے باز نہیں رہتا۔ انسان کی اس طبعی اور جبلتی کمزوری یا خامی کا ذکر سورۃ القیامہ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿۲۱﴾﴾ ”ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔“

**آیت ۱۷ ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾** ﴿۱۷﴾ ”جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔“

**آیت ۱۸ ﴿إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ﴾** ﴿۱۸﴾ ”یقیناً یہی بات اگلے صحیفوں میں بھی۔“

یعنی تذکیر اور ہدایت کا اصل جوہر اور خلاصہ یہی ہے کہ انسان آخرت کو دنیا پر ترجیح دے کیونکہ دنیا فانی اور وقتی ہے جبکہ آخرت اس سے کہیں بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ہدایت کے حوالے سے یہ بنیادی نکتہ پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی مذکور تھا۔

**آیت ۱۹ ﴿صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ﴾** ﴿۱۹﴾ ”(یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف تو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا آج بظاہر کہیں نشان نہیں ملتا۔ اس حوالے سے میری رائے یہ ہے اور میں اپنی اس رائے کا اظہار قبل ازیں بھی متعدد بار کر چکا ہوں کہ ہندوؤں کے اپنشد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف ہی کی بگولی ہوئی شکلیں ہیں۔



# سُورَةُ الْغَاشِيَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۖ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۖ عَامِلَةٌ تَأْسِبَةٌ ۖ تَصْلَى نَارًا  
حَامِيَةً ۖ تُنْفَى مِنْ عَيْنٍ أُنِيَّةٍ ۖ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ۖ لَا يَسْنُونُ وَلَا يُعْنَى  
مِنْ جُوعٍ ۖ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ تَأْعِمَةٌ ۖ لَسَعِيهَا رَاضِيَةٌ ۖ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۖ لَا تَسْمَعُ فِيهَا  
لَاغِيَةً ۖ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۖ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ۖ وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ۖ وَنَهَايُ  
مَصْفُوفَةٌ ۖ وَزُرُرٌ مَبْثُوثَةٌ ۖ أَفْلا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۖ وَإِلَى السَّمَاءِ  
كَيْفَ رُفِعَتْ ۖ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۖ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۖ فَذَكِّرْ ۚ إِنَّمَا  
أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُضَيِّطٍ ۚ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۚ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ  
الْأَكْبَرَ ۚ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابُهُمْ ۚ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۚ

**آیت ۱** ﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ ”کیا پہنچ چکی ہے آپ کے پاس اس ڈھانپ لینے والی (آفت) کی خبر؟“

یعنی قیامت کی خبر جو پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

**آیت ۲** ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ ”بہت سے چہرے اُس دن ذلیل ہوں گے۔“

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ القیامہ اور سورۃ یس میں بھی آچکا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس صورت حال کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۖ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۖ﴾ ۳۲ ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۖ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۖ﴾ ۳۳ ”کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے اور کچھ چہرے اُس دن افسردہ ہوں گے۔ خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے۔“ جبکہ سورۃ یس میں یہی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۖ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۖ﴾ ۳۴ ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ غَاسِقَةٌ ۖ تَرَهَقَهَا فَتْرَةٌ ۖ﴾ ۳۵ ”اس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے۔ مسکراتے ہوئے خوش و غرم۔ اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔“

**آیت ۳** ﴿عَامِلَةٌ تَأْسِبَةٌ﴾ ”مشقت زدہ تھکے ماندے۔“

**آیت ۴** ﴿تَصَلَّىٰ نَارًا حَامِيَةً﴾ ”وہ داخل ہوں گے دہکتی ہوئی آگ میں۔“

**آیت ۵** ﴿تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ اَنِيبَةٍ﴾ ”انہیں پلایا جائے گا پانی ایک کھولتے ہوئے چشمے سے۔“

**آیت ۶** ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ صَرِيحٍ﴾ ”نہیں ہوگا ان کے لیے کھانے کو کچھ بھی سوائے

خاردار جھارڑیوں کے۔“

**آیت ۷** ﴿لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾ ”جو نہ تو موٹا کرے اور نہ ہی بھوک مٹائے۔“

اسے کھانے سے نہ تو انہیں کوئی تقویت ملے گی اور نہ ہی بھوک کا احساس ختم ہوگا۔ کسی بھی غذا کے یہی دو فائدے ہوتے ہیں، لیکن اہل جہنم کو اس کھانے سے ان میں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اب اگلی آیات میں نیک لوگوں کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے:

**آیت ۸** ﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ ”بہت سے چہرے اُس روز تر و تازہ ہوں گے۔“

ان کے چہرے ناز و نعمت میں پلے بڑھے لوگوں کے چہروں کی طرح بار و نفع ہوں گے۔

**آیت ۹** ﴿لَسَعِيهَا رَاضِيَةٌ﴾ ”وہ اپنی کوشش (کے نتائج) پر راضی ہوں گے۔“

وہ لوگ اپنی دنیوی زندگیوں میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے رہے تھے اور آخرت کی کامیابی کے لیے مسلسل کوشاں بھی تھے۔ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی کوششیں اور محنتیں قبول فرمائے گا۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾ ”اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو اور اس کے لیے اس کے شایان شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔“

**آیت ۱۰** ﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ ”(وہ ہوں گے) عالی مقام جنت میں۔“

**آیت ۱۱** ﴿لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً﴾ ”وہ اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔“

وہاں انہیں کوئی ایسی فضول یا غلط بات سنائی نہیں دے گی جس سے انہیں کو فتنہ ہو۔

**آیت ۱۲** ﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ ”اس میں ایک چشمہ ہے بہتا ہوا۔“

**آیت ۱۳** ﴿فِيهَا سُرُورٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ ”اس میں اونچے اونچے انچے تخت ہیں۔“

**آیت ۱۴** ﴿وَاَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ﴾ ”اور جام قرینے سے رکھے ہوئے۔“

**آیت ۱۵** ﴿وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ﴾ ”اور قالین بچھے ہوئے صف در صف۔“

**آیت ۱۶** ﴿وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ﴾ ”اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے۔“

اگلی چار آیات قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہیں جو بقول علامہ اقبال شعوری مشاہدے پر زور دیتی ہیں کہ چیزوں کو دیکھو، ان پر غور کرو اور اپنی عقل اور منطق کے مطابق ان سے نتائج اخذ کرو۔ ظاہر ہے عقل، شعور اور حواس کی صلاحیتیں انسان کو اسی لیے دی گئی ہیں کہ اپنی زندگی میں وہ ان سے کام لے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ





”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلُوكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۳۷﴾“

”یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ان کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اُس پانی میں کہ جو ابتداء سے آسمان سے اتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو معلق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔“ اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

برگ درختان سبز در نظر بوشیار ہر ورقش دفترے است معرفت کردگار!

کہ ایک صاحب شعور انسان کے لیے سبز درختوں کا ایک ایک پتہ گویا معرفت خداوندی کا دفتر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے تو اپنے زمانے میں یہ بات اپنی خدا داد بصیرت کی بنا پر کہی تھی لیکن آج سائنسی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سبز درختوں کا ایک ایک پتہ دراصل photosynthesis کی فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹریاں سارا دن آکسیجن بنانے اور سورج کی روشنی کو جذب کر کے درختوں کی لکڑی کی طرف منتقل کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ صفحات ایسی مثالوں کی تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے انسان کے سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کو محض حیوانی آنکھ سے نہیں بلکہ عقل اور شعور کی نظر سے دیکھے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے ”زبورِ نجم“ میں کیا پتے کی بات کہی ہے:

دم چیست؟ پیام است شنیدی نشیدی! در خاک تو یک جلوة عام است ندیدی!

دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز!

کہ اے ناظر انسان! تمہارا ہر سانس اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے۔ کیا تم نے اس پیغام کو کبھی سنا؟ نہیں سنا! اور تمہاری اس خاک (حیوانی جسم) کے اندر ایک جلوة ربانی (نورانی روح) بھی پوشیدہ ہے، لیکن تم نے اس جلوے کو کبھی دیکھنے کی رحمت ہی گوارا نہیں کی۔ چنانچہ تمہیں چاہیے کہ تم اس کائنات کی چیزوں کو حیوانی آنکھوں سے دیکھنا اور حیوانی کانوں سے سننا چھوڑو اور انسانوں کا سادہ دیکھنا اور سننا سیکھو۔ تم اشرف المخلوقات ہو تمہیں اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور سمیت بہت سی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا رکھا ہے ان صلاحیتوں کو استعمال میں لاؤ۔ مظاہر فطرت اور دوسری چیزوں کو دیکھو اور ان پر غور کرو: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (البقرة: ۲۹) یہ زمین پر جو کچھ ہے سب اللہ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں پر تحقیق کرو، نئے نئے قوانین فطرت کو تلاش کرو، انہیں کام لاؤ۔ تمہیں زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی ہے۔ اس حیثیت سے خود زمین اس پر موجود تمام چیزیں یہ ہوائیں یہ فضا میں ستارے سیارے، کھکشائیں سب تمہارے لیے مسخر ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم عقل و شعور سے کام لو گے تو ان پر حکومت کرو گے، لیکن اگر تم توہمات میں پڑ جاؤ گے تو ان چیزوں کے غلام بن جاؤ گے۔

**آیت ۲۱** ﴿فَلَذِكْرِكَ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾ (تو (اے نبی ﷺ!) آپ یاد دہانی کراتے رہیے) آپ تو بس یاد دہانی کراتے والے ہیں۔“

**آیت ۲۲** ﴿لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُضَيِّطٍ﴾ (آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔“  
آپ کی ذمہ داری صرف تذکیر اور نصیحت تک ہے کسی کو زبردستی راہ ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے۔

**آیت ۲۳** ﴿إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ﴾ (مگر جس نے منہ موڑا اور کفر کیا۔“

**آیت ۲۴** ﴿فَعَذَابُ اللَّهِ الْعَذَابُ الْأَكْبَرُ﴾ (تو اس کو اللہ عذاب دے گا سب سے بڑا عذاب۔“

بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا کلام اور پیغام اپنی بے داغ اور مثالی سیرت کی گواہی کے ساتھ اُمت تک اس انداز میں پہنچا دیا ہے کہ حق کو سمجھنے کے بارے میں کہیں کوئی ابہام نہیں رہا۔ اب اس کے بعد بھی جو شخص حق سے منہ موڑے گا تو وہ گویا حق کو حق سمجھتے ہوئے اسے ٹھکرائے گا اور اس سے یہی ثابت ہوگا کہ اس کے اندر بھلائی اور خیر کی کوئی رُمق موجود ہی نہیں۔ چنانچہ ایسا ہر شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید ترین عذاب کا مستحق ہے۔

**آیت ۲۵** ﴿إِنَّ إِلَيْنَا أِيَابَهُمْ﴾ (اے نبی ﷺ!) ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔“

**آیت ۲۶** ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (پھر ان کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔“

آپ تذکیر اور یاد دہانی کے حوالے سے اپنا فرض ادا کرتے جائیے۔ ان کی جوابدہی اور حساب کا معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ یہ وہی انداز اور اسلوب ہے جو اس گروپ کی سورتوں میں قبل ازیں بھی کئی بار آچکا ہے۔ اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں مشرکین کو مہلت دینے کا ذکر بہت خصوصیت کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ المزمل میں فرمایا گیا: ﴿وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولَى النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا﴾ (آپ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دیں جو بڑی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں اور ابھی آپ انہیں کچھ مہلت دیں۔“ اسی طرح سورۃ الطارق کی آخری آیت میں بھی یہ مضمون خصوصی اسلوب کے ساتھ آیا ہے۔ اس آیت میں اس مفہوم کے دو صیغے (مَهِّلْ - اَمْهِّلْ) باب تفعیل اور باب افعال سے آئے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ ”ان سب کو لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے۔ پھر ان کا حساب ہمارے ذمہ ہے!“

اَللّٰهُمَّ حَاسِبُنَا حِسَابًا يَّسِيرًا - آمین یا رب العالمین!



# سُورَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حُجْرٍ ۝  
 أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرْمَ دَاثِ الْعِبَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِنْهَا فِي الْبِلَادِ ۝  
 وَهُمْ ذُو الْأَرْحَامِ بَالِغًا فِي الْأَقْصَادِ ۝ الَّذِينَ طَعَوْا فِي الْبِلَادِ ۝  
 فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفُسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَبَالِهْ صَادٍ ۝ فَأَمَّا  
 الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ  
 فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَا تَنْكُرُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحْضُونَ عَلَى  
 طَعَامِ الْيَتِيمِ ۝ وَتَاْكُلُونَ الثَّرَاكِلَ الْيَتَامَى ۝ وَتُحِبُّونَ الْبَالِغَ جُنَا جُنَا ۝ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ  
 الْأَرْضُ دَكَّادًا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْهَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۝ يَوْمَئِذٍ  
 يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ ۝ وَأَنْتَ لَهُ الذِّكْرَى ۝ يَقُولُ لِيَكُنْ بِي قَدَمْتُ لِيَاكُنْ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ  
 عَذَابَ أَحَدٍ ۝ وَلَا يُؤْتِي وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝ يَأْتِيهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ أَرْجَعِي إِلَىٰ رَبِّكَ  
 رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّاتِي ۝

ج

**آیت ۱ ﴿وَالْفَجْرِ﴾** ”قسم ہے فجر کی۔“

سورۃ الفجر کی ابتدائی آیات قسموں کے حوالے سے مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ بہر حال اس پہلی آیت کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس سے ۱۰ اذی الحجۃ کی فجر مراد ہے جس کے بعد قربانی ہوتی ہے اور یہ دن مناسک حج کے حوالے سے بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

**آیت ۲ ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾** ”اور قسم ہے دس راتوں کی۔“

پہلی قسم کی مناسبت سے اکثر مفسرین نے ان راتوں سے ۱۰ اذی الحجۃ کی فجر سے پہلے کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ ظاہر ہے ۱۰ اذی الحجۃ کی فجر سے پہلے ۱۰ اذی الحجۃ کی رات گزر چکی ہوتی ہے اس لیے وہ رات بھی ان میں شامل ہے۔

**آیت ۳ ﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾** ”اور قسم ہے بخت کی اور طاق کی۔“

اس سے عموماً رمضان کے آخری عشرہ کی جفت اور طاق راتیں مراد لی جاتی ہیں اور طاق راتوں میں لیلة القدر ہے۔ البتہ دنیا کے تمام علاقوں میں چاند چونکہ ایک ساتھ نظر نہیں آتا اس لیے مختلف علاقوں کی طاق اور جفت راتوں میں فرق ہوگا۔ مثلاً ہو سکتا ہے ہمارے ہاں پاکستان میں جورات طاق ہو سعودی عرب میں وہ جفت ہو۔

**آیت ۴ ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَأْسِرُ ۝﴾** ”اور قسم ہے رات کی جب وہ گزرنے لگے۔“

**آیت ۵ ﴿هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝﴾** ”کیا اس میں کوئی قسم (دلیل) ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل مند ہیں؟“

یعنی ان تمام چیزوں کو اگلی آیات کے مضمون پر گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

**آیت ۶ ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝﴾** ”کیا تم نے دیکھا نہیں کیا کیا تھا آپ کے رب نے عاد کے ساتھ؟“

**آیت ۷ ﴿اِذْ ذٰبَ الْعِمَادُ ۝﴾** ”وہ ارم جو ستونوں والے تھے۔“

”ارم“ کے بارے میں عام مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ قوم عاد کے شاہی خاندان کا لقب تھا۔ یعنی جس طرح مصر میں فرعون، عراق میں نمرود اور یمن میں تباہیہ خاندانوں کی حکومتیں تھیں، اسی طرح قوم عاد کے علاقے میں ارم خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ یہاں ان کے حوالے سے ستونوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی تعمیرات میں ستونوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور دنیا میں ستونوں پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہی نے شروع کیا تھا۔ جیسے اس قوم کے ایک شہر کے جوزیزمین آثار دریافت ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس شہر کی فصیل پر تین ستون یا مینار بنائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر شداد نے خصوصی اہتمام کے ساتھ بسایا تھا جو اس قوم کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔

**آیت ۸ ﴿الَّتِيْ لَّمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝﴾** ”جن کے مانند نہیں پیدا کیے گئے (دنیا کے) ملکوں میں۔“

یعنی قد و قامت اور جسمانی قوت کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی غائبی پیدا نہ ہوا۔ ان الفاظ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس قوم نے جس معیار اور جس انداز کی تعمیرات کی تھیں ایسی تعمیرات ان سے پہلے دنیا میں کسی اور قوم نے نہیں کی تھیں۔ شاید اسی لیے تاریخ میں شداد کی ”جنت ارضی“ مشہور ہے۔

**آیت ۹ ﴿وَتَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝﴾** ”اور تمود کے ساتھ (کیا کیا آپ کے رب

نے) جنہوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا تھا۔“

قوم تمود کے لوگ پہاڑوں کو تراشنے کے ماہر تھے۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت کشاہ گھر اور محلات بناتے تھے۔ پہاڑوں سے تراشنے ہوئے ان کے گھر اور محلات آج بھی موجود ہیں۔

**آیت ۱۰ ﴿وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۝﴾** ”اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو مینوں والا تھا۔“

اوتاد (وتد کی جمع) لوہے کی مینوں کو بھی کہتے ہیں اور لکڑی کے کھونٹوں کو بھی جن کے ساتھ خیموں کی رسیاں باندھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ اس کے لشکروں کے خیموں کے کھونٹوں کا ذکر ہے۔ اس

لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

**آیت ۱۱ ﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ﴾** ”جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔“

**آیت ۱۲ ﴿فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفُسَادَ﴾** ”سو انہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔“

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوق خدا پر ظلم و زیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم و زیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج G-7 اور G-9 ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورت حال کے خطرناک نتائج خود ان کے اپنے گلے کا طوق بنیں گے۔ اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہر حال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفُسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ”بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے لوگوں کے اعمال کے سبب۔“

**آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾** ”تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوزہ۔“

چنانچہ یہ سب تو میں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

**آیت ۱۴ ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبَلَمُرْصَادٍ﴾** ”بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔“

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔ **آیت ۱۵ ﴿فَإِنَّمَا لِلنَّاسِ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ﴾** ”انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزما تا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی!“

**آیت ۱۶ ﴿وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ﴾** ”اور جب وہ اسے آزما تا ہے پھر اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے“

﴿فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ﴾ ”تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!“

لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

**آیت ۱۱ ﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ﴾** ”جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔“

**آیت ۱۲ ﴿فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفُسَادَ﴾** ”سو انہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔“

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوق خدا پر ظلم و زیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم و زیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج 7-G اور 9-G ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورت حال کے خطرناک نتائج خود ان کے اپنے گٹھے کا طوق بنیں گے۔ اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہر حال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفُسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ”بحر و دریا میں فساد رونما ہو چکا ہے لوگوں کے اعمال کے سبب۔“

**آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾** ”تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوزہ۔“

چنانچہ یہ سب تو میں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

**آیت ۱۴ ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبَاسِمٌ صَادٍ﴾** ”بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔“

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔ **آیت ۱۵ ﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ﴾** ”انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزما تا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی!“

**آیت ۱۶ ﴿وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ﴾** ”اور جب وہ اسے آزما تا ہے پھر اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے“

﴿فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ﴾ ”تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!“

## آیت ۷۱ ﴿كَلَّا﴾ ”ایسا ہرگز نہیں ہے!“

یہ مقام اپنے مضمون کے اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے۔ مذکورہ دونوں کیفیات کے حوالے سے انسان کے جن مکالمات کا یہاں ذکر ہوا ہے بظاہر ان میں کوئی خرابی یا شرک کی آلودگی نظر نہیں آتی۔ دونوں کلمات توحید کے عین مطابق ہیں۔ رزق کی فراخی اور تنگی کے حوالے سے عزت اور ذلت کو کسی دیوی یا دیوتا سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ہے اور یہ کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ بظاہر تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتَعْبُوهُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾ (آل عمران: ۲۶) ہی کا اقرار ہے کہ اے اللہ تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تو پھر یہاں ان جملوں کو آخر قابلِ مذمت کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اس نکتہ لطیف کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ توحید و ہدایت کی جز اور بنیاد ہے جبکہ اس بنیاد سے اوپر بھی ہدایت کی بہت سی منازل ہیں۔ اس لیے ایک بندہ مؤمن کو زندگی میں راہنمائی کے لیے اپنی نگاہیں صرف مینارہ توحید پر ہی مرکوز نہیں رکھنی چاہئیں بلکہ اسے شاہراہ ہدایت کے ہر سنگ میل اور ہر موڑ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا رخ متعین کرنا چاہیے۔ چنانچہ ان جملوں کے حوالے سے اصل اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہاں انسانی سوچ نے رزق کی فراخی اور تنگی کو عزت اور ذلت کا معیار سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کے رزق کی بست و کشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی زیادہ رزق دے کر آزماتا ہے تو کبھی اس کو معاشی تنگی سے دوچار کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔ گویا انسان کے لیے عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی امتحان ہے اور رنج و عسرت اور تنگدستی و ناداری بھی امتحان ہی کے مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو جس انسان نے مال و دولت کی کمی یا زیادتی کو ذلت اور عزت کا معیار سمجھ لیا وہ دھوکا کھا گیا۔ ایک بندہ مؤمن کو تو دنیوی عزت و ذلت کی ویسے بھی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے اصل اور حقیقی عزت یا ذلت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ چنانچہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی سے آزماتا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اپنے دائیں بائیں محروم و نادار لوگوں کو ان کا وہ حق ادا کرے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی غرض سے اس کے مال میں رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کا امتحان رزق کی تنگی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنی عزت نفس کو بچا کر رکھے۔ اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر رزق کی کمی بیشی اور عزت و ذلت کے حوالے سے مذکورہ فلسفہ و اعتقاد ہماری سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ہمارا نفس ہمیں یہ پٹی ضرور پڑھاتا ہے کہ رزق کی فراخی والی آزمائش آسان ہے اور اس کے مقابلے میں غربت و تنگدستی کی آزمائش بہت مشکل ہے جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے اصل حقیقت یہ ہے کہ غربت و تنگدستی کی آزمائش سے سرخرو ہونا انسان کے لیے نسبتاً آسان ہے اور اس کے مقابلے میں مال و دولت کی فراوانی کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آزمائش و آرام میں انسان کے غافل ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا زیادہ امکان ہے جبکہ

مشکل اور پریشانی کی کیفیت میں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَا قُلٌّ وَكَفَى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَالْهَيَّ))<sup>(۱)</sup> ”جو (مال) مقدار میں کم ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو مگر غافل کر دے۔“

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب خلیفہ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے تو جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں آپ کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا ویسا تشدد اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ لیکن آپ نے وہ اذیت ناک آزمائش کمال صبر و استقامت سے برداشت کی اور اس دوران آنکھوں میں کبھی آنسو تک نہ آنے دیے۔ لیکن دوسرے خلیفہ کے دور میں جب آپ کو رہائی ملی اور آپ کی خدمت میں اشرافیوں کے توڑے بطور نذرانہ پیش کیے گئے تو آپ یہ ”نذرانہ“ دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ اے اللہ! تیری یہ آزمائش بہت سخت ہے، میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ”توحید“ ہدایت کا پہلا اور بنیادی درجہ ہے۔ اگر انسان اپنے اچھے برے ہر طرح کے حالات کو من جانب اللہ سمجھے تو اس کا یہ طرز عمل توحید کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھی ہدایت کے بہت سے درجات ہیں۔ ان درجات میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلاء کے اصول و ضوابط کو سمجھے اور یقین رکھے کہ دنیا کے عیش و آرام اور تنگدستی و عسرت کی کیفیات اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ کہ تنگدستی و عسرت کی آزمائش کے مقابلے میں دولت کی فراوانی کی آزمائش کہیں زیادہ سخت اور خطرناک ہے۔

﴿كَلَّا بَلْ لَا تَكْفُرُونَ الْيَتِيمَ﴾<sup>(۱۷)</sup> ”ایسا ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیم کی عزت نہیں کرتے۔“  
**آیت ۱۸** ﴿وَلَا تَحْضُونَهُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ﴾<sup>(۱۸)</sup> ”اور نہ ہی تم لوگ آپس میں مسکینوں کو کھانے کی ترغیب دیتے ہو۔“

کسی دوسرے شخص کو کسی نیکی کی ترغیب دینا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اس کے لیے انسان کو پہلے خود اس نیکی پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نہ تم خود بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو اس نیک کام کی ترغیب دیتے ہو۔

**آیت ۱۹** ﴿وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا﴾<sup>(۱۹)</sup> ”اور تم ساری کی ساری میراث سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔“  
 اس آیت میں انسانوں کے بنائے ہوئے غیر متوازن اور ظالمانہ قوانین و رراثت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہے کہ تم میں سے جو طاقتور ہے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے تمام وراثت پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے دنیا کو مفصل جامع اور متوازن قوانین وراثت عطا کیے ہیں۔ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں باپ کی پوری وراثت بڑے بیٹے کو منتقل ہو جاتی تھی اور چھوٹے تمام بہن بھائیوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ دنیا کے بعض ممالک میں ایسے ظالمانہ قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔



**آیت ۲۰** ﴿وَتُجِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ ”اور تم مال سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو۔“

دنیوی مال و دولت کی محبت تمہارے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ سورتوں کے اس جوڑے یعنی سورۃ الفجر اور سورۃ البلد میں نزول قرآن سے قبل کے عرب معاشرے کے تمدن اور رسم و رواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً طاقتوروں کے میراث کو زبردستی ہڑپ کر جانے مال و دولت کی غیر معمولی محبت اور اسی محبت کی وجہ سے خدمت خلق کے کاموں سے پہلو تہی کرنے کی مثالیں اس معاشرے میں عام تھیں۔

**آیت ۲۱** ﴿كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دُكًّا دُكًّا﴾ ”ہرگز نہیں! جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیا جائے گا۔“

اس آیت کا یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق ہے جبکہ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ جب زمین کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔  
**آیت ۲۲** ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ ”اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا جب کہ فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔“

سورۃ الحاقہ میں قیامت کے دن کا ایک منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَّةٌ﴾ ”اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر“ اور اس دن آپ کے رب کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے۔ سورۃ الرحمن میں اس دن کے آسمان کی کینیت کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ ”پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی تیل کی تچھٹ جیسا۔“

قرآن مجید میں قیامت کے دن سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میدانِ حشر اسی زمین پر قائم ہوگا۔ زمین کو کھینچ کر چپنا ﴿وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ﴾ (الانشقاق) اور کوٹ کوٹ کر ایسے ہموار کر دیا جائے گا کہ اس کے تمام نشیب و فراز ختم ہو جائیں گے ﴿لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا﴾ (ظہ)۔ پہاڑوں کو روٹی کے گالوں کی طرح اڑا دیا جائے گا۔ پھر زمین پر اللہ تعالیٰ کا نزولِ اجلال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی کے ساتھ آٹھ فرشتے نازل ہوں گے۔ دوسرے فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی، حساب کتاب ہوگا اور یوں قصہ زمین بر سر زمین ہی طے ہوگا۔ گویا جس زمین پر انسانوں نے اپنے اچھے برے اعمال کا ارتکاب و اکتاب کیا ہے اسی زمین پر ان کا حساب ہوگا۔

**آیت ۲۳** ﴿وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ بُجْهَتُمْ﴾ ”اور لے آئی جائے گی اس روز جہنم بھی“

جہنم کا ظہور بھی شاید زمین کے اندر سے ہی ہوگا۔ یعنی جب زمین کو کھینچ کر چپنا کیا جائے گا تو اس کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا باہر نکل آئے گا جو جہنم کا سماں پیدا کر دے گا۔ (واللہ اعلم!)

﴿يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ﴾ ”اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی، لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ!“

شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ”اُس دن انسان چیتے گا“ یعنی اس دن انسان کو بہت کچھ یاد آ جائے گا کہ وہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لے کر آیا تھا اور اسے نصیحت بھی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت کی نصیحت سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ظاہر ہے فائدہ تو تب ہوتا اگر اس نے دنیا میں نصیحت پکڑی ہوتی۔

**آیت ۲۳** ﴿يَقُولُ يٰلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي﴾ ”وہ کہے گا: اے کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا!“

یہاں لفظ حیاتِی (میری زندگی) خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ یعنی اس وقت انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ میری اصل زندگی تو یہ ہے جو اب شروع ہوئی ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتا رہا جو اس اصل زندگی کی تہید تھی۔

در اصل انسانی زندگی عالم ارواح سے شروع ہوتی ہے اور دنیا سے ہوتی ہوئی ابدالاباد تک جاتی ہے۔ دنیا کے ماہ و سال اور شب و روز کی گنتی سے زندگی کے اس طویل سفر کا حساب ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کی ترجمانی یوں کی ہے:-

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں بہیم دواں ہر دم جو اس ہے زندگی!  
چنانچہ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس کی دنیوی زندگی اس کی جاودانی زندگی کے تسلسل کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے امتحان کے لیے منتخب فرمایا ہے اور اس وقت امتحان کے اختتام کی علامت کے طور پر اس نے موت کو تخلیق فرمایا ہے تاکہ ہر انسان کے اعمال کی جانچ کی جاسکے: ﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَنۡتُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك: ۲) ”اس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔“

**آیت ۲۵** ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَہٗٓ اَحَدٌ﴾ ”تو اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔“

**آیت ۲۶** ﴿وَلَا يُؤْتِقُ وَثَاقَہٗٓ اَحَدٌ﴾ ”اور اُس کا سا بانہننا کوئی اور نہیں باندھ سکتا۔“

میدانِ حشر میں ایک طرف تو یہ نقشہ ہوگا اور دوسری طرف کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوں گے جن سے کہا جائے گا:

**آیت ۲۷** ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ”اے نفسِ مطمئنہ!“

جو اس امتحانی زندگی میں مطمئن ہو کر یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی میں لگا رہا اور اس کے دین کے ساتھ چٹا رہا۔

**آیت ۲۸** ﴿ارْجِعِيۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ ”اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اس سے راضی ہو، وہ تم سے راضی۔“

سورۃ البینہ کی آیت ۸ میں ایسے خوش قسمت لوگوں کی یہی کیفیت ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾

”اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی!“ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

**آیت ۲۹ ﴿قَدْ خَلِیْ فِیْ عِبَادِیْ﴾** ”تو داخل ہو جاؤ میرے (نیک) بندوں میں۔“

اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی نشاندہی سورۃ النساء کی اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾

”اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسول کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی ان کی جن

پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!“

**آیت ۳۰ ﴿وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾** ”اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں!“

چنانچہ اس نفیس مٹمٹتہ سے کہا جائے گا کہ آؤ! میرے ان انعام یافتہ بندوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔

ایسے خوش قسمت لوگوں کے مراتب کی بلندی کے تصور اور اپنی جہی دامن کی احساس کے پیش نظر ہمارا ان کی

معیّت کے لیے دُعا مانگنا اگرچہ ”چھوٹا منہ بڑی بات“ کے زمرے میں آتا ہے مگر پھر بھی دل سے بے اختیار دُعا

نکلے گی ہے: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ — آمین!



# سُورَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أَقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ ۚ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۚ أَيْحَسِبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ يَقُولُ أَهْلَكَ مَا لَآلِبُدَّ ۚ أَيْحَسِبُ أَنْ لَمْ يَرَكْ أَحَدٌ ۚ أَلَمْ تَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۚ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۚ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۚ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۚ وَمَا أَذْرُكَ مَا الْعَقَبَةُ ۚ فَكْ رَقَبَةً ۚ أَوْ اطَّعِمْ فِي يَوْمِ ذِي مَسْغَبَةٍ ۚ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۚ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۚ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَّصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَّصَوْا بِالرِّحْمَةِ ۚ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْيَمِينَةِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِالْآيَاتِ هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۚ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُؤَصَّدَةٌ ۚ

ع

**آیت ۱** ﴿لَا أَقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ﴾ ”نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔“

اس آیت میں بھی لَا أَقْسِمُ کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ القیامہ کی پہلی اور دوسری آیات یا سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۶ میں پڑھ چکے ہیں۔ یعنی ان آیات میں لَا نافیہ نہیں ہے بلکہ مخاطبین کے خیالات باطلہ کے ابطال کے لیے ہے۔ چنانچہ سورۃ القیامہ کی پہلی آیت ﴿لَا أَقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ ۚ﴾ کا اگر ہم انگریزی ترجمہ کریں تو ہم کہیں گے: Nay, I swear by the Day of Judgement! دراصل انگریزی میں تو Nay کے بعد کو ما (۱) آ جانے سے مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن عربی میں چونکہ ”کو ما“ وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا اس لیے سننے یا پڑھنے والا لَا أَقْسِمُ کا مفہوم یوں بھی سمجھ سکتا ہے کہ ”میں قسم نہیں کھاتا“۔ بہر حال اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو وہ درست نہیں بلکہ میں اس شہر یعنی مکہ مکرمہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے خیالات و نظریات باطل ہیں۔ آگے چل کر واضح ہو جائے گا کہ یہاں مکہ مکرمہ کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔

**آیت ۲** ﴿وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ﴾ ”اور (اے نبی ﷺ) آپ حلال کر لیے گئے ہیں اس شہر میں۔“

کچھ مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ ”آپ کے لیے حلال ہو جائے گا یہ شہر“۔ یعنی اگرچہ یہ بلد الحرام ہے یہاں خونریزی وغیرہ کی اجازت نہیں لیکن ایک وقت آئے گا کہ آپ کو اس کی اجازت مل جائے گی جیسے فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ حضور ﷺ کے لیے حلال کر دیا گیا اور اس دن لشکر کشی کے دوران مسلح تصادم کے اکاؤنٹات بھی ہوئے۔ البتہ میرے نزدیک آیت کا اصل مدعا اور مفہوم وہی ہے جو میں نے

ترجمے میں اختیار کیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بلد الحرام میں آپ کی عزت پر حملے ہو رہے ہیں آپ کی عزت نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے آپ کو مسلسل ستایا جا رہا ہے۔ اس وادی غیور ذی دُرع کے ماحول میں جہاں معمول کی زندگی بھی سراپا مشقت ہے وہاں اہل شہر کی مخالفت نے آپ کے لیے زندگی کو مزید کنھن اور مشکل بنادیا ہے۔ چنانچہ دعوت حق کی جدوجہد میں مسلسل سختیاں برداشت کرتے ہوئے آپ کی زندگی کے شب و روز کی اس وقت جو صورت حال اور کیفیت ہے ہم اس کی قسم کھا رہے ہیں۔

**آیت ۳ ﴿وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ﴾** ”اور قسم ہے والد کی اور اولاد کی۔“

اس قسم میں اس مشقت اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہے جو ایک والد کو اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ کے حوالے سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اب اگلی آیت میں اس حقیقت یعنی قسم علیہ کا ذکر ہے جس پر یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں:

**آیت ۴ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾** ”بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے۔“

سورة الانشقاق میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ ”اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف پھر تو اس سے ملنے والا ہے۔“ انسانی زندگی کے بارے میں یہ تلخ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اس دنیا میں کوئی انسان جیسا ہے جہاں ہے غریب ہے، امیر ہے، صاحب اقتدار ہے، فقیر ہے، کلفت، مشقت، کوفت، پریشانی اس کا مقدر ہے۔ کوئی انسان جسمانی محنت کے ہاتھوں بے حال ہے تو کوئی ذہنی مشقت کی وجہ سے پریشان۔ کوئی جذباتی اذیت سے دوچار ہے تو کوئی نفسیاتی خلفشار کا شکار ہے۔ کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہے تو کسی کے لیے دولت کے انبار و بال جان ہیں، کسی کے پاس سرچھپانے کو جگہ نہیں تو کوئی غلی گدلیوں پر لیٹا نیند کو ترستا ہے۔ غرض مختلف انسانوں کی مشقت کی کیفیت، نوعیت اور شدت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر مشقت اور پریشانی سے چھکارا جیتے جی کسی کو بھی نہیں ہے۔ بقول غالب۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں! بظاہر تو یہ صورت حال بھی بہت گھمبیر محسوس ہوتی ہے، لیکن انسان کی اصل مشکل اس سے کہیں بڑی ہے اور وہ مشکل یہ ہے کہ اسے دُنیوی زندگی میں پیش آنے والی یہ تمام پریشانیاں اور سختیاں بھی سہی ہیں اور اس کے بعد اپنے رب کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب بھی دینا ہے۔ سورة الانشقاق کی مذکورہ آیت میں اسی ”ملاقات“ کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے انسان کی قسمت کا حتمی فیصلہ تو اسی ملاقات میں ہونا ہے۔ اس ساری صورتحال میں انسان کی اصل مشقت، اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی کا اندازہ لگانا ہو تو ایک ایسے انسان کا تصور کریں جو زندگی بھر ”دُنیا“ حاصل کرنے کے جنون میں کولہو کا تیل بن کر محنت و مشقت کی کچی میں پستا اور طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی اذیتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ پھر مشقتوں پر مشقتیں برداشت کرتا اور تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلتا یہ

انسان جب اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوا تو اس کا دامن مطلوبہ معیار و مقدار کی نیکیوں سے خالی تھا۔ چنانچہ اس عدالت سے اسے دائمی سزا کا حکم ہوا: ﴿وَيُصَلِّي سَبْعِينَ ۱۵﴾ (الانشقاق) اور اس کے بعد اسے جہنم میں جھونک دیا گیا — ہمیشہ ہمیش کے لیے! یہ ہے انسان کی اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی جس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو تنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟  
**آیت ۵** ﴿يَتَحَسَّبُ أَنْ لَنْ يَقْدَرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۵﴾ ”کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی قابو نہیں پاسکے گا؟“

مشقت میں پڑے ہوئے انسان کا حال دیکھو۔ اس حالت میں بھی وہ غرور کرتا ہے۔ ابو جہل کو دیکھو کیے اکڑا ہوا ہے — مقام غور ہے! چاروں طرف سے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے انسان کا اپنے خالق اور مالک کے سامنے یہ حال ہے تو اگر اس کے لیے دنیا میں آسانیاں ہی آسانیاں ہوتیں تو پھر یہ اللہ تعالیٰ سے کیسی کیسی بغاوتیں کرتا اور مخلوق خدا پر کیا کیا ستم ڈھاتا!

**آیت ۶** ﴿يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۶﴾ ”کہتا ہے میں نے تو ذہیروں مال خرچ کر ڈالا۔“  
 اس فقرے میں سردارانِ قریش کی ذہنیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بھلائی اور نیکی کے کام اکثر و بیشتر جذبہ مسابقت کے تحت کرتے تھے اور پھر اپنی نیکیوں کا خوب چرچا کرتے اور شیخیاں بگھارتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی یہی جذبہ مسابقت تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ حضور ﷺ کو اپنے خاندان کے مد مقابل خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ اس حوالے سے ابو جہل کا اقراری بیان تو تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمد (ﷺ) جھوٹے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس پر پوچھنے والے نے سوال کیا کہ پھر تم ان پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس پر اس نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا بنو ہاشم کے ساتھ پشتوں سے مقابلہ چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے غرباء کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھانے کھلائے۔ اگر وہ فحاج کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے تو اس میدان میں بھی ہم نے انہیں آگے نہیں نکلنے دیا۔ یوں اب تک ہم ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو ہم ہمیشہ کے لیے ان کے غلام بن جائیں گے اور یہ صورت حال کم از کم مجھے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں سردارانِ قریش کے اسی طرزِ عمل کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص کبھی بھلائی کا کوئی کام سرانجام دے لیتا ہے تو جگہ جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور شیخیاں بگھارتا پھرتا ہے کہ فلاں کام میں میں نے ذہیروں مال کھیا ڈالا ہے۔

**آیت ۷** ﴿يَتَحَسَّبُ أَنْ لَمْ يَرَ أَحَدٌ ۷﴾ ”کیا اس کا گمان ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا نہیں؟“

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر شخص کے ایک ایک عمل سے واقف ہے اس کی اس نیکی سے وہ بے خبر ہے۔ یعنی اگر تو اس نے وہ نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی تھی تو پھر وہ اس کا ڈھنڈھورا کیوں پیٹ رہا ہے؟

**آیت ۸ ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۭ﴾** ”کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟“

**آیت ۹ ﴿وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِۭ﴾** ”اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)؟“

**آیت ۱۰ ﴿وَهَدَيْنٰهُ السَّبْعَۃَ الدُّجُرٰی﴾** ”اور ہم نے اس کو راہ دکھلا دی دو گھاٹیوں کی۔“

عام مفسرین کے نزدیک دو گھاٹیوں سے مراد نیکی اور بدی کے دو راستے ہیں۔ البتہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے ماں کی دو چھاتیاں مراد ہیں۔ نجد کے لغوی معنی ابھری ہوئی چیز کے ہیں۔ بلند سطح پر جو راستہ ہو اس کو بھی نجد کہتے ہیں۔ چنانچہ ”التَّجْدِیْنِ“ کے معنی ”دو بلند (واضح) راستے“ بھی ہو سکتے ہیں اور ”دو ابھار“ بھی۔ اور مجھے مؤخر الذکر رائے زیادہ پسند ہے۔ انسان کی زبان اس کے دو ہونٹوں اور پھر ماں کی چھاتیوں کے ذکر کے حوالے سے دراصل یہاں انسان کی اس جبلی اور پیدائشی ہدایت کا ذکر مقصود ہے جس کے بارے میں ہم سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی﴾ میں پڑھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے ایک بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد نہ صرف ماں کے دودھ کی تلاش شروع کر دیتا ہے بلکہ جو نبی اس کی رسائی ماں کی چھاتیوں تک ہوتی ہے تو وہ دودھ چوسنے بھی لگتا ہے۔ اس نومولود کو آخر اپنی غذا کی تلاش کا یہ شعور کس نے دیا ہے؟ اور اس مرحلے پر زبان اور ہونٹوں کے اس خاص استعمال کا طریقہ اسے کس نے سکھایا ہے؟ ظاہر ہے یہ شعور یہ آگہی اور یہ ہدایت اس کی اس فطرت اور جبلت کا حصہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور اس اعتبار سے بچے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

**آیت ۱۱ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾** ”لیکن وہ گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔“

**آیت ۱۲ ﴿وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ﴾** ”اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟“

**آیت ۱۳ ﴿فَلَکَ رَقَبَةٌ﴾** ”کسی گردن کا چھڑا دینا۔“

یعنی مال خرچ کر کے کسی غلام کو آزاد کر دینا یا کسی مقروض کا قرض ادا کر دینا۔

**آیت ۱۴ ﴿اَوْ اِطْعَمُ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ﴾** ”یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن میں۔“

یعنی کسی شخص کا قسط سالی کے دوران بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ خصوصی طور پر ایسی صورت حال میں جب اسے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کا خیال بھی پریشان کیے دے رہا ہو۔

**آیت ۱۵ ﴿بَتِّیْسًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾** ”اُس یتیم کو جو قرابت دار بھی ہے۔“

**آیت ۱۶ ﴿اَوْ مَسْکِیْنًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾** ”یا اُس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔“

یہ وہ فلسفہ ہے جس پر سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ مشکل گھاٹی دراصل حُب مال کی وہ چٹان ہے جو متعلقہ انسان کے لیے بھلائی کے راستے کو مسدود کیے کھڑی ہے۔ سورۃ الحدید کی

آیت ۱۸ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے اسے گاڑی کی بریک سے تشبیہ دی تھی۔ چنانچہ مذکورہ گھائی کو عبور کرنے یا گاڑی کی بریک کو کھولنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اللہ کی رضا کے لیے محتاجوں اور ناداروں کی مدد کرنے اور بھلائی کے دوسروں کاموں پر دل کھول کر خرچ کرے۔ یعنی مال کی محبت کی آلودگی کو دل سے صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے پیارے مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت پر قربان کر دیا جائے۔ یاد رکھیں! حُبِّ مال کی گندگی کو دل سے نکالے بغیر انسان کو ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی۔ (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الحمد آیات ۲۰ تا ۲۱ کی تشریح)۔

**آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾** ”پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے“

یہاں پر لفظ **ثُمَّ** بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی پہلے انسان اس مشکل گھائی کو عبور کرے، اپنے دل کی زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا بل چلائے، اس کے ذریعے سے دل کی زمین سے حُبِّ مال کا جھاڑ جھکاڑ صاف کرے اور پھر **(ثُمَّ)** اس میں ایمان کا بیج ڈالے۔ اگر وہ اس ترتیب اور اس انداز سے محنت کرے گا تو تبھی ایمان کا پودا اس کے دل کی زمین میں اپنی جڑیں پھیلانے کا اور برگ و بار لانے کا۔

**﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾** ”اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی اور باہم ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔“

یہ مضمون سورۃ العصر میں بایں الفاظ آیا ہے: **﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾** ”سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی“۔ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں آیات میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ البتہ دونوں جگہ مذکور اصطلاحات کی ترتیب مختلف ہے۔ سورۃ العصر کی اس آیت میں ایمان کے بعد عمل صالح کا بیان ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں عمل صالح (غریاء و مساکین اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی) کے بعد ایمان کا ذکر ہے۔ سورۃ العصر میں تو اوصی بالحق کے بعد تو اوصی بالصبر کا تذکرہ ہے جبکہ یہاں پر پہلے تو اوصی بالصبر اور بعد میں تو اوصی بالمرحمہ کا ذکر آیا ہے۔ اس پہلو سے دونوں آیات کے تقابلی مطالعہ سے بہت سے حقائق و رموز کی نشاندہی ہوتی ہے۔

**آیت ۱۸ ﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ﴾** ”یہ ہوں گے داہنے والے۔“

یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے۔ لفظ **یمن** کے معنی خوش بختی کے بھی ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہوں گے جو رشد و ہدایت کے راستے پر چلتے ہوئے فوز و فلاح کی منازل تک پہنچ گئے۔

**آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَيْتِ﴾** ”اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیات کا“

**﴿هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ﴾** ”وہ ہوں گے بائیں والے۔“

یعنی ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھوں میں پکڑائے جائیں گے۔ لغوی اعتبار سے جس طرح **یمن**



کے معنی خوش بختی کے ہیں اسی طرح الْمُشْتَمَّة کے مادے میں بد بختی کے معنی پائے جاتے ہیں (شومنی قسمت کی ترکیب اردو میں بھی مستعمل ہے)۔ لہذا اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ ہوگا کہ ”یہ بد بختی والے لوگ ہوں گے“۔ قرآن مجید میں آخرت کی کامیابی یا ناکامی کے حوالے سے دائیں والے (اصحاب الیمینہ یا اصحاب الیمین) اور بائیں والے (اصحاب المشئمہ یا اصحاب الشمال) کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ البتہ سورۃ الواقعة کی اس آیت میں نسل انسانی کے تین گروہوں کا تذکرہ بھی ہوا ہے: ﴿وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً﴾ کہ اس دن تم لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے دو گروہ تو یہی (دائیں اور بائیں والے) بتائے گئے ہیں جبکہ تیسرے گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ﴾ اُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۱۱﴾ (الواقعة) ”اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہی تو بہت مقرب ہوں گے“۔ گویا یہ تیسرا گروہ اہل جنت میں سے بہت ہی خاص لوگوں یعنی مقررین بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ بہر حال آیت زیر مطالعہ میں ان بد قسمت لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامے پکڑا کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

**آیت ۲۰ ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ﴾** ”ان پر آگ بند کر دی جائے گی۔“

تاکہ پریش کر کی طرح آگ کی ساری تپش اندر ہی رہے اور انہیں شدید ترین عذاب ملے۔ اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے عذاب سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت اور شانِ غفاری کے طفیل اصحابِ جنت میں شامل فرمائے۔ آمین!



# سُورَةُ الشَّمْسِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الشمس اور اس کے بعد کی تین سورتوں (سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے لیے میں نے ”چہار سورۃ نور و ظلمت“ کا مشترک عنوان تجویز کر رکھا ہے۔ ان میں سے پہلی تین سورتوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ الشمس اور سورۃ اللیل (ان دونوں سورتوں کا باہم جوڑے کا تعلق بھی ہے) کا انداز سورۃ التکویر اور سورۃ الانفطار سے ملتا جلتا ہے۔ یاد رہے کہ سورۃ التکویر کے آغاز میں قسموں والا حصہ زیادہ آیات (۱۳ آیات) پر مشتمل ہے اور جواب قسم کے طور پر صرف ایک آیت (آیت ۱۴) آئی ہے جبکہ اس کی جڑواں سورت یعنی سورۃ الانفطار میں قسموں والا حصہ نسبتاً کم ہے اور بعد کی آیات میں ان دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ بالکل اسی انداز میں زیر مطالعہ جوڑے کی پہلی سورت یعنی سورۃ الشمس میں قسموں والا حصہ زیادہ (آٹھ آیات پر مشتمل) ہے اور اس کے بعد جواب القسم کے ضمن میں صرف دو آیات آئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سورۃ اللیل میں قسموں کا حصہ نسبتاً کم ہے جبکہ سورۃ الشمس سے شروع ہونے والا مضمون یہاں آکر مزید واضح ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا سورۃ الضحیٰ میں جا کر نقطہ عروج کو پہنچے گا۔

## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝ وَالسَّمَاءَ  
وَمَا بَنَاهَا ۝ وَالْأَرْضَ وَمَا طَعْنَاهَا ۝ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ قَدْ  
أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝ إِذِ انْبَعَثَ  
أَشْقَاهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۝ فَكَذَّبُوهُ فَفَقَرُوا ۝ وَهَآءَ فَدُمْدَمٌ  
عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَدْنَهِمْ فُسُوهُنَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝

دع

**آیت ۱** ﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝﴾ ”قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔“

**آیت ۲** ﴿وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝﴾ ”اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔“

تلا، یتلو کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنا۔ تلاوت کا لفظ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ ”تلاوت“ کے مفہوم میں قرآن مجید کے متن کا پڑھنا (زبان اور نظر سے عبارت کی پیروی کرنا) اس کے احکام پر عمل کرنا اور اس کا اتباع کرنا شامل ہے۔

**آیت ۳ ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا﴾** ”اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کر دیتا ہے۔“

اگرچہ بظاہر صورت حال تو یہ ہوتی ہے کہ سورج سے دن روشن ہوتا ہے، لیکن یہاں اسی بات کے اندر یہ لطیف نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ دن ہوتا ہے تو سورج نظر آتا ہے۔ گویا دن سورج کو روشن کرتا ہے۔ آیت کے اس اسلوب کا تعلق دراصل اگلی آیت کے اسلوب سے ہے۔ اگلی آیت میں رات کا ذکر بالکل اسی انداز میں ہوا ہے:

**آیت ۴ ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا﴾** ”اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لیتی ہے۔“

ان دونوں آیات کا مفہوم یوں ہوگا کہ دن سورج کو نمایاں کر دیتا ہے جبکہ رات اسے ڈھانپ لیتی ہے۔

**آیت ۵ ﴿وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا﴾** ”اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اسے بنایا۔“

**آیت ۶ ﴿وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا﴾** ”اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کہ اسے بچھا دیا۔“

نوٹ کیجیے! یہ تمام قسمیں جوڑوں کی صورت میں آئی ہیں۔ پہلے سورج اور چاند کا، پھر دن اور رات کا اور اب آسمان اور زمین کا ذکر ہوا۔ ان ظاہری تضادات کی مثالوں سے دراصل نفس انسانی کے ردش اور تاریک پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر جگہ تم لوگوں کو تضادات نظر آتے ہیں، سورج ہے تو اس کے ساتھ چاند ہے، اندھیرا ہے تو اس کے ساتھ اجالا ہے، بلندی ہے تو اس کے ساتھ پستی ہے، اسی طرح انسان کی ذات یا شخصیت کے بھی دو رخ ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں تو تمام انسان ایک جیسے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی حیوانی اور نفسانی خواہشات کے راستے پر چل رہا ہے تو کسی نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے فلاح کی منزل حاصل کر لی ہے۔

**آیت ۷ ﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا﴾** ”اور قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔“

**آیت ۸ ﴿فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾** ”پس اس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا۔“

اب اگلی دو آیات میں ان قسموں کے جواب مذکور ہے۔

**آیت ۹ ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾** ”یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔“

**آیت ۱۰ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾** ”اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا۔“

یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ ان دو آیات میں انتہائی اختصار کے ساتھ انسان کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا معیار بیان کر دیا گیا ہے۔ دَسَّ يَدْسُ کے معنی کسی چیز کو مٹی میں دفن کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۵۹) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اَيُّمْنِكُمْ عَلٰی هٰؤُنِ اَمْ يَدْسُهُ فِى التُّرَابِ﴾ اس آیت میں قبل از اسلام زمانے کے عربوں کی ایک خاص ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جس شخص کے گھر بٹی پیدا ہوتی ہے وہ یا تو اسے ذلت آمیز طریقے سے زندہ رکھتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ یہاں ”دَسَّاهَا“ دراصل دَسَّسَ (باب تفعیل) ہے اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تو جس انسان نے اپنے نفس کو مٹی میں دفن کر دیا (اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس نے اپنی روح کو اپنے خاکی وجود کے اندر دبا دیا۔ یعنی جس کی حیوانی خواہشات و شہوات اس کی روح پر غالب آگئیں) تو وہ ناکام رہا۔ البتہ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کے مطالعہ کے

دوران بھی نشان دہی کی گئی ہے، زیر مطالعہ سورتوں کے مضامین میں سے اکثر کا تعلق سورۃ الاعلیٰ کے مضامین کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ کے الفاظ میں جو مضمون انتہائی مختصر انداز میں آیا تھا، یوں سمجھیں کہ اب آیات زیر مطالعہ میں اس مضمون کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس مضمون پر قسموں کی صورت میں یہاں مزید گواہیاں بھی لائی گئی ہیں اور زیر مطالعہ آیت کے الفاظ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾ میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے۔

دراصل انسان کا نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس امانت کو پاک صاف رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔ نفس کو پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو، یعنی اپنی شخصیت کو تمام رذائل اور باطنی بیماریوں سے پاک کر کے بہترین انسانی خوبیوں کا مرقع بنائے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں عام طور پر تزکیہ نفس، تعمیر سیرت، تعمیر خودی وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے نفس کو پاک کرنے اور پاک رکھنے میں کامیاب ہو گیا، خواہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ حقیر، فقیر اور بے نام ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو رذائل و خباثت سے آلودہ کر لیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ناکام ہے، دنیا میں خواہ وہ غیر معمولی عزت، شہرت اور دولت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل اور حقیقی کامیابی اور ناکامی کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ اس کی ”ذات“ سے ہے۔

انسان کی ”ذات“ سے کیا مراد ہے؟ فرائنڈ نے اسے انسان کی self (اُنا) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی self کو id اور libido کے تسلط سے آزاد کر کے اسے مثبت انداز میں ترقی دے۔ علامہ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے اور انسان کی ”کامیابی“ کو اس کی خودی کی تعمیر و ترقی سے مشروط کیا ہے۔ بہر حال اس حوالے سے سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک جسم یا ہاتھ پاؤں، سر، دھڑ وغیرہ کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میرا سر وغیرہ۔ یہ تمام اعضاء بے شک اس کے ہیں، لیکن وہ انسان جو ان اعضاء کو اپنا بتا رہا ہے وہ خود کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے اصل انسان اس جسم یا وجود کے اندر ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جس طرح آم کی گتھلی کے اندر آم کا پورا درخت موجود ہے، اسی طرح انسانی جسم کے اندر اصل انسان ایک لطیف شخصیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لطیف شخصیت عبارت ہے اس روح سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حیوانی یا خاکی وجود کے اندر پھونکی ہے: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر: ۲۹)۔

روح یا انسان کی انا کا ذکر اپنشد کے اس فقرے میں بھی ہے: جس کا حوالہ میں پہلے بھی دے چکا ہوں:

*Man in his ignorance identifies himself with the material sheaths that encompass his real self.*

گویا انسان کی self یا انا یا خودی یا روح اس کے حیوانی وجود کی مٹی کے اندر دفن ایک خزانہ ہے۔ اب جو انسان اس خزانے کو مٹی سے نکال کر کام میں لے آئے گا، یعنی اپنی روح کو منتقل کر لے گا، اس کا نفس پاک ہو جائے گا (روح کی پاکیزگی نفس کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ دونوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے) اور وہ کامیابی یا فلاح کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ (فلاح کا لفظ قرآن مجید میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا

ہے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت کی تشریح۔)

زیر مطالعہ آیات کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر پیش نظر رہنا چاہیے کہ انسان کی روح اور اس کا نفس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان آیات میں انسانی روح کا نہیں بلکہ انسانی نفس کا ذکر ہوا ہے۔ روح انسانی دراصل عالم امر کی چیز ہے اور یہ معرفت خداوندی اور محبت خداوندی کی امین ہے جبکہ نفس انسانی کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ اسی لیے اس کے ذکر سے پہلے جن چیزوں کی یہاں قسمیں کھائی گئی ہیں ان سب (سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین) کا تعلق بھی عالم خلق سے ہے۔ روح تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو عطا ہوئی ہے جبکہ نفس گدھے، گھوڑے اور چمنییری وغیرہ سب جانوروں میں ہوتا ہے۔ البتہ انسان کی خصوصیت اس حوالے سے یہ ہے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں نفس انسانی کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ارتقائی درجات سے نوازا ہے اور اس کے اندر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی وہ تمیز الہام کر دی ہے جو دوسرے جانوروں کے نفس میں نہیں پائی جاتی۔ اسی حس اور تمیز کی وجہ سے انسانی فطرت آفاقی سطح پر نیکی کو اچھا اور بدی کو برا سمجھتی ہے۔ دنیا میں کسی معاشرے کسی مذہب اور کسی نسل کا انسان ہو وہ سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن میں معروف اور منکر کی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ معروف وہ چیزیں یا افعال یا اعمال ہیں جو نفس انسانی کے لیے مانوس ہیں۔ انہیں دیکھ کر یا اپنا کر نفس انسانی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں منکرات وہ چیزیں یا اعمال یا افعال ہیں جنہیں نفس انسانی برا سمجھتا ہے اور جن کی صحبت و معیت میں وہ اجنبیت اور کوفت محسوس کرتا ہے بلکہ وہ انسان کو ایسے اعمال و افعال سے ٹوکتا ہے۔ اسی لیے انسان غلطی کرنے کے بعد اکثر یہ کہتا پایا جاتا ہے کہ ”میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے“ (my conscience is pinching me)۔ نفس انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سورۃ القیامہ کی آیت ۲ میں اسے نفس لؤامہ (ملامت کرنے والا نفس) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے آیات زیر مطالعہ کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی تمیز کا بنیادی بیج ڈال دیا گیا ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس بیج کی حفاظت کرے، اسے سازگار ماحول فراہم کرے اور عمل صالح کے پانی سے اس کی آبیاری کرے۔ سورۃ فاطر (آیت ۱۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ کہ کسی بھی اچھی بات یا اچھے کلام میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن عمل صالح اس کی اس صلاحیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان جب تزکیہ نفس اور اعمال صالحہ کے حوالے سے محنت کرے گا تو اسے ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی، وہ ایمان کے ان ثمرات سے بھی بہرہ مند ہوگا جن کا ذکر ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں اور اسے کامیابی کی ضمانت بھی ملے گی۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو حیوانی وجود کے تابع کیے رکھا اور وہ اس کی آواز کو دبا کر زندگی بھر جسمانی تقاضے پورے کرنے میں لگا رہا وہ گویا خائب و خاسر ہو کر رہ گیا۔

اب اگلی آیات میں ایک قوم یا ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے حوالے سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس طرح ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح ہر معاشرے میں اجتماعی طور پر بھی اخلاقی حس پائی جاتی ہے اور جس طرح ایک انسان میں اچھے برے داعیات ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاشرے

کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو، اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھود جیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حس کی تصویر پیش کی ہے:-

وائے ناکامی ستارے کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!  
اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قومِ شمود کی مثال:

**آیت ۱۱** ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۖ﴾ ”قومِ شمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔“  
یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلادیا جو ان کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

**آیت ۱۲** ﴿إِذْ أَبْعَثَ أَشْقَاهَا ۖ﴾ ”جب اُنھ کو کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔“  
وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمر بستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطور معجزہ پیدا کیا تھا۔

**آیت ۱۳** ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۖ﴾ ”تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔“

**آیت ۱۴** ﴿فَكَذَّبُوهُ فَعَبَّرُوا وَّهَّامَ﴾ ”تو انہوں نے اُس کو جھٹلادیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔“  
﴿فَدَمَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَذَّوْنِهِمْ فَمَسُوْنَهَا ۖ﴾ ”تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔“

ان کے جرمِ عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابِ استیصال نازل فرمایا اور پوری قوم کو ایک ساتھ پیوندِ خاک کر دیا۔

**آیت ۱۵** ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۖ﴾ ”اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔“  
اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے وہ جو چاہے کرے۔ اس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔ اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قومِ شمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔



کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھودیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حسی کی تصویر پیش کی ہے:-

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!  
اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قوم خود کی مثال:

**آیت ۱۱** ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۖ﴾ ”قوم ثمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔“  
یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلادیا جو ان کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

**آیت ۱۲** ﴿إِذِ اتَّبَعَتْ أَشْقَاهَا ۖ﴾ ”جب اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔“  
وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمر بستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطور معجزہ پیدا کیا تھا۔

**آیت ۱۳** ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۖ﴾ ”تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔“

**آیت ۱۴** ﴿فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوْهَا ۖ﴾ ”تو انہوں نے اُس کو جھٹلادیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔“  
﴿فَقَدِمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَذِشِّيْهِمْ فَسَوْأَتُهَا ۖ﴾ ”تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔“

ان کے جرم عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب استیصال نازل فرمایا اور پوزی قوم کو ایک ساتھ بوند خاک کر دیا۔

**آیت ۱۵** ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۖ﴾ ”اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔“  
اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے وہ جو چاہے کرے۔ اس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔ اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قوم ثمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔



# سُورَةُ اللَّيْلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۖ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۖ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۚ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۚ  
فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۖ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ  
وَأَسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۖ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۚ  
إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۖ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۚ فَأَنْذَرْنَكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۚ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا  
الْأَشْقَى ۚ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۚ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۚ وَمَا  
لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرَىٰ ظَىٰ

**آیت ۱** ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۖ﴾ ”قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔“

یعنی تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔

**آیت ۲** ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۖ﴾ ”اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔“

رات اور دن اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے ہیں، جبکہ اگلی قسم کا تعلق انسان کی ذات (اللہ تعالیٰ کی انفسی نشانیوں) سے ہے۔

**آیت ۳** ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۚ﴾ ”اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔“

ان قسموں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے اندر نظر آنے والے تضادات دراصل نظام کائنات کا حصہ ہیں، بلکہ کائنات کا نظام انہی تضادات کی وجہ سے چل رہا ہے اور ایک جنس سے تعلق رکھنے والی دو متضاد چیزیں باہم مل کر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ دنیا کا سارا نظام دن اور رات کے ادا لے بدلنے کی وجہ سے قائم ہے۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کا وجود اسی گردشِ لیل و نہار کا مرہونِ منت ہے۔ خود نسلِ انسانی کا تسلسل بھی مرد اور عورت کے جنسی اختلاف و تضاد کی وجہ سے چل رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کی مختلف تخلیقات میں بظاہر نظر آنے والے ان تضادات کے اندر بھی ایک طرح کا توافق اور تطابق پایا جاتا ہے۔

**آیت ۴** ﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۚ﴾ ”بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔“

یعنی جس طرح کائنات کی باقی چیزوں میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اسی طرح تمہارے مختلف افراد کی کوششوں اور محنتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔



ظاہر ہے زندگی کے شب و روز میں محنت، مشقت اور بھاگ دوڑ کرنا تو انسان کا مقدر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (۹۲) (الْبَلَدِ) ”بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے“۔ ہر انسان اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لیے بھی مشقت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کسی نظریے کا پیروکار ہے تو اس نظریے کی اشاعت اور سر بلندی کے لیے بھی تنگ و دو کرتا ہے اور اس نظریے کے تحت ایک نظام کے قیام کے لیے بھی جدوجہد کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق محنت اور مشقت تو سب انسان ہی کرتے ہیں لیکن ان کی مشقتوں کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی محنت کے نتیجے میں جنت خرید لیتا ہے اور دوسرا اپنی محنت و مشقت کی پاداش میں خود کو دوزخ کا مستحق بنا لیتا ہے۔ انسانی محنت میں اس فرق کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث میں ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَايَعُ نَفْسَهُ فَمُعْتَقَهَا أَوْ مُوْبَقَهَا)) (۱) ”ہر شخص روزانہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے، پھر یا تو وہ اسے آزاد کرالیتا ہے یا اسے تباہ کر بیٹھتا ہے“۔ کوئی اپنی جسمانی قوت کا سودا کرتا ہے، کوئی ذہنی صلاحیت بیچتا ہے، کوئی اپنی مہارت نیلام کرتا ہے، کوئی اپنا وقت فردخت کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے طریقے اور اپنے اپنے انداز میں ہر شخص دن بھر خود کو بیچتا ہے۔ اب ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے خود کو بیچتے ہوئے حلال کو مد نظر رکھا، اس نے جھوٹ نہیں بولا، کسی کو دھوکہ نہیں دیا، کم معاوضہ قبول کر لیا لیکن حرام سے اجتناب کیا۔ ایسا شخص شام کو لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص نے بھی دن بھر مشقت کی، مگر حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر معاوضہ اس نے بھی لیا مگر غلط بیانی کر کے اور دوسروں کو فریب دے کر ناپ تول میں کمی کر کے اور گھٹیا چیز کو بڑھیا چیز کے دام پر بیچ کر۔ اب یہ شخص جب شام کو گھر آئے گا تو جہنم کے انگاروں کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے آئے گا۔

اب آئندہ آیات میں انسانی زندگی کے دو راستوں میں سے ہر راستے کے تین اوصاف یا تین سنگ ہائے میل کی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے، اس راستے پر اب وہ کس مقام پر ہے اور اگر وہ مزید آگے بڑھے گا تو آگے کون سی منزل اس کی منتظر ہوگی۔ اس مضمون کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اب ملاحظہ ہوں ان میں سے پہلے راستے کے تین اوصاف:

**آیت ۵ ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ﴾ (۵) ”تو جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔“**

ظاہر ہے یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کا پہلا وصف یا پہلا سنگ میل ”اعطاء“ یا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ البلد میں اس عمل کو انسان کے لیے ایک بہت مشکل گھائی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی: ﴿فَلَنْ رَقَبَةٍ ۚ أَوْ أَعْطَىٰ ذَا مَقْرَبَةٍ ۚ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۚ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ﴾ ”کسی گردن کا چھڑا دینا، یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن اس یتیم کو کہ جو قرابت دار نبی ہے یا اس محتاج کو جو مٹی میں زل رہا ہے۔ پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے.....“

یعنی جو انسان اس ”مشکل گھائی“ کو عبور کرنے کے بعد اہل ایمان کی صف میں شامل ہوگا وہ ان شاء اللہ ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کا پیروکار بنے گا۔ لیکن جس نے یہ امتحان پاس کیے بغیر ہی کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ توحید و رسالت کی گواہی دینے کے بعد بھی اس کے ایمان کی بوابس عبد اللہ بن ابی کے ایمان کی سی ہوگی۔ ظاہر ہے جو کلمہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے پڑھا تھا وہی کلمہ عبد اللہ بن ابی نے بھی پڑھا تھا۔ یعنی ایمان کا بیج تو دونوں طرف ایک سا تھا، مگر یہ زمین اور تھی وہ زمین اور تھی۔ اس زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا بل چل چکا تھا اور اُس زمین میں حُبِ دنیا اور شکوک و ترّد کے جھاڑ جھکاڑ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبد اللہ بن ابی کے دل کی زمین میں ایمان کے بیج کا جماؤ ممکن ہی نہ ہوا۔ اس حوالے سے اگر سورۃ آل عمران کی آیت ۹۲ کے اس جملے کو مد نظر رکھا جائے تو انفاق و اعطاء کے اس فلسفے کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے: ﴿لَٰكُنْ تَنَالُوا الْيَوْمَ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ﴾ یعنی جب تک تم لوگ اپنی عزیز ترین چیز کو اللہ کی راہ میں نہ دے ڈالو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے تو مال کی قربانی دو اور قربانی بھی بہترین چیز کی۔ یہ نہیں کہ چھانٹ کر بے کار چیزیں کسی کو دے کر سمجھو کہ تم نے حاتم طائیؓ کی قبر پر ملا مار دی ہے۔

اس راستے کا دوسرا وصف یا سنگ میل تقویٰ (وَاتَّقُوا) ہے۔ یعنی انسان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا۔ ہر لمحہ برائی کی خدادار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں رہنا اور مسلسل کوشش کرتے رہنا کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں اور کسی کا حق نہ ماروں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ وہ اخلاقی حس زندہ و بیدار ہو جس کا ذکر سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَالْقَلَمَہَا فُجُورُہَا وَتَقْوِہَا﴾ میں آیا ہے۔ اگر اس کی اخلاقی حس کی شمع ہوا و ہوس کے طوفان کی نذر ہو چکی ہو تو پھر ظاہر ہے کہاں کا تقویٰ اور کس کا ڈر!

**آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾** ”اور اس نے تصدیق کی اچھی بات کی۔“

یہ خیر کے راستے کی تیسری شرط یا اس کا تیسرا وصف ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھلائی اور حق کی کوئی بات انسان کے سامنے آئے اور اس کا دل گواہی دے دے کہ ہاں یہ بات حق ہے تو وہ بلا ترّد اس کی تصدیق کر دے۔ یعنی وہ بھلائی، سچائی اور حق کی تصدیق کرنے کے لیے عواقب و نتائج کی پروا نہ کرے۔ حق کو حق جان کر اس کی تصدیق و توثیق کے لیے سو دو زیاں کا ترازو نصب کر کے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس حوالے سے اپنی انا کو آڑے آنے دے۔ جیسے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی بحث کے دوران ایک آدمی پر واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی بات درست ہے مگر وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس کے موقف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

**آیت ۷ ﴿فَسَيَسِّرُہُ لِلْيُسْرٰی﴾** ”تو اس کو، ہم رفتہ رفتہ آسان منزل (جنت) تک پہنچا دیں گے۔“ اس حوالے سے سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿وَنُيَسِّرُکَ لِلْيُسْرٰی﴾ ”اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسان منزل تک۔“ لیکن سورۃ الاعلیٰ کی نسبت یہاں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں

آیا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں اگلی آیات میں دوسرے راستے اور اس کے تین سنگ ہائے میل کا ذکر آ رہا ہے:

**آیت ۸ ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ﴾** ”اور جس نے بخل کیا“

پہلی تین خصوصیات کی ترتیب ذہن میں رکھیے اور نوٹ کیجیے کہ ”إعطاء“ کے مقابلے میں یہاں بخل آ گیا ہے۔

**﴿وَأَسْتَعْنِيَ﴾** ”اور بے پروائی اختیار کی۔“

بھلائی اور خیر کے راستے کی تین خصوصیات میں إعطاء کے بعد تقویٰ یعنی پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور ذمہ داری کے احساس کا بیان تھا۔ اس کے مقابلے میں لا ابالی پن لا پرواہی اور بے نیازی (استغناء) کا تذکرہ ہے۔ گویا ایک شخص حلال و حرام کی تمیز سے نا آشنا اور نیکی و بدی کے تصور سے بیگانہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا ہے۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اس کی بلا سے کسی کی عزت پر حرف آتا ہے تو آتا رہے کسی کے جان و مال کی حرمت پامال ہوتی ہے تو بھی پروا نہیں! غرض اپنی سوچ ہے اپنی مرضی ہے اور اپنے کام سے کام ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

**آیت ۹ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى﴾** ”اور جھٹلایا اچھی بات کو۔“

یعنی اس کے دل نے گواہی دے دی کہ یہ سچ اور حق بات ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تعصب یا تکبر یا ہٹ دھرمی یا مفاد یا کسی خوف کی وجہ سے اسے جھٹلایا۔ واضح رہے اس آیت کا تقابل آیت ۶ (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى) کے ساتھ ہے۔

**آیت ۱۰ ﴿فَسَيَرَىٰ لِنَفْسِهِ﴾** ”تو اس کو ہم رفتہ رفتہ مشکل منزل (جہنم) تک پہنچا دیں گے۔“

یہ ہیں انسانی کوشش اور مشقت کے دورخ۔ گویا پہلی تین شرائط کو اپنانے کا راستہ صدیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ اگر کسی نے کوشش کی لیکن وہ مذکورہ تینوں شرائط کو کما حقہ پورا نہ کر سکا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوشش اور اخلاص کے مطابق ہوگا۔ لیکن جس بدقسمت شخص کی کوشش اور محنت میں ان تینوں اوصاف کا فقدان ہوا اور وہ ان کے مقابلے میں عمر بھر دوسرے راستے (بخل، استغناء اور تکذیب) پر گامزن رہا، ظاہر ہے اس کا شمار ان بدترین لوگوں کے گروہ میں ہوگا جس کے سرغنہ ابولہب اور ابو جہل ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ابو جہل کے مقابلے میں ابولہب کا کردار کہیں زیادہ گھٹیا اور مذموم تھا، بلکہ قرآن مجید نے جس انداز میں اس کی مذمت کی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کا بدترین فرد تھا۔ بز دلی، بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی خود غرضی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس کے بخل اور مال کو سینت سینت کر رکھنے کا ذکر سورۃ الہلب میں بھی آیا ہے۔ اس کی بز دلی اور خود غرضی کا پول اس وقت کھلا جب اس کے سامنے اپنے ”دین“ کے لیے جنگ کرنے کا مرحلہ آیا، اس وقت اس نے اپنی جگہ کرائے کے دو سپاہیوں کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے مقابلے میں ابو جہل صاف گوبہادر اور اپنے نظریے پر مرمٹنے والا شخص تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے باطل دین کی خاطر بڑے فخر سے گردن کٹوائی۔ انگریزی کی مثل ہے: ”give the devil his due“ یعنی شیطان کے کردار میں بھی اگر کوئی مثبت خصوصیت ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت میں

آخر کوئی تو خوبی تھی جس کی بنا پر حضور ﷺ نے اپنی خصوصی دعائیں اسے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ایک ہی پڑے میں رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے تو ان دونوں شخصیات کے لیے برابر کی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمر بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے! حضور ﷺ کی اس دعا کی روشنی میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ابو جہل ایمان لے آتا تو وہ حضرت عمرؓ کے پائے کا مسلمان ہوتا نہ کہ عبد اللہ بن ابی کے کردار والا مسلمان۔

بہر حال ان آیات میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کے معیار اور اوصاف کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو انسان اپنی سیرت و شخصیت کی بنیاد پہلے تین اوصاف (بحوالہ آیت ۵ اور ۶) پر رکھے گا وہ ان شاء اللہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور جو آخری تین اوصاف (بحوالہ آیت ۸ اور ۹) کا انتخاب کرے گا وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔

**آیت ۱۱ ﴿وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾** ﴿۱۱﴾ ”اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا جب وہ (جہنم کے) گڑھے میں گرے گا۔“

**آیت ۱۲ ﴿إِنَّا عَلَيْنَا لَلْهُدَى﴾** ﴿۱۲﴾ ”(دیکھو انسانو!) یقیناً ہمارے ذمے ہے ہدایت پہنچا دینا۔“

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانا اور ”ہدایت“ اس تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی ہدایت بھی عطا کی ہے اس کے نفس کے اندر اخلاقی حس بھی الہام کر دی ہے۔ اس کے اندر اپنی روح بھی پھونکی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی امین ہے اور پھر اس ہدایت و معرفت کی تکمیل کے لیے اس نے دنیا میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع سے انسان کو راہ ہدایت دکھانے کا اہتمام فرما دیا ہے۔

**آیت ۱۳ ﴿وَإِنَّا لَنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾** ﴿۱۳﴾ ”اور ہمارے ہی لیے ہے اختیار آخرت کا بھی اور دنیا کا بھی۔“

ظاہر ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کون انسان کامیاب ہوا ہے اور کون ناکام رہا ہے۔ اور دنیا میں بھی وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی قوم اب اس کی زمین پر بوجھ بنے جا رہی ہے اور اس طرح کے کس بوجھ سے کس وقت اس نے زمین کو آزاد کرنا ہے۔ گزشتہ سورت (سورۃ الشمس) میں قوم شمد کے بارے میں اللہ کے ایسے ہی ایک فیصلے کا ذکر ہم بایں الفاظ پڑھ آئے ہیں: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَحَسْوٰهُمْ﴾ ﴿۱۴﴾ ”تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔“ یعنی جب اس قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول واضح نشانیوں کے ساتھ آگیا، پھر اللہ کے رسول نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور اپنے کردار و عمل کا نمونہ پیش کر کے اس قوم پر اتمام حجت کر دیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ قوم کفر و سرکشی پر اڑی رہی تو انہیں ایسے ملیامیٹ کر دیا گیا جیسے کسی باغ کی صفائی کے لیے اس کا سارا کوڑا کرکٹ جمع کر کے اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

**آیت ۱۴ ﴿فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى﴾** ﴿۱۴﴾ ”دیکھو! میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔“

جہنم تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کی تاک میں ہے: ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی﴾ ﴿۱۵﴾ تَدْعُوا مَنَ اَذْبَرُ وَتَوَلَّی﴾ ﴿۱۵﴾

(المعارج) ”وہ بکلیوں کو کھینچ لے گی۔ وہ پکارے گی ہر اس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔“

**آیت ۱۵ ﴿لَا يَصْلٰهَا اِلَّا الْاَشْقٰی﴾** ﴿۱۵﴾ ”نہیں پڑے گا اس میں مگر وہ جو انتہائی بد بخت ہے۔“

ظاہر ہے جس انسان کو آخری رسولؐ کے آجانے کے بعد بھی حقیقت نظر نہ آئی اس سے بڑا بد بخت اور کون ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ جہنم کے گڑھے میں گرنے کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شخص اندھیرے میں یا کم روشنی میں ٹھوکر کھا جائے تو اس کی ٹھوکر کا پھر بھی کچھ نہ کچھ جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دن کی روشنی میں اس وقت راستہ پہچاننے سے انکار کر دے جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو تو ظاہر ہے اس کے لیے وہ خود ہی قصور وار ہوگا۔

**آیت ۱۶ ﴿الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾** ”جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔“

**آیت ۱۷ ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقَى﴾** ”اور بچا لیا جائے گا اس سے جو انتہائی متقی ہے۔“

اس آیت کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیونکہ قبل ازیں آیت ۵ اور ۶ میں جن تین اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ اس اُمت کی جس شخصیت میں تمام و کمال نظر آتے ہیں وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔

”تصدیق بالحق“ کے حوالے سے آپؐ کے بارے میں خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے جس کسی کو بھی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا، سوائے ابوبکرؓ کے۔ ان کے سامنے جو نبی میں نے اپنی نبوت کا ذکر کیا وہ فوراً مجھ پر ایمان لے آئے۔ آپؐ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپؐ توحید پر کاربند اور بت پرستی سے دور رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی آپؐ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپؐ نے کئی نادار خاندانوں کی کفالت مستقل طور پر اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ مکہ کے بہت سے غلاموں اور لونڈیوں کو آپؐ نے منہ ماگی قیمت میں خرید کر آزاد کرایا تھا اور غزوہ تبوک کے موقع پر تو آپؐ نے اپنا پورا اثاثہ لاکر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ غرض مذکورہ تینوں اوصاف بدرجہ اتم اُمت کے مردوں میں آپؐ کی شخصیت میں جبکہ خواتین میں حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔

**آیت ۱۸ ﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى﴾** ”جو اپنا مال دیتا ہے اپنے (نفس) کو پاک کرنے کے لیے۔“

یعنی مال خرچ کرتے ہوئے دنیا داری کا کوئی مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرانے کے لیے امیہ بن خلف کو جب منہ ماگی قیمت ادا کی تو اس پر امیہ خود بھی حیران رہ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ (آپؐ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے) نے بھی آپؐ سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم تم نے کسی طاقتور غلام پر کیوں نہ خرچ کی جو تمہارے کام بھی آتا! (اس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کرتا تھا تو وہ غلام زندگی بھر اسی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اخلاق لحاظ سے بھی وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ عرب رواج کے مطابق ایسے آزاد کردہ غلام کو متعلقہ شخصیت کا مولیٰ کہا جاتا تھا جیسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے مولیٰ تھے۔) بہر حال مال خرچ کرنے کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے جن کی نظر ہر وقت دنیا کے مفادات پر رہتی ہے۔

**آیت ۱۹ ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى﴾** ”اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا وہ

بدلہ چکارہا ہو۔“

**آیت ۲۰ ﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾** ”بلکہ (وہ تو خرچ کر رہا ہے) صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی کے لیے۔“

**آیت ۲۱ ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضَى﴾** ”اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔“

یہاں پر یَرْضٰی کی ضمیر کا اشارہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور اس شخصیت کی طرف بھی جس کی صفات کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ گویا یہ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ جیسی بشارت ہے کہ اگر اللہ کا یہ بندہ اپنا مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے لٹا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ یہاں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ معنوی اعتبار سے اس آیت کا اگلی سورت (سورۃ الضحٰی) کی آیت ۵ کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق ہے جس کی وضاحت سورۃ الضحٰی کے مطالعہ کے دوران کی جائے گی۔

یہاں پر زیر مطالعہ سورتوں (سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحٰی اور سورۃ الانشراح) کے مرکزی مضمون کے اہم نکات ایک دفعہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورۃ الشمس کی ابتدائی آٹھ آیات قسموں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مقسم علیہ کے طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نفس انسانی کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد دو آیات میں اس حوالے سے کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی بتا دیا گیا ہے: ﴿كَذَٰلِكَ أَفْكَحَ مَنْ رَكَّهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۝۱۰﴾ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ٹھہرا اور جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا وہ ناکام ہو گیا۔ اگلی سورت یعنی سورۃ اللیل میں نفس کو سنوارنے اور بگاڑنے کے طریقوں یا راستوں کے بارے میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ جو انسان اعطائے مال، تقویٰ اور تصدیق بالحق کے اوصاف اپنائے گا وہ صدیقیت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بخل، استغناء (حلال و حرام اور جائز و ناجائز سے متعلق لاپرواہی) اور حق کی تکذیب کی راہ پر چلنے والا انسان بالآخر خود کو جہنم کے گڑھے میں گرائے گا۔ پھر کامیابی کے راستے کی مثال کے طور پر امت کی ایک ایسی شخصیت کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا جسے پہلے تین اوصاف کو اپنانے کے باعث اعلیٰ مدارج و مراتب سے نوازا گیا۔ لیکن ظاہر ہے اس منزل کا بلند ترین مقام تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے جو معراج انسانیت ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے حوالے سے اب اگلی دو سورتوں کا تعلق خصوصی طور پر حضور ﷺ کی ذات اقدس سے ہے۔ اسی نسبت سے ان سورتوں کا مطالعہ سیرت النبی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہے۔ متقدمین میں سے تصوف کا ذوق رکھنے والے اکثر مفسرین نے ان سورتوں میں بعض باطنی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ (متعلقہ آیات کے مطالعہ کے دوران جہاں جس حد تک ممکن ہوا ایسے کچھ نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی)۔ ظاہر ہے موجودہ دور کے ”عقلیت پسند“ مفسرین نہ تو تصوف کا ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسے موضوعات سے دلچسپی



ہے۔ (الا ماشاء اللہ!)

# سُورَةُ الضُّحٰی

## تمہیدی کلمات

سورۃ الضحٰی کے شان نزول سے متعلق مختلف روایات میں جو تفصیل ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائے بعثت میں حضور ﷺ پر نزول وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا اور پھر اچانک رک گیا۔ جب یہ وقفہ زیادہ طویل ہوا تو اس کا علم آپ کے مخالفین کو بھی ہو گیا۔ (واضح رہے کہ یہ وقفہ اس وقفے کے علاوہ تھا جو پہلی وحی کے بعد آیا تھا اور جس کا ذکر میرت کی کتابوں میں عام طور پر ”فترت وحی“ کے نام سے ملتا ہے۔) ظاہر ہے حضور ﷺ ہر نئی وحی کا کلام لوگوں کو سناتے تھے۔ جب آپ نے کافی دنوں تک لوگوں کو قرآن مجید کا کوئی نیا حصہ نہ سنایا تو لوگ سمجھ گئے کہ نزول وحی کا سلسلہ رک گیا ہے۔ کچھ روایات میں اس کی وضاحت یوں بھی آئی ہے کہ اس دوران علالت طبع کے باعث آپ چند راتوں تک قیام اللیل کے لیے نہ اُٹھ سکے تو ابولہب کی بیوی آمنہؓ جیل جس کا مکان حضور ﷺ کے مکان سے متصل تھا، آکر کہنے لگی کہ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے! بہر حال مشرکین کو جب معلوم ہوا کہ نزول وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو انہوں نے آپ کو طعنے دینے شروع کر دیے کہ محمد (ﷺ) کو خدا تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے اور وہ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔

یہ کیفیت خود حضور ﷺ کے لیے بھی بے حد پریشان کن اور ناقابل برداشت تھی۔ وحی آپ کی روح کی غذا تھی۔ ہر نئی وحی سے آپ کی روح کو تازگی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کو بار بار یہ خیال بھی آتا تھا کہ شاید مجھ سے کہیں کوئی خطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا ہے۔ لوگوں کے طعنے اس کے علاوہ تھے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اس دوران شدید رنج و غم کی وجہ سے کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ کر خود کو نیچے گرا دوں۔ بہر حال اس پس منظر میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کی آیت ۳ میں خصوصی طور پر آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ کے رب نے نہ تو آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ روحانی انقباض کی کیفیت میں اس سورت کا پڑھنا تریاق کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کی زبان میں قبض یا انقباض انسان کی اس روحانی کیفیت کا نام ہے جب اس کی طبیعت میں ناامیدی اور بندش سی آ جاتی ہے اور اسے ہر معاملے کا تاریک و منفی رخ ہی سوجھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کی مثبت روحانی کیفیت کو تصوف کی اصطلاح میں ”بسط“ کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کی وہ روحانی کیفیت ہے جس میں اسے اپنی طبیعت میں انشراح محسوس ہوتا ہے اور ہر معاملے کا روشن اور مثبت پہلو نظر آتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے نفسیاتی طور پر انسان کے مزاج کے دور رخ ہیں۔ کبھی انسان کی طبیعت ہشاش بشاش اور ہنسنے کھیلنے پر آمادہ ہوتی ہے اور کبھی وہ غمگین و افسردہ ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلُ إِذَا سَجَىٰ ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ أَلَمْ يَجِدَكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَابِدًا فَأَغْنَىٰ ۝ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّابِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

آیت ۱ ﴿وَالضُّحَىٰ ۝﴾ ”قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی۔“

آیت ۲ ﴿وَاللَّيْلُ إِذَا سَجَىٰ ۝﴾ ”قسم ہے رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔“

رات میں اندھیرا اور سکون ہے جبکہ دن اُجالے اور حرکت کا مظہر ہے۔ ان دو آیات میں رات اور دن کی متضاد خصوصیات کو اس فرمان پر بطور شہادت پیش کیا گیا کہ:

آیت ۳ ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝﴾ ”آپ کے رب نے آپ کو رخصت نہیں کیا اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔“

یعنی وحی کے تسلسل میں یہ وقفہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہو گیا ہے بلکہ یہ وقفہ ہماری حکمت و مشیت کا حصہ اور آپ کی تربیت کا جزو تھا۔ ظاہر ہے نظام کائنات میں دن کے اُجالے کے ساتھ رات کی تاریکی کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ جس طرح دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے اسی طرح نفس انسانی کے لیے رستہ و کشادگی لذت کے ساتھ ساتھ ”انقباض“ کی کیفیت سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝﴾ ”اور یقیناً بعد کا وقت آپ کے لیے بہتر ہوگا پہلے سے۔“

یعنی اس وقفے اور ”انقباض“ کی کیفیت کے بعد آنے والی اب ہر گھڑی اور ہر ساعت آپ کے لیے ”انبساط“ اور انشراح کا نیا پیغام لے کر آئے گی۔ ان آیات میں انقباض و انبساط کے حوالے سے جو اصول بیان ہوئے اس کی حیران کن حد تک درست ترجمانی غالب نے اپنے اس مصرع میں کی ہے: ”رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!“ یعنی اشعار کی آمد کے حوالے سے کبھی کبھی مجھ پر انقباض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس وقفے کے بعد دوبارہ آمد شروع ہوتی ہے تو پھر میری طبیعت کی روانی پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ گویا انقباض کے بعد جب انبساط کا مرحلہ آتا ہے تو انسان اپنی پہلی کیفیت کے مقابلے میں ایک درجہ آگے جا چکا ہوتا ہے۔

[اس آیت مبارکہ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ ”یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلے سے (بدرجہ) بہتر ہے۔“ آپ پر آپ کے رب کے لطف و کرم اور انعام و احسان کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ ہر آنے والا وقت گزشتہ حالات سے بہتر سے بہتر ہوگا۔ اس ایک جملہ میں کفار کے طعن و تشنیع اور الزام تراشیوں کا



بھی سد باب کر دیا گیا اور اسلام کے درخشاں مستقبل کے بارے میں بھی نوید جانفزا سنا دی گئی۔]

**آیت ۵** ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ ”اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔“

یعنی اب بہت جلد آپ ﷺ کی محنتوں کے ایسے ایسے نتائج آپ کے سامنے آئیں گے کہ انہیں دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گے۔<sup>(۱)</sup>

یہاں پر پچھلی سورت کی آخری آیت کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلَسَوْفَ يُؤْطَىٰ﴾ گویا جو خوشخبری یہاں حضور ﷺ کو سنائی جا رہی ہے وہی بشارت سورۃ اللیل میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دی گئی ہے۔ دونوں آیات کا اسلوب اصلاً ایک سا ہے، صرف ضمیر اور صیغہ کا فرق ہے۔ حضور ﷺ پر چونکہ وحی آتی تھی اس لیے آپ کو صیغہ حاضر (تَرْضَىٰ) میں براہ راست مخاطب کیا گیا، جبکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے غائب کا صیغہ (يُؤْطَىٰ) آیا ہے۔

”انقباض“ کی مذکورہ کیفیت کے سیاق و سباق میں اب اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اپنے احسانات بتا رہا ہے۔ یہ بھی دراصل حضور ﷺ کے لیے تسلی ہی کا ایک انداز ہے۔ جبکہ اس میں ہمارے لیے بھی راہنمائی ہے کہ جب کسی وقت آدمی پر ڈپریشن اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو تو اسے چاہیے کہ اس کیفیت میں وہ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کو گن گن کر یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ کس کس انداز میں اس کی مدد کرتا رہا ہے اور کسی کیسی مشکلات سے اسے نجات دلاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ماضی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے سے ایک پریشان حال آدمی کا حوصلہ بڑھتا ہے اور اس کی مثبت سوچ کو تحریک ملتی ہے۔

**آیت ۶** ﴿لَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾ ”کیا اُس نے نہیں پایا آپ کو یتیم، پھر پناہ دی!“

یہ آیات سیرت النبی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے حوالے سے بھی بہت اہم ہیں۔ حضور ﷺ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ آپ پیدا ہی تیسری حالت میں ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں والدہ کا سہارا بھی چھین گیا۔ دادا نے اپنی کفالت میں لیا تو دو سال بعد وہ بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ تایازیر بن عبدالمطلب سرپرست بنے تو کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا (حضور ﷺ کی کفالت کے حوالے سے آپ کے تایازیر بن عبدالمطلب کا ذکر اکثر تاریخی حوالوں میں موجود ہی نہیں۔ ایسا دراصل جناب ابوطالب کے کردار

(۱) علامہ سید محمد آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(ترجمہ) ”یہ اللہ تعالیٰ کا کریمانہ وعدہ ہے جو ان تمام عطیات کو شامل ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دنیا میں سرفراز فرمایا۔ یعنی کمالِ نفس، اولین و آخرین کے علوم، اسلام کا غلبہ دین کی سر بلندی، ان فتوحات کے باعث جو عبد رسالت میں ہوئیں اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوئیں یا دوسرے مسلمان بادشاہوں نے حاصل کیں اور اسلام کا دنیا کے مشارق و مغارب میں پھیل جانا۔ نیز یہ وعدہ ان عنایات اور عزت افزائیوں کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کے لیے آخرت کے لیے محفوظ رکھی ہیں جن کی حقیقت اور نہایت کو اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں جان سکتا۔“ (بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن از پیر محمد کرم شاہ الازہری)

کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے جان بوجھ کر باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے)۔ اس کے بعد جناب ابوطالب نے آپ ﷺ کے سر پر دست شفقت رکھا اور انہی کی سرپرستی میں آپ جوانی کی عمر کو پہنچے۔ آیت کے لفظ ”فَلَاوَلٰی“ میں ان تمام دنیوی سہاروں کی طرف اشارہ ہے جو ظاہر ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے فراہم کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان تمام رشتہ داروں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت اور چاہت پیدا کی تھی۔ اسی نے آپ کی شخصیت ایسی بنائی تھی کہ جو کوئی آپ کو دیکھتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بچپن میں سہارا دیا تھا۔ سورہ طہ میں اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حکمت کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَأَلْقَيْنَا عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِنَّا﴾ (آیت ۳۹) کہ اے موسیٰ! میں نے آپ پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے لوگ آپ کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے تھے اور یوں وہ آپ کو قتل کرنے سے باز رہے۔

**آیت ۷** ﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ﴾ اور آپ کو تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی!“ جب آپ شعور کی پختگی کی عمر کو پہنچے اور آپ نے کائنات کے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو راہنمائی فراہم کر دی۔<sup>(۱)</sup>

**آیت ۸** ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ﴾ اور اس نے آپ کو تنگ دست پایا تو غنی کر دیا!“ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ کی ساری دولت آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ حضرت خدیجہؓ بہت مال دار اور صاحب حیثیت خاتون تھیں۔ مکہ کے بڑے بڑے سرداران سے نکاح کے خواہش مند تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دل آپ ﷺ کی طرف پھیر دیا اور انہوں نے خود آپ کو نکاح کا پیغام بھجوایا۔ گزشتہ آیات میں حضور ﷺ کی زندگی کے تین مراحل کے حوالے سے تین احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی ترتیب سے آپ ﷺ کو تین ہدایات دی جا رہی ہیں:

**آیت ۹** ﴿فَإِنَّمَا إِلَهُ الْبَنِيَّةِ فَلَا تَفْهَرْ﴾ ”تو آپ کسی یتیم پر سختی نہ کریں۔“ جیسے آپ کی یتیمی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی کفالت وغیرہ کا بندوبست کیا، اسی طرح اب آپ بھی یتیموں

(۱) اس آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

”جب حضرت جوان ہوئے، قوم کے شرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم و راہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا۔ عشق الہی کی آگ سیدہ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ اور ہدایت خلق کی اُس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا اندر ہی اندر جوش مارتا تھا، لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اُس عرش و کرسی سے وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اسی جوش طلب اور فرط محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر بالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غایر میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں، یعنی دین حق نازل فرمایا: ﴿مَا كُنْتُ نَذْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا تَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

کی سرپرستی کریں اور انہیں لوگوں کی زیادتیوں سے بچائیں۔

**آیت ۱۰** ﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَوْهُ ۝۱۰﴾ ”اور آپ کسی سائل کو نہ جھڑکیں۔“

ایک وقت تھا جب آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ہم نے آپ کو ہدایت عطا فرمائی تھی۔ اب اگر آپ کے پاس کوئی سائل اپنی حاجت لے کر آئے تو اس کی حاجت روائی کریں اور اسے جھڑکیں نہیں۔ ظاہر ہے سائل بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کوئی مالی معاونت کے لیے سوال کرتا ہے تو کوئی علم کی تلاش میں لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔

**آیت ۱۱** ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱﴾ ”اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کریں۔“

یہ ہدایت جو آپ کو عطا ہوئی ہے یہ آپ کے رب کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر کا تقاضا ہے کہ آپ اس کی اس نعمت کا چرچا کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلائیں۔ اس حکم میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ ہدایت کی نعمت کو اگر انسان اپنی ذات تک محدود کر کے بیٹھ رہے تو اس کا یہ طرز عمل بخل کے مترادف ہوگا۔ لہذا جس کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی دولت سے نوازے اسے چاہیے کہ اس خیر کو عام کرے اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔



# سُورَةُ الْمُنَشَّرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۚ الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۖ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۚ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ فَاِذَا اَفْرَغْتَ فَاَنْصَبْ ۚ وَاِلَىٰ رَبِّكَ يٰۤا ۚ فَارْغَبْ ۚ

**آیت ۱** ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۖ﴾ ”کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟“  
یعنی ہم نے آپ کا اضطراب کم کر کے آپ کے دل کو ایک خبر آؤ اور سکون عطا فرما دیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”اس میں علوم و معارف کے سمندر اُتار دیے اور لوازم نبوت اور فرائض رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔“

**آیت ۲** ﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۚ﴾ ”اور ہم نے اُتار نہیں دیا آپ سے آپ کا وہ بوجھ؟“

**آیت ۳** ﴿الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۖ﴾ ”جو آپ کی کمر کو توڑے دے رہا تھا؟“

**آیت ۴** ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۚ﴾ ”اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔“ (۱)

**آیت ۵** ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ﴾ ”تو یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔“

**آیت ۶** ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ﴾ ”یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔“

یہ سورت دراصل مشکلات القرآن میں سے ہے۔ آیت ۲ میں جس بوجھ کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی مشقتوں اور لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے

(۱) صحیح ابن حبان مسند ابی یعلیٰ الموصلی اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سعد بن مالک اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما

سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا جَبْرَائِلُ فَقَالَ: اِنَّ رَبِّي وَرَبُّكَ يَقُولُ لَكَ: اَتَذَرُنِي كَيْفَ رَفَعْتُ ذِكْرَكَ؟ قُلْتُ: اللّٰهُ اَعْلَمُ۔

قَالَ: اِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ مَعِيَ))

”حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے ذکر کو کس طرح بلند کیا ہے؟ میں نے جواب دیا: اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (آپ کے رفع ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ) جہاں میرا ذکر کیا جائے گا وہاں آپ کا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔“ (حاشا از مرتب)

والی اذیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رائے صرف جزوی طور پر درست ہے اس لیے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کی مشکلات کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور بعد کے زمانے میں آپ کو نسبتاً بہت زیادہ مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ مثلاً شعب ابی طالب میں تین سال کی قید کا واقعہ اس سورت کے نزول کے بعد پیش آیا اور اس کے بعد ہی آپ کو یوم طائف اور یوم اُحد جیسے گھمبیر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت و تبلیغ اور آپ کے فریضہ رسالت سے متعلقہ مشکلات بھی اس سورت کے نزول کے بعد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھیں، بلکہ بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں جس بوجھ کے اتار دینے کا ذکر ہوا ہے وہ اصل میں کوئی اور بوجھ تھا۔

اس بوجھ کی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو اپنے قرب خاص کی نعمت سے نوازتا ہے۔ چنانچہ قرب خاص کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد انبیاء و رسل علیہم السلام کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کیفیت میں گزاریں۔ لیکن وہاں سے حکم ملتا ہے کہ جاؤ خلق خدا تک میرا پیغام پہنچاؤ اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھاؤ! مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر اپنے قرب خاص سے نوازا اور آپ سے کلام فرمایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تو یہی ہو گئی کہ وہ سدا اسی کیفیت میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مکالمے اور مخاطبے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا: ﴿وَإِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ أَنَّهُ طَغَىٰ﴾ (۳۳) ”اب جاؤ فرعون کی طرف“ وہ برا سرکش ہو گیا ہے!“ ظاہر ہے فریضہ رسالت کی ادائیگی کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس بارے میں اصل حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی اور طنز و تمسخر کے تیر برسائے جاتے تھے، حتیٰ کہ جسمانی اذیت پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ الغرض اس راستے میں تو ہر قدم پر مخالفت اور ہر موڑ پر تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں پیغمبروں کو دوسری طرف مشکل کا سامنا رہا ہے یعنی ایک طرف قرب و حضوری کی خصوصی کیفیت سے باہر آنے کا مالال اور دوسری طرف لوگوں کے رویے کے باعث دل پر تنکد کا بوجھ۔ کہاں وہ قرب خاص کا کیف و سرور اور کہاں یہ مشقت بھری مصروفیات۔ روح اور طبیعت کا میلان تو ظاہر ہے اسی طرف ہو گا کہ وہی خلوت ہو، وہی حضوری ہو اور وہی کیف و سرور ہو۔ غالب نے اپنی زبان اور اپنے انداز میں محبوب کی قربت کے حوالے سے انسان کی اس کیفیت اور خواہش کی ترجمانی یوں کی ہے:-

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے!

اس صورت حال یا کیفیت کو علامہ اقبال کے بیان کردہ اس واقعہ کے حوالہ سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات (چوتھے لیکچر) میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں انہیں اقامت کی آواز سنائی دی۔ آپ فوراً نماز کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جھنجھلا کر کہا: ”حضوری سے نکال کر درباری میں کھڑا کر دیا!“ اب ظاہر ہے حضوری کی کیفیت میں تو اور ہی لذت تھی جبکہ نماز میں جماعت کا نظم و ملحوظ رکھنے کی پابندی ہے اور ہر صورت میں امام کی اقتدا ضروری

ہے۔ فرض کریں مقتدی کو تلاوت سننے میں لذت محسوس ہو رہی ہے اور وہ مزید سننا چاہتا ہے لیکن یہاں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے جب امام قراءت ختم کر کے رکوع میں جائے گا تو اسے اس کی اقتدا کرنا ہوگی۔ اگر وہ دیر تک سجدہ میں ہی پڑے رہنا چاہتا ہے تو بھی اسے اپنا سجدہ مختصر کر کے امام کی اقتدا میں سر اٹھانا ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کو مد نظر رکھتے ہوئے اب آپ حضور ﷺ کی اس کیفیت کا تصور کیجیے جب حضور ﷺ رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اس وقت آپ کی روح کیسی کیسی قربتوں اور رفتوں سے آشنا ہوتی ہوگی اور آپ کے قلب مبارک پر کیسے کیسے انوار و تجلیات کی بارش ہوتی ہوگی۔ پھر صبح کو جب آپ اہل مکہ کے درمیان جا کر ان سے شاعر، مجنون، کذاب (نعوذ باللہ) جیسے القابات سننے ہوں گے اور ان کے تمسخر بھرے جملوں کا سامنا کرتے ہوں گے تو آپ اپنی طبیعت میں کیسا تکدر اور کیسی کوفت محسوس کرتے ہوں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے لیے اصل معاملہ یہ تھا کہ ”عروج“ (قرب خاص) کی لذت کے بعد ”نزول“ کا مرحلہ آپ پر بہت شاق گزرتا تھا۔ اور یہی وہ ”بوجھ“ تھا جو آپ کی کمر کو دہرا کیے دے رہا تھا۔ البتہ رفتہ رفتہ آپ کا مزاج جب اس معمول کا خوگر ہو گیا تو اس بوجھ کے احساس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ پھر جب روز بروز اہل ایمان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی تو دعوت و تحریک کی مصروفیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے تسکین کا سامان پیدا فرمادیا۔

بہر حال یہاں پر یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ فریضہ رسالت کی انجام دہی کے لیے عروج اور نزول (ان) کیفیات کے لیے صوفیاء کے ہاں ”سیر الی اللہ“ اور ”سیر عن اللہ“ کی اصطلاحات بھی معروف ہیں) کی دونوں کیفیات کا بیک وقت باہم متوازی چلنا ضروری ہے۔ اس نکتہ لطیف کو مولانا روم نے بارش کی مثال سے بہت مؤثر انداز میں سمجھایا ہے۔ مولانا کی بیان کردہ اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات کی شکل میں بالکل صاف اور پاکیزہ پانی فضا میں پہنچتا ہے۔ بارش برستی ہے تو یہ صاف پانی فضا کی کدورتوں کو بھی صاف کرتا ہے زمین کی گندگیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر سمندر میں ڈال دیتا ہے اور اس کے بعد سمندر سے پھر بخارات بن کر صاف اور پاکیزہ حالت میں بارش کے لیے فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس مثال کو حضور ﷺ کی ذات پر منطبق کرتے ہوئے یوں سمجھیں کہ حضور ﷺ کو ”سیر الی اللہ“ (قیام اللیل اور خلوت کی مناجات وغیرہ) کے ذریعے روحانی ترفع حاصل ہوتا۔ پھر جب آپ ”سیر عن اللہ“ کی صورت میں معاشرے کی طرف رجوع فرماتے تو آپ کی رت اور روحانیت لوگوں پر بارش کی طرح برستی اور راستے میں آنے والی تمام ظاہری و باطنی آلائشوں اور کدورتوں کو دھو ڈالتی۔ اسی دوران لوگوں کی مخالفت اور گھٹیا حرکات کے باعث آپ کی ”روحانیت“ میں کچھ تکدر بھی پیدا ہوتا جسے ”سیر الی اللہ“ کے اگلے مرحلے میں صاف کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ نتائج کے اعتبار سے تو دعوت و تبلیغ کی مصروفیات بھی ”سیر الی اللہ“ ہی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن عملی طور پر اس کی کیفیت بظاہر ”سیر عن اللہ“ جیسی ہے۔ جیسے نماز کی حالت میں انسان کا رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے لیکن ایک داعی جب نماز سے فارغ ہو کر تبلیغ کے لیے نکلتا ہے تو بظاہر اس کی پشت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور رخ لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔

آیت ۸۷ ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ ۸ ﴿”پھر جب آپ (فرانض نبوت

سے) فارغ ہو جائیں تو اسی کام میں لگ جائیے۔ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیے۔“

تو اے نبی ﷺ! جب آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو جائیں اور اللہ کا دین غالب ہو جائے تو پھر آپ یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نوٹ کیجیے! سورۃ النصر میں بھی حضور ﷺ کے لیے بالکل یہی پیغام ہے:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۖ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ ۱۰

یعنی جب غلبہ دین کے حوالے سے آپ کا مشن مکمل ہو جائے تو پھر ہر تنہا ہر وقت آپ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیے گا اور تقرب الی اللہ کے لیے محنت شروع کر دیجیے گا۔ چنانچہ جو نبی آپ کا مشن پایہ تکمیل کو پہنچا تو آپ نے فوراً محبوب کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا (اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰی) کہ اے اللہ اب میں اپنے فرانض منصبی سے فارغ ہو گیا ہوں اب مجھ میں مزید انتظار کا یا رانہیں! واضح رہے کہ انبیاء و رسل ﷺ کو اللہ تعالیٰ دنیا میں مزید رہنے یا کوچ کرنے سے متعلق اختیار عطا فرماتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ آخری ایام میں ایک دن جب حضور ﷺ کے مرض میں افاتہ ہوا تو آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ منبر پر فروکش ہوئے اور خطبہ دیا۔ اس کے بعد منبر سے نیچے تشریف لائے۔ ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور چند اہم نصیحتیں فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: ”ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ وہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب و زینت میں سے جو کچھ چاہے اللہ اسے دے دے یا اللہ کے پاس جو کچھ ہے اسے اختیار کر لے تو اس بندے نے اللہ کے پاس والی چیز کو اختیار کر لیا۔“ یہ بات سن کر ابو بکر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور فرمایا: ”ہم اپنے ماں باپ سمیت آپ پر قربان!“ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضور ﷺ کیا ارشاد فرما رہے ہیں اور اس پر ابو بکر کیا کہہ رہے ہیں! لیکن چند دن بعد واضح ہوا کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے اور ابو بکر صدیقؓ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ صاحب علم تھے۔

یہاں حضور ﷺ کے اس فرمان کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل کی بات زبان پر آگئی ہے — وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے مجھے حضور ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیا تو میں حضور ﷺ سے شکوہ کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ حضور! آپ نے بہت جلدی کی ..... حضور! مانا کہ ہجر و فراق کا ایک ایک لمحہ آپ کے لیے مشکل تھا ..... مگر حضور! جو لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے تھے وہ بھی تو آپ کے فیضانِ نظر کے محتاج تھے ..... حضور! اگر تھوڑا سا وقت ان کو بھی مل جاتا تو ..... مہاجرین و انصار کی طرز پر ان کی تربیت بھی ہو جاتی .....!!!



# سُورَةُ التَّيْنِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ التین میں انسانی زندگی کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو سے متعلق اہم حقائق بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس سورت کا مضمون چونکہ انسان کی تخلیق سے متعلق ہے اس لیے اسے سمجھنے کے لیے نفس انسانی کی تخلیق کے بارے میں سورۃ الشمس کی آیت ﴿فَالْتَمِهْمَهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۸﴾ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے بارے میں یہ حقیقت واضح فرمادی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز الہام کر دی گئی ہے۔ اب اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایسے انسان کا تصور کریں جس کی اخلاقی حس پوری طرح فعال و بیدار ہے۔ ایسا انسان جب ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو دیکھتا ہے (بد قسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اجتماعی بگاڑ کا مثالی نقشہ پیش کرتا ہے) تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید انسان بنیادی طور پر بہت گھٹیا اور گندی مخلوق ہے اور یہ کہ شاید اس میں خیر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے دور جدید کے تقریباً تمام ماہرین نفسیات اس نکتے پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر حیوانی داعیات یعنی پیٹ اور شہوت کے تقاضوں اور حُبِ تفوق (urge to dominate) کے علاوہ اور کوئی حس یا داعیہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ صورت حال ایک حساس انسان کے لیے یقیناً نہت مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ سورت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان صرف شر کا پتلا اور گناہ کی پوٹلی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت اعلیٰ بلند یوں کو چھونے کی صلاحیت بھی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَنْزَلْنَاهُ الرُّوحُ الْكَافِرُ

وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سَيْنِينَ ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّكْرِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ ۝

**آیت ۱** ﴿وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝﴾ ”گواہ ہے انجیر اور گواہ ہے زیتون۔“

**آیت ۲** ﴿وَطُورِ سَيْنِينَ ۝﴾ ”اور گواہ ہے طور سینا۔“

**آیت ۳** ﴿وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝﴾ ”اور گواہ ہے یہ امن والا شہر۔“

التین کے معنی انجیر کے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قوم نوح کے علاقے میں ایک بڑے پہاڑ کا نام بھی



جبل التین تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی پہاڑ کے دامن میں ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی طرح الزیتون سے مراد زیتون کا بھل اور درخت بھی ہے اور وہ پہاڑی بھی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تبلیغی خطبات دیا کرتے تھے۔ ان خطبات میں سے آپ کا ایک خطبہ ”پہاڑی کے وعظ“ (Sermon of the Mount) کے نام سے خاص طور پر مشہور ہے۔ تیسری قسم (وَطُورِ سَيْنِينَ) کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ کوہ طور پر آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اور امن والے شہر سے مکہ مکرمہ مراد ہے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ اس سورت کے نزول کے وقت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گویا ان آیات میں جن مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں سے ہر مقام کا تعلق ایک جلیل القدر شخصیت سے ہے۔ گویا ان شخصیات کو گواہ بنا کر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بنیادی طور پر انسان بہت بلند مرتبت اور صاحب عزت و عظمت مخلوق ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے نوح علیہ السلام کی زندگی کے شب و روز کا تصور کرے۔ اس کے بندے عیسیٰ علیہ السلام کے کردار کا نقشہ ذہن میں لائے، موسیٰ علیہ السلام کی عظیم المرتبت شخصیت کو یاد کرے اور پھر سب سے بڑھ کر اس کے بندے محمد ﷺ کی بے مثال سیرت کا نمونہ دیکھے۔ یہ شخصیات ان کے کردار اور ان کی سیرتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

**آیت ۴** ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ ”ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔“  
ہم نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوُجُوهِ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (بنی اسرائیل)  
”اور ہم نے بڑی عزت بخشی ہے اولاد آدم کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر، بہت بڑی فضیلت“۔ نسل انسانی کی عزت و تکریم کی انتہا یہ ہے کہ ان کے جدا مجد کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا (ص: ۷۵) اور موجود ملک بنا یا۔

اگر تمہیں یہ دنیا ظالموں، بدکاروں اور گھٹیا انسانوں سے بھری نظر آتی ہے تو اللہ نے بھی تمہارے سامنے اپنے ایسے چار بندوں کی مثالیں پیش کر دی ہیں جو عظمت انسانی کے زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی عقل کا اندھا یہ دعویٰ کرے گا کہ انسان کے اندر خیر اور عظمت کا کوئی پہلو سرے سے موجود ہی نہیں؟ بہر حال اگر کوئی شخص عظمت کے ان میناروں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انسانی عظمت کا قائل نہ ہو اور اس عظمت و اکرام کو پانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے تو یقیناً اس کا شمار نسل انسانی کے ان افراد میں ہوگا جو شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ كَانُوا لَنَا نَجْمًا﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

**آیت ۵** ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ ”پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف۔“  
پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم المرتبت مخلوق (کی روح) کو اس کے جسد خاکی میں بٹھا کر نیچے دنیا میں بھیج

دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر جہالت کی تاریکی میں نہیں بلکہ ہدایت کے اجالے میں بھیجا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی اور ناکامی کے راستوں کا شعور بھی عطا کیا، اس کی فطرت میں نیکی و بدی کی تمیز بھی و دیت کی اور وقتاً فوقتاً وہ براہ راست ہدایات بھی بھیجتا رہا: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر: ۱۹) کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اور اس کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اب اگر وہ اپنے شرف انسانی کو بھلا کر محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے اور خود کو حیوان ہی سمجھتا رہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی سرشت (حیوانی وجود کے تقاضوں) کے اعتبار سے انسان میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اپنی فطرت (روح) کے لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ اور عظیم المرتبت مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس کے حیوانی جسم میں متمکن فرما کر اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا ارفع و اعلیٰ روحانی وجود اس کے حیوانی جسم میں قید ہو کر گویا اسفل (نچلی) مخلوق کی سطح پر آ گیا۔ چنانچہ دنیوی زندگی میں اس کے سامنے اصل ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے شعور اور اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کے مطابق راستہ اختیار کرے، اس راستے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے محنت کرے اور اسفل سطح سے اوپر اٹھ کر اپنی اصل عظمت اور حقیقی منزل کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگلی آیت میں اس راستے کی نشاندہی اور مطلوبہ محنت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے:

**آیت ۶** ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے“

اب مذکورہ ہستی سے صرف وہی لوگ نکل پائیں گے جو اپنے شعور و حواس سے کام لیتے ہوئے اپنے خالق اور معبود کو پہچانیں گے یعنی اس پر ایمان لائیں گے اور پھر محنت کر کے اپنے کردار و عمل کو اس کی منشاء و مرضی کے مطابق ڈھالیں گے، یعنی اعمال صالحہ کا اہتمام کریں گے۔

﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ ⑤ ”تو ان کے لیے ایسا اجر ہوگا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔“

**آیت ۷** ﴿فَمَا يَكْذِبُكَ بَعْدَ الْبَلَدَيْنِ﴾ ⑥ ”تو اس کے بعد کیا چیز تھے آمادہ کرتی ہے جزا و سزا کے

انکار پر؟“

تو اے جزا و سزا کے منکر انسان! جب تو خود دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں ہیں، ان میں کچھ بہت اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے ماتھے پر بدنام داغ کی حیثیت رکھتے ہیں، تو اس صورت حال میں کیا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اچھوں کو ان کی اچھائی اور محنت کا پھل ملے اور بدوں کو ان کی برائی اور نافرمانی کی سزا دی جائے؟ یہ ایسی سیدھی سادی بات ہے جو عام ذہنی سطح کا ایک انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ تو یہ سب کچھ دیکھنے سننے اور سمجھنے کے بعد بھی آخردہ کون سی منطق ہے جس کے تحت تم جزا و

سزا کے انکار پر جے ہوئے ہو؟

**آیت ۸** اَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸﴾ ”کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟“

دنیا میں تم لوگ چھوٹے چھوٹے حاکموں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے غداروں اور باغیوں کو عبرتناک سزا دیتے ہیں اور اپنے وفاداروں کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ کیا دنیا میں تم نے کوئی ایسا حاکم بھی دیکھا ہے جو اپنے باغیوں اور وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟ اگر دنیا میں محدود اختیار کا مالک کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ عزوجل اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کو کیسے برابر کر دے گا جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین نہیں مانتے ہو؟

مسند احمد، سنن الترمذی، سنن ابی داؤد اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سورۃ التین پڑھے اور اَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ پر پہنچے تو کہے: بلی وانا علیٰ ذلک من الشاہدین ”کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔“ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبْحَانَكَ قَبْلٰی!



# سُورَةُ الْعَلَق

## تمہیدی کلمات

سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بارے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ غار حرا میں حضور ﷺ پر جو پہلی وحی آئی تھی وہ ان آیات پر مشتمل تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ رات کو آپ جو خواب دیکھتے دن کو اس کی تعبیر ہو، ہو وہی سامنے آ جاتی۔ پھر آپ خلوت گزینی کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ کئی کئی راتوں تک غار حرا میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرماتی ہیں فَيَحْتَضُّتُ فِيهِ یعنی غار حرا میں آپ عبادت کیا کرتے تھے۔ غار حرا کی خلوت میں آپ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی اس بارے میں تمام شارحین حدیث کا اجماع ہے کہ وہاں پر آپ اپنا وقت غور و فکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپ غار حرا میں مصروف ذکر و فکر تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آپ سے کہا: اقْرَأْ کہ پڑھئے۔ آپ نے فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپ نے پھر فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ۔ حضرت جبرائیل نے پھر وہی عمل دہرایا اور آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب حضرت جبرائیل نے تیسری مرتبہ آپ کو بھینچنے کے بعد فرمایا: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ ①..... الخ تو مذکورہ آیات آپ کی زبان مبارک پر جاری ہو گئیں۔ اس حوالے سے مجھے اس روایت سے اتفاق ہے کہ اس وحی کے نزول کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس سونے کی ایک تختی لے کر آئے تھے جس پر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر حضرت جبرائیل نے آپ کو زبانی پڑھا نا ہوتا تو آپ یقیناً مذکورہ جواب نہ دیتے۔ یعنی ضرور آپ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی تھی جسے دیکھ کر پڑھنا تھا۔ تبھی آپ ﷺ نے فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ۔

اس وحی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس اپنی اصلی مَلَکَی شکل میں آئے تھے۔ اس وقت اگرچہ آپ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی کیفیت میں تھے لیکن آپ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک طویل وقفے (فترت وحی) کے بعد چوتھی وحی کے نزول کے موقع پر حضرت جبرائیل آپ کو افاق پر نظر آئے (اس واقعہ کی تفصیل سورۃ المدثر کے تمہیدی کلمات میں بیان ہو چکی ہے) تو آپ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو قبل ازیں میرے پاس غار حرا میں آیا تھا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ ۝ اسْتَغْنَى ۝ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ۝ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۝ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ ۝ أَوْ أَمَرَ بِالْتَّقْوَىٰ ۝ أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۝ كَلَّا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ كَلَّا لَا تَطِعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝

**آیت ۱** ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ①﴾ ”پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔“  
**آیت ۲** ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ②﴾ ”انسان کو پیدا کیا ہے اُس جو تک کی طرح کی چیز سے جو رحم مادر میں چمٹ گئی تھی۔“

**آیت ۳** ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ③﴾ ”پڑھیے اور آپ کا رب بہت کریم ہے۔“  
**آیت ۴** ﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④﴾ ”جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔“  
 گویا عام انسانی تعلیم کا ذریعہ قلم ہے جبکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے لیے فرشتہ مقرر ہوا۔

**آیت ۵** ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤﴾ ”اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔“  
 پہلی وحی ان پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اس وحی میں حضور ﷺ کو تبلیغ و انداز سے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ اس وحی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس سے آپ کی نبوت کا ظہور ہوا (ہر نبی اگرچہ پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے لیکن اس کی نبوت کا باقاعدہ ظہور پہلی وحی کے وقت ہوتا ہے)۔ تبلیغ کا باقاعدہ حکم آپ کو سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبُّكَ فَكَثِيرٌ ③﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یعنی اے نبی (ﷺ) اب آپ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیجیے۔ سورۃ العلق اور سورۃ المدثر کے مابین اس لحاظ سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے کہ سورۃ المدثر کی طرح یہ سورت بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پھر جس طرح سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات میں حضور ﷺ سے خطاب کے بعد تین آیات میں قیامت کا ذکر آیا ہے بالکل اسی طرح اس سورت میں بھی پہلی پانچ آیات میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور اس کے بعد درج ذیل تین آیات میں آخرت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

**آیت ۶** ﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ ⑥﴾ ”کوئی نہیں! انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔“  
 انسان سرکشی اور ظلم و زیادتی پر کیوں اتر آتا ہے؟ اس کی وجہ اگلی آیت میں بتائی گئی:

**آیت ۷** ﴿أَنْ رَّاهُ اسْتَعْصَىٰ﴾ ”اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو مستعنی دیکھتا ہے۔“

وہ دیکھتا ہے کہ اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ دنیا میں نہ تو ظالم کو اس کے ظلم کی قرار واقعی سزا ملتی ہے اور نہ ہی مظلوم کی کماحقہ دادرسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دنیا کا نظام محض طبعی قوانین و ضوابط (physical laws) کے مطابق چل رہا ہے اور یہ کہ یہاں اخلاقی قوانین (moral laws) کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی کا تجربہ بھی اسے یہی بتاتا ہے کہ زہر کھانے سے تو آدمی ہلاک ہو جاتا ہے لیکن حرام کھانے سے اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معاشرے کے عام آدمی کو نیکی، انصاف، دیانت داری جیسے الفاظ عملی طور پر بے معنی اور بے وقعت نظر آتے ہیں تو وہ سرکشی اور سمن مرضی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ اب اگلی آیت میں انسان کی اس سرکشی اور بغاوت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اس یاد دہانی میں ہے کہ:

**آیت ۸** ﴿إِنِّي إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾ ”یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

گویا انسان کو راہِ راست پر رکھنے کا جو موثر ترین علاج ہے وہ ہے عقیدہ آخرت پر پختہ یقین۔ یعنی یہ یقین کہ ایک دن اسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور وہ عدالت بھی ایسی ہے جہاں ذرہ برابر بھی کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکے گی: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزال) ”جس کسی نے ذرے کے ہم وزن نیکی کمائی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔“ گویا یہ عقیدہ آخرت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن کی پیشی کا خوف ہی ہے جو انسان کے اندر خود احتسابی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یہی یقین اور خوف اسے خلوت و جلوت میں اندھیرے اُجالے میں اور ہر جگہ ہر حال میں غلط روی اور ظلم و تعدی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ جس مفاد تک اس کا ہاتھ پہنچتا ہو اسے سمیٹنے کے لیے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی پروا نہیں کرتا۔

اب اگلی آیت سے اس سورت کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ المدثر کے ساتھ اس سورت کے مضامین کی مشابہت کا انداز ملاحظہ ہو کہ سورۃ المدثر کے تیسرے حصے میں ولید بن مغیرہ کے کردار کی جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ یہاں اس کے مقابل ابو جہل کے طرزِ عمل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

**آیت ۹** ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ﴾ ”کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو روکتا ہے۔“

**آیت ۱۰** ﴿اَلْعَبْدَ إِذَا صَلَّىٰ﴾ ”(ہمارے) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔“

یہ اشارہ ہے ابو جہل کی ان جسارت آمیز حرکات کی طرف جو وہ حضور ﷺ کو نماز سے روکنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہل نے آپ کو دیکھا تو اونٹ کی اوجھڑی منگوا کر عین سجدے کی حالت میں آپ کی پشت مبارک پر رکھوا دی۔ حضرت فاطمہؓ ابھی بچی تھیں ان کو پتا چلا تو آپ گھر سے بھاگ بھاگ حرم میں پہنچیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس غلاظت کو آپ کے اوپر سے ہٹایا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ابو جہل نے آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال

کہ اس قدر زور سے مروڑا کہ آپ کی آنکھیں ابل پڑیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور ﷺ کے سفر طائف سے واپسی کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل روایات میں یوں آتی ہے کہ ابو جہل نے لات اور عزی کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اگر اس نے پھر محمد (ﷺ) کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو ان کی گردن روند ڈالوں گا اور ان کا منہ خاک آلود کر دوں گا۔ ایک دن اُس نے آپ ﷺ کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھا تو غصے میں آپ کو ڈانٹتے ہوئے آپ کی طرف بڑھا تا کہ اپنی قسم پوری کرے مگر پھر یکدم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کیوں پیچھے ہٹ آئے؟ کہنے لگا کہ آگے بڑھنے پر مجھے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان حائل آگ سے بھری ہوئی ایک خندق اور ایک پروں والی کوئی مخلوق دکھائی دی جو میری تنکہ بوٹی کرنے کو تیار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو فرشتے اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔ یہاں یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے حوالے سے ابو جہل کو ایسے کسی غیر معمولی یا غیر مرئی رد عمل کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے زمانے میں حضور ﷺ کی پشت پناہی کے لیے دنیوی اسباب کے طور پر جناب ابوطالب موجود تھے جبکہ تیسرا واقعہ اس زمانے میں پیش آیا جب یہ دنیوی سہارا بھی موجود نہ رہا اور اب حضور ﷺ کی حفاظت براہ راست اللہ تعالیٰ خود فرما رہا تھا۔ اس لیے اس وقت غیبی مدد کے ذریعے حضور ﷺ کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ آیات زیر مطالعہ میں خاص طور پر اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

**آیت ۱۱ ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كُنَّا عَلَى الْهُدَىٰ﴾** ”کیا تم نے غور کیا اگر وہ شخص ہدایت پر ہوتا؟“

**آیت ۱۲ ﴿أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ﴾** ”یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا!“

جیسا کہ سورۃ اللیل کی آیت ۱۰ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ابو جہل کے کردار میں بہت سی مثبت خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً وہ مال خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاف گو بھی تھا۔ اپنے ایمان نہ لانے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے بالکل کھری اور سچی بات کہی تھی کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن ہمارے خاندان نے چونکہ غرباء کو کھانے کھلانے اور حاجیوں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ بنو ہاشم کا مقابلہ کیا ہے اس لیے اب میں محمد (ﷺ) کی نبوت کی شہادت دے کر اپنے حریف خاندان کی بڑائی تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جری اور بہادر ایسا تھا کہ نزع کے وقت بھی اس نے ہار نہیں مانی اور میدان بدر میں اپنا سر قلم کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ اس کی گردن کو ذرا نیچے سے کاٹا جائے تاکہ سر نیزے پر چڑھے تو اونچا نظر آئے۔ بہر حال شخصی اعتبار سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر و نڈر رہے باک اور صاف گو انسان تھا۔ اگر وہ ایمان لے آتا تو یقیناً حضرت عمرؓ کی طرح اعلیٰ پائے کا مسلمان ہوتا۔ لیکن جب وہ ﴿صَدَقَ بِالْحَسَنَىٰ﴾ (الیل) یعنی تصدیق حق کی گھائی عبور کرنے میں ناکام رہا تو اس کے کردار کی بہت سی مثبت خصوصیات بھی اس کے کسی کام نہ آ سکیں۔

**آیت ۱۳ ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾** ”کیا تم نے سوچا کہ اس نے جو جھٹلایا ہے اور منہ موڑ لیا ہے۔“

**آیت ۱۴ ﴿أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ﴾** ”کیا یہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے!“

آیت ۱۵ ﴿كَذَٰلِكَ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ﴾ ”ہرگز نہیں! اگر یہ باز نہ آیا“

﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۵﴾ ”تو ہم گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر۔“

آیت ۱۶ ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶﴾ ”وہ پیشانی کہ جو خطا کا رہے، جھوٹی ہے۔“

آیت ۱۷ ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝۱۷﴾ ”تو وہ بلا لے اپنی مجلس کے لوگوں کو۔“

آیت ۱۸ ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۸﴾ ”ہم بھی بلا لیں گے جہنم کے فرشتوں کو۔“

آیت ۱۹ ﴿كَذَٰلِكَ لَا تَطِعُهُمْ وَأَسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹﴾ ”کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی

بات نہ مانے، آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیے!“

آپ ﷺ اس جھوٹے غلط کار شخص کی ایک نہ سنیں۔ یہ اگر آپ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے تو اس کی پروا نہ

کیجیے۔ آپ اپنے پروردگار کی جناب میں سجدے کرتے رہیے اور کثرتِ سجدہ سے اس کا قرب حاصل کرتے رہیے۔





# سُورَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۚ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ ۚ سَلَّمَ بِهِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ

ع

**آیت ۱** ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ ”یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔“  
 ”اُنزلْنٰہُ“ کی ضمیر مفعول کا مرجع بالاتفاق قرآن مجید ہی ہے۔ نوٹ کیجیے! ان سورتوں کے مضامین کے اندر ایک ربط پایا جاتا ہے، یعنی پہلی وحی (سورۃ العلق) کے فوراً بعد بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس کلام کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ قدر کا معنی تقدیر اور قسمت بھی ہے اور عزت و منزلت بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو اس رات میں اتارا ہے جو قدر و منزلت کے اعتبار سے بے مثل رات ہے یا اس رات میں اتارا ہے جو تقدیر ساز ہے۔ سورۃ الدخان میں اس رات کا ذکر لَیْلَۃٌ مُّبَارَكَةٌ کے نام سے آیا ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ﴾ (آیت ۳) ”یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں۔“ یہ کونسی رات ہے؟ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَحْرَىٰ لَيْلَةُ الْقَدْرِ فِي الْوَتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ)) (۱) ”لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔“ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفجر کی آیت ۳ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے، قمری کیلنڈر کی طاق اور جفت راتوں کی گنتی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ہاں جو طاق رات ہے سعودی عرب میں ممکن ہے وہ جفت رات ہو۔ اس لیے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کا محتاط طریقہ یہی ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی تمام راتوں (جفت اور طاق دونوں) میں تلاش کیا جائے۔ اور اگر واقعی ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے تو اس بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پھر یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ستائیسویں شب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات کو پورا قرآن مجید

(۱) صحیح البخاری، کتاب صلاة التراويح، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔ وصحیح

مسلم، کتاب الصیام، باب فضل لیلۃ القدر.....

روح محفوظ سے حاملین وحی فرشتوں کے سپرد کر دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔

**آیت ۲** ﴿وَمَا آذْرُكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝﴾ ”اور تم کیا جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے!“

**آیت ۳** ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝﴾ ”لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔“

یہ بہتری اور افضلیت کس اعتبار سے ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل خیر سے بہتر ہے جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))<sup>(۱)</sup> ”جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔“ اس رات کی افضلیت کے ضمن میں ایک رائے یہ ہے کہ اس ایک رات میں اتنی خیر تقسیم کی جاتی ہے جتنی ایک ہزار مہینہ میں بھی تقسیم نہیں کی جاتی۔ اس رات کی افضلیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کے لیے جو کام (نزول قرآن) اس ایک رات میں ہوا، خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ اہل عرب بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے کے لیے ألف (ہزار) کا لفظ بولتے تھے۔

**آیت ۲** ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝﴾ ”(اس رات میں) اترتے ہیں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔“

روح سے مراد یہاں روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیل فرشتوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝﴾ ”مُطَّلَعٌ ثَمَّ أَمِينٌ ۝“ ”وہ (جبرائیل) بہت قوت والا ہے صاحبِ عرش کے قرب میں اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں وہ امانت دار بھی ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت جبرائیل اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے تو ان (حضرت جبرائیل) کا ذکر عام طور پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔ لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا خصوصی نزول و راصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ کے بارے میں ایک خصوصی بات یہ بتائی گئی ہے: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝﴾ کہ اس رات میں تمام پُر حکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ سورۃ الدخان کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی نکوئی سلطنت سے متعلق فیصلوں کے لیے سالانہ بحث و سیشن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس رات میں اگلے سال کے لیے تمام اہم امور کے فیصلے کر کے تعمیل و تنفیذ کی غرض سے فرشتوں کے حوالے کر دیے جاتے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونية۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح۔

ہیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت جبرائیلؑ کی قیادت میں ان احکامات پر عمل درآمد کے لیے پوری زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ نظام کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس ”تدبیرِ امر“ کا ذکر سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿يَذْكُرُ الْأُمُورَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ﴾ (آیت ۵) ”وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف“۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بعد متعلقہ فرشتے تعمیلی رپورٹیں بھی بھیجتے ہیں۔

**آیت ۵ ﴿سَلَامٌ﴾** ”سراسر سلامتی ہے۔“

اس سلامتی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اس رات میں لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

﴿هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝﴾ ”یہ (رات) رہتی ہے طلوع فجر تک۔“



# سُورَةُ الْبَيِّنَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ البینۃ کو قرآن مجید کے اکثر نسخوں میں ”مدنیہ“ لکھا گیا ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس کے کئی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ یہ کئی سورت ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب مصحف میں اس کو سورۃ اعلق اور سورۃ القدر کے بعد رکھنا نظم قرآن کے اعتبار سے بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ سورۃ اعلق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۃ القدر میں بتایا گیا ہے کہ اس قرآن کا نزول کب ہوا اور اس سورت میں واضح کیا گیا ہے کہ اس قرآن کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۖ  
رَسُولٌ مِّنْ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۖ فِيهَا كُتِبَ قِسْمَةٌ ۖ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا  
الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۖ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ  
الْدِّينَ ۚ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ ۗ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا  
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۗ إِنَّ  
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۗ جَزَاءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ  
عَدْنٍ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۗ  
ذَٰلِكَ لِمَنْ حَسِبَ رَبَّهُ ۗ

**آیت ۱** ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۖ﴾  
”نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے نفرت کیا تھا اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ ہونے والے (یا  
باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البینہ نہ آ جاتی۔“

ظاہر ہے وہ لوگ سیدھے راستے سے بھٹک کر گمراہی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اب جب تک ان کے سامنے  
کوئی مین (واضح) دلیل نہ آ جاتی جس سے انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ گمراہ ہیں یا انہیں بہت واضح انداز میں بتا دیا  
جاتا کہ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ راہ ہدایت نہیں اس وقت تک انہیں رشد و ہدایت کی راہ پر چلنے والوں سے

علحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا مفہوم یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک ان لوگوں کے پاس البینہ نہ آ جاتی وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے — مُتَّفَعِينَ: اِنْفِكَاكَ (فَكَ) سے باب اِنْفَعَال) سے ہے جس کا مفہوم ہے کسی چیز کا کسی چیز سے الگ ہو جانا، جدا ہو جانا۔

وہ البینہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیات میں کی جا رہی ہے:

**آیت ۲** ﴿رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾ ﴿۲﴾ ”ایک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتے ہیں پاکیزہ اور اراق کی۔“

ان اوراق میں کیا ہے؟

**آیت ۳** ﴿فِيهَا كُتِبَ قِیمَةُ﴾ ﴿۳﴾ ”ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔“

لفظ ”کتاب“ کے بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ عام طور پر احکام شریعت کے لیے آتا ہے۔ تو پتا چلا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی کتاب کا اکٹھا نام البینہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو قبل ازیں ہم لفظ ”ذِکْرًا“ کے حوالے سے سورۃ الطلاق میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہاں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِکْرًا﴾ ﴿۱۰﴾ رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ..... ”اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کر دیا ہے۔ ایک رسول جو اللہ کی آیات بینات تم لوگوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے.....“ گویا تعبیر اور تعریف (definition) کے اعتبار سے البینہ اور ذِکْرًا ہم معنی اصطلاحات ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے واضح احکام کتاب کی صورت میں نازل کیے اور اس کتاب کی تفہیم و تعلیم کے لیے رسول ﷺ کو بھی مبعوث فرمایا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے وہ تمام احکام اس انداز میں کھول کر بیان فرمادیے کہ اب اس کے بعد ان مخاطبین کے پاس کفر و شرک کے ساتھ چھٹے رہنے اور ضلالت و گمراہی سے باز نہ آنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

**آیت ۴** ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ﴾ ﴿۴﴾ ”اور جن لوگوں کو

کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا تھا مگر اس کے بعد جبکہ ان کے پاس البینہ آ چکی تھی۔“  
یعنی اسی طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل کے پاس بھی البینہ (اللہ کا رسول اور اس کی کتاب) آئی تھی، مگر وہ لوگ اس کے بعد بھی راہ راست پر آنے کے بجائے تفرقہ بازی میں پڑ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کچھ نصاریٰ۔ بعد میں نصاریٰ مزید کئی فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ چنانچہ البینہ کے آ جانے کے بعد بھی راہ راست پر نہ آنے کے جرم کی پاداش میں وہ لوگ شدید ترین سزا کے مستحق ہو چکے ہیں۔

**آیت ۵** ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حَقَّاءَ﴾ ﴿۵﴾ ”اور انہیں حکم نہیں ہوا تھا مگر یہ

کہ وہ بندگی کریں اللہ کی اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر“

یہ حکم گویا پورے دین کا خلاصہ ہے جو اس سے پہلے سورۃ الزمر (آیات ۲، ۳، ۱۱ اور ۱۴) میں بہت تاکید اور شد و مد کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی پوری اطاعت کے ساتھ کریں۔ یہ نہیں کہ نماز

بھی پڑھے جارہے ہیں اور حرام خوریوں سے بھی باز نہیں آتے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کی اطاعت بھی جاری ہے۔ ایسی آیات دراصل ہمیں خبردار کرتی ہیں کہ جزوی بندگی اور سانجھے کی اطاعت اللہ تعالیٰ کو ہرگز قابل قبول نہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم اس جرم کا ارتکاب کریں گے تو ہم بھی اسی وعید کے مستحق ہوں گے جو اس حوالے سے بنی اسرائیل کو سنائی گئی تھی۔ ملاحظہ ہوں اس وعید کے یہ الفاظ: ﴿اَفْتَوُمْنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ (البقرة: ۸۵) ”تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے سوائے ذلت و رسوائی کے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے روز وہ لو نادے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف“۔ بلکہ اس حوالے سے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس آیت میں دنیا کے جس عذاب کا ذکر ہے ﴿خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ وہ اس وقت بحیثیت امت ہم پر مسلط ہو بھی چکا ہے۔ مقام عبرت ہے! آج مسلمانوں کی آبادی دو ارب سے بھی زیادہ ہے دنیا کے بہترین خطے اور بہترین وسائل ان کے قبضے میں ہیں مگر اس کے باوجود عزت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں۔ بین الاقوامی معاملات کے حوالے سے مسلمان حکمرانوں کی حالت یہ ہے کہ ”کس نمئی پرسد کہ بھیا کیستی؟“ یعنی عالمی معاملات میں کوئی ان کی رائے لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ مسلمان ملکوں کی اپنی پالیسیوں کا اختیار بھی ان کے پاس نہیں۔ ان کے سالانہ بجٹ بھی کہیں اور سے بن کر آتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کے حکم کا مدعا یہی ہے کہ جسے اللہ کا ”بندہ“ بننا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس کے قانون کے تابع کر کے اس کے حضور پیش ہو۔ ”قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور خدا کا حصہ خدا کو دو“ والا قانون اللہ تعالیٰ کو قابل قبول نہیں۔ چنانچہ ایمان کے دعوے داروں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے پوری یکسوئی کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔

﴿وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُوْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقِيٰمَةِ ۝﴾ ”اور (یہ کہ) نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی ہے سیدھا (اور سچا) دین۔“

گویا ان الفاظ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ”بندگی“ اور شے ہے جبکہ نماز اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھیں کہ بندگی تو پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دینے کا نام ہے۔ بقول شیخ سعدی:

زندگی آمد برائے بندگی      زندگی ہے بندگی شرمندی!

جبکہ نماز زکوٰۃ (عبادات) وغیرہ اس بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لوازمات ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے بندہ اپنے رب کو مسلسل یاد کرتا رہے اور اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہر دم ہر گھڑی تازہ رہے۔ حفظ جالندھری کے اس خوبصورت شعر میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے:

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی      آؤ سجدے میں گریں لوحِ جہیں تازہ کریں!

گویا ہمارے ”نقوشِ بندگی“ نفس پرستی کی کشافٹوں اور کدورتوں کے گرد و غبار سے اکثر دھندلا جاتے ہیں۔

چنانچہ انہیں تازہ رکھنے کے لیے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر مراسمِ عبادت کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور مسلسل حاضری دینے کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے ایک بندہ مسلمان اپنی نماز، ہجگہ کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا یہ عہد تازہ کرتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں (اور کرتے رہیں گے) اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں (اور مانگتے رہیں گے)۔ تصور کیجئے اگر ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ عہد پورے ارادے اور شعور کے ساتھ روزانہ بار بار دہرائے گا تو اس سے اس کے تعلق مع اللہ کے چمن میں تروتازگی کی کیسی کیسی بہاروں کا سماں بندھا رہے گا۔

**آیت ۶** ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ﴾ ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی، خواہ وہ اہل کتاب میں سے تھے، خواہ مشرکین میں سے“

﴿فَنَارُ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”وہ ہوں گے جہنم کی آگ میں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

﴿أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ ”یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔“

**آیت ۷** ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”(اس کے برعکس) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے“

﴿أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ ”یہی بہترین خلائق ہیں۔“

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

**آیت ۸** ﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتٌ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ ”ان کا بدلہ ہوگا ان کے رب کے پاس دائمی قیام کے باغات کی صورت میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی ان میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔“

یہاں پر ضمنی طور پر یہ علمی نکتہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید میں دو مقامات ایسے ہیں جہاں اہل جنت اور اہل جہنم کے فوری تقابل (simultaneous contrast) میں اہل جنت کے لیے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ جبکہ اہل جہنم کے لیے صرف ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں ایک مقام تو یہی ہے۔ یعنی اس سورت کی زیر مطالعہ آیت میں اہل جنت کے لیے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں جبکہ اس سے پہلے آیت ۶ میں اہل جہنم کا ذکر کرتے ہوئے ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ کے الفاظ تک اکتفاء فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ النبا کی آیت ۱۹ اور آیت ۱۰ میں بھی اہل جنت اور اہل جہنم کے تقابل کے حوالے سے یہی فرق دیکھنے میں آتا ہے۔ ان دونوں مقامات میں مذکورہ فرق کی بنیاد پر امت مسلمہ کی دو بہت بڑی علمی شخصیات نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں تو ابدی ہیں، لیکن جہنم ابدی نہیں ہے اور یہ کہ کبھی ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اہل جہنم میں سے خیر کے حامل آخری عناصر کو نکال کر باقی لوگوں کو مدتِ مدید تک مبتلائے عذاب رکھنے کے بعد بالآخر اس میں جلا کر معدوم کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جہنم کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اس موقف کی حامل دو

شخصیات میں ایک تو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ہیں جن کا شمار چوٹی کے صوفیاء میں ہوتا ہے اور دوسری شخصیت امام ابن تیمیہؒ کی ہے جو سلفی حضرات کے نزدیک اسلامی دنیا کے سب سے بڑے امام اور عالم ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کا اس نکتے پر محی الدین ابن عربیؒ سے متفق ہو جانا یقیناً ایک اہم بات اور ”متفق گردید رائے بوعلی بارائے من“ والا معاملہ ہے، کیونکہ مجموعی طور پر وہ محی الدین ابن عربیؒ کے خیالات و نظریات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ جہنم کے ابدی نہ ہونے سے متعلق میں نے یہاں مذکورہ دو شخصیات کی آراء کا ذکر محض ایک علمی نکتے کے طور پر کیا ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ بہر حال یہ نہیں ہے۔ اہل سنت علماء کے نزدیک جہنم بھی جنت کی طرح ابدی ہی ہے۔

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ ”اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔“

یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ وہ اللہ سے خوش ہو جائیں گے۔

﴿ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ﴾ (۸) ”یہ (صلہ) اُس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔“

اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین! ثم آمین!





# سُورَةُ الزَّلَازِلِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الزلزال کے کئی یا مدنی ہونے کے بارے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے اسلوب اور مضامین پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ کئی سورت ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک ہزار آیات کے برابر قرار دیا ہے۔ یہ سورت اور اس کے بعد کی تین سورتیں (سورۃ العادیات، سورۃ القارعہ اور سورۃ التکاثر) انذارِ آخرت کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۖ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۖ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۖ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ

ع

**آیت ۱** ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۖ﴾ ”جب زمین ہلائی جائے گی جیسے کہ ہلائی جائے گی۔“  
یعنی تم انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس زلزلے کی کیفیت کیسی ہوگی۔ سورۃ الحج کے آغاز میں اس کیفیت کی شدت کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ ۖ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرْوُهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝﴾

”اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے رب کا‘ یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔ جس دن تم اُس کو دیکھو گے اس دن (حال یہ ہوگا کہ) بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور (دہشت کا عالم یہ ہوگا کہ) ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تم دیکھو گے لوگوں کو جیسے وہ نشے میں ہوں حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت سخت ہے۔“

**آیت ۲** ﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۖ﴾ ”اور زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی۔“  
یعنی اس دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کو وہ جس حالت میں بھی ہوں گے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اگر ان کے ذرات منتشر ہو کر زمین کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہوں گے تو ان کو بھی کیجا کر دیا

جائے گا۔ واضح رہے کہ جو انسان اصطلاحی مفہوم میں زمین کے اندر باقاعدہ دفن نہیں ہوتے، مثلاً سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں یا جلادے جاتے ہیں ان کے اجسام کے اجزائی ذرات بھی کسی نہ کسی شکل میں بالآخر زمین میں ہی جذب ہوتے ہیں اور وہ قیامت کے دن زمین سے ہی برآمد ہوں گے۔ سورہ طہ کی یہ آیت اس لحاظ سے بہت واضح ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝﴾ ”اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے اور اسی میں سے ہم تمہیں ایک مرتبہ پھر نکالیں گے۔“

**آیت ۳** ﴿وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ﴾ ”اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟“

**آیت ۴** ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ﴾ ”اُس دن یہ اپنی خبریں کہہ سنائے گی۔“

اس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی بولنے کی صلاحیت عطا فرمائے گا اور وہ ہر انسان کے بارے میں ایک ایک خبر دے گی کہ وہ اس کی پشت پر بیٹھ کر کیا کیا حرکتیں کرتا رہا ہے۔ یعنی جس طرح انسان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء اس دن اس کے خلاف گواہی دیں گے اسی طرح زمین کا متعلقہ حصہ اور ٹکڑا بھی اس کے خلاف بطور گواہ کھڑا ہوگا۔ سورہ خلم السجدہ (آیت ۲۱) میں ان گواہیوں کے حوالے سے بہت عبرت انگیز مکالمات کا ذکر ہے۔ جب انسانوں کی جلدوں سمیت ان کے تمام اعضاء ان کے خلاف گواہیاں دے رہے ہوں گے تو وہ جھنجھلا کر اپنی جلدوں سے کہیں گے: ﴿لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا﴾ کہ تم کیوں ہمارے خلاف بول رہے ہو؟ اس پر وہ ترکی بہ ترکی جواب دیں گی: ﴿أَنطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کہ آج ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے باقی ہر چیز کو بولنا سکھایا ہے۔ بہر حال اس دن اللہ تعالیٰ زمین کو بھی زبان عطا کرے گا اور وہ انسانوں سے متعلق تمام احوال کی ایک ایک تفصیل بیان کرے گی۔

**آیت ۵** ﴿بَانَ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۚ﴾ ”اس لیے کہ اسے اس کے رب نے حکم دیا ہوگا۔“

**آیت ۶** ﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا﴾ ”اُس دن لوگ علیحدہ علیحدہ ہو کر نکل پڑیں گے۔“

اَشْتَاتًا جمع ہے شَتُّ کی، یعنی منتشر و متفرق۔ نصبِ حالیت کی وجہ سے ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۃ اللیل کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ﴾ کہ تم انسان بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہو لیکن تمہاری سعی و مجتہد کے رخ بالکل مختلف ہیں۔

﴿لَيَرَوُنَّ أَعْمَالَهُمْ﴾ ”تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھادیے جائیں۔“

اس منظر کی ایک جھلک سورۃ الکہف کی اس آیت میں بھی دکھائی گئی ہے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ

صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝﴾

”اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہوگا اسے موجود۔ اور

آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔“

آج کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا مفہوم یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس دن ایک بہت بڑا کمپیوٹر سرخشر نصب کر دیا جائے گا جس میں پوری نوع انسانی کے ایک ایک فرد کے اعمال سے متعلق تفصیلی ڈیٹا موجود ہوگا۔ جو نہی کسی فرد کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا اس کی پوری زندگی کی آڈیو ویڈیو فلم فوراً سکرین پر چلنا شروع ہو جائے گی۔

**آیت ۷** ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝۷﴾ ”تو جس کسی نے ذرہ کے ہم وزن بھی کوئی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔“

**آیت ۸** ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝۸﴾ ”اور جس کسی نے ذرہ کے ہم وزن کوئی بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔“

عربی لغت کے مطابق چیونٹی کے اندے سے نکلنے والے بچے کو ”ذرہ“ کہا جاتا ہے۔ یعنی بہت چھوٹی اور حقیر چیز۔ اسی مفہوم میں لفظ ”ذرہ“ اردو میں بھی مستعمل ہے۔

یہ آیت انسان کو اس اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی بہر حال اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے۔ بسا اوقات انسان نیکی کے چھوٹے سے کام کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، اور بعض اوقات صغیرہ گناہوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ درست طرز عمل نہیں ہے۔ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے اور کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اس پر جری نہیں ہونا چاہیے۔





**آیت ۵** ﴿فَوَسَّطْنَا بِهِ جَمْعًا ۝﴾ ”پھر اس کے ساتھ وہ (دشمن کی) جمعیت کے اندر گھس جاتے ہیں۔“

پرانے زمانے کی جنگوں میں گھوڑے بہت موثر اور کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ حملے کے وقت گھوڑے اپنے سواروں کے حکم پر مخالف فوج کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ اور نیزوں کی یلغار کی پروانہ کرتے ہوئے ان کی صفوں میں گھس جاتے تھے۔ گھوڑے کا اپنے مالک کی فرمانبرداری میں اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کا جذبہ اور اس کی وفاداری میں اپنی جان کی بازی تک لگا دینے کا وصف! یہ ہے دراصل ان قسموں کے مضمون کا مرکزی نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے۔ چنانچہ گھوڑوں کے ان اوصاف کے ذکر کے بعد تقابل کے طور پر انسان کے کردار کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

**آیت ۶** ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝﴾ ”یقیناً انسان اپنے رب کا بہت ہی ناشکر ہے۔“

مطلب یہ کہ ایک طرف وہ جانور ہے جو اپنے مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے، جو اُس کا خالق نہیں ہے، بلکہ صرف اُس کے دانے پانی کا انتظام کرتا ہے، اور دوسری طرف یہ باشعور صاحب عقل و دانش اشرف المخلوقات انسان ہے جو اپنے خالق اور مالک کا شکر ادا نہیں کرتا۔

**آیت ۷** ﴿وَأَنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝﴾ ”اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔“

وہ اپنے اس طرزِ عمل سے خوب واقف ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝﴾ کہ انسان اپنے خیالات، جذبات اور کردار کے بارے میں خود سب کچھ جانتا ہے۔ چنانچہ انسان خوب جانتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنے رب کی ناشکری کا مرتکب ہو رہا ہے۔

**آیت ۸** ﴿وَأَنَّهُ لَحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝﴾ ”اور وہ مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے۔“

مال و دولت کی محبت میں انسان اکثر اوقات حلال و حرام کی تمیز تک بھلا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ حرام کھاتے ہوئے وہ اپنے نفسِ لوامہ (بحوالہ سورۃ القیامہ آیت ۲) اور ضمیر کی ملامت کی بھی پروا نہیں کرتا۔

**آیت ۹** ﴿أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝﴾ ”تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے۔“

**آیت ۱۰** ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝﴾ ”اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔“

**آیت ۱۱** ﴿إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝﴾ ”یقیناً ان کا رب اس دن ان سے پوری طرح باخبر ہوگا۔“

اللہ تعالیٰ کو ان کے تمام اعمال و افعال کا علم ہے اور اس دن وہ ان سے ایک ایک چیز کا حساب لے لے گا۔ اَللّٰهُمَّ حَاسِبُنَا حِسَابًا يَّبْسِرًا۔ آمین! انذارِ آخرت کے مضمون کی حامل ان سورتوں میں سے ہر سورت کی تلاوت کے بعد یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اے اللہ! تو ہم سے آسان حساب لینا اور اپنی خصوصی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کر دینا۔



# سُورَةُ الْقَارِعَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ  
الْمَبْثُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوفِ ۝ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَهُوَ فِي  
عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَأُمُّهُ هَايَةٌ ۝ وَمَا أَذْرُكَ مَا هِيَةٌ ۝ نَارُ  
حَامِيَةٍ ۝

آیت ۱ ﴿الْقَارِعَةُ ۱﴾ ”وہ کھٹکانے والی۔“

آیت ۲ ﴿مَا الْقَارِعَةُ ۲﴾ ”کیا ہے وہ کھٹکانے والی!“

قُرْع کے معنی ایک چیز کو کسی دوسری چیز پر زور سے دے مارنے کے ہیں۔ جیسے دروازے کو زور زور سے  
کھٹکانا۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور عظیم مصیبت کے لیے بولا جاتا ہے۔  
چنانچہ جب کوئی قوم کسی حادثہ فاجعہ یا عظیم آفت کا شکار ہو تو عرب کہتے ہیں: قَرَعَتْهُمْ الْقَارِعَةُ — یعنی وہ  
قیامت جب آئے گی تو پوری کائنات کو کھٹکھا ڈالے گی اور دنیا کی ہر چیز کو تہ و بالا کر دے گی۔ تمام اجرام فلکی  
آپس میں ٹکرائیں گے جس سے خوفناک دھماکے ہوں گے اور دل دہلا دینے والی آوازیں پیدا ہوں گی۔

آیت ۳ ﴿وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ ۳﴾ ”اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ کھٹکانے والی!“

آیت ۴ ﴿يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۴﴾ ”جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند  
ہوں گے۔“

آیت ۵ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوفِ ۵﴾ ”اور پہاڑ دھنسی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔“  
العُفُوف: رنگ دار اون کو کہتے ہیں اور مُنْفُوش کے معنی ہیں دھنسی ہوئی۔ یعنی پہاڑ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہیں  
گے بلکہ ریزہ ریزہ ہو کر رنگ دار اون کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہوں گے۔

آیت ۶ ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۶﴾ ”تو جن لوگوں کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے۔“  
یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائق توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک ہی قسم کے وزن یا میزان کے ایک ہی پلڑے  
کا ذکر آیا ہے۔ اس بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ”مَوَازِين“ سے مراد یہاں نیکیوں کا وزن ہے۔ یعنی حساب  
کے وقت ہر شخص کی نیکیوں کا وزن کر کے دیکھا جائے گا کہ یہ وزن ”مطلوبہ معیار“ کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور یہ

”مطلوبہ معیار“ بھی ہر شخص کا الگ الگ اس کے ”شاکلہ“ کے مطابق ہوگا۔ ظاہر ہے ہر شخص کی استطاعت (پیدائشی صلاحیتوں اور ماحول کے منفی و مثبت اثرات کے مطابق) دوسرے شخص کی استطاعت سے مختلف ہوگی اور ہر شخص اپنی استطاعت کی حد تک ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مکلف ہوگا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶) ”اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق“۔ چنانچہ ہر شخص کے شاکلہ یعنی اس کے جینز (genes) کی طرف سے اسے حاصل ہونے والی صلاحیتوں اور ماحول کے اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے نیکیوں کے وزن کا ایک خاص معیار مقرر کیا جائے گا۔ اگر تو اس کی نیکیوں کے وزن (موازینہ) کو اس معیار کے مطابق پایا گیا تو اسے کامیابی کا پروان مل جائے گا۔

**آیت ۷** ﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝۷﴾ ”تو وہ ہوگا عیش و عشرت کی زندگی میں۔“

**آیت ۸** ﴿وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝۸﴾ ”اور جس (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے۔“

**آیت ۹** ﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝۹﴾ ”تو اُس کا ٹھکانہ ایک گڑھا ہوگا۔“

**آیت ۱۰** ﴿وَمَا أَذْرٰكَ مَا هِيَهٗ ۝۱۰﴾ ”اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ کیا ہے؟“

**آیت ۱۱** ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱﴾ ”آگ ہے دہکتی ہوئی!“

اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ يَا مُجِيْرُ يَا مُجِيْرُ !!



# سُورَةُ التَّكَاثُرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْهَكْمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۚ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۚ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۚ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۚ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۚ

**آیت ۱** ﴿الْهَكْمُ التَّكَاثُرُ ۚ﴾ ”تمہیں غافل کیے رکھا ہے بہتات کی طلب نے!“  
التکاثر کے معنی مال جمع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے بھی ہیں اور مال و دولت کی کثرت پر فخر کرنے کے بھی۔  
دولت انسان کے پاس چاہے جتنی بھی ہو اس کی طبیعت اس سے بھرتی نہیں اور وہ بدستور مزید حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۚ﴾ ”یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔“  
یعنی انسان اپنی ساری عمر اسی تگ و دو میں کھادیتا ہے اور مرتے دم تک یہ فکر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انسان کی حرص و ہوس کے پیانے کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے <sup>(۱)</sup>۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۰ میں انسانی زندگی کے جن مراحل کا ذکر ہوا ہے ان میں آخری مرحلہ تکاثر فی الاموال والاولاد کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری عمر میں انسان کی یہ حرص مزید بڑھ جاتی ہے۔

**آیت ۳** ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ﴾ ”کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“  
**آیت ۴** ﴿ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ﴾ ”پھر کوئی بات نہیں! بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“  
اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ النبا کی ان آیات سے مشابہ ہیں: ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۚ﴾ ثُمَّ

(۱) حضرات عبداللہ بن عباس، ابو موسیٰ الاشعری اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے (الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ) مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ كَانَ لِإِنْسَانٍ آدَمٌ وَإِدْبَانٍ مِنْ مَالٍ لَا تَغْنَىٰ وَإِدْبَانٌ فَإِلْنَا وَلَا يَمْلَأُ خَوْفُ ابْنِ آدَمَ إِلَّا الْقُرَابُ»

(صحیح البخاری، ج: ۶، ۴۳۶، صحیح مسلم، ج: ۱۰، ۵۰ و ۱۰۴۸)

”اگر آدم کے بیٹے کے پاس مال سے بھری دو وادیاں ہوں تو وہ لازماً تیسری وادی کی خواہش کرے گا اور ابن آدم

کے پیٹ کو سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔“

(حاشیہ از مرتب)



کَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿۵﴾۔ یعنی ابھی تم لوگ ”تکاشف“ کے نشے میں مست ہونے کی وجہ سے موت کا تصور بھی ذہن میں لانے کے لیے تیار نہیں ہو مگر وہ وقت دور نہیں جب موت خود آکر تم سے ملاقات کرے گی: ﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلْفِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵﴾﴾ (الحجۃ) ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف جو غیب اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے، پھر وہ تمہیں بتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔“ بہر حال جو نبی تمہاری آنکھیں بند ہوں گی، وہ تمام حقائق تم پر روشن ہو جائیں گے جن سے تم اس وقت نظریں چرانے کی کوشش کر رہے ہو۔

**آیت ۵ ﴿کَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾** ”کوئی بات نہیں! کاش کہ تم علم یقین کے ساتھ جان جاتے!“

یعنی موت یا قیامت کا علم دراصل یقین علم ہے، کاش کہ تمہیں اس کا شعور ہوتا۔ حکماء کے ہاں ہمیں یقین کے تین درجوں کا ذکر ملتا ہے: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین وہ یقین ہے جو انسان کو علم، معلومات یا استدلال کی بنیاد پر حاصل ہو۔ مثلاً آپ نے دور سے دھواں اٹھتا دیکھا تو آپ نے کہا کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے، حالانکہ آگ آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ پھر جب آپ نے وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے آگ کو دیکھ لیا تو آپ کو عین الیقین حاصل ہو گیا۔ لیکن حق الیقین کا درجہ اس سے بھی آگے ہے۔ یقین کا یہ درجہ باقاعدہ تجربے سے حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ آنکھ سے دیکھنے میں بھی دھوکے کا امکان ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی چیز جیسی نظر آ رہی ہے حقیقت میں بھی ویسی ہو۔ جیسے آج کل بعض الیکٹریک ہیٹرز میں انگارے دھکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب آپ غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو محض دکھاوے کا منظر ہے اور حرارت کا اصل منبع کہیں اور ہے۔ چنانچہ آگ کے بارے میں آپ کو ”علم الیقین“ تو محض دھواں دیکھنے سے ہی حاصل ہو گیا۔ پھر جب آپ نے آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو آپ کا یقین ”عین الیقین“ میں بدل گیا۔ اس کے بعد جب آپ نے آگ کو چھو کر یا اس کے قریب ہو کر اس کی حرارت کو عملی طور پر محسوس کیا تو آگ کی موجودگی کے بارے میں آپ کا یقین ”حق الیقین“ کے درجے میں آ گیا۔

**آیت ۶ ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾** ”تم جہنم کو دیکھ کر رہو گے۔“

**آیت ۷ ﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾** ”پھر تم اس کو عین الیقین کے ساتھ دیکھو گے۔“

**آیت ۸ ﴿ثُمَّ لَتَسْتَلْنَ يَوْمَئِذٍ النَّعِيمَ﴾** ”پھر اس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں۔“

اس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک ایک نعمت کے بارے میں تم سے جواب طلبی ہوگی کہ دنیا میں تم نے اس کی کون کون سی نعمتوں سے استفادہ کیا اور ان کے حقوق کہاں تک ادا کیے۔



# سُورَةُ الْعَصْرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ العصر قرآن مجید کی مختصر ترین اور جامع ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس کی جامعیت کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے درج ذیل دو اقوال بہت اہم ہیں:

- (۱) لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَّتِ النَّاسُ "اگر قرآن مجید میں سوائے اس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ بھی ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔"
- (۲) لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هَذِهِ السُّورَةَ لَوَسِعَتْهُمْ "اگر لوگ تبنا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔"

یہ سورت "مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب" کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ یعنی ہمارے منتخب نصاب کا پہلا درس سورۃ العصر کے بارے میں ہے۔ اس سورت پر میری ایک کتاب اور ایک مختصر کتابچہ بھی موجود ہے۔ تفصیلی معلومات کے لیے ان سے استفادہ کرنا مفید رہے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَكَانُوا صَوَابًا بِحَقِّ ۝  
وَكَانُوا صَوَابًا بِالصَّبْرِ ۝

**آیت ۱ ﴿وَالْعَصْرِ ۝﴾** "زمانے کی قسم ہے۔"

یعنی اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے یا پوری تاریخ انسانی شاہد ہے کہ:

**آیت ۲ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝﴾** "یقیناً انسان خسارے میں ہے۔"

اگلی آیت میں اس نقصان اور خسارے سے بچاؤ کے لیے چار شرائط بتائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین شرائط پوری کر دینے سے مذکورہ خسارے سے بچنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ کامیابی کے لیے بہر حال چاروں شرائط پر عمل درآمد ضروری ہے۔

**آیت ۳ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَكَانُوا صَوَابًا بِحَقِّ ۝ وَكَانُوا صَوَابًا بِالصَّبْرِ ۝﴾** "سوائے

ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے

باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“

ان شرائط میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان لائے۔ اس میں ایمان باللہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سمیت تمام ایمانیات شامل ہیں۔ یعنی انسان اس کائنات کے مخفی اور غیبی حقائق کو سمجھے ان کا شعور حاصل کرے اور ان کی تصدیق کرے۔ ایمان لانے کے بعد دوسری شرط اس ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ یعنی اگر انسان اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے عمل اور کردار سے ثابت ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس عمل کو اپنے شب و روز کے معمول کا حصہ بنانے پر کمر بستہ ہو جائے جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ہر اس فعل سے اجتناب کرنے کی فکر میں رہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔

تیسری شرط ”تواصی بالحق“ کی ہے۔ یعنی جس حق کو انسان نے خود قبول کیا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالا ہے اس حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن جائے۔ اس کے بعد چوتھی اور آخری شرط ”تواصی بالصبر“ کی ہے اور یہ ”تواصی بالحق“ کا لازمی اور منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ ”تواصی بالحق“ کا علم اٹھائے گا اسے شیطانی قوتوں کی مخالفت مول لے کر آزمائش و ابتلا کی مشکل گھاٹیوں سے بھی گزرنا ہوگا اور اس راستے پر چلتے ہوئے نہ صرف اسے خود صبر و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت کرنا ہوگی۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جب امر بالمعروف کی نصیحت کی تو ساتھ ہی صبر کی تلقین بھی کی تھی: ﴿يَبْنِي أَقِمِ الصَّلَاةَ وَآمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ﴾ (لقمن: ۱۷) ”اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!“

بہر حال راہِ حق کے مسافروں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستہ آزمائش و ابتلا کے خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ وَبَشِيرِ الصَّابِرِينَ ﴿۵۴﴾ (البقرة) ”اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔“

یہ شہادت گم الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اللَّهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین!



# سُورَةُ الْهُمَزَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ العصر میں نسل انسانی کو ایک بہت بڑے ممکنہ خسارے کی وعید سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس خسارے سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اب سورۃ الہمزہ میں تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر ان لوگوں کے کردار کی جھلک دکھائی جا رہی ہے جو آخرت کے بارے میں کسی تنبیہ یا وعید کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے اور اندھا دھند اسی راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں جو حقیقت میں خسارے اور بربادی کا راستہ ہے۔ دراصل جب انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین یا آدرش (ideal) نہیں ہوتا تو اس کی شخصیت پستی کی طرف مائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس روش پر چلتے چلتے وہ پستی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے اخلاق و کردار میں خیر اور بھلائی کی کوئی رمت بھی باقی نہیں رہتی۔ ایسا انسان معاشرے میں رہتے ہوئے کسی کی غیبت کرتا ہے تو کسی پر طعنہ زنی کرتا ہے، کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے تو کسی کا مال ہڑپ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت وہ کوئی نیک کام بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اس کے پیچھے بھی اس کا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔ غرض اس کی ہر حرکت اس کی پست سوچ کی مظہر اور اس کا ہر فعل اس کے گھٹیا کردار کا عکاس ہوتا ہے۔ پھر جب کسی معاشرے کے انسانوں کی غالب اکثریت پستی اور گھٹیا پن کا یہ رنگ اپنائیتی ہے تو وہ معاشرہ مجموعی طور پر ہر قسم کے خیر سے محروم ہو کر گندگی اور غلاظت کے متعفن ڈھیر کا روپ دھار لیتا ہے۔

ایسے معاشرے کو دیکھ کر ایک حساس انسان بجا طور پر مایوسی کی آتھما گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ دوسری طرف اس معاشرے کے فلسفی اور حکماء انسان کے بارے میں ایسے فتوے جاری کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں کہ انسان تخلیقی اعتبار سے محض حیوانی داعیات و شہوات کا پتلا اور گندگی کی ایک پوٹ ہے اور یہ کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی عنصر سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے ہی منفی نظریات و خیالات کے جواب کے طور پر سورۃ التین میں نسل انسانی کی چار عظیم شخصیات (حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر احسن تقویم کی سطح پر پیدا ہوا ہے۔ البتہ جب یہ اپنے فطری شرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی اصل عظمت کو فراموش کر دیتا ہے تب یہ پستی میں گرے گرتے اسفل سافلین کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب شرف انسانیت کی خلعت فاخرہ کو اتار پھینکتا ہے اور اپنے حیوانی داعیات کی تسکین و تنفی کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے تو پھر یہ خنزیر سے بڑھ کر شہوت پرست، اونٹ سے بڑھ کر کینہ پرور اور بھیڑیے سے بڑھ کر سفاک بن جاتا ہے۔ یعنی یہ اشرف المخلوقات جب حیوان بنتا ہے تو بے حیائی، خود غرضی اور خونخواری کی دوڑ میں تمام حیوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَبَلِّغْ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةً ۚ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ كَلَّا  
لَيُبَدِّلَنَ فِي الْحُطَمَةِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ نَارُ اللَّهِ الْمَوْقُودَةُ ۚ الَّتِي تَطْلِعُ عَلَى  
الْأَفْدَةِ ۚ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوصَدَّةٌ ۚ فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ ۚ

**آیت ۱** ﴿وَبَلِّغْ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةً ۚ﴾ ”بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چھتا رہتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے۔“

هُمَزَةٌ اور لُّمَزَةٌ دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے باہم بہت قریب ہیں۔ بعض اہل لغت کے نزدیک روبرو طعنہ زنی کرنے والے کو هُمَزَةٌ اور پس پشت عیب جوئی کرنے والے کو لُّمَزَةٌ کہتے ہیں، جبکہ بعض اہل لغت نے ان کا معنی برعکس بیان کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہر چغلی کھانے والے دوستوں میں جدائی اور تفرقہ ڈالنے والے بے تصور اور بے عیب انسانوں میں نقص نکالنے والے کو هُمَزَةٌ اور لُّمَزَةٌ کہتے ہیں۔

**آیت ۲** ﴿الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ﴾ ”جو مال جمع کرتا رہا اور اس کو گنتا رہا۔“  
جس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری جدوجہد مال کمانے اور اس کا حساب رکھنے میں برباد کر دی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس ماہ میرے اکاؤنٹس میں اتنے فیصد اضافہ ہو گیا ہے اور پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال میرے اثاثہ جات اس قدر بڑھ گئے ہیں۔

**آیت ۳** ﴿يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ﴾ ”وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔“  
گویا اُس کے مال نے اسے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ ایک دولت مند آدمی اپنی دولت کے ذریعے دنیا میں ایسے آثار و نقوش چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جن کی وجہ سے اس کا نام دنیا میں ہمیشہ رہے۔ انسان کی اسی خواہش نے اسے اہرام مصر جیسے عجائبات کی تخلیق پر مجبور کیا۔ مشہور انگریزی نظم The Pyramids کے ان الفاظ میں انسان کی اسی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے:

Calm and self possessed,  
Still and resolute,  
Pyramids echo into eternity,  
They defined cry of man's will  
To strive & conquer the storms of time.

**آیت ۴** ﴿كَلَّا لَيُبَدِّلَنَ فِي الْحُطَمَةِ ۚ﴾ ”ہرگز نہیں، وہ تو یقیناً جھوٹک دیا جائے گا علمہ میں۔“  
حُطَمَةٌ: حُطَمَ سے ہے، یعنی توڑ ڈالنے والی، پیس ڈالنے والی، چور چور اور ریزہ ریزہ کر دینے والی۔ یہ دوزخ کے ایک خاص طبقے کا نام ہے جس کی آگ اتنی تیز ہوگی کہ اس میں جو شے بھی ڈالی جائے گی اس کو آگِ واحد میں پیس کر رکھ دے گی۔

**آیت ۵** ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطْمَةُ ۝﴾ ”اور کیا تم جانتے ہو وہ حطمہ کیا ہے؟“

**آیت ۶** ﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝﴾ ”وہ آگ ہے اللہ کی بھڑکائی ہوئی۔“

**آیت ۷** ﴿الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْفَيْدَةِ ۝﴾ ”جو دلوں کے اوپر جا چڑھے گی۔“

یعنی اس آگ کی حدت اور تپش انسان کی جلد سے زیادہ اس کے دل پر اثر انداز ہوگی۔ بہر حال آج جب انسان خود Infra red Rays اور Ultra violet Rays سمیت آگ اور حرارت کی رنگا رنگ اقسام ایجاد کر چکا ہے اس کے لیے ”حُطْمَہ“ کی مذکورہ خصوصیت کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ایک صاحب نے خیال پیش کیا ہے کہ حُطْمَہ ایٹمی حرارت کی کوئی شکل ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایٹم سے جو حرارت پھیلتی ہے وہ براہ راست آگ نہیں ہوتی لیکن انسان کے وجود کو چیرتی چل جاتی ہے۔

**آیت ۸** ﴿إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۝﴾ ”بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی۔“

تاکہ اس کی تمام تر حرارت ان پر اثر انداز ہو اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

**آیت ۹** ﴿فَبِئْسَ عَمَدٌ مُمَدَّدَةٌ ۝﴾ ”بڑے اونچے اونچے لے ستونوں میں۔“



# سُورَةُ الْفِيلِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الفیل اور اس کے بعد کی سورتوں میں سے اکثر کا تعلق حضور ﷺ کی سیرت یا آپ ﷺ کے زمانے کے عرب معاشرے کے ماحول اور حالات سے ہے۔ جیسے سورۃ الفیل میں جس واقعہ کا ذکر ہے یہ واقعہ اسی سال پیش آیا جس سال حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کی ولادت عین اس واقعہ کے دن ہوئی تھی۔ البتہ کچھ ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔

اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ یمن کے عیسائی بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کے مقابلے میں ایک عالیشان کلیسا اس غرض سے تعمیر کرایا کہ عرب کے لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس کلیسا میں حاضری دیا کریں۔ لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں ناکام رہا۔ اسی دوران کسی عرب نے شرارتاً اس کلیسا میں رفع حاجت کر کے غلاظت بکھیری۔ ابرہہ تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا تھا اس واقعہ کو بہانہ بنا کر اس نے کعبہ کو مسمار کرنے کے ارادے سے مکہ مکرمہ پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔ مکہ پر حملہ آور ہونے والے ابرہہ کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور ان کے ساتھ بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ اسی لیے عربوں نے اس لشکر کو ”اصحاب الفیل“ کا نام دیا اور جس سال یہ لشکر حملہ آور ہوا تھا وہ سال ان کے ہاں ”عام الفیل“ کے نام سے مشہور ہوا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اپنے گھر کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کے لشکر کو چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نیست و نابود کر دیا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِ ۚ  
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۚ  
وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيلَ ۙ  
تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ۚ  
فَجَعَلَهُمْ كَعَصِفٍ  
مَّا تُكْوَىٰ ۚ

**آیت ۱** ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِ ۙ﴾ ”کیا تم نے دیکھا نہیں کیا حشر کیا تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا؟“

**آیت ۲** ﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۙ﴾ ”کیا اُس نے ان کی تمام تدبیروں کو بے کار اور غیر موثر نہیں کر دیا؟“

اُبرہہ کی اس لشکر کشی کا مقصد انہدام کعبہ کے علاوہ عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اُس تجارت پر قبضہ کرنا بھی تھا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

**آیت ۳** ﴿وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝﴾ ”اور اُن پر بھیج دیے ٹھنڈے ٹھنڈے اڑتے ہوئے پرندوں کے۔“

**آیت ۴** ﴿تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝﴾ ”جو اُن پر مارتے تھے کنکر کی پتھریاں۔“  
رَمَى يَرْمِي رَمًيًا کا معنی ہے پھینکنا مارنا۔ حج کے دوران شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل کو بھی ”رمی جرات“ کہا جاتا ہے۔

لفظ سِجِّيل دراصل فارسی ترکیب ”سنگِ گل“ سے معرب ہے (فارسی کی ”گ“ عربی میں آکر ”ج“ سے بدل گئی ہے)۔ فارسی میں سنگ بمعنی پتھر اور گل بمعنی مٹی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سنگِ گل کے لغوی معنی ہیں مٹی کا پتھر۔ اس سے مراد وہ کنکریاں ہیں جو ریتلی زمین پر ہلکی بارش برسنے اور بعد میں مسلسل تیز دھوپ چمکنے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی بارش کے ایک ایک قطرے کے ساتھ جو ریت ملی مٹی گیلی ہو جاتی ہے وہ بعد میں مسلسل تیز دھوپ کی حرارت سے پک کر سخت کنکری بن جاتی ہے۔

اُبرہہ کے لشکر جبار کو تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی غیر معمولی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ پڑی بلکہ اُس نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ٹھنڈے بھیج دیے جو ساحلِ سمندر کی طرف سے اُمد پڑے اور چند لمحوں کی سنگ باری سے اس لشکر کا بھر کس نکال دیا۔ ان میں سے ہر پرندہ تین چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھا ایک اپنی چونچ میں اور دواپنے پنجوں میں۔

**آیت ۵** ﴿فَجَعَلْنَاهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝﴾ ”پھر اُس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے ٹھس کی طرح۔“  
یعنی اس پورے لشکر کی حالت اس چارے یا ٹھس کی طرح ہو گئی جسے جانوروں نے کھا کر چھوڑ دیا ہو۔





# سُورَةُ قُرَيْشٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ إِلَهُهُمْ ۚ رِحْلَةَ الْشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِي  
أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۚ وَأَمْنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۚ

**آیت ۱** ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ﴾ ”قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے۔“

**آیت ۲** ﴿إِلَهُهُمْ ۚ رِحْلَةَ الْشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴾ ”(یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفر کی الفت و محبت پیدا کر دی۔  
إِبْلَافٌ: اَلْفٌ يَأْلَفُ الْفَا سے باب افعال کا مصدر ہے، یعنی مانوس کرنا اور خوگر بنانا۔ اردو میں اَلْفَتْ اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔

سورۃ قریش کی پہلی دو آیات میں قریش کی اس اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے جو حضور ﷺ کی پیدائش سے قبل زمانے میں انہیں مشرق اور مغرب کی تجارت پر حاصل تھی۔ اس زمانے میں مشرقی بعید کے ممالک (ہندوستان، جادا، ملایا، سماٹرا، چین وغیرہ) سے بحر ہند کے راستے جو سامان تجارت آتا تھا وہ یمن کے ساحل پر اترتا تھا۔ دوسری طرف یورپ سے آنے والے جہاز شام اور فلسطین کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یمن سے سامان تجارت کو شام پہنچانے اور ادھر کا سامان یمن پہنچانے کے لیے خشکی کا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اس راستے کی حیثیت اس زمانے میں گویا بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کی سی تھی۔ ظاہر ہے یورپ کو انڈیا سے ملانے والا سمندری راستہ (around the cape of good hope) تو واسکوڈے گاما نے صدیوں بعد ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا، جبکہ بحیرہ احمر کو بحر روم سے ملانے والی نہر سوئز ۱۸۶۹ء میں بنی تھی۔

حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک اس تجارتی شاہراہ پر قوم سبا کی اجارہ داری تھی۔ لیکن جب ”سد مأرب“ ٹوٹنے کی وجہ سے اس علاقے میں سیلاب آیا اور اس سیلاب کی وجہ سے اس قوم کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ شاہراہ فُنی طور پر قریش مکہ کے قبضے میں چلی گئی۔ قریش مکہ چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں انہیں عزت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جہاں کوئی بھی تجارتی قافلہ لیثروں اور ذاکوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا وہاں قریش کے قافلوں کو پورے عرب میں کوئی میلی نظر سے بھی نہیں

دیکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے بت خانہ کعبہ میں نصب کر رکھے تھے۔ گویا ہر قبیلہ کا ”خدا“ قریش کی مہربانی سے ہی خانہ کعبہ میں قیام پذیر تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریش کے پاس یرغمال تھا۔ اس لیے عرب کا کوئی قبیلہ بھی ان کے قافلوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلے سارا سال بلا خوف و خطر یمن سے شام اور شام سے یمن کے راستے پر رواں دواں رہتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ شام و فلسطین کے سرد علاقوں جبکہ سردیوں میں یمن کے گرم علاقے کا سفر اختیار کرتے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں ان کے اسی تجارتی سفر کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے بین الاقوامی تجارتی شاہراہ پر مکمل اجارہ داری تجارتی قافلوں کے ہمہ وقت تحفظ کی یقینی ضمانت اور موسموں کی موافقت اور مطابقت سے سرد و گرم علاقوں کے سفر کی سہولت، یہ ان لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تھیں جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔ اس لیے ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

**آیت ۳ ﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ﴾** ”پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے رب کی۔“

ظاہر ہے ان کے جدا جدا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا یہ گھر (ع) ”دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا“ توحید کے مرکز کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں بساتے وقت توحید کے اعتبار سے ان کی ذمہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: لْيُقِيمُوا الصَّلَاةَ تاکہ وہ اللہ کی بندگی کے طور پر نماز قائم کریں۔ چنانچہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں خوشحالی اور عزت ملی تھی وہ اس گھر کے مالک کو پہچانتے اور اس کا حق ادا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے اللہ کے اس گھر میں ۳۶۰ بت نصب کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے بت کدے میں تبدیل کر دیا اور اس کے اصل مالک کو بالکل ہی فراموش کر دیا۔

**آیت ۴ ﴿الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ﴾** ”جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا“

انہیں رزق عطا فرما کر فاقہ کشی سے محفوظ رکھا۔ جب عرب کے عام لوگ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ کو کامیاب تجارت اور کعبہ کی تولیت کی وجہ سے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

**﴿وَأَمْنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾** ”اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔“

ان کے قافلے سارا سال یمن اور فلسطین کے درمیان بلا خوف و خطر گھومنا سفر کرتے تھے۔ خدا واد تحفظ کی یہ ضمانت انہیں اس سرزمین میں میسر تھی جہاں ہر طرف جنگل کے قانون کا راج تھا۔



# سُورَةُ الْمَاعُونِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الماعون میں اس معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی جھلک دکھائی گئی ہے جس میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی۔ وہ لوگ بظاہر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار تھے، لیکن عملی طور پر صورتحال یہ تھی کہ ان کے عقائد و نظریات مسخ ہو چکے تھے اور معاشرتی و اخلاقی اقدار بھی ان کے ہاں اب محض روایتوں اور رسوں کی حد تک زندہ رہ گئی تھیں۔ بد قسمتی سے آج امت مسلمہ بھی ایسے ہی نظریاتی و اخلاقی انحطاط کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَرۡءَيْتَ الَّذِي يَكۡذِبُ بِالۡدِّينِ ؕ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدۡعُ الْيَتِيۡمَ ؕ وَلَا يَحۡصُصْ عَلٰی طَعَامِ  
الْمُسۡكِيۡنِ ؕ قَوِيۡلٌ لِلۡمَصۡلِيۡنِ ؕ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنْ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ؕ الَّذِيۡنَ هُمۡ  
يُرۡءَوۡنَ ؕ وَيَسۡتَعُوۡنَ الْمَاعُوۡنَ ؕ

ع

**آیت ۱** ﴿اَرۡءَيْتَ الَّذِي يَكۡذِبُ بِالۡدِّينِ ①﴾ ”کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟“  
جو نہ تو بعثت بعد الموت کا قائل ہے اور نہ ہی آخرت کی جزا و سزا کو مانتا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس  
زندگی کے سوا ان کی کوئی اور زندگی نہیں ہے: ﴿وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوۡتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهۡلِكُنَا اِلَّا  
الدَّهۡرُ﴾ (الحاثیہ: ۲۴) ”وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے“ ہم خود ہی  
مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ۔“

آخرت کے احتساب کا انکار کر کے انسان دراصل جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا  
ہے اور اس کا کردار ع ”بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“ کے فلسفے کا چلتا چھرتا اشتہار بن کر رہ جاتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿فَذٰلِكَ الَّذِي يَدۡعُ الْيَتِيۡمَ ②﴾ ”یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔“

ظاہر ہے جو انسان اچھے برے اعمال کی جزا و سزا کو نہیں مانتا وہ معاشرے کے ایسے افراد کے لیے اپنا مال  
بھلا کیوں ضائع کرے گا جن سے اسے کسی فائدے کی توقع نہیں؟

**آیت ۳** ﴿وَلَا يَحۡصُصْ عَلٰی طَعَامِ الْمُسۡكِيۡنِ ③﴾ ”اور نہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین کرتا ہے۔“

اس میں انسان کی اس اخلاقی کمزوری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس نیک کام پر وہ خود کار بند نہیں ہے اس  
کے بارے میں دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کرے۔

**آیت ۵۴** ﴿قَوْلٌ لِّلْمَصْلِينَ ۝ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾ ”تو بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے زمانے تک مشرکین عرب کے ہاں نماز کا تصور موجود تھا لیکن اس کی عملی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ سورۃ الانفال کی اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مَكَاءً وَتَصْدِيَةً﴾ (آیت ۳۵) ”اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا۔“ ظاہر ہے جو لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس طواف کو سب سے اعلیٰ طواف سمجھتے تھے ان کے لیے تو نماز میں سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا بھی ایک مقدس عمل اور حصول ثواب کا بہت بڑا ذریعہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نماز کی ظاہری شکل آج تک اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں قائم ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا اور پھر حکم دیا: ((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))<sup>(۱)</sup> کہ تم لوگ نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ حضور ﷺ کی نماز کا وہ طریقہ اور عملی نمونہ جو صحابہ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے آج ہم اس پر تو کاربند ہیں لیکن بد قسمتی سے نماز کی اصل روح سے ہم بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ نماز کی اصل روح تو نماز کی خضوع و خشوع اور یہ احساس ہے کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے اور کس کے حضور کھڑے ہو کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ جیسا عہد و پیمان باندھ رہا ہے۔ بہر حال آج ہماری نمازیں اس روح سے خالی ہو کر محض ایک ”رسم“ کی ادائیگی کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں (الامشاء اللہ)۔ اقبال نے اپنے خصوصی انداز میں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کی تصویر انہیں بار بار دکھائی ہے:

رہ گئی رسم اذانِ روجِ بلائی نہ رہی      فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

اور۔

نماز و روزہ و قربانی و حج      یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

**آیت ۶** ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ يَّرْءَوْْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ هُمْ يَّرْءَوْْنَ ۝﴾ ”یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔“ وہ نماز کی ادائیگی سمیت ہر نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ان کی نیکی کا چرچا ہو۔

**آیت ۷** ﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝﴾ ”اور عام استعمال کی چیز بھی (مانگنے پر) نہیں دیتے۔“

مَاعُوْن کے معنی روزمرہ استعمال کی چیزیں ہیں جو ہر پڑوسی بوقت ضرورت اپنے پڑوسی سے عاریتاً لے لیتا ہے اور اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے کردار کی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے پاس سے آگ کی چنگاری (ماچس وغیرہ) اور نمک جیسی معمولی اشیاء تک بھی کسی کو دینا پسند نہیں کرتے۔



# سُورَةُ الْكَوْثَرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الکوثر اور اس سے پہلے کی تین سورتوں کے مضمون میں باہم گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس ربط کو یوں سمجھئے کہ پہلی تین سورتوں (سورۃ الفیل، سورۃ قریش اور سورۃ الماعون) میں حضور ﷺ کی بعثت سے قبل کے ماحول کا تاریخی، اقتصادی اور اخلاقی پس منظر دکھایا گیا ہے، جبکہ سورۃ الکوثر میں آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔ گویا مذکورہ تینوں سورتوں کی حیثیت سورۃ الکوثر کی تمہید کی سی ہے۔ سورۃ الفیل میں اس دور کے ایک بہت اہم تاریخی واقعہ کا ذکر ہے۔ سورۃ قریش میں قریش مکہ کی اقتصادیات کا حوالہ ہے کہ انہیں جو خوشحالی اور امن و امان حاصل ہے وہ صرف اور صرف بیت اللہ کی وجہ سے ہے، جبکہ سورۃ الماعون میں اس معاشرے کی اخلاقی پستی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اب سورۃ الکوثر میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا آتَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۖ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۚ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

**آیت ۱** ﴿إِنَّا آتَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۖ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کیا۔“

الکوثر: کثرت سے ماخوذ ہے اس کا وزن فُوعُلٌ ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جاسکے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ ”خیر کثیر“ کیا گیا ہے۔

”الکوثر“ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے حوض کوثر مراد ہے جو میدانِ حشر میں ہوگا اور اس سے حضور ﷺ اپنی امت کے پیاسوں کو سیراب فرمائیں گے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی ”خیر کثیر“ ہی میں شامل ہے۔ ”خیر کثیر“ کی وضاحت سے متعلق بھی تفاسیر میں لگ بھگ پچیس تیس اقوال ملتے ہیں۔ حضور ﷺ کو عطا ہونے والے خیر کثیر کی سب سے بڑی مثال خود قرآن مجید ہے۔ اسی طرح اس کی ایک مثال حکمت بھی ہے۔ ظاہر ہے آپ ﷺ کو اعلیٰ ترین درجے میں حکمت بھی عطا ہوئی تھی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ لَا يَبْلُغُهُ إِلَّا الَّذِينَ خَلَوْا رَبَّهُمْ ۚ قَلِيلٌ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ ۚ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (البقرة: ۲۶۹) ”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔“ مزید برآں جنت کی نہر کوثر نبوت کے فیوض و برکات، دین اسلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثرت، رفع ذکر اور مقام محمود کو ”کوثر“ کا مصداق سمجھا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو وہ سب کچھ عطا کر دیا اور کثرت کے

ساتھ عطا کر دیا جس کی انسانیت کو ضرورت ہے اور جو نوع انسانی کے لیے طرہ امتیاز بن سکتا ہے۔

**آیت ۲ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾** ”پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کیجیے اور قربانی کیا کیجیے۔“

نحر کے لغوی معنی اونٹ ذبح کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں جن دو احکام کا ذکر ہے ان دونوں پر عید الاضحیٰ کے دن عمل ہوتا ہے۔ یعنی عید الاضحیٰ کے دن پہلے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور پھر جانور قربان کرتے ہیں۔

**آیت ۳ ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾** ”یقیناً آپ (ﷺ) کا دشمن ہی جڑ کٹا ہوگا۔“

شَانِئِ بغض و عداوت رکھنے والے دشمن کو کہتے ہیں۔ اَبْتَرُ: بتر سے ہے، یعنی کسی چیز کو کاٹ دینا، منقطع کر دینا۔ اہل عرب دُم کٹے جانور کو ابتر کہتے ہیں۔ عرف عام میں اس سے ایسا آدمی مراد لیا جاتا ہے جس کی نرینہ اولاد نہ ہو اور جس کی نسل آگے چلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ یہ لفظ مشرکین مکہ نے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے لیے استعمال کیا تھا، جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور ﷺ کی یہ اولاد پیدا ہوئی: قاسم، پھر زینب، پھر عبداللہ، پھر ام کلثوم، پھر فاطمہ، پھر رقیہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ پہلے قاسم کا انتقال ہوا۔ پھر عبداللہ (جن کا لقب طیب و طاہر ہے) داغ مفارقت دے گئے۔ اس پر مشرکین نے خوشیاں منائیں کہ آپ کے دونوں فرزند فوت ہو گئے ہیں اور باقی اولاد میں آپ کی بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ لہذا آپ جو کچھ بھی ہیں بس اپنی زندگی تک ہی ہیں آپ کے بعد نہ تو آپ کی نسل آگے چلے گی اور نہ ہی کوئی آپ کا نام لیوا ہوگا۔ اس پس منظر میں یہاں ان لوگوں کو سنانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ کا نام اور ذکر تو ہم بلند کریں گے، جس کی وجہ سے آپ کے نام لیوا تواریخوں کی تعداد میں ہوں گے۔ البتہ آپ کے یہ دشمن واقعی ابتر ہوں گے جن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔



# سُورَةُ الْكَافِرُونَ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الکافرون گویا حضور ﷺ کا ان لوگوں سے اعلانِ براءت ہے جن پر ہر لحاظ سے ”حق“ واضح ہو چکا تھا اور وہ اس اتمامِ حجت کے باوجود بھی آپ کو جھٹلانے پر تلمے ہوئے تھے۔ یہ موڑ ہر رسول کی دعوت کے سفر کے دوران آتا رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسے اعلان کا انداز نا صحانہ یا واعظانہ نہیں بلکہ جارحانہ ہوتا ہے۔ یہ سورۃ مبارکہ مکہ مکرمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب قریش مکہ و قنوف قنار رسول اللہ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی ایک کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے مابین پیدا ہو چکا تھا۔ اس پر یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی جس نے کفار مکہ کی ساری اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ۚ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۚ وَلَا اَنْتُمْ عِبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۚ وَلَا اَنَا عَابِدٌ  
مَّا عَبَدْتُمْ ۚ وَلَا اَنْتُمْ عِبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۚ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَاِلٰيَّ دِيْنُ

عِ

**آیت ۱** ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ۚ﴾ (اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! ”

نوٹ کیجیے! یہ داعیانہ طرزِ مخاطب نہیں ہے بلکہ لاتعلق اور علیحدہ ہونے کا انداز ہے۔ ظاہر ہے ایک داعی تو اپنے مخاطبین کو یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کہہ کر پکارتا ہے کہ اے اللہ کے بندو! میری بات سنو! گویا کلمہ مخاطب میں ہی مفہوم واضح کر دیا گیا کہ اگر میری تمام تر نا صحانہ کوششوں کے باوجود بھی تم لوگوں نے کفر و انکار پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارا یہ فیصلہ اور طرزِ عمل تمہیں مبارک ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد اب میری اور تمہاری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔

**آیت ۲** ﴿لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۚ﴾ ”میں ان کو ہرگز نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو۔“

**آیت ۳** ﴿وَلَا اَنْتُمْ عِبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۚ﴾ ”اور نہ تم پوجنے والے ہو اُسے جسے میں پوجتا ہوں۔“

اس آیت میں ان کے تمام معبودوں کی نفی کر دی گئی ہے۔ وہ لوگ اللہ کی پرستش تو کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے بھی قائل تھے۔ اس پس منظر میں ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ جس طرح میں خالص اللہ کی بندگی کرتا ہوں اس طرح تم لوگ صرف اور صرف اس کی پرستش نہیں کرتے ہو۔ چنانچہ تمہاری اس

انداز کی پرستش تمہارے اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش تو ہو سکتی ہے ایک اللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی۔  
**آیت ۴** ﴿وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۖ﴾ ”اور نہ ہی میں آئندہ کبھی پوجنے والا ہوں ان کو جن کی تم پرستش کر رہے ہو۔“

ان آیات میں بظاہر تکرار نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت اس اسلوب میں ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یعنی نہ میں نے زمانہ ماضی میں کبھی تمہارے معبودانِ باطل کی پرستش کی اور نہ آئندہ کبھی تم مجھ سے اس کی توقع کر سکتے ہو۔

**آیت ۵** ﴿وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَّا أَعْبُدُ ۖ﴾ ”اور نہ تم پوجنے والے ہو اس کو جس کو میں پوج رہا ہوں۔“

**آیت ۶** ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۖ﴾ ”اب تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔“  
 اب میرا تمہارا تعلق ختم۔ تم لوگ جس راستے پر جا رہے ہو تمہیں وہ راستہ مبارک ہو۔ تم اپنے حال میں مست رہو میں اپنے دین حق پر ثابت قدم ہوں۔ حق و باطل کا یہ معرکہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر رہے گا اور تم دیکھو گے کہ جلد ہی جزیرہ عرب پر دین اسلام غالب آکر رہے گا۔





# سُورَةُ النَّصْرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ النصر کے بارے میں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ مدنی ہے لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ سورت ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی اور اس میں حضور ﷺ کو خوشخبری سنائی گئی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ کی تائید و نصرت سے آپ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے اور لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس مفہوم میں میرے نزدیک اس سورت کے مضمون کا سورۃ الانشراح کی ان آیات سے گہرا تعلق ہے: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ (۸) ”پھر جب آپ فارغ ہو جائیں تو خوب محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیے“۔ بلکہ اس سورت کی آخری آیت کے الفاظ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ تو سورۃ الانشراح کی مذکورہ آیات کے مضمون کا تسلسل محسوس ہوتے ہیں۔<sup>(۱)</sup>

واضح رہے کہ قرآن مجید کے مختلف مصاحف میں کسی سورت کے بارے میں کمی یا مدنی لکھا ہونا حرف آخر نہیں ہوتا۔ دراصل طویل سورتوں کے زمانہ نزول کے بارے میں تو متیقن کے ساتھ معلوم ہے کہ یہ مکی ہیں یا مدنی، چنانچہ ان کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے جبکہ چھوٹی سورتوں میں سے اکثر کے زمانہ نزول سے متعلق تفاسیر میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۖ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

- (۱) سورۃ النصر کے زمانہ نزول کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورت ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوتی ہے۔ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول روایت کے مطابق یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں بمقام منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد حضور ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ (خطبہ حجۃ الوداع) دیا۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت آن پورا ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ابن عباسؓ کے اس قول کی تائید منقول ہے۔ (حاشیہ از مرتب)

**آیت ۱** ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝۱﴾ ”جب آجائے مدد اللہ کی اور فتح نصیب ہو۔“

**آیت ۲** ﴿وَرَأَيْتِ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝۲﴾ ”اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہوتے

ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔“

**آیت ۳** ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۝۳﴾ ”تو پھر آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے

اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔“

﴿إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝۴﴾ ”یقیناً وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔“

یعنی ابھی تو آپ کو دعوت و تبلیغ اور فریضہ رسالت کے سلسلے میں بہت سی مشقتیں اٹھانی ہیں اور جنگ و قتال

کے مراحل سے گزرنا ہے، لیکن جب آپ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں یعنی اللہ کا دین غالب ہو جائے تو

آپ ہمہ وقت ہمدن اپنے رب کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جائیے گا۔ نوٹ کیجیے! سورۃ الانشراح کی آخری

آیات میں بھی اسی اسلوب و انداز میں بالکل ایسا ہی حکم دیا گیا ہے۔



# سُورَةُ اللَّهَبِ

## تمہیدی کلمات

حضور ﷺ اپنی بعثت کے بعد تقریباً تین سال تک دعوت و تبلیغ کا فریضہ زیادہ تر ذاتی سطح کی انفرادی ملاقاتوں (PP calls) کے ذریعے سرانجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپ نے اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم کے لوگوں کو دعوت کی غرض سے دو مرتبہ کھانے پر مدعو کیا۔ بعض مستشرقین نے آپ کے اس دور کے دعوتی رابطوں کو زیر زمین (under ground) سرگرمیوں کا نام دیا ہے جو کہ بالکل خلاف حقیقت بات ہے، البتہ اسے جیسے انداز کی (low key) دعوت کہا جاسکتا ہے۔

بہر حال جب سورۃ الحجر کی آیت ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ کے ذریعے آپ کو حکم ملا کہ آپ اپنی دعوت کو ڈنکے کی چوٹ عام کریں تو آپ نے قریش مکہ کو کھلے عام دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے آپ ﷺ نے معاشرے کے عام رواج کے مطابق ایک دن کوہ صفا پر کھڑے ہو کر وَاَصْبَحَا کا نعرہ بلند کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ اگر کوئی شخص لوگوں کو کسی اہم خبر سے متنبہ کرنا چاہتا تو وہ برہنہ حالت میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر وَاَصْبَحَا کی آواز بلند کرتا۔ عرب میں یہ نعرہ خطرے کا الارم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جو کوئی بھی اسے اس حالت میں دیکھتا یا اس کی آواز سنتا وہ اس کی بات سننے کے لیے فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتا۔ اس زمانے میں زیادہ تر خبریں مخالف قبیلوں کے حملوں وغیرہ کے بارے میں ہوتی تھیں، اس حوالے سے کلمہ وَاَصْبَحَا کا مفہوم یہ تھا کہ کل تم لوگ بہت بری صبح کا سامنا کرنے جا رہے ہو۔ (اس زمانے میں یہ گویا ہنگامی پریس کانفرنس کا ایک انداز تھا۔) چنانچہ حضور ﷺ نے اسی رواج پر جزوی انداز سے عمل کرتے ہوئے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر وَاَصْبَحَا کے اعلان سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ گویا آپ بھی ان لوگوں کو ایک بھیاں تک صبح کی خبر دینے والے تھے، اگرچہ یہ خبر اگلے دن کی معمول کی صبح کی نہیں تھی بلکہ صبح قیامت سے متعلق تھی:۔

بات کوئی تو ہنسی کی نلکے خندۂ صبح قیامت ہی سہی!

بہر حال جب قریش کے لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے انہیں مخاطب کر کے اندازِ آخرت کے بارے میں ایک مدلل و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا۔ ابولہب آپ کے گھر کھانے کی دعوت میں آپ کی یہ باتیں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اس نے اس موقع پر انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا: تَبَّ لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَّا؟ کہ تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں (معاذ اللہ! نقل کفر کفر نباشد) تم نے صرف اس بات کے لیے ہمیں بلایا تھا؟ چنانچہ اس کے اس رویے اور اس جملے کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا کہ ہاتھ تو دراصل تمہارے ٹوٹے ہیں اور تم اپنی بیوی سمیت دہکتی آگ کے گڑھے میں بھی گر چکے ہو۔

اپنے مضمون کے اعتبار سے اس سورت کا انداز سورۃ الکوتر کی آخری آیت ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ سے ملتا جلتا ہے۔ سورۃ الکوتر کی اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دشمنوں کے گستاخانہ نعروں کا جواب خود دیا تھا اور ان پر واضح کر دیا تھا کہ ”ابتر“ تو حقیقت میں تم لوگ ہو اور تمہارے بعد دنیا میں تمہارا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بَتَّ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۖ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۖ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۖ  
وَأُمْرَأَتُهُ ۖ حَبَالَةَ الْحَطَبِ ۖ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۖ

**آیت ۱** ﴿بَتَّ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۖ﴾ ”ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہو گیا۔“  
**آیت ۲** ﴿وَأُمْرَأَتُهُ ۖ حَبَالَةَ الْحَطَبِ ۖ﴾ ”کچھ کام نہ آیا اس کے اس کا یہ مال اور وہ کمائی جو اس نے کی ہے۔“

**آیت ۳** ﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۖ﴾ ”عنقریب وہ جھونکا جائے گا بھڑکتی ہوئی آگ میں۔“  
لہب کے معنی آگ کے شعلے اور انگارے کے ہیں۔ اس شخص کی کنیت (ابولہب) کے حوالے سے یہاں اس لفظ کا استعمال ”صنعت لفظی“ کی بہترین مثال ہے۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا، لیکن اپنی سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے ”ابولہب“ (شعلہ رو) کی کنیت سے مشہور تھا۔ ظاہری اعتبار سے ابولہب بہت وجیہ اور خوبصورت شخص تھا۔ اس پس منظر میں اس آیت کے الفاظ گویا یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اس شخص کو سرخ و سفید رنگت اور خوبصورت شکل و صورت بھی ہم نے عطا کی ہے اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں بھی اسے ہم ہی جھونکیں گے۔  
[قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے جہاں دشمنان اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے] حالانکہ مکہ مدینہ اور دیگر قبل عرب میں حضور ﷺ کے دشمنوں اور بدخواہوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابولہب حضور ﷺ کا حقیقی چچا اور قریب ترین ہمسایہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھا اور اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں صلہ رحمی اور خاندانی حمیت جیسی عرب روایات کا بھی کچھ پاس نہ کیا۔

**آیت ۴** ﴿وَأُمْرَأَتُهُ ۖ﴾ ”اور اس کی بیوی کو بھی۔“

اس کی بیوی بھی حضور ﷺ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی۔ اس کا نام اُروہ اور کنیت اُم جمیل تھی اور اس کے دل میں حضور ﷺ کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضور ﷺ کی دشمنی کے اعتبار سے ان دونوں کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی میں سے کون حضور ﷺ کا بڑا دشمن تھا۔

قبل ازیں سورۃ التحریم کے آخری رکوع میں ہم خواتین کے کردار کی تین مثالوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ پہلی مثال میں حضرت لوط اور حضرت نوح علیہ السلام کی کافر بیویوں کا ذکر ہے۔ یہ بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین

بیویوں کی مثال ہے۔ پھر فرعون کی بیوی آسیہؓ کا ذکر گویا بدترین شوہر کے ہاں بہترین بیوی کی مثال ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم سلام علیہا کے حوالے سے ایک ایسی خاتون کی مثال بیان کی گئی ہے جو خود بھی نیک فطرت تھی اور حضرت زکریاؑ کی سرپرستی میں انہیں ماحول بھی ایسا ملا جو نیکی اور پاکیزگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ گویا وہاں سورۃ التحریم میں خواتین کے حوالے سے تین قسم کی ممکنہ صورتوں کی مثالوں کا ذکر تو ہو چکا ہے جبکہ اس سلسلے کی چوتھی ممکنہ صورت کا ذکر یہاں اس سورت میں ہوا ہے، یعنی شوہر بھی بدترین اور بیوی بھی بدترین۔ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ ”جو ایندھن اٹھانے والی ہوگی۔“

روایات میں چونکہ ذکر ملتا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی بہت بخیل تھے، اس لیے بعض لوگوں نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ عورت جنگل سے لکڑیاں لٹھ کر لایا کرتی تھی، حالانکہ یہ بات خلاف عقل و قیاس ہے۔ ابولہب نہ صرف بہت مال دار تھا بلکہ معاشرتی لحاظ سے وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا منصب دار بھی تھا۔ وہ حرم کے محکمہ مالیات کا انچارج تھا (اس حیثیت سے اس پر اگرچہ یہ الزام بھی تھا کہ اس نے حرم کے خزانے سے سونے کے دوہرن چرائیے تھے)۔ چنانچہ یہ دونوں میاں بیوی اپنے معاشرے کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معاشرے کی ایک وی آئی پی خاتون، بنو ہاشم کے رئیس کی بیوی جسے گویا خاتونِ اول کا سادہ رہہ حاصل تھا، کے بارے میں جنگل سے لکڑیاں لٹھ کر سر پر کٹھن لاد کر لانے والی بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس عورت کی حرکتیں جہنم کی آگ کا ایندھن اکٹھا کرنے اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکانے کے مترادف ہیں۔ جب یہ اپنے شوہر کے ساتھ جہنم میں جھونکی جائے گی اُس وقت اس کا حال اُس مجرم کا سا ہوگا جو اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔

**آیت ۵** ﴿فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ﴾ ”اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔“

آج یہ عورت اپنے گلے میں جو خوبصورت ہار پہنے پھرتی ہے کل آخرت میں یہی ہار اس کے گلے میں ایک مضبوط بٹی ہوئی رسی کی صورت اختیار کر لے گا جیسی رسی ایندھن ڈھونڈنے والی لونڈیوں کے گلے میں پڑی ہوتی ہے۔ اس رسی میں یہ اپنے اعمالِ بد کا ایندھن باندھ کر جہنم میں لے جائے گی اور اپنی اور اپنے شوہر کی آگ کو مزید بھڑکائے گی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ”شاید وہاں زقوم اور ضریح کی (جو جہنم کے خاردار درخت ہیں) لکڑیاں اٹھائے پھرے اور ان کے ذرپے سے اپنے شوہر پر عذابِ الہی کی آگ کو تیز کرتی رہے۔“



# سُورَةُ الْإِخْلَاصِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الاخلاص قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے اور توحید باری تعالیٰ کے موضوع پر یہ قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے اس سورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ 'الاخلاص' اس سورت کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝

**آیت ۱** ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝﴾ ”کہہ دیجیے وہ اللہ یکتا ہے۔“

أَحَد: وہ اکیلا اور یکتا جس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ وہی اکیلا رب ہے کسی دوسرے کا ربوبیت اور الوہیت میں کوئی حصہ نہیں۔ وہی تنہا کائنات کا خالق، مالک الملک اور نظامِ عالم کا مدبر و منتظم ہے۔

**آیت ۲** ﴿اللَّهُ الصَّمَدُ ۝﴾ ”اللہ سب کا مرجع ہے۔“

صَمَد کے لغوی معنی ایسی مضبوط چٹان کے ہیں جس کو سہارا بنا کر کوئی جنگجو اپنے دشمن کے خلاف لڑتا ہے تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ بعد میں یہ لفظ اسی مفہوم میں ایسے بڑے بڑے سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو لوگوں کو پناہ دیتے تھے اور جن سے لوگ اپنے مسائل کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اس طرح اس لفظ میں مضبوط سہارے اور مرجع (جس کی طرف رجوع کیا جائے) کے معنی مستقل طور پر آ گئے۔ چنانچہ اللہ الصَّمَد کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کا مرجع اور مضبوط سہارا ہے۔ وہ خود بخود قائم ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ باقی تمام مخلوقات کو اس کے سہارے کی ضرورت ہے اور تمام مخلوق کی زندگی اور ہر چیز کا وجود اسی کی بدولت ہے۔ ﴿وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (البقرة: ۲۵۵) ”اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو وہ خود چاہے“۔ ظاہر ہے وہ الٰہی اور القیوم ہے یعنی خود زندہ ہے اور تمام مخلوق کو تھامے ہوئے ہے۔ باقی تمام مخلوقات کے ہر فرد کا وجود مستعار ہے اور کائنات میں جو زندہ چیزیں ہیں ان کی زندگی بھی مستعار ہے۔ جیسے ہم انسانوں کی زندگی بھی ”عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن!“ کے مصداق اسی کی عطا کردہ ہے۔

**آیت ۳ ﴿لَمْ يَلِدْهُ وَلَمْ يُولَدْ﴾** ﴿۳﴾ ”نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔“

یعنی نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اُس کی کوئی اولاد ہے۔ یہ نکتہ سورۃ الجن میں بایں الفاظ واضح فرمایا گیا: ﴿مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا﴾ ﴿۴﴾ ”اُس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی اختیار کی ہے اور نہ کوئی اولاد۔“ عیسیٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور یہودیوں کے بعض فرقے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتاتے تھے۔ اس آیت میں ایسے تمام عقائد باطلہ کی نفی کر دی گئی ہے۔

**آیت ۴ ﴿لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾** ﴿۴﴾ ”اور کوئی بھی اُس کا کفو نہیں ہے۔“

’کُفُو‘ کے معنی ہم سر کے ہیں، جو قدرت، علم، حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلہ اور ہم پایہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نہ تو کوئی ہم پلہ اور برابر کر کے والا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضد، ند، مثل، مثیل وغیرہ ہے۔



# سُورَةُ الْفَلَقِ

## تمہیدی کلمات

اب ہم قرآن مجید کی آخری دو سورتوں (مُعَوِّذَتَيْنِ) کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ سورتیں گویا قرآن مجید کے اختتام پر دو پہرے دار ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آتا ہے کہ مدینہ کے ایک یہودی نے حضور ﷺ پر جادو کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ بعض باتیں بھول جاتے تھے اور آپ کو جسمانی طور پر بھی تکلیف رہتی تھی۔ اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ حضور ﷺ ان سورتوں کی کثرت سے تلاوت کرتے رہے تا آنکہ آپ سے جادو کے اثرات زائل ہو گئے۔

جدید دور کے عقلیت پسند (rationalists) ”اہل علم“ خصوصی طور پر منکرین احادیث ایسی روایات کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں بلکہ ان کے خیال کے مطابق تو ایسا سمجھنا حضور ﷺ کی توہین کے مترادف ہے۔ اس قسم کے دلائل کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضور ﷺ کامل ترین انسان ہیں اور معراج انسانیت کے درجے پر فائز ہیں۔ آپ کی عصمت و عظمت کے مراتب بلاشبہ ہمارے تصور سے بھی ماوراء ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام بشری کیفیات آپ کی ذات پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ مقام غور ہے کہ اگر حضور ﷺ کو بخار ہوتا تھا، اگر آپ تلوار کے وار سے زخمی ہوئے تھے، اگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپ پر نقابت طاری ہوئی تھی اور اگر آپ پر نزع کی تکلیف وارد ہوئی تھی تو آخر جادو آپ پر کیونکر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ جادو کا اثر حضور ﷺ کی جسمانی صحت تک محدود تھا، رسالت کا کوئی پہلو قطعاً اس سے متاثر نہ تھا۔ بہر حال جادو اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضور ﷺ پر جادو کیا گیا اور اس کے منفی اثرات کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو ان سورتوں کا بیش بہا تحفہ عطا کیا۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((اَلَمْ تَرَ آيَاتِ اَنْزَلَتْ اَللّٰیْلَةَ لَمْ یَرِ مِنْهُنَّ قَطُّ؟ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ)) (۱) یعنی تمہیں خبر ہے اللہ تعالیٰ نے آج رات ایسی آیات نازل فرمائی ہیں جن کی پہلے کوئی مثال نظر نہیں آتی؟ وہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں اور ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ یہ مضمون ایک سورت کی شکل میں بھی نازل ہو سکتا تھا، لیکن قرآن مجید کا عمومی مزاج چونکہ ایسا ہے کہ زیادہ تر سورتیں جوڑوں کی شکل میں نازل ہوئی



ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنیادی مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو الگ الگ سورتوں کی شکل میں نازل فرمایا۔ مضمون کی اس تقسیم کے مطابق سورۃ الفلق میں ان چیزوں یا ان شرور سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان پر باہر سے حملہ آور ہوتی ہیں جبکہ سورۃ الناس میں اندرونی طور پر اثر انداز ہونے والے شرور کا ذکر ہے۔ بہر حال ہمیں چاہیے کہ ان تمام شرور کے اثرات بد سے بچنے کے لیے ہم ان سورتوں کے ذریعے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

ع

**آیت ۱** ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝﴾ ”کہو کہ میں پناہ میں آتا ہوں صبح کے رب کی۔“

فَلَقٌ یَفْلُقُ کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے کے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے ﴿فَالِقُ الْاُصْبَاحِ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے سپیدہ سحر نمودار کرتا ہے۔ البتہ اسی سورت کی آیت ۹۵ میں یہ لفظ دانوں اور گٹھلیوں وغیرہ کے پھاڑنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْغُبِّ وَالنَّوْیِ﴾۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کے اندر دانوں یا گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے تو پودوں یا درختوں کی پتیاں اور جڑیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ فلق سے مراد یہاں صرف صبح ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عدم کا پردہ چاک کر کے وجود بخشا ہے۔ جیسے کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا گیا:

**آیت ۲** ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝﴾ ”(میں پناہ میں آتا ہوں) اس کی تمام مخلوقات کے شر سے۔“

یعنی ”شر“ مستقل طور پر علیحدہ وجود رکھنے والی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات کے اندر ہی کا ایک عنصر ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص یا عیب سے پاک ہے۔ لیکن اس کی مخلوق اپنے خالق کی طرح کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہر مخلوق کے اندر کمی یا تقصیر و تنقیص کا کوئی نہ کوئی پہلو یا عنصر بالقوہ (potentially) موجود ہے۔ جیسے خود انسان کی متعدد کمزوریوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِیْفًا ۝﴾ کہ انسان بنیادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝﴾ کے الفاظ میں انسان کی جلد بازی کا ذکر ہوا۔ سورۃ المعارج میں اس کی تین کمزوریوں کا ذکر باس الفاظ ہوا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝﴾ ”یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑ دلا۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔“

گویا انسان روحانی طور پر اگرچہ احسن تقویم کے درجے میں پیدا کیا گیا ہے، لیکن اس کے حیوانی اور مادی وجود میں مذکورہ خامیوں سمیت بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہر مخلوق میں مختلف کمزوریوں

کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے 'شر' جنم لیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے پروردگار! تیری جس جس مخلوق میں شر کے جو جو پہلو پائے جاتے ہیں ان میں سے ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

**آیت ۳** ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝﴾ ”اور (خاص طور پر) اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے۔“  
ظاہر ہے رات کے اندھیرے میں انسانوں، جنوں اور ضرر رساں جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی صورت میں شر پھیلانے والے عناصر زیادہ فعال اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ گویا رات کا اندھیرا بذاتِ خود ایک بہت بڑا شر ہے جس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔

**آیت ۴** ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝﴾ ”اور اُن عورتوں کے شر سے جو گرہیں باندھ کر پھونکیں مارتی ہیں۔“

یعنی وہ تمام ٹوٹے ٹوٹے، تعویذ گنڈے اور سفلی عملیات جن کے ذریعے سے کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ کسی چیز کا بالفعل موجود ہونا اور بات ہے اور اس چیز کا حلال، حرام یا جائز، ناجائز ہونا الگ بات ہے۔ مثلاً جادو ایک حقیقت ہے لیکن کفر ہے۔ شراب اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتی ہے لیکن حرام ہے۔ اسی طرح علم نجوم، پامسٹری (ہاتھ کی لکیروں کا علم) اور سفلی عملیات کی حقیقت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا (ظاہر ہے جب ہم اچھے وظائف و کلمات کی اچھی تاثیر کو مانتے ہیں تو ہمیں سفلی و شیطانی کلمات وغیرہ کی منفی تاثیر کا بھی اقرار کرنا پڑے گا) لیکن شریعت نے ہمیں ایسے علوم سے استفادہ کرنے اور ایسے علوم کی بنیاد پر کیے گئے دعووں پر یقین کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہ تو موثر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس لیے ان کے شر سے بچنے کا آسان اور موثر طریقہ یہی ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دے۔

**آیت ۵** ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝﴾ ”اور حسد کرنے والے کے شر سے بھی (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔“

ظاہر ہے جب ایک انسان کسی دوسرے انسان سے حسد کرتا ہے تو عین ممکن ہے وہ اپنے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر عملی طور پر بھی اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((الْعَيْنُ حَقٌّ))<sup>(۱)</sup> یعنی نظر لگ جانا برحق ہے۔ چنانچہ حاسدانہ نگاہ بذاتِ خود بھی منفی اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کی ضرورت ہے۔

بہر حال جادو ٹوٹے، تعویذ گنڈے، نظر بد وغیرہ کے اثرات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۲ میں شیاطین جن کا ذکر آیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ گھناؤنا کاروبار کسی نہ کسی انداز سے ہر زمانے میں چلتا رہا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسی

چیزیں سیکھنے سکھانے اور پھر مختلف دعوؤں کے ساتھ اپنا کاروبار چکانے میں مصروف ہیں۔ البتہ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے ہماری شریعت میں ایسی چیزیں سیکھنا اور پھر کسی بھی انداز میں ان سے استفادہ کرنا حرام ہے۔ اس حوالے سے ایک بندہ مؤمن کو اپنے دل میں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَا لَهُمْ بِصَآدِقِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (آیت ۱۰۲)۔ ایک بندہ مؤمن کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ جو تکلیف بھی آئے گی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی آئے گی (یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ خود کسی انسان کو کسی تکلیف یا مشکل سے دوچار کرنا چاہے) اور اللہ کے اذن سے ہی دور ہوگی۔ جہاں تک ایسی چیزوں سے حفاظتی تدابیر اپنانے یا ایسے کسی شیطانی حملے کے توڑ کرنے کا تعلق ہے تو ان دو سورتوں (مُعَوِّذَتَيْنِ) کے ہوتے ہوئے ایک بندہ مسلمان کو کسی اور عمل، تعویذ یا تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو سکھائی تھیں اور اس لحاظ سے یہ حضور ﷺ کی وساطت سے امت کے لیے ایک بیش بہا تحفے کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ ہر شب آرام کرنے سے پہلے آخری تینوں سورتیں (سورۃ الاخلاص اور معوذتین) پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے اور پھر اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ مزید برآں شیطانی اثرات اور نظر بد وغیرہ سے حفاظت کے لیے احادیث میں متعدد ادعیہ ماثورہ بھی وارد ہوئی ہیں، جن کو ہمیں اپنا معمول بنانا چاہیے۔



# سُورَةُ النَّاسِ

## تمہیدی کلمات

جیسا کہ سورۃ الفلق کے تعارف کے دوران بھی بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ الناس مدنی سورت ہے بلکہ میری تحقیق کے مطابق تو سورۃ الملک سے شروع ہونے والی سورتوں کے اس آخری گروپ میں صرف یہی دو سورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہی مدنی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر کمی مدنی سورتوں کے اس آخری گروپ اور پہلے گروپ کے درمیان مدنی اور کمی قرآن کی مقدار کے حوالے سے پائی جانے والی ایک ”مککوس (reciprocal) نسبت“ کے بارے میں بھی جان لیجیے۔ یعنی جس طرح سورتوں کے پہلے گروپ میں کمی قرآن بہت تھوڑا (صرف سورۃ الفاتحہ) اور مدنی قرآن کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ (سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ) پر مشتمل تقریباً سوا چھ پارے) ہے، اسی طرح زیر مطالعہ آخری گروپ میں مدنی قرآن کی مقدار بہت کم (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہے اور اس کے مقابلے میں کمی قرآن تقریباً دو پاروں پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفلق میں ان مضرتوں اور شرانگیزیوں سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسان کے ظاہری حالات اور جسمانی کیفیات کو متاثر کرتی ہیں جبکہ سورۃ الناس میں ایسے شرور سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے جو انسان کے باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے ایمان و ایقان پر یلغار کرتے ہیں۔

سورۃ الناس کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس سورت کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ بھی جوڑے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کی آیات میں گہری مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں سورتوں کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ مشابہت اور مناسبت صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ کی پہلی اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و صفات کا بیان اور اس کے رب العالمین ہونے کا اقرار ہے جبکہ سورۃ الناس کی پہلی آیت میں تمام انسانوں کے رب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ دونوں سورتوں کی اگلی دونوں آیات (مَلِکِ یَوْمِ الدِّینِ ② اور مَلِکِ النَّاسِ ③) کی لفظی و معنوی مشابہت بہت ہی واضح ہے۔ اس کے بعد سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور اس کی عبادت کرنے کے عہد کے ساتھ اس سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے جبکہ اس کے متوازی سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت (إِلَہِ النَّاسِ ④) کے اقرار کے ساتھ شیطان کے وساوس کے خلاف اس کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ ظاہر ہے سیدھے راستے پر چلنے کے لیے مدد طلب کرنا (استعانت) اور شیطان کے حملوں سے پناہ مانگنا (استعاذہ) باہم ملتی جلتی اصطلاحات ہیں کہ اے اللہ ہم تیری عبادت کا وعدہ کرتے ہیں مگر ہم تیری مدد کے محتاج ہیں۔ اس کے لیے ہمیں تیرے سہارے اور تیری پناہ کی ضرورت ہے تاکہ تیری پناہ میں آکر ہم شیطان کی وسوسہ اندازی سے محفوظ ہو جائیں۔ اس زاویے سے ان دونوں سورتوں کا جائزہ لیا جائے تو سورۃ الناس، سورۃ الفاتحہ کا عکس یا شئی (duplicate) بنتی نظر آتی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ إِلَهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

**آیت ۱** ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ ”کہیے کہ میں پناہ میں آتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔“ یہاں سب سے پہلے ”رَبِّ النَّاسِ“ (لوگوں کا پروردگار) کے کلمات سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا ہے کہ تمہیں ایسی ذات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو تمہاری جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔

**آیت ۲** ﴿مَلِكِ النَّاسِ ②﴾ ”تمام انسانوں کے بادشاہ کی۔“ وہ تمام انسانوں کا صرف پروردگار ہی نہیں ان کا بادشاہ اور فرماں روا بھی ہے۔ اس کا حکم ہر وقت ہر جگہ اور ہر چیز پر نافذ ہے۔

**آیت ۳** ﴿إِلَهِ النَّاسِ ③﴾ ”تمام انسانوں کے معبود کی۔“ انسانوں کا رب اور بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ان کا معبود بھی ہے چنانچہ وہ ان پر کامل اقتدار اور اختیار رکھتا ہے اور ان کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے۔

**آیت ۴** ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ④﴾ ”اس بار بار وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے۔“

شیطان کی وسوسہ اندازی کا طریق کاریہ ہے کہ وہ لگاتار اپنی کوشش جاری رکھتا ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کی کوششوں سے تھکتا نہیں۔ کبھی حملہ کرتا ہے، کبھی دفاعی پسپائی اختیار کرتا ہے اور پھر پلٹ کر حملہ آور ہوتا ہے۔

**آیت ۵** ﴿الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ⑤﴾ ”جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔“

**آیت ۶** ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥﴾ ”خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔“

انسان کے دل و دماغ پر شیطانی دساوس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کی وضاحت حضور ﷺ کے اس فرمان سے ملتی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَئِنْ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ))<sup>(۱)</sup> ”شیطان انسان کے وجود میں خون کی مانند گردش کرتا ہے۔“ گویا شیطان نفس انسانی کے اندر موجود حیوانی شہوات اور سفلی داعیات (فرائیڈ اسے id یا libido کا نام دیتا ہے) کو بھڑکاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان اپنی تھوٹنی انسان کے دل پر رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس طرح اس کے جذبات و شہوات میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافہ۔ وصحیح مسلم، کتاب

السلام، باب بیان انه يستحب لمن رئی خالیا بامرأة.....

انسان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے اور اس کے جذبات کو انگیزت دینے کی حد تک اختیار دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان سے زبردستی کوئی عمل کرانے کا اختیار اسے نہیں دیا گیا۔ بہر حال نفس انسانی بعض اوقات شیطان کے بہکاوے میں آکر متعلقہ انسان کے لیے شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے اور پھر بالکل شیطان ہی کی طرح اس کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ ق میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْنَاهُ مَأْوِسًا بِهٖ نَفْسُهُ﴾ (آیت ۱۶) ”اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے“۔ ایسے نفس انسانی کو سورہ یوسف کی آیت ۵۳ میں ”نفس امارہ“ کا نام دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اہم اور بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ شیطان اُسی دل پر اپنی تھوٹھنی رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے جو دل اللہ کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو دل اللہ کی یاد میں مشغول اور اس کے ذکر سے معمور ہوتا ہے شیطان اس سے دور رہتا ہے۔ بہر حال شیطان کے تمام وسوسے اور حربے انسان کے اپنے نفس کے ذریعے سے ہی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ سورت خصوصی طور پر شیطانی وسوسوں کے توڑ کے لیے نازل ہوئی ہے۔

بَارِكْ اللّٰهُ لِيْ وَلِكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعْنِيْ وَآتَاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝۰۰

## دعاۓ ختم قرآن

اَللّٰهُمَّ اِنْسِ وَحَشَّتِيْ فِيْ قَبْرِىْ، اَللّٰهُمَّ اَرْحَمْنِيْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ، وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَنُوْرًا وَهَدًى وَرَحْمَةً، اَللّٰهُمَّ ذِكْرُنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيتُ، وَعَلِّمْنِيْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ، وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهُ اَنَاءَ اللَّيْلِ وَاَنَاءَ النَّهَارِ، وَاجْعَلْهُ لِيْ حُجَّةً يَّارَبَّ الْعَالَمِيْنَ!

اب ہم اس دعا کا مطالعہ کریں گے، کیونکہ دعا مانگنے کا مزہ تو تبھی ہے جب انسان اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو۔

اَللّٰهُمَّ اِنْسِ وَحَشَّتِيْ فِيْ قَبْرِىْ

”اے اللہ! میری قبر کے اندر مجھے جو وحشت ہوگی اسے میرے لیے مانوس کر دے!“

اس وحشت کو دور کرنے کے لیے مجھے قرآن مجید کا انس عطا کر دے! — یاد رکھیں! قبر کی وحشت قرآن کے ساتھ تعلق کی بنا پر مانوس ہوگی۔ اپنی جوانی کے ایام میں (جب آتش جوان تھا!) جب میں اس دعا کو پڑھا کرتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرآن سے متعلق اصل دعا تو اگلے فقرے سے شروع ہوتی ہے اور یہ پہلا جملہ اضافی سا ہے۔ مگر اب جبکہ بڑھا پے میں قبر ہر وقت سامنے نظر آتی ہے تو اب معلوم ہوا ہے کہ اس دعا کا اہم ترین حصہ تو یہی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَرْحَمْنِيْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ

”اے اللہ! مجھ پر رحم فرما قرآن عظیم کی بدولت“

وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَنُوْرًا وَهَدًى وَرَحْمَةً

”اور اس کو میرے لیے امام، نور، ہدایت اور رحمت بنا دے!“

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کو اپنا امام بنانے کا ارادہ بھی کرے کہ اب مجھے قرآن مجید کو اپنا راہبر و راہنما مان کر اس کی پیروی کرنی ہے۔ لیکن اگر دل میں ایسا کوئی شعوری ارادہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو ظاہر ہے ایسی کیفیت میں یہ دعائیں کلمہ بھی ”ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ“ کے مصداق محض منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بن کر رہ جائے گا اور عملی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

اَللّٰهُمَّ ذِكْرُنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيتُ

”اے اللہ! مجھے یاد کرادے جو کچھ میں اس میں سے بھول جاؤں“

وَعَلَّمْنِي مِنْهُ مَا جَهِلْتُ

اور مجھے سکھادے اس میں سے جو میں نہیں جانتا“

ظاہر ہے یہ دعا بھی تبھی کارگر ہوگی جب عملی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے کی نیت اور کوشش انسان کے شامل حال ہوگی۔ یاد رکھیں! قرآن مجید کا علم بہت قیمتی چیز ہے۔ یہ عظیم دولت اللہ تعالیٰ کسی کی جھولی میں زبردستی نہیں ڈالتا۔ چنانچہ جس طرح انسان دنیا کے دوسرے علوم و فنون کو سیکھنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے اسی طرح قرآن مجید کو سیکھنے کے لیے بھی محنت درکار ہے۔ چنانچہ قرآن سیکھنے کے لیے آپ زانوائے تلمذ تہ کریں اور عربی سیکھیں۔ اس حوالے سے حضرت علیؓ کے یہ اشعار بہت بصیرت افروز ہیں:

يَعُوْذُ الْبَحْرُ مَنْ طَلَبَ الْاَلَاءِ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَى سَهَرَ اللَّيَالِی

”جو شخص بھی موتیوں کا طلب گار ہوتا ہے اسے سمندر میں غوطہ زنی کرنا پڑتی ہے۔ اور جو شخص کسی بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے (اور محنت و مشقت کرتا ہے)۔“

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَى مِنْ غَيْرِ سَكَدَ اَصْحَاغُ الْعُمُرِ فِي طَلَبِ الْمَحَالِی

”اور جو کوئی بلندی کا طلب گار بن جائے بغیر کوشش کے وہ اپنی عمر ضائع کر بیٹھتا ہے ایک محال چیز کی طلب میں۔“

اس حوالے سے پڑھ لکھے خواتین و حضرات کو خصوصی طور پر بہت تنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اگر انہوں نے بہت سے دنیوی علوم و فنون سیکھ رکھے ہیں تو آخر وہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ اور یہ کہ قیامت کے دن وہ اپنی اس کوتاہی کے جواز میں آخر کیا عذر پیش کریں گے؟

وَاِذْ فُتِنِیْ تِلْكَ لَوْنَتُهُ

”اور مجھے تو فتنہ عطا فرما کہ میں اسے پڑھتا رہوں“

اِنَّآءَ الْیَلِ وَاِنَّآءَ النَّهَارِ

”رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی۔“

وَاَجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّارَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

”اور اے تمام جہانوں کے پروردگار! اس قرآن کو میرے حق میں دلیل اور گواہ بنادے۔“

اس جملے کا مفہوم سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کا یہ فرمان مد نظر رہنا چاہیے: ((الْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَیْكَ))

”کہ یہ قرآن جہت (دلیل یا گواہ) ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف!“، یعنی قرآن مجید قیامت کے دن ہر انسان کے حساب کے وقت گواہ بن کر کھڑا ہوگا۔ جس کسی نے حسب استطاعت اس کے حقوق (یعنی اس پر ایمان لانے) اس کو پڑھنے سمجھنے اس پر عمل کرنے اور اس کی ترویج و تبلیغ کے حوالے سے) ادا کیے ہوں گے تو قرآن مجید اس کے حق میں گواہی دے گا اور اس کے شافع کی حیثیت سے اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لیکن جس شخص نے قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے سے بے اعتنائی برتی ہوگی قیامت کے دن وہ اس کے خلاف گواہی دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ



کی عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ اے اللہ! یہ بد بخت مجھے تیرا کلام تو مانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے مجھے پڑھنے یا سمجھنے یا میرے احکام پر عمل کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔ یہ تو وہ دعا ہے جو قرآن مجید کے نسخوں کے اختتام پر عام طور پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ سے ایک اور دعا بھی منقول ہے جسے میں نے تین مختلف روایتوں سے جمع کر کے لوگوں کی سہولت کے لیے ترجمے کے ساتھ شائع کروایا ہے۔ اس دعا میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ اَمَتِكَ، فِیْ قَبْضَتِكَ، نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ، مَا ضِیْعَ فِیْ حُكْمِكَ، عَدْلٌ فِیْ قَضَاءِكَ، اَسْأَلُكَ بِکُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّیْتَ بِهِ نَفْسَكَ، اَوْ عَلَّمْتَهُ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ، اَوْ اَنْزَلْتَهُ فِیْ كِتَابِكَ، اَوْ اَسْتَاثَرْتَ بِهِ فِیْ مَكْنُونِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْکَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ، وَنُوْرَ صَدْرِیْ، وَجَلَاءَ حُزْنِیْ، وَذَهَابَ هَمِّیْ وَغَمِّیْ۔ اَمِیْنُ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

اس دعا کو پڑھتے ہوئے مجھے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو انہوں نے عبادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہے ہیں۔ امام ابن تیمیہ کے الفاظ میں عبادت ”غَايَةُ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذِّلِّ وَالْخُضُوعِ“ کا نام ہے۔ یعنی عبادت یہ ہے کہ انسان خود کو خدا درجے کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھا دے۔ اس دعا کے ایک ایک جملے اور ایک ایک لفظ میں اللہ تعالیٰ کے لیے غایت درجے کی محبت، انکساری، عاجزی اور تدلل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر بندہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اس دعا کو زبانی یاد کر لے اور حرز جاں بنالے۔ آئیے اب اس دعا کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیجیے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ ”اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں“

وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ اَمَتِكَ ”تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔“

میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا اور میری والدہ بھی تیری ادنیٰ کنیز تھی۔

فِیْ قَبْضَتِكَ ”میں تیرے قبضہ قدرت میں ہوں۔“

نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ ”میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔“

مَا ضِیْعَ فِیْ حُكْمِكَ ”میرے پورے وجود میں تیرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔“

عَدْلٌ فِیْ قَضَاءِكَ ”میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ عدل ہی پر مبنی ہے۔“

اَسْأَلُكَ بِکُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّیْتَ بِهِ نَفْسَكَ ”میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اس پاک نام

کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذات مقدس کو موسوم فرمایا۔“

اس جملے میں گویا قرآن مجید کے اس حکم کی جھلک نظر آ رہی ہے اِنَّ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءَ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا ص (الاعراف: ۱۸۰) کہ سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، تم اس سے ان ناموں کے حوالے سے دعا کیا کرو۔

”أَوْ أَنْزَلْنَاهُ فِي كِتَابِكَ“ یا جسے تو نے اپنی کسی کتاب میں نازل کیا  
 ”أَوْ عَلَّمْنَاهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ“ یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا  
 ”أَوْ اسْتَأْذَنَتْ بِهِ فِئِی مَكْنُونِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ“ یا اسے ابھی تو نے اپنے پاس اپنے غیب کے  
 خزانے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔“

اب دیکھیں حضور ﷺ نے اپنی عاجزی و انکساری اور اللہ تعالیٰ کے سارے ناموں کا حوالہ دے کر مانگا کیا ہے؟  
 ”أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْكَرِيمَ رِبْعَ قَلْبِي“ (اے اللہ!) اس قرآن کریم کو میرے دل کی بہار بنادے  
 ”وَنُورَ صَدْرِي“ اور اسے میرے سینے کا نور بنادے  
 ”وَجَلَاءَ حُزْنِي“ اور میرے رنج و حزن کا مداوا بنادے  
 ”وَكَهَابَ هَمِّي وَغَمِّي“ اور میرے تفرات اور غموں کے ازالے کا سبب بنادے۔“  
 آمین! ثُمَّ آمین!!

نوٹ کیجیے! حضور ﷺ نے عبدیت، تواضع اور تذلل کی انتہا پر جا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے تو قرآن  
 کریم کی محبت کا، قرآن مجید کی معیت کا اور قرآن حکیم کے سہارے کا۔ ظاہر ہے یہی تو کائنات کی سب سے قیمتی  
 چیز اور سب سے بڑی دولت ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ  
 لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ۖ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝﴾ (یونس)  
 ”اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض)  
 کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ  
 (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ  
 کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم ۝

(اختتامی نشست دورہ ترجمہ قرآن جامع مسجد قرآن اکیڈمی، ڈیفنس، کراچی)

۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ / ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء

## کلمہ تشکر

الحمد للہ، غم الحمد للہ! بانی تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے شہرہ آفاق دورہ ترجمہ قرآن کی ترتیب و تسوید اور تدوین کا کام آج پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ ”شکر صد شکر کہ جتنا زہ منزل رسید!“ اس کٹھن کام جسے خود ڈاکٹر صاحب نے ”پہاڑ ایسا بھاری کام“ قرار دیا تھا، کا آغاز میں نے 2006ء میں ”تعارف قرآن“ کی ایڈیٹنگ سے کیا تھا، جبکہ ”بیان القرآن“ کا حصہ اول (مشتمل بر ”تعارف قرآن“ سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ“) 2008ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد حصہ دوم کی ایڈیٹنگ کے دوران مجھے یقینینٹ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب (ایجوکیشن کور) کی رفاقت میسر آ گئی، جس کی حیثیت بلاشبہ تائید نہیں کی تھی۔ محترم کرنل صاحب نے خالصتاً رضائے الہی کے حصول کی خاطر مسلسل چھ برس تک اس مشکل کام میں انتہائی دلچسپی، ذوق و شوق اور لگن سے حصہ لیا اور کمال مہارت سے معاونت کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے۔

”بیان القرآن“ کے قارئین اس امر سے واقف ہوں گے کہ دعوت قرآنی کی نشر و اشاعت کے ضمن میں یہ تحریری کاوش محض دروس قرآنی کو لفظ بہ لفظ صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے کتابی صورت میں پیش کر دینے پر منحصر نہیں ہے، بلکہ خطابی انداز کو تحریری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش ہے، جس میں الفاظ اور جملوں کی تقدیم و تاخیر کے علاوہ کہیں حسب ضرورت اختصار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں بعض الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ گویا یہی سے اتارے گئے مسودہ کو از سر نو تحریر کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیث نبویؐ کے صحت متن اور تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ ہم اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس ضمن میں ہمیں قارئین کی آراء، تبصروں اور تجاویز کا انتظار رہے گا۔

”بیان القرآن“ کی تیاری کے ضمن میں شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی لاہور کی پوری ٹیم نے بقدر استطاعت محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خصوصاً اس کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، تصحیح غلطائے تدوین و تزئین اور طباعت کے مراحل میں برادر م حافظ محبوب احمد خان، عزیز م مرتضیٰ احمد، عزیز م حافظ محمد زاہد اور برادر محترم شیخ رحیم الدین (انچارج پرنٹنگ) کی لگن اور سرگرمی لائق تحسین ہے۔ ”بیان القرآن“ کی طباعت کا سہرا انجمن خدام القرآن پشاور کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی کے سر ہے، جو اس کی تکمیل پر بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ”بیان القرآن“ کو اہل علم اور طالبان قرآن کے حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اور اس کا حصہ ہفتم پریس جانے سے قبل حصہ اول کے دس ایڈیشن اور حصہ دوم تا حصہ ششم کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ! مکتبہ خدام القرآن لاہور کے کارکنان جس مستعدی سے اس کی ترسیل و فروخت کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ بھی یقیناً لائق ستائش ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دعوت قرآنی کی اس خدمت کو شرف قبول عطا فرما کر اسے داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے لیے صدقہ جاریہ اور رفیع درجات کا ذریعہ بنائے اور اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے سعادت دارین کا باعث بنائے۔ آمین یا رب العالمین!!

حافظ خالد محمود خنفر

مدیر شعبہ مطبوعات

۷ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ / ۵ جون ۲۰۱۵ء

بروز جمعہ المبارک

# بیاض القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد